مجموعہ القاسم

Jamiatul Qasim Darul Uloom-il- Islamia, Supaul Bihar (INDIA)

جلد دوم ۲ سیرت محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

ترتیب

ناموس رسالت کے علمبردار، امین ملت

مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

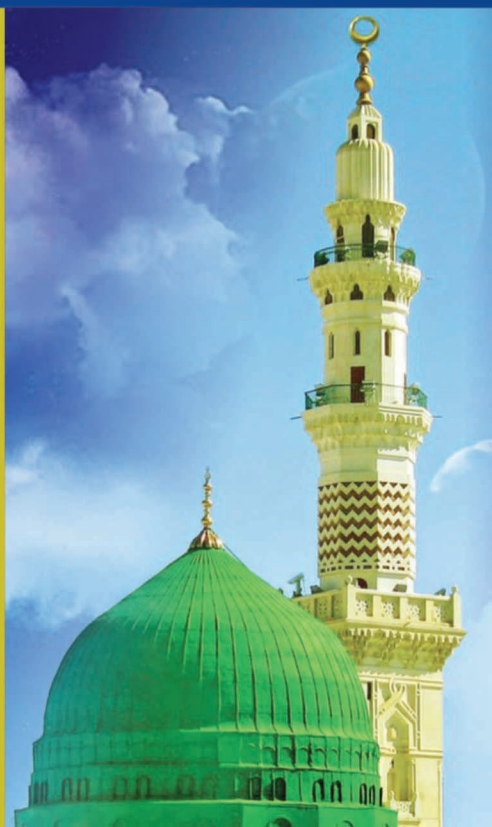

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ سپول بہار کا علمی، دینی، دعوتی، فکری اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ معارف قاسم جدید، دہلی

کی

تحقیقی، تاریخی اور دستاویزی پیش کش

مجموعہ القاسم

﴿سیرت محسن انسانیت ﷺ - ۲﴾

ترتیب

ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

تقدیم

ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

ناشر

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : مجموعہ القاسم (سیرت محسن انسانیت ﷺ-٢)

ترتیب : ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

تقدیم : ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

صفحات : ٥٧٢

اشاعت : ٢٠١٨ء

تعداد : ٢٥٠٠

ناشر : جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، سپول، بہار، الہند

﴿ملنے کے پتے﴾

- امام قاسم اسلامک ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ انڈیا
K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave, Part-I
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
Ph: +91-11-26981876, 26982907, **Mob.:** +91-9811125434
9899766786, 9931906068, 9931515312, 9708056420
- حرا انٹرنیشنل اکیڈمی، فاربس گنج، ارریہ بہار، الہند
- خدمت خلق ٹرسٹ انڈیا، ہرپور بیشی، اورائی، مظفر پور بہار، الہند۔ موبائل:9891763977

انتساب

استاذ الکل مولانا مملوک علی النانوتوی، حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم النانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، مجاہد فی سبیل مولانا محمد مظہر النانوتوی بانی مظاہر علوم سہارنپور، امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الحدیث اوّل مولانا محمد یعقوب نانوتوی، امیر لشکر میدان شاملی مولانا محمد منیر نانوتوی، کتب فقہ اسلامی کے مصنف مولانا محمد احسن نانوتوی اور مصلح قوم سرسید احمد خان بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام منسوب کرتا ہوں۔ جن کے جلائے ہوئے چراغ کی لَو سے آج پوری دنیا ڈیڑھ صدی سے روشن ہے، اور جن کے اخلاص کا تاج محل، کتاب وسنت، فقہ اسلامی کی ترویج کے علاوہ اسلامی تحریک، ناموس تحفظ ختم نبوت، مدارس ومساجد اور انسانی خدمات کا وہ روشن باب جن کا شمار ہمیشہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے تاریخ داں لکھے گا انشاء اللہ۔ یقیناً یہ کارہائے نمایاں ہمیشہ انجام پاتے رہیں گے اور آئندہ بھی مورخ اِن کارناموں کو سنہری حروف میں لکھتا رہے گا۔

بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

رونق بزم

نمبر شمار	عناوین	اہل قلم	صفحہ
۱	سیرت محسن انسانیتؐ کا مطالعہ ضروری کیوں؟	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۷
۲	پیغامات		۹
	مقالات و مضامین		۳۱
۳	حضور ﷺ کے حقوق امت پر	مولانا اشرف علی تھانویؒ	۳۴
۴	ہمارا پرچم انقلاب-لا الٰہ الا اللہ	سید قطب شہیدؒ	۴۱
۵	النبی الخاتم ﷺ	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	۵۵
۶	دنیا پیاسی ہے	محمد نور اللہ جاوید قاسمی	۶۴
۷	محمد عربی ﷺ کا خلق عظیم	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی	۷۱
۸	ذکر جمیل	مولانا عبدالماجد دریا آبادی	۷۷
۹	سیرت کا پیغام موجودہ دور کے مسلمانوں کے نام	مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	۸۱
۱۰	پیغمبر اسلام کا پیغام امن	مولانا زین العابدین سجادؒ میرٹھی	۸۵
۱۱	سیرت نبوی میں دعوت وسیاست کا امتزاج	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۱۰۰
۱۲	رحمت عالم کا لایا ہوا نظام حیات	مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی	۱۰۴
۱۳	سیرت رسولؐ میں عصر حاضر کے مسائل کا حل	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۲۹
۱۴	حقوق نسواں تعلیمات نبوی کی روشنی میں	مولانا محمد قمر الزماں الٰہ آبادی	۱۳۳
۱۵	حضور اکرم ﷺ اور تعدد ازدواج	مولانا جعفر شاہ پھلواروی	۱۴۰

۱۶	رسول اللہ ﷺ کا تعلیمی انقلاب	مولانا محمد عیسیٰ منصوری	۱۶۵
۱۷	تحفظ حقوق انسانی کا عالمی منشور	ادارہ	۱۷۴
۱۸	سیرت طیبہ کی پیروی.....	حکیم محمد سعیدؒ	۱۷۶
۱۹	عہد نبوی میں معاشرتی انقلاب	مولانا اسرار الحق قاسمی	۱۸۲
۲۰	رحمت عالم، بہار عالم	علامہ محمد اکرام علی	۱۸۸
۲۱	حق پر ثابت قدمی سیرت طیبہ کا اہم ترین درس	مولانا نور عالم خلیل امینیؒ ترجمہ: محمد جسیم الدین قاسمی	۱۹۹
۲۲	پیغمبر اسلام کا غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۲۰۸
۲۳	مسائل کا حل سیرت کی روشنی میں	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۲۲۰
۲۴	تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں؟	مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ	۲۴۵
۲۵	اسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ	۲۴۸
۲۶	رحمت للعالمینؐ مثالی رہنما	ڈاکٹر محمد عنایت اسعد سبحانی	۲۵۱
۲۷	سید المرسلین ﷺ کے پیغام کی افادیت	عبدالاحد حقانی	۲۵۸
۲۸	کامیابی کا راز خلق عظیم کی تلوار	ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی	۲۶۲
۲۹	رسول پاک ﷺ اور شہری منصوبہ بندی	ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی	۲۶۷
۳۰	نسلی تفاخر اور اسوۂ رسول اکرم ﷺ	مولانا خالد ندوی غازی پوری	۲۸۸
۳۱	دعوت وتبلیغ دین اسوۂ نبوی کی روشنی میں	پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی	۲۹۲
۳۲	دعوت وتبلیغ کا نبوی طریقہ	مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی	۲۹۷
۳۳	مدینہ کی اسلامی ریاست اور جہاد	ڈاکٹر محمود حسن	۳۰۴
۳۴	مجالس نبوی کی خصوصیات	مولانا انیس الرحمٰن قاسمی	۳۲۴
۳۵	وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا	مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی	۳۳۰
۳۶	اسوۂ رسول کے روشن ابواب	محمد اسجد قاسمی ندوی	۳۵۱

۳۷	پیغمبر اسلام اور تعلیمی نظام	مولانا عقیدت اللہ قاسمی	۳۷۸
۳۸	رسول اللہ ﷺ کا تبسم	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۳۹۶
۳۹	خاتم النبیین ﷺ کا بچپن	بریگیڈیئر گلزار احمد	۴۰۴
۴۰	رسول اللہ ﷺ اور طبقہ نسواں	بیگم خدیجۃ النساء سنگاپور	۴۱۹
۴۱	راہ ارتقاء	ڈاکٹر قیصر حبیب ہاشمی	۴۳۵
۴۲	معاشرتی زندگی اور پیغمبر انقلابؐ کا اسوہ	فرحانہ فردوس	۴۴۵
۴۳	رسول خدا کی ازدواجی زندگی	مولانا عین الحق قاسمی	۴۴۹
۴۴	اسلام اور مذہبی آزادی	سید عبدالحکیم	۴۵۸
۴۵	محمدؐ بے زبانوں کے ہمدرد وغم گسار	مولانا محمد سعیدی	۴۷۲
۴۶	کتاب اللہ کی تفسیر اسوۂ رسول اللہ	مولانا مفتی ثمین اشرف قاسمی	۴۷۷
۴۷	یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا	ابواحسن مہتاب	۴۸۱
۴۸	سیرت محمدی ﷺ کا راز	مولانا رضوان احمد ندوی	۴۸۴
۴۹	حضور ﷺ کی امتیازی خصوصیات	مولانا محمد یوسف انور قاسمی	۴۸۸
۵۰	معاشرہ کی اصلاح میں محسن انسانیت کی رہنمائی	مفتی معظم علی قاسمی	۴۹۵
۵۱	شہ لولاک ﷺ کا عفو درگذر	ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی	۵۰۰
۵۲	محمد عربیؐ غیر مسلم مصنّفین اور دانشوروں کی نظر میں	محمد رضوان الحق قاسمی	۵۰۶
۵۳	اسوۂ نبوی ہی ہر دور میں کامیابی کا ضامن	محمد جسیم الدین قاسمی	۵۱۴
۵۴	سیرت طیبہ کے چند دعوتی پہلو	مولانا ابوریحان ندوی	۵۱۸
۵۵	طب نبوی ﷺ	حکیم سید امین الدین	۵۲۲
۵۶	'محمد ﷺ خدا کے پیغمبر اور ایک عظیم ہیرو'	تھامس کارلائل (ترجمہ) ڈاکٹر شبیر احمد بن عبدالرشید	۵۳۵

☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سیرت محسن انسانیتؐ کا مطالعہ ضروری کیوں؟

● ناموس رسالت کے علمبردار امین ملت بندہ مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

مجموعہ القاسم کا جلد دوم سیرت النبی نمبر پر مشتمل ہے۔ اس کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ عصر حاضر میں دنیا بھر میں صہیونی تحریک اور خود ہندوستان کا ایک طبقہ پروپیگنڈہ کے ذریعہ نبی اعظم وآخر حضرت محمد ﷺ کی شخصیت وتعلیمات کو ایک خاص زاویہ سے پیش کررہا ہے اور یہ پروپیگنڈہ اس قدر متواتر اور منظّم انداز میں کیا جارہا ہے کہ ہماری نئی نسل کا ذہن و دماغ اس سے متاثر ہورہا ہے اور دین واسلام سے بیزاری بڑھتی جارہی ہے۔ ظاہر ہے یہ صورت حال انتہائی تشویشناک ہے، ان حالات میں شدت سے تقاضہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے آفاقی پیغام اور عالم گیر دعوت کو عصر حاضر کے تناظر میں پیش کیا جائے۔ تاکہ باطل طاقتوں کے پروپیگنڈے اور ان کی سازشوں کا دفاع کیا جاسکے اور نئی نسل کو ذہنی آوارگی سے بچایا جاسکے اور ان کے سامنے آپ ﷺ کی تعلیمات روز روشن کی طرح عیاں ہوکر سامنے آئیں۔

الحمد للہ یہی باتیں سیرت النبیؐ کی ترتیب میں پیش نظر رہیں، جس کو قارئین خود محسوس فرمائیں گے۔ اہل علم کے لئے یہ ایک ایسا دستاویز تیار ہوگیا، کہ جس کا مطالعہ محبت رسول ﷺ میں اضافہ کا باعث ہوگا اور آقا کی تعلیمات پر عمل کرنے کا جذبہ اور شوق بیدار ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس کی ترتیب میں مولانا محمد نور اللہ جاوید قاسمی، مولانا محمد رضوان الحق قاسمی اور ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی نے کافی دلچسپی لی اور انھیں حضرات کی محنت شاقہ کی بدولت یہ سیرت النبی کا عظیم علمی اور دستاویزی ذخیرہ آپ کی خدمت میں پیش ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مذکورہ حضرات کی کاوشوں کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین

اخیر میں ہم اپنی اس حقیر کاوش کو خاتم النبین محسن انسانیت ﷺ کی بارگاہ عالی میں ان ہی جذبات کے ساتھ نچھاور کرتے ہیں جو حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے المناک سانحہ کے وقت بارگاہ اقدس میں نذر کئے تھے۔ ''حضور! میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کی زندگی بھی پاکیزہ تھی اور وفات بھی پاکیزہ ہوئی، آپ نے امت کے ساتھ وہ خصوصی برتاؤ کیا کہ آپ کی ذات سراپا تسلی گاہ بن گئی، آپ نے اس قدر رحمت کو عام کیا ہم سب آپ کی نظر میں برابر قرار پائے، اگر آپ کی وفات اختیاری ہوتی تو ہم آپ کی وفات کے بدلے کتنی ہی جانیں نچھاور کر دیتے، اے اللہ ہمارے یہ جذبات آقائے مدنی تک پہنچا دے اور اے محمد ﷺ آپ اپنے پروردگار کے دربار میں ہمیں یاد رکھیے اور ہمیں اپنے دل میں بسائے رکھئے۔''

کاش بارگاہ عالی میں اس کاوش کو پروانہ قبولیت عطا ہو اور یہ خدمت ذریعہ نجات اور وسیلہ شفاعت بن جائے۔ **وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز.**

☆☆

پیغامات

وہ دانائے سبل مولائے کل، ختم الرسل جس نے
غبار راہ کو بخشا، فروغ وادی سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

علامہ اقبالؒ

پیغام

● جانشیں مفکر اسلام حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدالمرسلین وخاتم النبین محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وبعد!

پیغمبر اعظم نبی خاتم سیدنا حضرت محمد ﷺ کی شخصیت اپنے امتیازات کے ساتھ جلوہ گر ہوئی، جس میں ان کا کوئی شریک وسہیم نظر نہیں آتا، شفقت علی الخلق، رافت ومحبت، تواضع، رحم دلی، کرم گستری، معاندین ومخالفین کے ساتھ بھی وہ برتاؤ اور حسن سلوک جس کا تصور محال تھا، ہر موقع پر برسر پیکار رہنے والے کو اگر امان چاہئے تو انہیں امان دے دی اور جائے امان میں پہنچ جانے والے کو حفظ وامان میں لے لیا، جنگوں اور صلح حدیبیہ اور پھر فتح مکہ کے موقعہ پر اس تعلق سے کتنے واقعات پیش آئے جس سے آپ ﷺ کی انسانیت نوازی کی وہ اعلیٰ مثال اور اسوۂ حسنہ سامنے آتا ہے جس کی دوسری قوموں کے پاس کوئی نظیر نہیں۔ بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور قیدیوں، ذمیوں، دوسرے مذاہب کے ماننے والوں، پڑوسیوں، عزیزوں ورشتہ داروں، مسافروں، ساتھیوں، محافظوں، کمزوروں، غریب محتاج لوگوں حتیٰ کہ جانوروں اور اس سے بڑھ کر اشیاء خوردنی، نباتات، جمادات، جسم کے اعضاء سڑکوں، مکانات، پانی اور خشکی، گو سبھی چیزوں کے تعلق سے جن کا دنیوی زندگی سے کیسا ہی تعلق ہو ایسا اسوۂ حسنہ پیش کیا اور وہ احکامات دئے جن سے کسی کی حق تلفی نہ ہو اور ایک انسان کو انہیں چیزوں کا مکلّف کیا ہے

جس میں اس کی منفعت ہے، مگر وہ منفعت دوسرے کو مضرت پہنچے بغیر ہے۔

اس باریکی سے آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ سامنے آئی ہے اور اللہ رب العالمین نے آنے والی نسلوں کے لئے وہ محفوظ بھی فرمادی، تاکہ صحیح انسانی زندگی گزارنے کا نمونہ لوگوں کے سامنے ہو، مگر ایسے لوگ بھی ہر دور میں موجود رہے جو انسانیت کو گمراہ کرنے کے لئے آپ ﷺ کی شخصیت کو متنازعہ بنا کر پیش کرنے اور دوسروں کو اسوۂ حسنہ وسیرت مبارکہ سے استفادہ سے محروم رکھنے کی کوشش کرتے رہے، ان حالات میں امت مسلمہ کی یہ اولین ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اہانت رسول ﷺ کے جرم کے مرتکبین اور انسانیت کو غلط ڈگر پر لے جانے والے معاندین کا تعاقب اور کیفر کردار تک پہنچائیں۔ ہر دور میں علماء ومسلمین نے یہ فریضہ انجام دیا اور آج بھی دے رہے ہیں، اردو زبان میں اس خدمت کی انجام دہی کی توفیق جن حضرات کو ملی ان میں علامہ شبلی نعمانیؒ اور ان کے تلمیذ رشید علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، جن کی کتاب ''سیرۃ النبی ﷺ'' اس سلسلہ کی شاہکار تصنیف ہے، مزید علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ''سیرت عائشہ'' اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ''نبی رحمت'' اور دیگر علمائے دیوبند مثلاً علامہ انور پاشا صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ وغیرہ کے مقالات وتصنیفات نمایاں رول ادا کرچکی ہیں۔ خوشی ومسرت کی بات ہے کہ محبّ عزیز مکرم مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی مدیر اعلیٰ ''معارف قاسم جدید'' دہلی ورئیس جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی، سپول (بہار) اس سلسلہ کا ایک اہم وقیع اقدام کرنے جارہے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی اس جہاد میں شریک کرنا چاہا ہے اس طرح گنہگار کو بھی یہ چند سطریں لکھ کر شرکت کی سعادت حاصل ہورہی ہے، اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر عطا کرے اور اس خدمت کو قبول فرمائے۔ (آمین)

محمد رابع حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

نئی نسل کے نام

سیرت نبویؐ کا ایک اہم پیغام!

● متکلم اسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت الطافکم

جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم، دیوبند

مخلص مکرم عزیز گرامی مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی حفظہ اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے مراسلہ اور فون کی گفتگو سے اطلاع ہوگئی تھی، مزید برآں آپ نے مولانا رضوان الحق قاسمی سلمہ کو بھیج کر توجہ دلائی کہ جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی سپول کا ترجمان ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' کا سیرت نمبر شائع ہورہا ہے۔ **فجزاکم اللہ خیرا.**

اس وقت جب کہ انسانیت روحانی طور پر سسکتی بلکتی حالت میں دم توڑ رہی ہے، اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ کی سیرت مقدسہ کو بہتر طور پر امت کے سامنے پیش کرکے اسلامی قدروں کو اجاگر کیا جائے اور اخلاقی پستی کو بلند اخلاق سے تبدیل کرکے انسانیت کو اعلیٰ مقام دلانے کی جدوجہد کی جائے۔ آپ کی اس پیش رفت پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، حق تعالیٰ شانہ سے بصمیم قلب دعا گو ہوں کہ اس خصوصی شمارہ کو قبول فرمائے اور اس کو افادۂ عام کے لئے شرف قبولیت سے نوازے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

نئ نسل کے لئے نبی اکرم ﷺ کی سیرت کی روشنی میں یہ پیغام ابدی صداقت پر مبنی ہے کہ ملت اسلامیہ اگر اہل علم وفکر کی کثرت، اخلاق مندانہ تمدن، شرافت کی قدروں پر مشتمل تہذیب، ضروریات زندگی میں سہل العمل وسائل کی افراط، صنعتی برتری، ذرائع نقل وحمل اور وسائل علم وخبر میں خود کفیل، نیز دینی لحاظ سے بلند معیار وتدریس، تبلیغ وافتا، تقریر و خطاب اور تحریر و کتاب سے بہرہ مند ہو، تو یہ تمام نعمتیں جہاں لائق شکر ہیں، وہیں یہ دوسرا پہلو بھی غیر معمولی طور پر لائق التفات وتوجہ ہے کہ ملت کا جو طبقہ ان کمالات کا حامل اور ان امتیازات سے متصف ہوگا وہ یقیناً بوڑھا، یا بڑھاپے سے قریب ہوگا اور قدرت نے موت سے کسی کو مستثنیٰ نہیں رکھا، اس لئے اس بارے میں دورائیں نہیں ہوسکتیں کہ یہ صاحب فضل وکمال کا طبقہ جلد اور عنقریب اٹھ جانے والا ہے، اس لئے اس طبقے کی علمی اور عملی یا کمالی صفات کو ملت کے روشن مستقبل کی ضمانت قرار نہیں دی جاسکتی۔

سیرۃ النبی بے پناہ اور کامل تربیتی بنیاد پر اس نئ نسل کو مخاطب بناتی ہے، جو بہت جلد پرانی نسل کی جگہ لینے والی ہے۔ قوم کی قسمت اسی سے وابستہ ہے، کیونکہ تاریخی تسلسل اسی سے قائم رہتا ہے اور قوم کے روشن یا تاریک مستقبل کا انحصار اسی پر ہے۔ اس مرحلے پر سیرت نبوی کا جائزہ لینے کا طریقہ یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ نئ نسل کا اخلاقی معیار کیا ہے۔ اس میں ضبط نفس کتنا ہے؟ اس میں اپنے نظریۂ حیات کو افراط وتفریط سے بچا کر اعتدال پر رکھنے کی کتنی صلاحیت ہے اور بحیثیت مسلمان ان میں صالح نظام کے اندر رہنے کی کتنی عادت ہے اور ان میں ایمانی غیرت کا معیار کیا ہے؟۔

قدیم نسل کے پاس سب کچھ موجود ہونے کے باوجود نئ اور تعلیم یافتہ نسل اگر اپنے نظریہ حیات کا احترام کرنا نہیں جانتی! اگر وہ جماعتی اور قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کی عادی نہیں ہے، اگر اس میں اعتدال برقرار رکھنے کا حوصلہ نہیں ہے تو یقیناً ملت کا مستقبل شدید خطرے میں ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ نئ نسل ایک آتش فشاں ہے کہ پھٹ جائے

تو ملت کا ناقابل تلافی تاراجی اور بربادی سے دوچار ہونا اتنا یقینی بن جاتا ہے جس میں ادنیٰ شک اور تردد کی گنجائش نہیں ہوتی اور خلاصۃً اس کا اہم تر سبب نئ نسل میں قوت تحمل وبرداشت کی کمی اور ناخوشگوار حالات وواقعات پیش آنے پر ان سے مثبت وخوشگوار نتائج برآمد کرنے کی صلاحیت کا فقدان ہونا ہے۔

سیرت نبوی، اسوۂ صالحہ کتاب اللہ کی حسب ہدایت خاص طور پر مکی زندگی میں یہی رہا ہے کہ مخالف قوتوں کے سامنے آنے پر اللہ رب العزت کے بھروسے پر اس کا مقابلہ کرو، باہمی قوت واتحاد کو اس کے لئے محفوظ رکھو کہ تمہاری ہوا نہ اکھڑ جائے اور تم دنیا کی نگاہوں میں بے جہت نہ ہوجاؤ۔

معمر لوگوں میں ضبط نفس زندگی کے تجربات پیدا کردیتے ہیں، اس لئے ان مذکورہ تربیتی ہدایات کی اصل اور صحیح مخاطب وہ نوجوان نسل ہی ہوتی ہے جس کے لئے ضبط نفس اور قوت برداشت محنت طلب ہوتی ہے، کیونکہ اس نوجوان کی عمر میں ناپختگی کی وجہ سے شعور ان کا ساتھ نہیں دیتا اور مسائل کا صحیح ودرست حل جب ہی نکلتا ہے جب ضبط نفس کے ساتھ شعور بھی ہم رکاب ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ ملت کی انتہائی قیمتی نئ نسل اپنے بزرگوں کی زندگی سے سبق سیکھنے کی عادت بنائے اور اپنی زندگی کو اس پر ڈھال کر ملک وملت کی خیر و فلاح کی ضمانت وعلامت بننے کی بھرپور کوشش کرے۔

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ ذُرِّيَاتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَاجْعَلنَا لِلْمُتقين اماماً.

والسلام

☆☆

حیات طیبہ بہترین اسوہ

● عالم ربانی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی مدظلہ العالی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

عزیز گرامی قدر مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب سلمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ مدھوبنی سپول بہار کا ترجمان ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' کے سیرت نمبر کی اشاعت کی روح افزا خبر سے قلبی وایمانی مسرت ہوئی، اس کے لئے آں عزیز میری اور پوری امت کی طرف سے لائق مبارک باد ہیں، اللہ پاک آپ کی اس کوشش کو شرف قبولیت سے نواز کرامت کے لئے ازحد نفع بخش بنائے۔ آمین

آج کی یہ ترقی یافتہ دنیا جن سنگین حالات سے دوچار ہے ان کا حتمی تقاضہ تمام اہل علم اور دعوت فکر کے حاملین پر یہ ہے کہ وہ اس عظیم اور ابدی پیغام محمدی کو اپنا حرز جاں اور سیرت نبوی علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام کے مطالعہ کو اپنا مرکز اولین بنائیں اور زوال آمادہ وفنا بردوش مادی تمدنوں اور کھوکھلی تہذیبوں کی چلچلاتی تیز دھوپ کے اثر سے جھلستے ہوئے انسانی معاشروں کو اس کے گھنے اور دراز سایے کی ہوا دیں، یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور آپ کی حیات طیبہ کے تابندہ و پائندہ نقوش ہمیں انسان کی وضع کردہ تعلیمات اور جھوٹے نظریات سے بے نیاز کرتے ہیں، کیونکہ ان میں تمام مادی اور اخلاقی مشکلات اور پریشانیوں کا علاج اور کافی وشافی حل موجود ہیں جن سے آج کی دنیا دوچار اور ان کے

چنگل میں گرفتار ہے اور جو اس کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں اور اس کو ہلاک کرنے کے درپے ہیں، اگر دنیا نے اپنی اوّلین فرصت میں ان سے چھٹکارا نہیں حاصل کرلیا تو اس کا زوال ایک یقینی فیصلہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ سب سے پہلے تو ایک مسلمان کے لئے بہترین اسوہ اور نمونہ ہے، اس میں ایک کامیاب وفیروز مند انسان کی بہترین اور خوشحال انسانی زندگی کے لئے ایک عظیم اور مثالی نمونہ موجود ہے، نیز اس میں ان لوگوں کے لئے بھی اسوہ موجود ہے جو فوز وفلاح اور چین وسکون کی تمنا رکھتے ہیں اور محبت وایمان کی لذت وحلاوت کے طالب اور عزت وخوشحالی اور کامرانی وشادمانی کے متمنی ہیں۔ آپ کی حیات طیبہ ہر نوع کے انسانوں کے لئے اسوہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ''

٦/ ربیع الثانی ١٤٢٦ھ

☆☆

سیرت پاک تمام انسانوں کے لئے بہترین نمونہ عمل

● امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ
امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

مکرم ومحترم جناب مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ ملا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ، مدھوبنی، سپول'' (بہار) کے ترجمان ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' نے سیرت النبی پر خصوصی دستاویز نکالنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس موقعہ پر آپ نے مجھ سے پیغام بھیجنے اور دعا کی فرمائش کی ہے۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کی مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے اور معارف قاسم کے سیرت نمبر سے لوگوں کو تازگی نصیب ہو۔ امت مسلمہ کے ہر شخص میں خاص کر ہماری بہنوں اور نوجوانوں میں سنت نبوی ﷺ پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

نبی آخر الزماں خاتم الانبیاء سید المرسلین رحمۃ اللعالمین حضرت محمدؐ کی سیرت پاک دنیا کے تمام انسانوں کے لئے بہترین نمونۂ عمل ہے۔ آج دنیا میں جو ظلم وفساد، تصادم اور خوف و نفرت کی فضا پائی جارہی ہے اور پوری دنیا کا امن خطرہ میں ہے، اس کا واحد علاج اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید میں ہے اور اس کا عملی نمونہ خاتم النبینؐ کی سیرت طیبہ میں ہے۔ ذمہ داری مسلمانوں کی ہے جن کے ہاتھوں میں قرآن مجید ہے اور جن کے سامنے اسوۂ رسول ہے کہ وہ خود اس پر عمل کریں اور ساری دنیا کو امن وسلامتی، انسانی اخوت وہمدردی

اور محبت کا پیغام دیں۔

اللہ کے رسولؐ کی سب سے امتیازی شان یہی ہے کہ آپؐ نے اللہ کا جو حکم بندوں کو سنایا اس پر عمل کر کے دکھایا اور آپؐ نے اپنی حیات مبارکہ میں سچے مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کردی، جنہوں نے اپنے قول وعمل سے ایمانداری، دیانتداری اور خداپرستی سے ساری دنیا کو امن کا پیغام دیا۔ اپنے اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ سے لوگوں کا دل جیت لیا اور انسانی مساوات امن وانصاف کا بول بالا ہوا۔

آج سب کچھ ہے، مگر ہم لوگوں کے سامنے عملی نمونہ نہیں پیش کر پاتے، جس کی وجہ سے ہماری زبان وقلم کی وہ تاثیر نہیں رہی ہے۔ دنیا کو حق کی تلاش ہے، اچھے انسانوں کی تلاش ہے۔ مسلمان خیر امت ہیں وہ آج بھی دنیا بھر کے انسانوں کی قیادت وسیادت کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆

دُرفشانی نے تیری قطروں کو دریا کر دیا

● عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد قمر الزماں الٰہ آبادی دامت برکاتہم

عزیز مکرم مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی، بانی و مہتمم جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ بہار

السلام علیہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''جامعۃ القاسم دارالعلوم الاسلامیہ'' کا علمی وادبی واصلاحی ترجمان ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' کے ''سیرت النبیؐ'' نمبر نکالنے کی اطلاع سے بڑی خوشی ومسرت ہوئی۔ مجھے پیغام لکھنے کو کہا گیا تو اپنی تمام تر مصروفیتوں کے باوجود میں نے پیغام لکھنے میں سعادت مندی محسوس کی۔

رسول کریمؐ کی تعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ سے دوری عام ہوتی جارہی ہے، جس کے نتیجہ میں آج امت مسلمہ قسم قسم کے مشکلات ومصائب میں الجھتی جارہی ہے، آں موصوف نے اس پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے معارف قاسم کا سیرت نمبر نکالنے کا اقدام کر کے تعلیمات نبویﷺ کو عام کرنے کی پیش رفت کی ہے۔ آپ کے اس اقدام پر ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعاء گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اس مبارک مساعی کو شرف قبولیت سے نوازے اور علماء وطلبا اور عامۃ المسلمین کے لئے نفع بخش بنائے۔ آمین

رحمت کا ابر بن کر جہاں بھر میں چھایئے
عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھایئے

آقائے نامدار، تاجدار مدینہ جناب محمدﷺ کی سیرت طیبہ وحیات مبارکہ میں آپ کے اوصاف وکمالات کا عظیم مظہر جزیرۃ العرب بالخصوص مکہ معظّمہ کا وہ دور جہالت ہے، جس میں آپﷺ کی بعثت مبارکہ ہوئی، جسے آپﷺ نے کتاب حکمت اور اپنے فیض وصحبت سے خیر القرون میں تبدیل کر دیا۔

اس دور جہالت کی اخلاقی گراوٹ، تنزل وانحطاط کا تذکرہ مکہ معظّمہ ہی کے ایک قدیم باشندے صحابیٔ رسول حضرت جعفر بن ابی طالب نے شاہ حبشہ نجاشی کے دربار میں اس طرح بیان کیا تھا:

''اے بادشاہ ہم جاہلیت والی قوم تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، ہر طرح کی بے حیائی کرتے تھے، رشتوں کو توڑتے تھے، پڑوسی کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے اور ہم میں طاقتور کمزور کو کھاتا تھا، جہالت اور ضلالت وگمراہی کے اس سیاہ دور میں نہ صرف کفر وشرک اور بت پرستی عام تھی، بلکہ ہر طرف شراب نوشی، قمار بازی، عیش پرستی، شہوت رانی، ظلم وزیادتی، حقوق کی پامالی کا دور دورہ تھا، بعض سنگ دل اور قسیّ القلب ظالم لوگ محض جھوٹی شرم اور خود ساختہ تخیل وننگ وعار کی وجہ سے اپنی نوزائدہ بچی کو زندہ درگور کرنا اپنے لئے فخر محسوس کرتے تھے۔ غرضیکہ پورا معاشرہ انسانیت سوز مظالم، معاصی وفحاشی اور ضلالت وگمراہی کے ایک عمیق واتھاہ سمندر اور نہایت مہیب خندق کے کنارے پر پہنچ چکا تھا اور قریب تھا کہ چند لمحوں میں گر کر اس کی تاریکیوں میں گم ہو جائے۔ قرآن کریم میں اس منظر کی عکاسی خود باری تعالیٰ نے ان الفاظ میں کی ہے:

''وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا'' (آل عمران 103)

(اور تم لوگ آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔)

ایسے سنگین حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرمؐ کی ذات گرامی کو سید المرسلین، خاتم النبیین اور رحمۃ اللعالمین بنا کر مبعوث فرمایا۔ اس عظیم ترین منصب پر فائز ہو کر اس عظیم ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے کتاب وحکمت، الفت ومحبت، اخلاق ومروت،

اپنے فیضِ صحبت اور مساوات ورواداری سے انسانیت کی نہ صرف اصلاح وتربیت فرمائی، بلکہ سسکتی، بھٹکتی، آہ بھرتی انسانیت کو ضلالت وگمراہی کی تاریکیوں سے بچا کر صراطِ مستقیم پر گامزن کیا۔ بے مقصد زندگی گزارنے والی نسلِ انسانی کو اس کی حقیقی منزل کا پتہ دیا، خالقِ کائنات کی صحیح معرفت، اس پر ایمان و یقین اور اپنے پروردگار کی سچی محبت ومحبوبیت، انسانیت کے ساتھ رواداری، حسنِ اخلاق، ایثار وقربانی، سچائی وامانت داری جیسی اعلیٰ صفات سے مزین اور دارین کی سعادت سے مالا مال کردیا، کسی شاعر نے اس خوشگوار تبدیلی کی ترجمانی وعکاسی کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

دُر فشانی نے تیری قطروں کو دریا کردیا — دل کو روشن کردیا آنکھوں کو بینا کردیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے — کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

وقال اللّٰہ تعالیٰ: " **وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْن.**" (سورہ احزاب)

کسی صاحبِ ذوق نے کیا خوب کہا ہے:

تر ہوئی باراں سے سوکھی زمین
یعنی آئے رحمۃ للعالمین

والسلام
۵؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ

☆☆

کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

● عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاریؒ
خلیفہ راشد حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند

عزیز مکرم جناب مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہو۔
آپ کا خط ملا، حالات سے آگاہی ہوئی اور اس بات سے بڑی مسرت وشادمانی ہوئی کہ آپ ''معارف قاسم جدید'' کا سیرت نمبر شائع کررہے ہیں۔
جزاکم اللہ خیر الجزاء.

آقاء مدنی تاجدار مدینہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت اور تعلیم کی اس وقت انسانیت پہلے سے زیادہ محتاج اور ضرورت مند ہے۔ آقاء مدنی ﷺ سے پہلے کا زمانہ زمانہ جاہلیت کہلاتا ہے۔ دنیا کی کوئی ایسی برائی نہیں ہے جو اس وقت نہ پائی جاتی رہی ہو، انسانیت، مروت، اخوت، ہمدردی ختم ہوچکی تھی، بھائی بھائی کا دشمن تھا، باپ بیٹے کا، بیٹی ماں پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں، جبکہ انسان انسانیت سے کوسوں دور ہوچکا تھا، ان میں درندوں کی خصلت پائی جاتی تھی، انسانیت کو ایک ایسے ہمدرد کی تلاش تھی جو اسے سہارا دے سکے، ایک ایسی روشنی کی تلاش تھی جس میں انسان اپنے آپ کو پہچان سکے، عین اسی موقع پر ایک روشنی نمودار ہوئی، جسے آج دنیا محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

تکلف برطرف ہم جاتے تھے سیدھے جہنم میں — اسی اثناء میں ایک سچا نبی پیدا ہوا ہم میں

نبی تشریف لائے دعوت اسلام دی ہم کو　　نکالا موت کے پنجے سے بخشی زندگی ہم کو

آپ ﷺ نے ''اقرأ باسم ربک الذی خلق''(سورہ علق: ۱) کی تعلیم دے کر اس کا عملہ نمونہ پیش کر کے پوری کائنات کو اپنے نور سے منور فرمادیا۔ امن وامان کا بول بالا ہوا، انسانیت کو چین وسکون ملا، رحمت عالم کی رحمت پورے عالم پر چھا گئی، آپ ﷺ کے فیض صحبت سے ایسی جماعت تیار ہوئی جس کو خیر امت کا لقب دیا گیا اور وہ جماعت آپ ﷺ کے اسوہ اور سیرت کا عملہ نمونہ بن کر عالم کے چپہ چپہ میں پھیل گئی، جس کو آج ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جنہوں نے پورے عالم کی قیادت اور رہبری کے کام انجام دئے۔ بقول شاعر:

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

آج کا دور بڑی جہالت (جہالت کبری) کا دور ہے، انصاف کے نام پر ظلم ہو رہا ہے۔ قیام امن کے نام پر ناحق خون بہایا جارہا ہے۔ نئی تہذیب کا عنوان دے کر عریانیت، بے حیائی، بے غیرتی پھیلائی جارہی ہے، حقوق انسانیت کی آواز اٹھا کر عورت کی عصمت وعفت کو تار تار کیا جارہا ہے۔ مساوات کا علمبردار بن کر قانون فطرت کو مٹایا جارہا ہے۔ الغرض انسانیت رو رہی ہے، ماتم کناں ہے، اپنے خاتمہ پر بلک رہی ہے، آنسو بہارہی ہے، انسانیت کا کوئی آنسو پوچھنے والا نہیں ہے۔ سوائے ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور سیرت کے۔ لہٰذا آج آقاء مدنی ﷺ کے اسوہ حسنہ اور سیرت کی اور ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ سیرت النبی ﷺ کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت ہے۔ لہٰذا آپ اپنے اس اقدام پر قابل مبارکباد ہیں، قدم قدم پر اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی مدد فرمائے۔ مزید ہمت وحوصلہ عنایت فرمائے آمین۔

☆☆

اور جب ایک عظیم انقلاب برپا ہوا

● رکن پارلیمنٹ مولانا محمد اسرار الحق قاسمی مدظلہ العالی
صدر آل انڈیا تعلیمی وملی فاؤنڈیشن

گرامی قدر محترم مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب! مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''معارف قاسم جدید''
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ آپ کے مؤقر ماہنامہ 'معارف قاسم جدید' کا 'سیرت نمبر' منظر عام پر آرہا ہے۔ میری طرف سے ہدیۂ تبریک وتہنیت قبول کیجئے۔
اس ماہنامہ نے نہایت قلیل مدت میں جس تیزی کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کئے ہیں اور عوامی مقبولیت حاصل کی ہے بلاشبہ اس کا سہرا آپ کو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ یہ علمی ودینی رسالہ مسلسل ترقی کی منزلیں طے کرے اور علمی وصحافتی حلقوں میں اپنی ایک شناخت بنائے۔
آمین بجاہ رب العالمین۔

اس خاکدان ارضی میں سرور کائنات محمد رسول اللہؐ کے قدم رکھنے سے ایک عظیم روحانی وانسانی انقلاب برپا ہوا۔ آپؐ نے انسانیت کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا اور انسانیت کو وسیع آفاقی سوچ نصیب ہوئی۔

آپ سے پہلے انسان ایک محدود ذہن سے سوچنے اور غور کرنے کا عادی تھا۔ اپنی

قوم، اپنا قبیلہ، اپنا ملک، اپنے ہم خیال اور اپنے ہی رنگ ونسل تک سوچ وفکر کا دائرہ محدود تھا۔ عدل وانصاف اسی کا نام تھا جو اپنے مخصوص دائرہ کے مفاد میں ہو اور بس!

یہ قدرت کا واقعی ایک معجزہ تھا کہ اس نے اپنے اس مقدس بندے کا ذہن کچھ ایسے عجیب انداز کا بنایا کہ وہ جس خاندان کا فرد تھا اس کا ذہن خود اس خاندان سے بھی بندھا ہوا نہیں تھا۔ وہ جس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اس کی سوچ اس قبیلے تک ہی محدود نہ تھی۔ حتیٰ کہ وہ جس خطہ عرب کا باشندہ تھا، خود اس خطے کے حصار سے بھی ان کا ذہن آزاد تھا، اس سعید ہستی کو قدرت نے ایسا کشادہ ذہن اور اس قدر وسیع قلب ودماغ عطا فرمایا تھا کہ انسانی تاریخ میں کبھی ایسی وسعت کا تصور نہیں کیا گیا تھا۔

خلوص آگیں

☆☆

ایک مشورہ

● قاضی شریعت حضرت مولانا محمد قاسم مظفر پوری مدظلہ العالی

صاحب الشرف والسعادہ الاخ المؤقر مولانا مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی زیدت مکارکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''معارف قاسم جدید'' کی اصلاحی، دعوتی اور تعمیری خدمات کو حق تعالیٰ قبولیت عامہ عطا فرمائے آمین۔ اس وقت امت مسلمہ، اس کی مقدس تعلیمات اور شعار دین پر جو مختلف جہتوں سے پے در پے حملے ہو رہے ہیں اس کے پیش نظر اشاعت دین مبین اور دفاع عن الاسلام کی ہر مثبت کوشش وقت کا اہم فریضہ ہے، دعوت الی اللہ اور تعارف اسلام کے لئے یہ عہد انتہائی اہم ہے، پوری انسانیت سسک رہی ہے اور تلاش حق کر رہی ہے۔

''سیرت النبی نمبر'' انشاء اللہ ایمانی حرارت کا ذریعہ ہوگا۔ کاش چند صفحات ہندی میں بھی کر دئے جائیں۔ میری ایک ناقص رائے یہ ہے کہ آپ ''معارف قاسم جدید'' کے دفتر سے چار ورقہ ہینڈ بل ردقادنیت اور فتنہ قیادیانیت کا اردو اور ہندی میں پانچ ہزار کی تعداد میں طبع کرا کر پورے فاربس گنج کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھجوادیں اور آپ کے ادارہ سے ایک مطبوعہ گشتی مکتوب بھی ائمہ مساجد کے نام جائے، تاکہ حضور ﷺ کی سیرت میں آپ کی ختم نبوت کے موضوع کو خاص طور پر عامۃ المسلمین میں پیش کیا جائے، طلبا کے ذریعہ جو مجھے ذاتی طور پر یقینی اطلاع ملی ہے اس کی روشنی میں عرض ہے، حق تعالیٰ ہمارے ایمان واعمال کی حفاظت فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔ والسلام

☆☆

یہ مجلّہ مینارۂ نور ثابت ہوگا

● شیر ہند مولانا سید احمد بخاری مدظلہ العالی
شاہی امام جامع مسجد، دہلی

مجھے خوشی ہے کہ ماہنامہ ''معارف قاسم جدید'' نے سیرت نبوی ﷺ نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج کے اس ماحول میں نبی آخرالزماں ﷺ کے پیغام کی تبلیغ اور عصری حالات کے تناظر میں سیرت کے پیغام کو عام کرنے کا فیصلہ قابل تعریف ہے، مجھے امید ہے کہ سسکتی وبلکتی دنیا کے مسلمانوں کے لئے یہ سیرت نمبر مینارۂ نور ثابت ہوگا۔

آپ کی صحت وشادمانی اور ادارہ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

۲۴ رمئی ۲۰۰۵

بخدمت گرامی!
جناب مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی صاحب
مدیر اعلیٰ ماہنامہ معارف قاسم جدید، دہلی

☆☆

یہ مژدۂ جاں فزا باعث صد مسرت

● حضرت مولانا فضیل احمد قاسمی رحمۃ اللہ علیہ
جنرل سکریٹری مرکزی جمعیۃ علماء ہند

یہ مژدۂ جانفزا باعث صد مسرت وسعادت ہے کہ ''ماہنامہ معارف قاسم جدید'' دہلی کا سیرت النبیؐ نمبر بصورت ''سراج منیر'' نکل رہا ہے۔ آپؐ کے خصائل وشمائل اور پیام کا مجموعہ نکال کر دنیائے حیران وپریشان، ظلمات میں ہچکولے کھاتی ہوئی کو روشنی دکھانے کے لئے چراغ مصطفوی ﷺ اپنی بساط بھر روشن کررہے ہیں، جو قرآن نے چودہ سو سال سے روشن کررکھا ہے، رسول اکرم ﷺ کی مکمل حیات طیبہ سارے عالم کے لئے تاقیامت اسوہ اور نمونہ اور چراغ ہدایت ہے اس دور کے علماء ومفکرین کی ذمہ داری ہے کہ رسول ﷺ کے ابدی پیام سعادت کو زندگی کے تمام شعبوں میں اس دور کے تقاضوں اور چیلنجوں کے مطابق اس زمانے کی زبان واسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کریں اور اسلام کے عالمی نظام کی برتری و تفوق کو نئے عالمی نظام برپا کرنے والوں کی کوشش کرنے والوں کے سامنے عالمی، فکری وعملی طور پر پیش کریں اور ببانگ دہل مغرب کو چیلنج کریں کہ اسلام کے نظام حیات سے بہتر اگر تمہارا نظام ہے تو مباحثے اور مذاکرے کے لئے تیار ہوجاؤ۔ تمام عالم کے لئے محمد ﷺ رہبر کامل ہیں، ان کی رہبری کے بغیر ناکامی ورسوائی کے علاوہ کچھ نہیں۔ قابل مبارکباد ہیں مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی جو اس نمبر کا اہتمام فرمارہے ہیں، اللہ قبول فرمائے۔ آمین۔

☆☆

دلی مبارک باد

ڈاکٹر نسیم منصور صاحبہ
صدر شعبہ سنی دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مکرم جناب مفتی محفوظ الرحمٰن صاحب عثمانی مدیر اعلیٰ ماہنامہ 'معارف قاسم جدید' نئی دہلی
تسلیم وتکریم

خدا کرے مزاج عالی بخیر ہو۔

آپ کا ارسال کردہ پرمسرت اطلاع نامہ موصول ہوا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ، کہ آپ نے ایک ایسے کام کے لئے مجھے یاد کیا جو کسی بھی مومن یا مومنہ کے لئے انتہائی خوش قسمتی کا باعث ہے کہ وہ محسن انسانیت مرسل اعظم اور خاتم النبین کے ذکر خیر میں کسی بھی طرح شریک ہوجائے اور ''کان خلقہ القرآن'' کی نشرواشاعت میں اپنی شرکت کو ذخیرۂ اجروثواب اور نجات اخروی کا زینہ تصور کرے اور پوری امت کے لئے مفتاح خیر اور اغلاق شر کا ذریعہ بنے: جو سیرت نبوی میں اکمل واتم درجہ میں موجود ہے۔

سیرت نمبر کی اشاعت پر میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں اور بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ رب العالمین آپ کی سعی مشکور کو نہ یہ کہ صرف قبول فرمائے، بلکہ عصر حاضر کے ان تمام فتنوں اور پروپیگنڈوں کے سدباب کا ذریعہ ثابت ہو جو اسلام اور سیرت نبویہ ﷺ کے تعلق سے کئے جارہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ پوری امت کے لئے ذریعہ نجات وفلاح بنے، آمین۔

دعا گو

☆☆

مقالات و مضامین

''جب آپ ﷺ کی صوت پر صوت
بلند کرنا اعمال کے حبط ہونے کا موجب ہے، تو اپنی آراء
اور ہوا کو آپ ﷺ کی سنت اور حکم پر بڑھانے کی نسبت کیا گمان رکھتے
ہو اور جب آپ کی مجلس سے بغیر اجازت جانا جائز نہیں تو آپ ﷺ کی تفاصیل
دین سے دوسری طرف جانا کیسے جائز ہوگا اور دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ جس
طرح حضور ﷺ کے سامنے رفع صوت جائز نہیں تھا، اسی طرح آپ کے
ارشادات کے درس اور احکام کی نقل کے وقت بھی رفع صوت حاضرین
وسامعین کے لئے خلاف ادب ہے اور اسی طرح محل جسد شریف کے قریب بھی
رفع صوت ناجائز ہے۔ آپ ﷺ کی قرب مقام کی، کلام کی اور احکام سب
کی تعظیم واجب ہے اور من جملہ اسی تعظیم احکام کے یہ ہے کہ تعظیم
ظاہری میں حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو۔''

حضور ﷺ کے حقوق امت پر

● حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

سبب الفت: کمال، جمال، نوال:

جاننا چاہئے کہ کسی سے محبت ہونا اور اس محبت کا متقاضیٔ متابعت ہونا تین سبب سے ہے۔
ایک محبوب کا کمال جیسے عالم سے محبت ہوتی ہے، شجاع سے محبت ہوتی ہے۔
دوسرا جمال، جیسے کسی حسین سے محبت ہوتی ہے۔
تیسرا نوال، یعنی عطا و احسان، جیسے اپنے مربی اور منعم سے محبت ہوتی ہے۔
جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدسہ میں تینوں وصف علی سبیل الکمال (مکمل طریقے پر) مجتمع ہیں۔ جب تینوں وصف، جو علت محبت ہیں، آپ میں جمع ہیں تو خود اس کا طبعی مقتضیٰ ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ امت کو اعلیٰ درجہ کی محبت ہونی چاہئے، اگر نص شرعی بھی نہ ہوتی اور جب کہ نصوص شرعیہ بھی اس کے ایجاب میں موجود ہیں تو داعی عقل وطبع کے ساتھ داعی شرع بھی مل کر آپ کے وجوب محبت کو موکد کرتا ہے اور درحقیقت اعظم غایت اس مضمون کی اسی امر کی طرف اہل ایمان کو متوجہ کرنا ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ ان اسباب ودواعی کے ہوتے ہوئے محبت سے اتباع کا انعکاس (نافرمانی) عادتاً محال ہے، جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجے کا اتباع ہوگا اور ظاہر ہے کہ محبت علی سبیل الکمال (مکمل طور پر) واجب ہے۔ پس متابعت بھی علی سبیل الکمال (مکمل اتباع) واجب ہوگی اور اس میں گو کسی کو بھی کلام نہیں ہوسکتا، تاہم محض تجدید استحضار (دل ودماغ میں موجودگی کو تازہ کرنے) کے

لئے مختصر طور پر تنبیہ کر دی گئی اور اسی کی تقویت کے لئے چند روایات بھی ذکر کی جاتی ہیں۔

پہلی روایت: ''**لایومن احد کم حتی أکون أحبّ من والدہ و ولدہ والناس أجمعین**'' (حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ تم میں کوئی شخص مومن نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد اور اولاد اور تمام آدمیوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں) (روایت کیا اس کو بخاری و مسلم نے کذا فی المشکوٰۃ)۔

ف:- یعنی اگر میری مرضیات اور دوسروں کی مرضیات میں تزاحم (تقابل) ہو، تو جس کو ترجیح دی جائے اسی کے محبوب تر ہونے کی علامت ہوگی۔

دوسری روایت: امام بخاری نے ایمان ونذور کے باب میں حضرت عبداللہ بن ہشام سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ میرے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میرے نفس کے جو میرے پہلو میں ہے (یعنی وہ تو مجھے بہت ہی محبوب ہے) جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تم میں کوئی مومن نہیں ہوسکتا، جب تک خود اس کے نفس سے بھی زیادہ میں اس کو محبوب نہ ہو جاؤں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی کہ آپ میرے نزدیک اس نفس سے بھی زیادہ محبوب ہیں جو میرے پہلو میں ہے اس پر جناب رسول مقبول ﷺ نے فرمایا کہ بس اب بات ٹھیک ہوئی۔) (کذا فی المواہب)۔

ف:- حضرت عمرؓ نے اول محبت بلا اسباب کو محبت بالاسباب سے اقوی سمجھ کر نفس کو مستثنیٰ کیا۔ پھر آپ ﷺ کے اس ارشاد سے کہ اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب رکھنا ضروری ہے۔ یہ سمجھ گئے کہ اقوی ہونے کا مدار کوئی ایسا امر ہے کہ اس کے اعتبار سے کوئی چیز نفس سے بھی زیادہ محبوب ہوسکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ ﷺ کو نفس کی خوشی پر طبعاً مقدم اور راجح پایا۔ سو اس حقیقت کے انکشاف کے بعد آپ کی احبیت من النفس (نفس سے بھی زیادہ محبوب ہونے کا) مشاہدہ کیا اور خبر دی مواہب کے مقصد سابع میں دوسرے صحابہؓ کی عجیب وغریب

حکایتیں ذکر کی ہیں۔

تیسری روایت: روایت کے الفاظ، ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ امت جنت میں داخل ہوگی، مگر جس نے میرا کہنا قبول نہ کیا، عرض کیا گیا کہ حضور ﷺ قبول کس نے نہیں کیا؟ فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی، وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے قبول نہیں کیا۔ (روایت کی اس کو بخاری نے **کذا فی المشکوٰۃ**)

ف:- صحابہؓ کے اس سوال سے معلوم ہوا کہ ابائے مخصوص بہ کفر نہیں، ورنہ اس میں کون سا خفا تھا۔ پس آپ کے اتباع نہ کرنے کو اباء سے تعبیر فرمایا گیا۔ اس سے متابعت کا وجوب ثابت ہوا۔

چوتھی روایت: روایت کے الفاظ، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔ وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔ (روایت کیا اس کو ترمذی نے، کذا فی المشکوٰۃ)

ف:- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ کی محبت کی علامت آپ ﷺ کی سنت سے محبت کرنا ہے اور آپ کی محبت کی فضیلت بھی ثابت ہوئی، کہ مفتاح جنت ہے اور علاوہ جنت کے حضور ﷺ کی معیت کا بھی موجب ہے۔

پانچویں روایت: روایت کے الفاظ، حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو جناب رسول اللہ ﷺ نے شراب پینے کے جرم میں سزا دی پھر دوبارہ وہ اس جرم میں حاضر کیا گیا۔ آپ ﷺ نے پھر سزا کا حکم دیا۔ ایک شخص نے مجمع میں سے کہا کہ اے اللہ! اس پر لعنت کر کس قدر کثرت سے اس کو (مقدمہ میں) لایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر لعنت نہ کرو۔ واللہ میرے علم میں یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے (اس کو بخاری نے روایت کیا ہے)

ف:-اس حدیث سے چند امور ثابت ہوئے۔ایک بشارت زفین کر کے ان سے اللہ اور رسول ﷺ کی محبت کی نفی نہیں کی گئی۔دوسری ذنبیں کو تنبیہ کہ خالی اور صرف محبت سزا سے بچنے میں کام نہ آئی تو کوئی شخص اس ناز میں نہ رہے کہ خالی محبت ہی بغیر اطاعت واعمال خیر کے سزائے جہنم سے بچالے گی، البتہ بعد بعید من الرحمت (خدا کہ رحمت سے بہت دور ہوجائے) سے بچاسکتی ہے۔جیسا کہ نہی عن اللعنت (لعنت کرنے سے منع فرمانے) سے معلوم ہوا، پس جو سزائے آخرت اس ملعونیت پر مرتب ہے۔یعنی ہمیشہ جہنم میں رہنا اس سے محبت قلبی بچالے گی اور سزا بھگتنے کے بعد مغفرت ہوجائے گی۔تیسری بات محبت کی فضیلت معلوم ہوئی، جیسا کہ ظاہر ہے کہ چوتھی بات محبت کے مراتب کا فرق ظاہر ہوا کہ باوجود ایک گناہ کے اثبات محبت کا حکم فرمایا۔اس سے ثابت ہوا کہ متابعت کامل نہ ہونے سے گو کمال محبت کا حکم نہ ہوگا، مگر نفس متابعت سے جس کا ادنیٰ درجہ قبول اسلام ہے، کوئی نہ کوئی درجہ محبت ثابت کیا جائے گا۔پانچویں بات یہ معلوم ہوئی کہ مومن خواہ کتنا ہی گنہگار ہو، مگر اس پر لعنت نہ کرنی چاہیے۔اس سے اللہ و رسول ﷺ کی محبت کی عظمت معلوم ہوتی ہے کہ اگر چہ وہ محبت ایک شمہ برابر ہو اور وہ بھی گناہوں میں ملوث ہو، لیکن ایسی محبت بھی لعنت کرنے سے مانع ہے، تو سوچئے کہ محبت کا کام اور خالص درجہ کتنا کچھ مفید اور مؤثر ہے۔

حضور ﷺ محترم جناب رسول اکرم ﷺ کی توقیر احترام اور ادب کا واجب ہونا۔

یہ مضمون بھی مضمون بالا کے ساتھ ملحق ہے، کیونکہ یہ بھی منجملہ آپ ﷺ کے حقوق عظمت کے ہے۔اس مضمون کے متعلق چند آیات اور روایات کا نقل کرنا کافی ہے۔آیت کے الفاظ: اے محمد ﷺ ہم نے تم کو امت پر گواہی دینے والا، قیامت کے عموماً اور دنیا میں خصوصاً مسلمانوں کے لئے بشارت دینے والا اور کافروں کے لئے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اے مسلمانو! ہم نے ان کو رسول بنا کر اس لئے بھیجا ہے تا کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کے دین کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو (عقیدتاً بھی کہ اللہ

تعالیٰ کو موصوف بالکمالات اور منزہ عن النقائص سمجھو اور عملاً اطاعت کرو) اور صبح و شام اس کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہو۔

آیت کے الفاظ: اے ایمان والو! اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے پہلے تم کسی قول یا فعل میں سبقت نہ کیا کرو۔(یعنی جب تک قرائن قویہ یا تصریح سے گفتگو کی اجازت نہ ہو، گفتگو نہ کرو) اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ (تمہارے سب اقوال کو سننے والا تمہارے سب افعال کو جاننے والا ہے اور) اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں پیغمبر ﷺ کی آواز سے بلند مت کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو، جیسے کہ آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو (یعنی آپ کے سامنے اگر چہ آپس میں گفتگو کرو، لیکن بلند آواز سے نہ بولو اور جب خود حضور ﷺ سے بات کرو، تو برابر کی آواز سے بھی نہ بولو کہ تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ رفع صوت کی صورتاً بے باکی ہے اور جہر کجہر مابینہ کی طبعاً گستاخی ہے ناگوار اور موجب تأذی ہوسکتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو ایذا رسانی موجب حبط (بربادی) اعمال ہے، گو اور دوسرے معاصی موجب حبط نہیں ہوتے، لیکن یہ اس عام میں مخصوص ہے۔البتہ بعض اوقات جب کہ طبیعت زیادہ منبسط ہو، یہ امور ناگوار نہیں ہوتے اس وقت ایذا دہی ثابت نہ ہونے کی وجہ سے رفع صوت موجب حبط نہیں ہوتا، مگر چونکہ بعض اوقات متکلم کو سامع کی اذیت کا احساس نہیں ہوتا۔اس لئے ممکن ہے کہ تاذی ہوجائے اور اس سے حبط ہوجائے اور متکلم اس گمان میں رہے کہ تاذی نہیں ہوئی۔پس حبط کی بھی خبر نہ ہو۔''لاتشعرون'' کے یہی معنی ہیں اور اسی وجہ سے مطلق رفع صوت اور جہر بالقول کو منہی عنہ ٹھہرایا کہ گو اس کے بعض افراد موجب تاذی نہ ہوں گے، لیکن اس کی تعیین کیسے ہوگی؟ لہٰذا مطلقاً تمام اجزا و افراد کو ترک کر دینا چاہئے، یہ تو رفع صوت پر ترہیب تھی۔آگے خفض صوت پر ترغیب ہے۔آیت کے الفاظ: کہ بے شک جو لوگ اپنی آوازوں کو

رسول ﷺ کے سامنے پست رکھتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب میں غیر تقویٰ نہیں ہے مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس باب خاص میں وہ کمال تقویٰ کے ساتھ متصف ہیں، کیونکہ کمال تقویٰ یہ ہے حسب حدیث مرفوع ترمذی اور رفع صوت کا ایک فروتی نفسہٖ غیر ذی بأس ہے (یعنی اس میں بالذات کوئی نقصان نہیں) جس میں تاذی نہ ہو اور فروذی بأس ہے (نقصان دہ) جس میں تاذی ہو۔ جب انہوں نے مطلقاً رفع صوت کو ترک کر دیا۔ پس کمال تقویٰ متحقق ہو گیا اور فی نفسہ کی قید اس لئے لگائی کہ ممانعت کے بعد تو دونوں ہی فردیں ذی بأس ہو گئیں، آگے ان پر عمل کرنے کا اخروی ثمرہ مذکور ہے کہ، آیت کے الفاظ، ان لوگوں کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے اور جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ ﷺ کو پکارتے ہیں ان میں سے اکثروں کو عقل نہیں ہے، ورنہ آپ ﷺ کا ادب کرتے اور ایسی جرأت نہ کرتے اور اگر یہ لوگ ذرا صبر و انتظار کرتے یہاں تک کہ آپ ﷺ خود باہر ان کے پاس آجاتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا (کیونکہ یہ ادب کی بات تھی) اور (اگر یہ لوگ اب توبہ کر لیں تو معاف ہو جائے کیونکہ) اللہ غور رحیم ہے۔

حضور پاک ﷺ کی عظمت اور احترام کے متعلق چند روایات درج ذیل ہیں۔

پہلی روایت: حدیث کے الفاظ، سنن ابوداؤد کتاب الحدود میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک نابینا کی ام ولد تھی۔ جو رسول اللہ ﷺ کی شان میں بیہودہ اور گستاخانہ باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ نابینا منع کیا کرتے وہ باز نہ آتی۔ وہ اس کو ڈانٹتے، مگر وہ نہ مانتی۔ ایک شب اسی طرح اس نے کچھ بکواس شروع کی۔ نابینا نے چھرا لے کر اس کے پیٹ پر رکھ کر بوجھ دے دیا اور ام ولد کو ہلاک کر ڈالا۔ صبح کو اس کی تحقیقات ہوئی، نابینا نے حضور ﷺ کے سامنے اپنے فعل کا اقرار کیا اور پورا واقعہ بیان کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا سب گواہ رہو کہ ام ولد کا خون رائیگاں ہے۔ یعنی قصاص وغیرہ نہیں لیا جائے گا۔

ف:- اس واقعہ سے اس نابینا صحابیؓ کا حضور ﷺ کے ساتھ کس قدر جوش محبت اور

پاس ادب ثابت ہوتا ہے۔ یہ قتل سیاستاً اور زجراً ہے کہ اعلانیہ ایسے کلمات کا کہنا کہ اس کافر کے مذہب میں بھی داخل نہیں، پھر بار بار جو دلیل ہے۔ تمرد اور اسلام کے استخفاف کی بلاشبہ موجب زخیر بالقتل ہے۔

دوسری روایت: روایت کے الفاظ، امام بخاری نے کتاب الشروط میں قصہ حدیبیہ کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ عمرو بن مسعود رئیس مکہ نے آپ کی مجلس شریف سے مکہ واپس جا کر لوگوں سے بیان کیا کہ اے میری قوم! واللہ میں بادشاہوں اور قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں گیا ہوں۔ واللہ میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے مصاحب اس کی اس قدر تعظیم کرتے ہوں، جس قدر صحابہؓ محمد ﷺ کی تعظیم کرتے ہیں واللہ وہ جب کھنکار پھینکتے ہیں، تو وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ میں پہنچتی ہے اور وہ اس کو اپنے چہرہ بدن پر مل لیتا ہے اور جب آپ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ تعمیل کے لئے دوڑتے ہیں اور جب آپ ﷺ وضو کرتے ہیں تو ان لوگوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وضو کا گرتا ہوا پانی لینے کے لئے گویا اب لڑ پڑیں گے جب آپ کلام فرماتے ہیں تو، تو وہ لوگ اپنی آوازوں کو آپ کے سامنے پست کر لیتے ہیں اور وہ لوگ آپ کی طرف تیز نگاہ سے دیکھتے تک نہیں۔ (الحدیث)

تیسری روایت: مشکوٰۃ میں بروایت امام احمد براء ابن عازت سے مروی ہے کہ، روایت کے الفاظ، نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک انصاری کے جنازہ میں گئے اور قبر تک پہنچے۔ ابھی میت کو لحد میں نہیں رکھا تھا (کچھ دیر ہو گئی) آپ ﷺ بیٹھ گئے اور ہم آپ کے اردگرد اس طرح بیٹھ گئے کہ گویا ہمارے سروں پر پرندے تھے (یعنی نہایت سکون کے ساتھ)۔

ف: صحابہؓ حضور کی خدمت میں اس طرح بیٹھنے کا معمول تھا۔ اس سے غایت ادب ثابت ہوتا ہے اور اس قسم کی بے شمار روایات وارد ہیں۔ علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ آداب بعد وفات بھی باقی ہیں۔ چنانچہ مواہب میں ہے کہ جب آپ ﷺ کی صوت پر

صوت بلند کرنا اعمال کے حبط ہونے کا موجب ہے، تو اپنی آراء اور ہوا کو آپ ﷺ کی سنت اور حکم پر بڑھانے کی نسبت کیا گمان رکھتے ہو اور جب آپ کی مجلس سے بغیر اجازت جانا جائز نہیں تو آپ ﷺ کی تفاصیل دین سے دوسری طرف جانا کیسے جائز ہوگا اور دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ جس طرح حضور ﷺ کے سامنے رفع صوت جائز نہیں تھا، اسی طرح آپ کے ارشادات کے درس اور احکام کی نقل کے وقت بھی رفع صوت حاضرین وسامعین کے لئے خلاف ادب ہے اور اسی طرح محل جسد شریف کے قریب بھی رفع صوت ناجائز ہے۔ آپ ﷺ کی قرب مقام کی، کلام کی اور احکام سب کی تعظیم واجب ہے اور منجملہ اسی تعظیم احکام کے یہ ہے کہ تعظیم ظاہری میں حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو۔

☆☆

ہمارا پرچم انقلاب - لا الٰہ الا اللہ

● سید قطب شہیدؒ

حضور ﷺ کے مکی دور کا بنیادی مسئلہ:

قرآن کریم کا وہ حصہ جو مکی سورتوں پر مشتمل ہے پورے ۱۳ سال تک رسول ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔ اس پوری مدت میں قرآن کا مدار بحث صرف ایک مسئلہ رہا۔ اس کی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، مگر اسے پیش کرنے میں ہر مرتبہ نیا اسلوب اور نیا پیرایہ اختیار کیا اور ہر مرتبہ یوں محسوس ہوا کہ گویا اسے پہلی بار ہی چھیڑا گیا ہے۔

قرآن کریم پورے مکی دور میں اسی مسئلہ کے حل میں لگا رہا۔ اس کی نگاہ میں یہ مسئلہ اس نئے دین کے تمام مسائل میں اوّلین اہمیت کا حامل ہے۔ عظیم تر، اساسی اور اصولی مسئلہ اور عقیدہ کا مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ دو عظیم نظریوں پر مشتمل تھا، ایک اللہ تعالیٰ کو الوہیت اور انسان کی عبودیت اور دوسرے ان کے باہمی تعلق کی نوعیت۔ قرآن کریم اسی بنیادی مسئلہ کو لے کر انسان بحیثیت انسان خطاب کرتا رہا، کیونکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس سے تمام انسانوں کو یکساں تعلق ہے، وہ چاہے عرب کے رہنے والے انسان ہوں یا غیر عرب۔ نزول قرآن کے زمانہ کے لوگ ہوں یا کسی بعد کے زمانہ کے۔ یہ وہ انسانی مسئلہ ہے جس میں کسی ترمیم وتغیر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اس کائنات میں انسان کے وجود و بقا کا مسئلہ ہے، انسان کی عاقبت کا مسئلہ ہے۔ اسی مسئلہ کی بنیاد پر یہ طے ہوگا کہ انسان کا اس کائنات کے اندر کیا مقام ہے؟ اور اس کائنات میں بسنے والی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ اور خود

کائنات اور موجودات کا خالق سے کیا رشتہ ہے؟ یہ وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے اس مسئلہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ یہ اس کائنات اور کائنات کے ایک حقیر جز انسان کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

مکی زندگی میں قرآن انسان کو یہ بتاتا رہا کہ اس کے اپنے وجود اور اس کے ارگرد پھیلی ہوئی کائنات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کس غرض کے لئے آیا ہے؟ اور آکر وہ کہاں جائے گا؟ وہ معدوم تھا، اسے کس نے خلعت وجود بخشا؟ کون سی ہستی اس کا خاتمہ کرے گی؟ اور خاتمہ کے بعد اسے کس انجام سے دوچار ہونا ہوگا؟

وہ انسان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اس وجود کی حقیقت ہے جسے وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے؟ اور وہ کون سی ہستی ہے جسے وہ پردۂ غیب میں کارفرما محسوس کرتا ہے، لیکن دیکھ نہیں پاتا؟ اس طلسماتی کائنات کو کس نے وجود بخشا اور کون اس کا منتظم و مدیر ہے؟ کون اسے گردش دے رہا ہے؟ کون اسے بار بار نیا پیراہن بخشتا ہے؟ کس کے ہاتھ میں ان تغیرات کا سررشتہ ہے جن کا ہر چشم بینا مشاہدہ کررہی ہے۔ وہ اسے یہ بھی سکھاتا ہے کہ خالق کائنات کے ساتھ اس کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ اور خود کائنات کے بارے میں اسے کیا روش اختیار کرنی چاہئے؟ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ یہ ہے وہ اصل اور بنیادی مسئلہ جس پر انسان کی بقا اور وجود کا دارومدار ہے اور رہتی دنیا تک اسی عظیم مسئلہ پر انسان کی بقا اور وجود کا انحصار رہے گا۔ اس اہم مسئلے کی تحقیق و توضیح میں مکی زندگی کا پورا تیرہ سالہ دور صرف ہوا۔ اس لئے کہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ یہی ہے اور اس کے بعد جتنے مسائل ہیں وہ اسی تقاضے میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت اس کی تفصیلات اور جزئیات سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن نے مکی دور میں اسی بنیادی مسئلے کو اپنی دعوت کا مدار بنائے رکھا اور اس سے صرف نظر کرکے نظام حیات سے متعلق فروعی اور ضمنی

بحثوں سے تعرض نہیں کیا اور اس وقت تک نہیں چھیڑا جب تک علم الٰہی نے یہ فیصلہ نہیں فرمادیا کہ اب اس مسئلہ کی توضیح وتشریح کا حق ادا ہوچکا ہے اور یہ اس انتخاب روزگار جماعت کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں ہوچکا ہے، جسے قدرت الٰہی نے اقامت دین کا ذریعہ بنایا اور وہ دنیا کے اندر ایک ایسا نظام برپا کرنا چاہتے ہیں جو بالفعل اس دین کی نمائندگی کرے، انہیں اس عظیم حقیقت کے ہر پہلو پر غور کرنا چاہئے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے راسخ کرنے کے لئے قرآن کریم نے مکی زندگی کے پورے ۱۳ سال صرف کئے اور اس دوران کبھی اس سے توجہ ہٹا کر نظام زندگی کی دوسری تفصیلات کو نہیں چھیڑا، نہ ان قوانین واحکام بیان کرنے کی حاجت محسوس کی جو آگے چل کر مسلم معاشرے میں نافذ ہونے والے تھے۔

کار رسالت کا آغاز اسی مسئلہ سے ہوا:

یہ عین حکمت خداوندی تھی کہ آغاز رسالت ہی میں اس اہم مسئلہ کو جو عقیدہ ایمان کا مسئلہ ہے، کو دعوت کا محور ومرکز بنایا جائے۔ یعنی اللہ کے رسول ﷺ، راہ حق میں پہلا قدم ہی اس دعوت سے اٹھائیں کہ ''لوگو! گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے'' اور پھر اسی دعوت پر اپنا تمام وقت صرف کردیں۔ انسانوں کو ان کے حقیقی پروردگار سے آگاہ کریں اور انہیں صرف اسی کی بندگی کی راہ پر لگائیں۔

اگر ظاہری نگاہ اور محدود انسانی عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب اس طریق دعوت سے بآسانی رام ہونے والے نہیں تھے۔ عرب اپنی زبان دانی کی بدولت ''الٰہ'' اور ''لا الہ الا اللہ'' کا مدعا خوب سمجھتے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ الوہیت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص گردانے کے صاف معنی یہ ہیں کہ اقتدار پورے کا پورا کاہنوں، پروہتوں کے سرداروں اور امراء وحکام کے ہاتھ سے چھین کر اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ ضمیر وقلب پر مذہبی شعائر ومناسک پر، معاملات زندگی پر، مال ودولت اور عدل

وقضا پر، الغرض ارواح واجسام پر بہ ہمہ وجوہ اللہ اور صرف اللہ کا اقتدار ہو۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کا اعلان درحقیقت اس دنیاوی اقتدار کے خلاف ایک چیلنج ہے، جس نے الوہیت کی سب سے بڑی خصوصیت (حاکمیت) کو غصب کر رکھا ہے۔ یہ ان تمام قوانین اور نظاموں کے خلاف اعلان بغاوت ہے جو اس قبضہ غاصبانہ کی بنیاد پر وضع کئے جاتے ہیں اور ان تمام قوتوں کے خلاف اعلان جنگ ہے جو خانہ ساز شریعتوں کی بدولت دنیا میں کوس ''لمن الملک'' بجاتی ہیں۔ عرب اپنی زبان کے نشیب وفراز سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ ''لاالہ الا اللہ'' کے حقیقی مفہوم کو پوری طرح سمجھ رہے تھے۔ ان سے یہ امر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ ان کے خود ساختہ نظاموں اور ان کی پیشوائی اور قیادت کے ساتھ یہ دعوت کیا سلوک کرنا چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس دعوت کا یا بالفاظ دیگر اس پیام انقلاب کا اس تشدد اور غیظ وغضب کے ساتھ استقبال کیا اور اس کے خلاف وہ معرکہ آرائی کی جس سے ہر خاص وعام واقف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز اس انداز سے کیوں ہوا؟ اور حکمت الٰہی نے کس بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ اس دعوت کا افتتاح ہی مصیبتوں اور آزمائشوں سے ہو؟

رسول اللہ ﷺ نے قومیت کے نعرہ سے کیوں کام کا آغاز نہیں کیا؟

رسول اللہ ﷺ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین حق کو لے کر مبعوث ہوئے تو اس وقت حالت یہ تھی کہ عربوں کے سب سے زیادہ شاداب وزرخیز اور مالدار علاقے عربوں کے ہاتھ میں نہیں تھے، بلکہ دوسری اقوام ان پر قابض تھیں، شمال میں شام کے علاقے رومیوں کے زیرنگیں تھے جن پر عرب حکام رومیوں کے زیر سایہ حکومت چلا رہے تھے، جنوب میں یمن کا پورا علاقہ اہل فارس کے قبضہ میں تھا، جنہوں نے اپنے ماتحت عرب شیوخ کو فرائض حکمرانی سونپ رکھے تھے۔ عربوں کے پاس صرف حجاز اور نجد کے علاقے تھے یا وہ

بے آب وگیاہ صحرا تھے جن میں اکا دکا نخلستان پائے جاتے تھے۔ یہ بات بھی محتاج دلیل نہیں ہے کہ محمد ﷺ اپنی قوم میں صادق اور امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ آغاز رسالت سے ۱۵ سال قبل اشراف قریش حجر اسود کے تنازعہ میں آپ کو اپنا حاکم بنا چکے تھے اور آپ کے فیصلہ کو بخوشی مان چکے تھے، نسب کے لحاظ سے بھی آپ بنو ہاشم کے چشم وچراغ تھے جو قریش کا معزز ترین خاندان تھا۔ ان حالات واسباب کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس بات پر پوری طرح قادر تھے کہ اپنے ہم وطنوں کے اندر عرب قومیت کے جذبہ کو بھڑکاتے اور اس طرح ان قبائل عرب کو اپنے گرد جمع کر لیتے جنہیں باہمی جھگڑوں نے پارہ پارہ کر رکھا تھا اور کشت وخون اور انتقام کی چکی میں بری طرح پسے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ اگر چاہتے تو ان سب عربوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے انہیں قومیت کا درس دیتے اور شمال کے رومی اور جنوب کے ایرانی استعمار کے تسلط سے عرب سرزمین کو آزاد کرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے، عرب قومیت اور عربیت کا پرچم بلند کرتے اور جزیرۂ عرب کے تمام اطراف واکناف کو ملا کر متحدہ عرب ریاست کی داغ بیل ڈال دیتے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ قوم پرستی کے نعرہ کو لے کر اٹھتے تو عرب کا بچہ بچہ اس پر لبیک کہتا ہوا لپکتا اور آپ کو وہ مصائب وآلام نہ سہنے پڑتے، جو آپ ﷺ کو ۱۳ سال تک صرف اس بنا پر سہنے پڑے کہ آپ کی دعوت اور نظریہ جزیرۃ العرب کے فرماں رواؤں کی خواہشات سے متصادم تھا۔ مزید برآں یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ جب عرب آپ کی قومی دعوت کو جوش وخروش کے ساتھ قبول کر چکتے اور قیادت کا منصب آپ کو سونپ دیتے اور اقتدار کی ساری کنجیاں پوری طرح آپ ﷺ کے قبضے میں آجاتیں اور رفعت وعظمت کا تاج آپ کے مبارک سر پر رکھ دیا جاتا تو آپ ﷺ اپنی اس بے پناہ طاقت اور اثر کو عقیدۂ توحید کا سکہ رواں کرنے کے لئے استعمال کرتے اور لوگوں کو اپنے انسانی اقتدار کے سامنے سرنگوں کرنے کے بعد بالآخر لے جا کر خدا کے آگے

سرنگوں کر دیتے، لیکن خدائے علیم وحکیم نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو اس راستہ پر نہیں چلایا، بلکہ انہیں حکم دیا کہ صاف صاف کہہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور ساتھ ہی متنبہ بھی کر دیا کہ اس اعلان کے بعد آپؐ خود اور وہ مٹھی بھر افراد جو اس اعلان پر لبیک کہیں ہر قسم کی تکلیف واذیت برداشت کرنے کے لئے بھی تیار رہیں۔

قومی نعرے کو اختیار نہ کرنے کی وجہ:

آخر یہ کٹھن راستہ اللہ تعالیٰ نے کیوں منتخب فرمایا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کے حق میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ تشدد اور ظلم کا نشانہ بنیں، لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ اس دعوت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی صحیح بات ہوتی کہ مخلوق خدا رومی یا ایرانی طاغوت کے پنجے سے نجات پا کر عربی طاغوت کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے۔ طاغوت خواہ کوئی ہو وہ طاغوت ہی ہے۔ یہ ملک اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس پر صرف اللہ کا ہی اقتدار ہونا چاہیے اور اللہ کا اقتدار صرف اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ اس کی فضاؤں میں صرف ''لاالٰہ الا اللہ'' کا پرچم لہرائے۔ یہ بات کیونکر مقبول اور درست ہو سکتی تھی کہ خدا کی زمین پر بسنے والی مخلوق رومی اور ایرانی طاغوتوں سے نجات پاتے ہی عربی طاغوت کا طوق غلامی اپنے گلے میں ڈال لے۔ طاغوت جس قبا میں بھی ہو وہ طاغوت ہے۔ انسان صرف خدائے واحد کے بندے اور غلام ہیں اور وہ صرف اسی صورت میں بندے اور غلام رہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں صرف اللہ کی الوہیت کا بول بالا ہو۔ ایک عرب ''لا الٰہ الا اللہ'' کا لغوی لحاظ سے جو مفہوم سمجھتا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو، اللہ کے سوا کوئی اور ہستی قانون اور شریعت کا منبع وماخذ نہ ہو اور انسان کا انسان پر غلبہ واقتدار باقی نہ رہے، کیونکہ اقتدار بہ ہمہ وجوہ اللہ ہی کے لئے ہے اور اسلام انسانوں کے لئے جس ''قومیت'' کا علمبردار ہے وہ اسی عقیدہ کی

بنیاد پر طے ہوتی ہے اور تمام اقوام خواہ کسی رنگ ونسل کی ہوں، عربی یا رومی، ایرانی سب کی سب اس عقیدہ کی نگاہ میں پرچم الٰہی کے تحت مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ قرآن کے نزدیک اسلامی دعوت کا یہی صحیح اور فطری طریق کار ہے۔

آپ ﷺ نے اقتصادی انقلاب کا طریق کار کیوں اختیار نہیں کیا؟

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت عرب معاشرہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل وانصاف کے صحت مندانہ نظام سے یکسر بیگانہ ہو چکا تھا۔ ایک قلیل گروہ تمام مال ودولت اور تجارت پر قابض تھا اور سودی کاروبار کے ذریعہ اپنی تجارت اور سرمائے کو برابر بڑھاتا اور پھیلاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں ملک کی غالب اکثریت مفلوک الحال اور بھوک کا شکار تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں دولت تھی وہی عزت وشرافت کے اجارہ دار تھے۔ رہے بیچارے عوام تو وہ جس طرح مال ودولت سے تہی دامن تھے اسی طرح عزت وشرافت سے بھی بے بہرہ تھے۔

اس صورت حال کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ نے کوئی اجتماعی تحریک کیوں نہ اٹھائی اور دعوت کا مقصد دولت کی منصفانہ تقسیم ٹھہرا کر، امراء وشرفاء کے خلاف طبقاتی جنگ کیوں نہ چھیڑ دی، تاکہ سرمایہ داروں سے محنت کش عوام کو ان کا حق دلواتے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس دور میں بھی ایسی کوئی اجتماعی تحریک اور دعوت لے کر اٹھتے تو عرب معاشرہ لازماً دو طبقوں میں بٹ جاتا، مگر غالب اکثریت آپ ﷺ کی تحریک کا ساتھ دیتی اور سرمائے اور جاہ وشرف کی ستم کوشیوں کے سامنے ڈٹ جاتی اور آپؐ کے مقابلے میں وہ معمولی سی اقلیت ہی رہ جاتی جو اپنے پشتینی مال وجاہ سے چمٹی رہتی، اگر رسول اللہ ﷺ یہ نہج اختیار فرماتے تو زیادہ مؤثر اور کارگر ہوتا اور یہ صورت پیش نہ آتی کہ پورا معاشرہ ''لاالٰہ الا اللہ'' کے اعلان کے خلاف صف آرا ہو جائے اور صرف چند نادر روزگار

ہستیاں ہی دعوت حق کے افق تک پہنچ سکیں۔

کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ میں یہ صلاحیت بدرجہ کمال موجود تھی کہ جب اکثریت آپ کی تحریک سے وابستہ ہو کر اپنی زمام قیادت آپ کے ہاتھ میں دے دیتی اور آپ ﷺ دولت مند اقلیت پر قابو پا کر اس کو اپنا مطیع وفرماں بردار بنا چکتے تو آپ اپنے اس منصب واقتدار کو اور اپنی پوری قوت کو اس عقیدہ توحید کے منوانے اور اسے قائم وراسخ کرنے میں استعمال کر دیتے جس کے لئے دراصل اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا تھا۔ آپ انسانوں کو پہلے انسانی اقتدار کے آگے جھکا کر پھر انہیں پروردگار حق کے آگے جھکا دیتے۔

ایسا طریق کار اختیار نہ کرنے کی وجہ:

لیکن خدائے علیم وحکیم نے آپ ﷺ کو اس طریق کار پر بھی چلنے کی اجازت نہ دی۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ طریق دعوتِ اسلامی کے لئے موزوں ومناسب نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ معاشرے کے اندر حقیقی اجتماعی انصاف کے سوتے صرف ایک ایسے ہمہ گیر نظریہ کے چشمۂ صافی سے ہی پھوٹ سکتے ہیں جو معاملات کی زمام کار کلیتاً اللہ کے ہاتھ میں دیتا ہو اور معاشرہ ہر اس فیصلے کو برضا ورغبت قبول کرتا ہو جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور اجتماعی کفالت کے بارے میں بارگاہ الٰہی سے صادر ہو اور معاشرے کے ہر فرد کے دل میں، پانے والے کے دل میں بھی اور دینے والے کے دل میں بھی یہ بات پوری طرح منقش ہو کہ وہ جس نظام کو نافذ کر رہا ہے اس کا شارع اللہ تعالیٰ ہے اور اس نظام کی اطاعت سے اسے نہ صرف دنیا کے اندر فلاح کی امید ہے، بلکہ آخرت میں بھی وہ جزائے خیر پائے گا۔ معاشرے کی یہ کیفیت نہ ہو کہ کچھ انسانوں کے دل حرص وطمع کے جذبات سے امنڈ رہے ہوں اور کچھ دوسرے انسانوں کے دل حسد وکینہ کی آگ میں جل رہے ہوں۔ معاشرے کے تمام

معاملات تلوار اور ڈنڈے کے زور پر طے کئے جا رہے ہوں۔ تخویف اور دھونس اور تشدد کے بل پر فیصلے نافذ کئے جا رہے ہیں۔ انسانوں کے دل ویران اور ان کی روحیں دم توڑ رہی ہیں، جیسا کہ آج ان نظاموں کے تحت ہو رہا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت پر قائم ہیں۔

آپ ﷺ نے اصلاح اخلاق کی مہم سے دعوت کا آغاز کیوں نہ کیا؟

رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت جزیرۃ العرب کی اخلاقی سطح ہر پہلو سے انحطاط کے آخری کنارے تک پہنچی ہوئی تھی، صرف چند بدویانہ فضائل اخلاق خام حالت میں موجود تھے۔ ظلم اور جارحیت نے معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جاہلی دور کا نامور شاعر زہیر ابن ابی سلمٰی اسی معاشرتی فساد کی طرف اپنے اس شعر میں حکیمانہ انداز سے اشارہ کرتا ہے:

ومن لم یسدعن حوضه بسلاحه
یهدم ومن لا یظلم الناس یظلم

جو ہتھیار کی طاقت سے اپنا دفاع نہیں کرے گا تباہ وبرباد ہوگا اور جو خود بڑھ کر لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا تو وہ خود (بالآخر) ظلم کا شکار ہو جائے گا۔ اسی خرابی کی طرف جاہلی دور کا یہ مشہور ومعروف مقولہ بھی اشارہ کرتا ہے:

انصر أخاک ظالما أو مظلوما. (اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظلم کر رہا ہو یا اس پر ظلم ہو رہا ہو)

شراب خوری اور جوا بازی معاشرتی زندگی کی روایت بن چکے تھے اور ان پر فخر کیا جاتا تھا۔ جاہلی دور کی تمام شاعری خمر اور قمار کے محور پر گھومتی ہے۔

زنا کاری مختلف شکلوں میں رائج تھی اور اس جاہلی معاشرے کی قابل فخر روایت بن چکی تھی۔ یہ ایک ایسا حمام ہے جس میں ہر دور کا جاہلی معاشرہ ننگا نظر آتا ہے، خواہ وہ دور

قدیم کا جاہلی معاشرہ ہو یا عہد حاضر کا نام نہاد مہذب معاشرہ۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ چاہتے تو ایک اصلاحی تنظیم کے قیام کا اعلان کر کے اس کے ذریعہ اصلاح اخلاق، تزکیۂ نفوس اور تطہیر معاشرہ کا کام شروع کر دیتے، کیونکہ جس طرح ہر مصلح اخلاق کو اپنے ماحول کے اندر چند پاکیزہ اور سلیم الفطرت نفوس ملتے رہتے ہیں اسی طرح آپ کو بھی ایک ایسا پاک سرشت گروہ بالیقین دستیاب ہو جاتا جو اپنے ہم جنسوں کے اخلاق کے انحطاط اور زوال پر دلی دکھ محسوس کرتا۔ یہ گروہ اپنی سلامتی فطرت اور نفاست طبع کے پیش نظر آپ کی دعوت تطہیر و اصلاح پر لازماً لبیک کہتا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس کام کا بیڑا اٹھاتے تو بڑی آسانی سے اچھے انسانوں کی ایک جماعت کو منظم کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ جماعت اپنی اخلاقی مہارت اور روحانی پاکیزگی کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے بڑھ کر عقیدہ توحید کو عام کرنے اور اس کی گراں بار ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوتی ہے اور اس حکیمانہ آغاز سے آپ ﷺ کی یہ دعوت کہ الوہیت صرف خدا کے لئے مخصوص ہے، پہلے ہی مرحلہ میں تند و تیز مخالفت سے دوچار نہ ہوتی۔

اس طریقہ میں کیا کمزوری تھی؟

لیکن اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ راستہ بھی منزل مقصود کو نہیں جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ اخلاق کی تعمیر صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہی ہوسکتی ہے۔ ایک ایسا عقیدہ جو ایک طرف اخلاقی اقدار اور معیار کو قبول فراہم کرے اور دوسری طرف اسی ''طاقت'' کا تعین بھی کرے جس سے یہ اقدار و معیار ماخوذ ہوں اور انہیں سند کا درجہ حاصل ہو اور اس جزا و سزا، کی نشاندہی بھی کرے جو ان اقدار و معیارات کی پابندی یا ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس طاقت کی طرف سے دی جائے گی۔ دلوں پر اس نوعیت کے عقیدہ کی ترمیم اور بالاتر قوت

کے تصور کے بغیر اقدار و معیارات خواہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں مسلسل تغیر کا نشانہ بنے رہیں گے اور ان کی بنیاد پر جو بھی اخلاقی نظام قائم ہوگا وہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ اس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہوگا۔ کوئی نگراں اور محتسب طاقت نہ ہوگی، کیونکہ دل جزا و سزا کے کسی لالچ یا خوف سے بالکل خالی ہوگا۔

ہمہ گیر انقلاب:

صبر آزما کوششوں سے جب عقیدہ الوہیت دلوں میں راسخ ہو گیا اور اس ''طاقت'' کا تصور بھی دلوں میں اتر گیا جس سے اس عقیدہ کو سند حاصل ہوتی تھی، دوسرے لفظوں میں جب انسانوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور صرف اسی کی بندگی کرنے لگے، جب انسان خواہشات نفس کی غلامی سے اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی آقائی سے آزاد ہو گئے اور ''لاالہ الا اللہ'' کا نقش دلوں میں پوری طرح مرتسم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ اور اس عقیدہ کے ماننے والوں کے ذریعہ وہ سب کچھ فراہم کر دیا، جو وہ تجویز کر سکے تھے۔ خدا کی زمین رومی اور ایرانی سامراج سے پاک ہوگئی، لیکن اس تطہیر کا مدعا یہ نہیں تھا کہ اب زمین پر عربوں کا سکہ رواں ہو، بلکہ اس لئے کہ اللہ کا بول بالا ہو۔ چنانچہ زمین خدا کے سب باغیوں سے خواہ وہ رومی تھے یا ایرانی اور عربی پاک کر دی گئی۔ نیا اسلامی معاشرہ اجتماعی ظلم اور لوٹ کھسوٹ سے بالکل پاک تھا۔ یہ اسلامی نظام تھا اور اس میں عدل الٰہی پوری طرح جلوہ گر تھا۔ یہاں صرف میزان الٰہی میں ہر خوب و زیشت اور صحیح و غلط کو تولا جاتا تھا۔ اس عدل اجتماعی کی بنیاد توحید تھی اور اس کا اصطلاحی نام ''اسلام'' تھا اس کے ساتھ کسی اور نام یا اصطلاح کا اضافہ کبھی گوارا نہیں کیا گیا اس پر صرف یہ عبارت کندہ تھی۔

''لاالٰہ الا اللہ''

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے۔

نفوس اور اخلاق میں نکھار آ گیا، قلوب وارواح کا تزکیہ ہو گیا اور یہ اصلاح اس انداز سے ہوئی کہ چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر ان حدود وتعزیرات کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئی جن کو اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا تھا۔ اس لئے کہ اب ضمیروں کے اندر پولس کی چوکیاں قائم ہو گئیں۔ اب خدا کی خوشنودی کی طلب، اجر کی خواہش، خدا کے غضب اور عذاب کا خوف، محتسب کا فرض انجام دے رہا تھا۔ الغرض انسانی نظام، انسانی اخلاق اور انسانی زندگی کمال کی اس بلندی تک پہنچ گئی جس تک نہ پہلے پہنچی تھی اور نہ صدر اول کے بعد آج تک پہنچ سکی ہے۔

یہ انقلاب عظیم کیسے برپا ہوا؟

یہ انقلاب عظیم اور کمال انسانیت صرف اس بنا پر حاصل ہوا کہ جن لوگوں نے دین حق کو ایک ریاست، ایک نظام اور جامع قانون وشریعت کی شکل میں قائم کیا تھا وہ خود پہلے اسے اپنے قلب وضمیر اور اپنی زندگی میں قائم کر چکے تھے، اسے عقیدہ وفکر کے طور پر تسلیم کر چکے تھے، اپنے اخلاق کو اس سے آراستہ وپیراستہ کر چکے تھے، اپنی عبادت میں اسے سند دے چکے تھے اور اپنے معاملات میں اس کا سکہ رواں کر چکے تھے۔ اس دین کے قیام پر ان سے صرف ایک ہی وعدہ کیا گیا تھا۔ اس وعدہ میں غلبہ واقتدار عطا کر دینے کا کوئی جز شامل نہیں تھا۔ حتیٰ کہ یہ جز بھی شامل نہ تھا کہ یہ دین لازماً انہی کے ہاتھوں غالب ہوگا۔ ان سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف اتنا تھا کہ اقامت دین کے عوض انہیں جنت ملے گی۔ جو صبر آزما جہاد ان لوگوں نے کیا، جو زہرہ گداز آزمائشیں انہوں نے سہیں، جس پامردی اور استقامت کے ساتھ وہ راہ دعوت پر رواں دواں رہے اور پھر بالآخر جس طرح انہوں نے جاہلیت کے مقابلے میں اس حقیقت کبریٰ کا ساتھ دیا جو ''لا الٰہ الا اللہ'' کے اندر پنہاں اور جو ہر زمان ومکان کے فرماں رواؤں کے لئے ناگوار رہی ہے، ان سب خدمات کے عوض ان

سے صرف ایک وعدہ کیا گیا جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی فقط وعدہ فردا!

جب اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش کی بھٹی میں ڈالا اور وہ ثابت قدم رہے اور ہر نفسیاتی خواہش اور خط سے دست بردار ہو گئے اور جب اللہ تعالیٰ نے جان لیا کہ وہ اس دنیا کے اندر اب کسی طور جزا اور حوصلہ کے منتظر نہیں ہیں، نہ انہیں اس کا انتظار ہے کہ یہ دعوت لازماً انہی کے ہاتھوں غلبہ حاصل کرے اور یہ دین انہیں قربانیوں اور کوششوں سے بالاتر وبرتر ہو۔ ان کے دلوں میں نہ آباواجداد کا تفاخر باقی رہا، نہ قومی گھمنڈ کے جراثیم، نہ وطن وملک کی بڑائی کا جذبہ رہا اور نہ قبائلی اور نسبی عصبیتوں کی خو، بو رہی، پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں ان خوبیوں سے آراستہ دیکھا تب جا کر ان کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ یہ لوگ اب ''امانت عظمیٰ'' یعنی خلافت ارضی کے بار کو اٹھا سکتے ہیں۔ یہ اس عقیدے میں کھڑے ہیں جس کا تقاضہ ہے کہ ہر طرح کی حاکمیت صرف خدائے واحد کے لئے مخصوص ہو۔ دل وضمیر پر، اخلاق وعبادات پر، جان ومال پر اور حالات وظروف پر صرف اس کی حاکمیت ہو۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ اس سیاسی اقتدار کے سچے محافظ ثابت ہوں گے جو ان کے ہاتھوں اس غرض کے لئے دیا جائے گا، تاکہ شریعت الٰہی کو نافذ کریں اور عدل الٰہی کو قائم کریں، مگر اس اقتدار میں ان کو اپنی ذات کے لئے یا اپنے قبیلے اور برادری کے لئے یا اپنی قوم کے لئے کوئی حصہ نہ ہو، بلکہ وہ سراسر اللہ تعالیٰ کے لئے خالص ہو اور اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی خدمت کے لئے ہو، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس اقتدار کا منبع صرف اللہ ہے اور اسی نے ان کی تحویل میں دیا ہے۔

نظام حق کی کامیابی کا واحد راستہ:

اگر دعوت اسلامی کا قافلہ اس انداز سے روانہ سفر نہ ہوتا اور دوسرے تمام جھنڈوں کو پھینک کر صرف اسی جھنڈے، یعنی لا الٰہ الا اللہ کے پرچم توحید کو بلند نہ کرتا اور اس راہ کو اختیار نہ کرتا جو ظاہر میں دشوار گزار اور جاں گسل راہ تھی، مگر حقیقت میں آسان اور برکت

بداماں تھیں، تو اس مبارک اور پاکیزہ نظام کا کوئی جز بھی اتنے بلند معیار کے ساتھ ہرگز بروئے عمل نہ آسکتا تھا۔ اسی طرح اگر یہ دعوت اپنے ابتدائی مراحل میں قومی نعرہ بن کر سامنے آتی یا اقتصادی تحریک کے لبادہ میں ظاہر ہوتی، یا اصلاحی مہم کا قالب اختیار کرتی یا لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے شعار اور نعرے بھی شامل کر لیتی تو یہ پاکیزہ و مبارک نظام جو اس دعوت کے نتیجے میں قائم ہوا کبھی خالص ربانی نظام بن کر جلوہ گر نہ ہوسکتا۔

قرآن حکیم کا مکی دور اسی شان و شوکت کا حامل ہے۔ یہ دور قلوب و اذہان پر اللہ کی الوہیت کا نقش ثبت کرتا ہے، انقلاب کے فطری راستے کی تعلیم دیتا ہے۔ خواہ اس میں بظاہر کتنی ہی دشواریوں اور صعوبتوں کا سامنا ہو اور دوسری پگڈنڈیوں پر جانے سے منع کرتا ہے، خواہ عارضی طور پر انہیں اختیار کرنے کا ارادہ ہو۔ وہ ہر حال میں صرف فطری راستے پر گامزن رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغ جگر سے نورانی

☆☆

النبی الخاتم ﷺ

● حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

جب اس زمانہ میں ہر غائب کو حاضر اور ہر بعید کو قریب سمجھا جاتا ہے۔ کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ پھر ان تمام غائبوں میں جو سب سے زیادہ حاضر اور ایسا حاضر کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اتنا حضور ہم میں سے کسی کو خود اپنے سامنے نہیں ہے۔ ان تمام بعیدوں میں جو سب سے زیادہ قریب اور اتنا قریب ہے کہ خود ہم اپنے سامنے اپنے کو اس قدر قریب نہیں پاتے۔

آخر ہم میں کون ہے جس کے دماغ میں اپنی پیدائش، طفولیت، شباب، کہولت، خلوت، جلوت کے تمام واقعات اور اس کے تمام پہلو اتنی صفائی کے ساتھ موجود ہیں جتنی تابناکی کے ساتھ دنیا اس شخص کے متعلق جانتی ہے، جو اگرچہ آج سے صدیوں پہلے عرب میں ظاہر ہوا، لیکن جس کے ظہور کی شدت ہر پچھلی صدی میں پہلے سے زیادہ محسوس کی گئی اور کی جارہی ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ اسی بڑھتی ہوئی اشتدادی کیفیت کے ساتھ محسوس کی جائے گی کہ قدرت نے اب جن سامانوں کو پیدا کیا ہے ان کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

اور شاید کہ اس ہستی مبارک کے اسی غیر منقطع ارتقائی تسلسل کا نتیجہ ہے کہ اس کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ دور از کار، اس دعویٰ کا ہر مدعی فالتو اور زمین کی پشت کا بالکل غیر ضروری بار ٹھہرایا گیا، چھٹی صدی کے بعد زمانہ کے ہر حصہ میں ٹھہرایا گیا، دنیا کے ہر خطہ میں ٹھہرایا گیا۔

اور جن بدبختوں کے دل میں کبھی اس منصب کی جھوٹی ہوس اٹھتی ہے یا اٹھوائی جاتی ہے، تم دیکھو! خلاف دستور بنی آدم کتنی بدسلوکیوں کے ساتھ آخر وقت تک اس کو دُر دُراتے،

دھتکارتے رہے، اٹھنے کو تو یہ اٹھ جاتے ہیں، لیکن چند مغالطی پیروؤں کے بعد ہی ان کو یہ خود بخود محسوس ہوتا ہے کہ ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، پھر یونہی بازاری بے روزگاروں کی طرف بالآخر سرگردانی کے ساتھ بھٹکتے بھٹکاتے بہ ہزار حسرت وناکامی ونامرادی کے گڑھوں میں ہمیشہ کے لئے مدفون ہوگئے، تاریخ اس کی شاہد ہے کہ بوالہوسوں کے بپھاروں سے بے چین ومدہوش ہوہوکر، اگر کوئی نبوت کا نام لے کر کبھی اٹھا تو قدرت کے انہیں ہاتھوں نے جلتی ہوئی گھاس کے خاکستر کے مانند اس کو وہیں بٹھادیا۔ چودہ سو سال کا یہ تجربی مشاہدہ ہے، حالانکہ اس سے پہلے تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ چار پانچ سو سال کے اندر کوئی نبی نہ آیا ہو، اس کی ضرورت نہ پیدا ہوئی ہے۔ اگرچہ کھلے کھلے صاف غیر مبہم لفظوں میں بار بار اس کی منادی بھی کردی گئی تھی اور نبوت ورسالت کے سلسلہ کی یہ پہلی منادی تھی کہ اب آسمان کا پیغام لے کر زمین والوں کے پاس کوئی نہیں آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ختم نبوت کی اس سنگین مہر سے جو بھی ٹکراتا ہے وہ پاش پاش ہوجاتا ہے اور قدرت کی چٹان پر سر مارنے کا لازمی نتیجہ ہی ہے۔

بالفرض اگر یہ اعلان نہ بھی ہوتا جب بھی آخر دنیا کیا کرتی، آنے والے تو ہمیشہ اسی وقت آتے ہیں، ان میں آتے ہیں، جب جانے والا جاہی چکے، لیکن ایسا آنے والا جو اس شان کے ساتھ آیا کہ بجائے جانے کہ وہ آگے ہی بڑھتا رہا۔ بڑھ رہا ہے، گنجائش ہی کیا ہے کہ اس کی جگہ دوسرا آئے۔ جس طرح وہ بھیجا گیا جن صفات وکمالات کے ساتھ بھیجا گیا اسی شان، اسی آن کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب اور دمکتے ہوئے سورج کی مانند ہم میں وہ اسی طرح موجود ہے، ہر جگہ موجود ہے، ہر خطہ میں موجود ہے اس کا وجود مغرب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے، جس طرح وہ مشرق میں وہ آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے، شاہوں کے قصور اور غریبوں کے کلبہائے دیجور دونوں کو روشنی بانٹ رہا ہے اور یکسانی کے ساتھ بانٹ رہا ہے، وہ سب کے لئے برابر ہے، سب کے لئے یکساں ہے، وہ فضا میں بھری ہوئی

ہوا ہے، جس میں سب سانس لیتے ہیں اور وسعت کون ومکاں کا وہ نور ہے جس میں سب چلتے ہیں، پلتے ہیں، پھولتے ہیں، پھلتے ہیں، یقیناً اس کی ضرورت جتنی چھٹی صدی کے باشندوں کو تھی اتنی ہی ضرورت اس وقت تک باقی ہے پھر جب تک پیاس ہے پانی چھلکے گا اور جب تک بھوک ہے روٹی معدوم نہ ہوگی، آخر اس وقت کیا تھا جواب نہیں ہے، یہ سچ ہے کہ دنیا اپنے خالق سے ٹوٹ کر اس زمانہ میں مخلوقات کے اندر غرق تھی، لیکن کیا آدم کی اولاد تباہی کے اس گرداب سے نجات پاچکی ہے؟۔

بلاشبہ جنہیں اس کی برکت میسر آئی ہے ان میں اکثروں کا جو مرتد یا منافق نہیں ہیں، بیڑہ خطرہ سے انشاءاللہ نکل چکا ہے، لیکن کون کہتا ہے کہ سب کا نکل چکا ہے؟ غریب مشرق تو پس ماندوں کا ملک ہے، لیکن جن پیش گامیوں کا ڈھنڈھورا اس سے زور سے پیٹا جارہا ہے، کیا یورپ کے ان باشندوں کی سمجھ میں سیدھی ہوچکی ہے، باپ بیٹے کے قدیم افسانے کو تو چھوڑو، لیکن جن خلقتوں کی ایجاد وتخلیق کی انہیں توفیق بخشی گئی بجائے توفیق بخشنے والے کے خود اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ان مخلوقات کو اپنے دلوں میں نہیں بٹھائے ہوئے ہیں، یقیناً ان کے قلوب ان جدید مخلوقات کی انتہائی عظمت سے اسی طرح لبریز ہیں جس طرح ان کے بزرگوں کے دل پرانی مخلوقات کے احترام سے معمور تھے۔

پہلوں کی عقل کو سورج کی شعاعوں، آگ کے شعلوں نے خیرہ کیا تھا، تو کیا پچھلوں کے سینوں میں برق کی قوتوں، اسٹیم کی طاقتوں پٹرول کی توانائی نے چکاچوند نہیں لگائی ہے، بزرگوں کے کارناموں سورماؤں کی اولوالعزمیوں نے اگر پہلو کو ان بزرگوں کی پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکایا تھا تو پچھلوں کے لیڈروں زعیموں اور قائدوں کے کاموں نے ان کے اسٹیچو اور فوٹوؤں کے ساتھ ان کی ساری قومی عزت وفلاح کو وابستہ نہیں کیا ہے؟

پرانے بھی تنہا خدا کے نام پر بپھر جاتے تھے، کیا نیوں کے سامنے جاکر آج خدا کا تنہا کیا

، بلکہ ان کے معبودوں کے ساتھ ملا کر بھی نام لو، پھر دیکھو کہ ان کی پیشانی کی کھال کس طرح سکڑتی ہے اور منہ سے کتنے تولے کف کے اڑا اڑا کر بیچے نام لینے والے کے چہرہ پر پڑتے ہیں، تحریروں میں، تقریروں میں، گفتگوؤں میں تذکروں میں۔ کیا نیوں کا یہ گروہ اپنے معبودوں کے نام لئے بغیر کبھی گزر سکتا ہے، برق کا، بھاپ کا تارکا، ریل کا، سیاروں کا، طیاروں کا، ملوں کا، بینکوں کا، سرمایہ کا، ان کی مختلف شکلوں مثلاً انشورنسوں، ریسوں اور خدا جانے کن کن خداؤں کا نام آج جس دلچسپی کے ساتھ، جس ذوق کے ساتھ لیا جاتا ہے مشکل ہے کہ خالق کے پوجنے والوں نے اتنے ذوق وشوق کے ساتھ بِسْمِ اللّٰهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ، لا اِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ کا ذکر کبھی کیا ہو۔

یہ حمد بھی کرتے ہیں تو ان ہی خداؤں کی، نعت بھی لکھتے ہیں تو ان ہی کی، پھر کیا غلط سمجھا، جب میں نے کہا کہ ''جو پرانے تھے وہی نئے ہیں'' چند مخلوقات کے گرد پالتیاں مارے وہ بھی بیٹھے تھے اور ٹھیک اسی فطرت کے چند قوانین کے آگے یہ بھی محو رقص رامشگر ی ہیں، وہان کا بھجن گاتے تھے، یہ ان کا شکر یہ کرتے ہیں۔ ''اتوا صوابه بل هم طاغون.''

یہودی فلسفیوں کے نزدیک انسان کی بے وقعتی:

تم کہتے ہو کہ پہلوں نے انسانیت کو ذلیل کیا، جو سب سے اونچا لامحدود ہیں، پس جس نے ایک کو چھوڑا اس کو ہر ایک سے جڑنا پڑے گا، جو ایک سے نہیں ڈرے گا اس کو ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا جو جھکنے ہی کے لئے ہے، اس کو جھکنا ہی پڑے گا، لیکن اس کے آگے جھکا تو سب اس کے آگے جھکیں گے اور جس نے ایک کے آگے سر ٹیکنے سے انکار کیا، دیکھو! وہ ہر ایک کے آگے سر ٹیکے پڑے ہیں۔ ملائکہ کے آگے، جن کے آگے، انس کے آگے، حیوانات کے آگے، نباتات کے آگے، جمادات کے آگے اور میں کیا دکھاؤں کہ ''جو دیکھا نہیں جاسکتا۔''

یہی وہ عذاب ہے جو آخرت سے پہلے ان کو دنیا میں چکھنا پڑا، چکھ رہے ہیں، برضا ورغبت چکھ رہے ہیں۔ مگر کیا انسانیت کی یہ توہین صرف پہلوں میں تھی، پرانوں نے خالق کے معبود ہونے سے انکار کیا بے شک اس کے صلہ میں انہیں بندروں کو مسجود بنانا پڑا، لیکن جن لوگوں نے اپنے تئیں خدا کی مخلوق ہونے میں شک کیا تھا، آج بندر کے مولود ہونے کا اپنی زبانوں سے کیوں اقرار کررہے ہیں؟، جس نے بندر کو معبود بنایا کیا شبہ ہے کہ اس نے انسانیت کو رسوا کیا، لیکن جس نے خدا کی مخلوق ہونے سے انکار کر کے بندر سے مولود ہونے پر فخر کیا، کتابیں لکھیں، دلائل قائم کئے اور کررہے ہیں۔ کیا انسانیت کی خواری میں انہوں نے کوئی کمی کی ہے اور سچ تو یہ ہے جو چیز کی قیمت لگاتے ہوئے یکا یک چیخ اٹھتے ہیں کہ انسانیت کی کوئی قیمت نہیں ہے، سب انسان کے لئے ہیں، لیکن انسان کسی کے لئے نہیں، کسی مقصد کے لئے نہیں، کیا اس نے انسانیت کو ان عفونتوں اور غلاظتوں سے بدتر نہیں ٹھہرایا جن سے کسانوں کے کتنے مقاصد وابستہ ہیں، جب انہوں نے کہا کہ انسان اپنے خدا اور خالق کے لئے نہیں ہے، تو کیا اس کے بعد یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انسان کسی کے لئے بھی ہے ''پانی'' کا کیا بگڑے گا اگر آدمی نہ ہو؟ ''ہوا'' کیوں رک جائے گی، اگر آدمی نہ ہوں؟ آفتاب میں کیا داغ آئے گا اگر آدمی نہ ہوں؟ حتیٰ کہ سڑک کے کسی سنگریزہ اور جنگل کے کسی تنکے کا کیا نقصان ہے، اگر کوئی نہ ہو؟ تمہارے بڑے نہ ہوں، چھوٹے نہ ہوں، کوئی نہ ہو، بے شک سب ان کے لئے ہیں، لیکن مخلوقات کے اس طویل وعریض سلسلہ میں انسان کسی کے لئے نہیں، اب اگر وہ خالق کے لئے بھی نہیں ہے، تو اس سے زیادہ عبث وبے نتیجہ فضول، ومہمل، بیہودہ ہستی اور کس کی ہوسکی ہے؟ اس سے رسوائی بڑی رسوائی اس ہتک سے بڑی ہتک اور کیا ہوسکتی ہے؟

اور یہ تو ایمان کا حال ہے، عمل کے میدان میں ان جاہلوں کے پاس کیا تھا، جو آج کے عالموں کے پاس نہیں ہے؟

انسانوں کوانسانی معاشرے میں شامل ہونے سے روکنا (برتھ کنٹرول):

عرب کے جہل نے کیا پیدا کیا تھا جو آج کے علم سے نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ جاہل شراب پیتے تھے، مردار کھاتے تھے، زنا کرتے تھے، سود خوار تھے، جواری تھے ایک کا خون دوسرا پیتا تھا، املاق، افلاس کے اندیشہ سے لڑکیوں کو لڑکوں کو گور میں زندہ دفن کرتے تھے، لیکن قصہ کن کا سنایا جا رہا ہے، کیا عرب کے جاہلوں کا، یا یورپ کے عالموں کا؟ وہاں کیا دکھاتے ہو جسے یہاں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، عرب سے باہر ایران میں ایک طرف ''مزدک'' زر، زمین، زن'' کو سب سے چھین کے سب کو دے رہا تھا اور دوسری طرف ''مانی'' اور اس کے شاگرد ہاتھوں میں استرے لئے پھرتے تھے کہ جس راہ سے یہ برائیاں آئی ہیں ان ہی کا قلع قمع کر دیا جائے، وہ انسانوں کو انسانوں میں آنے سے روکتے تھے، یہی ان کا فلسفہ تھا، لیکن یہ تو ایران میں ہو رہا تھا، آج یورپ کے ایک حصہ میں پھر وہی ''مزدک'' زندہ ہو کر ''بالیشویک'' کے نام سے کیا وہی سب کچھ نہیں کر رہا ہے، جو اس نے کیا تھا اور دوسری طرف ''برتھ کنٹرول'' کے نام سے اسی طرح انسانوں کو انسانوں کی سوسائٹی میں شریک ہونے سے روکا نہیں جا رہا ہے، ایک راستوں کو ڈھاتا ہے اور دوسرا بند کرتا ہے، اس کے سوا اور کیا فرق ہے؟

الحاصل جو کچھ اس وقت تھا جہاں تک سوچو گے تقریباً کسی نہ کسی شکل میں تم اس وقت بھی اس کو پاؤ گے، بس آنے والا کیسے جا سکتا تھا جب تک کہ وہ سب نہ جان لے جس کے لئے وہ آیا تھا بلکہ اس کی ضرورت تو اس کے بعد بھی رہے گی کہ یہ تو تخریب ہے، لیکن کیا تعمیر بغیر معمار کے ممکن ہے اور یہی میرا مقصد تھا، جب میں نے کہتے ہوئے سب سے پہلے کہا تھا ''کہ یہی وہ آنے والا ہے جو آنے ہی کے لئے آیا'' پھر جس طرح آج وہ ہم میں موجود ہے اس کی ضرورت موجود ہے، ان کو دیکھ کر اب بھی کوئی شک نہیں کر سکتا ہے کہ آنے کے بعد وہ

نہیں گیا، اور جب تک اس کی ضرورت ہے نہیں جائے گا؟ تھا، ہے، رہے گا، ابد تک رہے گا اور اس کے لئے یہی مقدر ہے۔

پس اے اخوان عزیز!

''جاهدوا في الله حق جهاده هو اجتبكم وما جعل عليكم في الدين من حرج، ملة أبيكم ابراهيم هو سمكم المسلمين من قبل و في هذا ليكون الرسول شهيدا عليكم وتكونوا شهداء على الناس فاقيموا الصلوٰة واٰتوا الزكوة واعتصموا باللّٰه هو مولكم فنعم المولىٰ ونعم النصير.''

(کوشش کرو! اللہ کی طرف بلانے میں کوشش کا پورا حق ادا کرتے ہوئے، اسی نے (امت اسلامیہ) تم کو چن لیا ہے اور تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں فرمائی، یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے، اسی نے تمہارا نام ''مسلمین'' رکھا پہلے بھی اور اس میں بھی (کوشش کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا) کہ رسول تمہارے نگراں رہیں گے، اور تم دنیا کے نگراں رہو گے پھر لوگو! نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور زور سے پکڑ لو اللہ کو وہی تمہارا آقا ہے، پھر کتنا اچھا آقا، کتنا اچھا مددگار)، رب تک جانے کے لئے آنے والے آتے رہے، اشخاص چنے جاتے تھے، لیکن جب وہ آیا جو آنے ہی کے لئے آیا تو اس کے طفیل میں اس کے ساتھ شخص نہیں، بلکہ ایک امت چنی گئی، پہلے شخص مبعوث ہوتے تھے، اب ایک امت ہی مبعوث ہے، یہی اس امت کا اصل ''منصب'' اور فرض حقیقی ہے، جب تک وہ اس منصب ''پر قائم رہیں گے اور انسانوں کی نگرانی کریں گے اس وقت تک ان کے رسول بھی اس امن کے نگراں رہیں گے، لیکن جب تم اپنے منصب سے ہٹے، اگر رسول کی نگرانی کو نہیں محسوس کرتے ہو تو کیا یہی وعدہ نہیں تھا۔''

یہ امت مجتبیٰ ومبعوثہ ہر قوم میں ہے، ہر ملک میں ہے، پس جو جہاں ہے وہ وہیں مبعوث ہے، اس کی قوم اسی ملک کے باشندے ہیں مصیبت کی گھڑی وہی تھی جب اپنی قوم

کو ہم نے اپنی قومیت سے نکالا ،اسی کے ساتھ ان کا درد بھی دل سے نکالا، حالانکہ اگر حضرت نوح علیہ السلام کے منکران کی قوم تھی ،حضرت ہود علیہ السلام کی منکران کی قوم تھی ، قریش رسول خاتم ﷺ کی قوم کے لوگ تھے، تو کس نے کہا کہ ہندوستان کے ہندو، ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم نہیں، مصریوں کی قوم، مصر کے قبط نہیں، یورپ کے عیسائی، یورپ میں رہنے والے ترکوں کی قوم نہیں ہیں، پس جب تک ''حتیٰ لا تکون فتنة ویکون الدین کله لله'' نہ ہو تھک کر بیٹھنے کے کیا معنیٰ ہو سکتے ہیں، وثیقہ ہے کہ۔

'' هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَه بِالْهُدیٰ وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَه عَلَی الدِّیْنِ کُلِّه'' (اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ سارے دین پور وہ غالب ہو)۔

اور دیکھو کہ لا مذہبیت پر مذہبیت غالب ہے، چند پیشہ ور، کتاب سازوں یا سبق فروش معلّموں کو جانے دو، جو وساوس بانی کی روٹی کھاتے ہیں، عام فطرت انسانی پر مذہب کی گرفت اسی طرح سخت ہے جس طرح ہمیشہ سے تھی، آخر اگر لا مذہبیت کا اسی قدر زور ہو گیا ہے تو جس یورپ کے متعلق یہ سنایا جاتا ہے، کیوں نہیں وہاں کے باشندوں نے لا مذہبیت ہونے کا اعلان کیا۔

مذاہب میں جو وزن اسلام کو ہے کسی اور مذہب کو نہیں:

سچ ہے یہ کہ انسانی دماغ کی جو ذہنی ساخت ہے اس میں اتنی تنگی یا پستی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ ماضی و مستقبل کے انجام کے فیصلہ کے بغیر وہ اپنی زندگی گزارے، کہاں سے آیا ہوں؟ کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ چلنے والے کے سامنے ان سوالات کے جوابات نہیں ہیں۔ کیا وہ ایک قدم بھی آگے بڑھا سکتا ہے۔ بہر حال کم از کم اس وقت تک تو دنیا میں لا مذہبوں سے زیادہ بہت زیادہ بہت ہی زیادہ تعداد مذہبی لوگوں کی ہے اور مذاہب

میں ہر حیثیت سے جو وزن اسلام کو حاصل ہے کسی کو نہیں ہے، پس اس کا منطقی نتیجہ کیا یہی نہیں ہوا کہ لا مذہب غالب اور تمام مذاہب پر اسلام غالب، اس لئے سب پر اسلام غالب۔

جب مسلمان اپنی نگرانی دوسروں کے سپرد کر کے رسول ﷺ کی نگرانی سے اس وقت محروم ہیں، اس زمانہ میں بھی اسلام کے غلبہ کا یہ حال ہے تو کیا حال ہوگا جب دنیا کے نگراں بن کر پھر رسول کی نگرانی کی سعادت مسلمان حاصل کر لیں گے، کچھ نہیں کوئی کام نہیں، جب تک اصل کام نہ ہوگا کسی کام میں کوئی برکت نہ ہوگی بہت آرام لے چکے، تھکن مٹ چکی، بہت کام باقی ہے، ہوتا یہ کہ چونکنے والے چونکتے اور ''درا'' کی اس ''بانگ'' پر چل پڑتے۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے
وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

☆☆

دنیا پیاسی ہے

● محمد نور اللہ جاوید قاسمی

موجودہ عالمگیر مادہ پرستانہ تہذیب کی وجہ سے پوری دنیا اس وقت تاریخ کے انتہائی دشوار کن حالات اور خودکشی پر مجبور کردینے والے واقعات وحادثات سے دوچار ہے۔ معاشرتی وسماجی زندگی میں آئے دن پیش آنے والے غیر انسانی، غیر اخلاقی اور حیا سوز واقعات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اولاد آدم کو چند خواہشات نے اپنے شکنجے میں کس لیا ہے اور ہر طرف دولت اور اقتدار کے لئے سنگین کشمکش کی صورت حال پیدا ہے۔ نتیجتہ انسانی ذہن وفکر میں ایسا تضاد آگیا ہے کہ زندگی کا کوئی بھی گوشہ اس منحوس سائے سے محفوظ نہیں ہے۔ اعتقادات ونظریات میں توازن، قانون میں عدل کی روح، سیاست میں جذبہ ایثار و خدمت کا فقدان ہوگیا ہے، اب ان کی جگہ حرص، اغراض اور مفاد پرستی نے لے لی ہے، اس کی وجہ سے ذہنی سکون وعافیت یکسر معدوم ہوچکی ہے۔ انہی حالات کا معائنہ کرکے شاعر اسلام علامہ اقبال نے اپنے تاثرات اس طرح بیان کئے تھے۔

''مغرب کی مادی تہذیب کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہوچکی ہے، یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کے جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے، سیاسی اعتبار سے نظر ڈالئے تو افراد افراد اسے دست بہ گریباں ہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابل تسکین جوع زر پر قابو حاصل کرسکے، یہ باتیں ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لئے اس کی جدوجہد بتدریج ختم ہورہی ہے، بلکہ یہ کہنا

چاہیے کہ وہ درحقیقت زندگی سے اکتا چکا ہے، مادیات کی اس باقاعدہ نشونما نے اس کے رگ وپے بھی مفلوج کردئے ہیں،'' (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ بحوالہ نقوش اقبال: ص 64)

دوسری طرف ایک ایسی قوم بھی ہے جو اپنے مستقبل کے تئیں فکرمند ہے، جس کے پاس ایک مکمل دعوت ہے، اس کی تہذیب وثقافت اس کی جدوجہد اور عمل اور اس کی ہر قسم کی سرگرمی اور نشاط اس کے عقیدہ کے تابع ہے۔ جس کا مستقبل اس کا ماضی اور حال ہے، جسے اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے کسی انسان یا کسی تحریک کی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس آفاقی پیغام اور عالمگیر دعوت پر چلنے کی ضرورت ہے، جس آفاقی پیغام کو چودہ سو سال قبل حضور اقدس ﷺ نے مکہ کی سنگلاخ وادیوں سے بلند کیا تھا، طائف ونجد والوں کو سنایا تھا، وہی پیغام جسے سنا کر بدوی، غیر مہذب اور غیر متمدن قوم کو صرف مہذب ہی نہیں، بلکہ دنیا والوں کا قائد اور پیشوا بنادیا۔ ایک غیر مسلم حقیقت پسند شاعر پنڈت ہری چند نے اس کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کردیا
کس نے نظروں کو ملایا اور دریا کردیا
زندہ ہوجاتے ہیں جو مرتے ہیں اس کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کردیا

جس پیغام اور صدا نے ایک تھوڑی سی مدت میں جو انقلاب رونما کیا، اس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی، لیکن آج وہی پیغام 21 ویں صدی کی چکاچوند آنکھوں کو خیرہ کردینے والی دنیا میں گم ہوتا جارہا ہے۔ اس آفاقی پیغام کے حامل امت کا مذہب مال کی محبت، ذخیرہ اندوزی اور سرمایہ کاری، ان کے آستین سے ید بیضاء، دلوں سے دینی حمیت، اسلامی غیرت، ایمانی جوش و ولولہ، اللہ اور دین کی خاطر قربانی اور جہاد کا جذبہ معدوم ہوتا جارہا ہے۔ دنیا کی قیادت ورہنمائی، نگرانی واحتساب کائنات کرنے کے بجائے، دنیا والوں کی تہذیب وتمدن کی دلدادہ اور ان کی خوش کن وادیوں میں ضم ہوگئی ہے، آج اس امت کا ہر

شخص واعظ، ناصح، مفکر، مربی اور لیڈر رہے، ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ وہ صرف وعظ کرے، نصیحت دے، فکر انڈیلتا رہے اور تربیت کے پلان تیار کرتا رہے، عمل کرنا اس کی ذمہ داری نہیں، دوسروں کی ہے۔ اجتماعی اور قومی مفاد کو ذاتی مفاد کے آگے بھینٹ چڑھانا یہ تو عام سی بات بن گئی ہے۔ اقبال مرحوم نے اسی زبوں حالی کا رونا روتے ہوئے نبی ﷺ سے رہنمائی کی درخواست کی تھی کہ ’’للّٰہ آپ امت کے حال زار پر نگاہ کرم فرمایئے اور اس نازک گھڑی میں اس کی دست گیری فرمایئے۔

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند وہ بے قافلہ و راحلہ وزاد
اس کوہ بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمد
آیات الٰہی کا نگہباں کدھر جائے

(کلیات اقبال: اے روح محمد، ص429)

امت کے زوال، افتراق وانتشار، جہالت وپسماندگی پر کافی عرصے سے بہت کچھ لکھا جارہا ہے اور لکھا جاچکا ہے، اس لئے زوال امت کے اسباب تلاش کرنے کے بجائے، اب ضرورت ہے ادراک کی، یہ ادراک اسی وقت ممکن ہے جب امت محمدیہ اپنے ماضی کے پیغام پر کان دھرے اور قرآن وحدیث سے اپنی کوتاہیوں کا ادراک کرے۔

مسلمانوں کی عظمت رفتہ، عزت ووقار کی بحالی کا واحد ذریعہ بقول امام مالک:______
’’لا یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا‘‘، سابق میں صحابہ اوران کے بعد

مجموعہ القاسم: جلد دوم
سیرت محسن انسانیتؐ

اسلاف قرآن کے احکام اور سیرت کے آفاقی پیغام اور عالم گیر دعوت پر عمل کر کے دنیا کی نگاہوں میں معزز ہوئے تھے، آج بھی ہم اس مادیت کے دور میں اس پر عمل کر کے سرخرو ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ محمد ﷺ کی سیرت ایک فرد کی سیرت نہیں، بلکہ وہ ایک تاریخی قوت کی داستان ہے، جو ایک انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوئی، وہ زندگی سے کٹے ہوئے ایک درویش کی سرگزشت نہیں ہے، جو گوشہ عافیت میں بیٹھ کر محض انفرادی تعمیر میں مصروف رہا ہو، بلکہ وہ ایک ایسے شخص کی آپ بیتی ہے، جو بنی نوع انسان میں مکارم اخلاق کو بلند کرنے والی ایک اجتماعی تحریک کی روح رواں تھی، وہ محض ایک انسان کی نہیں، بلکہ ایک انسان ساز کی روداد ہے۔ جو عالم نو کے معمار کے کارنامے پر مشتمل ہے اور جس کی زندگی کا ہر گوشہ کامل ومکمل ہے اور قیامت تک آنے والی انسانیت، انسانی اقدار کو پانے کے لئے اب صرف اسی کی محتاج ہے۔

آپ ﷺ کے مدرسے سے ایک حاکم، ایک امیر، ایک وزیر، ایک افسر، ایک ملازم، ایک آقا، ایک سپاہی، ایک تاجر، ایک جج، ایک معلم، ایک واعظ، ایک لیڈر، ایک ریفارمر، ایک فلسفی، ایک ادیب، ہر کوئی یکساں درس حکمت لے سکتا ہے۔ وہاں ایک باپ کے لئے، ایک ہم سفر کے لئے، ایک ماں کے لئے، شوہر اور بیوی میں سے ہر ایک کے لئے یکساں مثال موجود ہے۔ ایک بار جو کوئی اس درس گاہ تک آپہنچتا ہے، پھر اسے دوسرے دروازے کو کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انسانیت کو جس چیز کی بھی ضرورت ہوسکتی ہے وہ ایک ہستی میں جلوہ گر ہے۔ تاریخ کے پاس انسان اعظم یہی ایک ہے، جس کو چراغ بنا کر ہر دور میں ہم ایوان حیات روشن کرسکتے ہیں۔ (حاصل مطالعہ محسن انسانیت، سیرت حلبیہ)۔

افسوس ہے اس عظیم ہستی کا تعارف، اس کے آفاقی پیغام اور عالمگیر دعوت کے فروغ کی ذمہ داری جس امت پر تھی وہ خود ہی اس سے دور جاچکی ہے۔ اس کی کتاب عمل کے اوراق پر انسان اعظم کی سیرت کی کوئی تصویر دکھائی نہیں دیتی، اس کی سیاست، معاشرت، اخلاق وکلچر پر انسان اعظم کی سیرت کے دھندلے نشانات بڑی مشکل سے ملیں گے۔ اس امت کا کوئی

بھی عمل انفرادی ہو یا اجتماعی گواہی نہیں دیتا کہ اس کا عمل نبی کریم ﷺ کے بتلائے ہوئے اصولوں اور ان کی قائم کردہ روایات واقدار کا آئینہ ہے۔ بلکہ اس کے برعکس آج یہ جماعت دنیا کے مختلف فاسد نظام تہذیب وتمدن کے دروازوں پر بھیک مانگتی پھر رہی ہے۔ ان کی تہذیب وتمدن سے متاثر ہوکر اپنے لافانی زندہ جاوید سرمایہ افتخار پر شرمسار ہورہی ہیں۔ اس نے قرآن کریم کو صرف تلاوت کی کتاب بنا کر رکھ دیا ہے۔ محمد ﷺ کو محض قومی ومذہبی رہنما کی حیثیت دے دی اور اس کے آفاقی اور عالمگیر دعوت کو گروہی اجارہ بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ کو محض مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے لیتا ہے۔ آپ کی تعلیمات کو سمجھنے اور سمجھانے کے بجائے معترضانہ اور تعصّبانہ انداز میں سیرت نبوی کا مطالعہ کرتا ہے، چنانچہ مغرب نے آپ ﷺ کی شخصیت کے بارے میں جو تاثرات اور تصویر پیش کی ہے وہ ایک ایسے شخص کا نقشہ کھینچتی ہے جو اپنے مفاد کی خاطر ہزاروں انسانوں کا قتل عام کرتا ہے۔ مغرب کے اس متعصّبانہ رویہ پر سوائے افسوس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

آج ہمیں شکایت ہے کہ اسلام کے خلاف سازشیں ہورہی ہیں، قرآن اور سیرت نبوی کو منظّم اور سازش کے تحت غلط انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔ آج اسلام کو صیہونی تحریک سے عظیم خطرہ لاحق ہے، لیکن یہ حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔ حق یہ ہے کہ اصل میں مجرم ہم خود ہی ہیں، محسن انسانیت ﷺ کی شخصیت اور کارنامے کو دنیا سے اوجھل رکھنے والے ہیں، اپنی نگاہوں سے چھپانے والے ہیں۔ آج اسلام کو خود ہم سے اور ہمارے اعمال اور کردار سے خطرہ لاحق ہے۔ ہمارا عمل اور کردار سیرت کے آفاقی پیغام کو غلط انداز سے دنیا کے سامنے پیش کررہا ہے۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

آج ضرورت ہے اس بات کی کہ ہم اجتماعی وانفرادی دونوں سطح پر اپنے اعمال اور کردار کا جائزہ لیں، اپنی زندگی کے تمام اوراق کو محمد الرسول ﷺ کی حیات مبارکہ سے ہم

آہنگ کریں اور حضور ﷺ کے عالمگیر پیغام کو از سرنو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ان کے سامنے یہ ثابت کریں کہ اللہ کے آخری رسول نبی کریم ﷺ کا پیغام اور ان کی دعوت نسل اور جغرافیائی حدود کی پابند نہیں، انسانی فکر وعمل کے لئے آپ ﷺ کی دعوت آفاقیت، عالمگیریت اور مساوات ازل کا پیغام ہے، تہذیب وتمدن میں قبائلی تعصب، عصبیت رنگ ونسل وملک کے متعلق نظریات ان سب کو اللہ کے رسول نے دین میں باطل قرار دیا اور مذہبی رواداری اور عدل وانصاف کی وہ مثال قائم فرمادی، جس کی نظیر سے انسانی تاریخ خالی ہے۔ آپ ﷺ بین الاقوامی اخوت، رواداری اور محبت کے معلم ہیں۔

اس وقت پوری دنیا معاشی نظام کی وجہ سے پیدا مسائل سے اپنی مسرت کھو بیٹھی ہے، سود اور قرضے کی مصیبت نے تمام انسانیت کو بے چین وپریشان کررکھا ہے۔ سود در سود کے رواج نے ایک ایسی حالت پیدا کردی ہے کہ مختلف قسم کے قرضوں، ٹیکسوں اور جرمانوں کے بوجھ سے انسانیت کراہ اٹھی ہے، لیکن آپ ﷺ نے معاشی اقتصادی، مالی اور تجارتی مسائل کے حل کے لئے ایسی فکری بنیادیں فراہم کی ہیں کہ اس پر عمل کرنے سے یہ مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ ان کی پیروی سے انسانی زندگی راحت اور چین سے گزر سکتی ہے۔ تجارتی اور معاشی مشکلات کو ختم کرکے پیغمبر اسلام نے زکوٰۃ کا نظام پیش فرمایا، غریبوں اور دینی امور میں دولت کو خرچ کرنے کا جذبہ پیدا کیا، زکوٰۃ سے غربت، گداگری اور مقروضیت دور ہوسکتی ہے، نفلی صدقات سے مذہبی اور تعلیمی اداروں کی مالی حالت اس قدر مضبوط اور مستحکم ہوسکتی ہے کہ ان سے تمام اولاد آدم استفادہ کرسکے۔ الغرض حضرت محمد ﷺ کا پیغام آج بھی اسی طرح واضح ہے، جس طرح چودہ سو سال پہلے تھا۔ موجودہ زمانے کی ہر مشکل اور مصیبت کا حل آپ ہی کے دامن میں موجود ہے۔ لہٰذا اکیسوی صدی کا انسان کھلے دل ودماغ سے اپنے مسائل کا حل کرنا چاہتا ہے تو اسوۂ محمدیؐ سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔

ماہنامہ معارف قاسم کا سیرت نمبر نکالنے کا بھی مقصد یہی ہے کہ ہم محسن انسانیت ﷺ

کی دعوت کا احیاء کریں۔ آپ ﷺ کی سچائی، ایمانداری، اخوت، امن، مساوات اور خداپرستی کے درس کو عام کریں۔ اپنی نئی نسل کے سروں سے تہذیب حاضر کی مرعوبیت کا بوجھ اتار پھینکیں، مادہ پرستانہ نظام کے خلاف بغاوت کا علم اٹھانے کا جذبہ اور شوق پیدا کریں۔

تو آئیے اپنے اداروں، گھروں، محلوں اور حلقہ ہائے اثر میں سیرت اور سنت نبوی کے آفاقی اور عالمگیر پیغام پر غور وفکر کی دعوت دیں، لیکن اس سے قبل ایک مرتبہ پھر اپنے ذاتی کردار کو سیرت النبی ﷺ کے آئینے کے سامنے رکھ کر ضرور دیکھ لیں اور محمد ﷺ کی سیرت کو کتابوں کے صفحات سے نکال کر نئے سرے سے اپنی عملی زندگی کے اوراق پر رقم کریں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اسی وقت ہم آپ ﷺ کے آفاقی پیغام اور عالمگیر دعوت کو دنیا والوں کے سامنے مؤثر انداز میں پیش کر سکتے ہیں جب ہماری زندگی خود سیرت النبی ﷺ کی آئینہ ہو۔

علامہ اقبال کا مندرجہ ذیل لافانی نغمہ مسلمانوں کو وہی دعوت فکر وعمل دے رہا ہے۔

ناموس ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقیں درش و ازدیر گماں خیز
ازخواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
فریاد زافرنگ و دلآویزئ افرنگ
فریاد زشیرینئ وپرویزئ افرنگ
عالم دہمہ ویرانہ زچنگیزئ افرنگ
معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز!
ازخواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

محمد عربی ﷺ کا خلق عظیم

● حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

قرآن عظیم نے نبی اکرم ﷺ کے اخلاق کریمانہ کی رفعت وبلندی کا تذکرہ کیا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس لئے کہ ایک انسان کامل کا سب سے قیمتی جوہر ''اخلاق کاملہ'' ہی ہوسکتا ہے اور ارشاد وہدایت کی اساس وبنیاد اخلاق حسنہ میں سے ''خلق عظیم'' ہی پر قائم ہے۔ زبان وحی ترجمان سے خود آپ نے ہی ارشاد فرمایا ہے:

انی بعثت لأتمم مکارم الاخلاق، وفی روایة محاسن الاخلاق حسن الخلق خلق الله الاعظم. (طبرانی)

میری بعثت کا مقصد ہی مکارم اور محاسن اخلاق کی تکمیل ہے، حسن خلق اللہ تعالیٰ کے اخلاق میں سب سے بڑا خلق ہے۔

خاتم النبیین کے ''خلق عظیم'' کے بعض تفصیلی گوشوں کو بھی مختلف آیات میں واضح کیا گیا ہے۔

''فبما رحمة من الله لنت لهم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنهم.''

(تو اے نبی) یہ اللہ ہی کی رحمت ہے کہ تو ان کو نرم خو مل گیا اور اگر کہیں تو بدخلق سخت دل ہوتا تو یہ سب تیرے پاس سے بچھڑ جاتے تو تو ان کو معاف کردے)۔

یعنی خدائے تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے کہ اس نے تم میں ایسا رسول بھیجا جو نرم

خوئی اور حسن اخلاق میں اس درجہ بلند اور رفیع مرتبہ رکھتا ہے کہ تمہاری خطا کاریوں، غلطیوں کے باوجود تم پر رحم وکرم ہی کی نگاہ رکھتا، لطف وعنایت سے گفتگو کرتا اور عفو ودرگزر کے ذریعے تم کو نوازتا ہے، ورنہ کہیں وہ تلخ درشت مزاج ہوتا تو تم میں یہ فدا کاری، شمع پر پروانہ کی طرح جان نثاری کا جذبہ اس کے لئے نہ ہوتا، بلکہ تم سب اس کے پاس سے منتشر ہوجاتے اور اسلام کی یہ شیرازہ بندی کیسے باقی رہتی۔ جو کچھ بھی ہے اس کے حسن اخلاق ہی کا ثمرہ ہے۔

"ورحمة للذين آمنوا منكم" اور جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں نبی ان کے حق میں رحمت ہے۔

آیت خود اپنا مطلب اور وضاحت ہے۔ مومن کے ایمان اور مسلم کے اسلام کی سب سے بڑی قدر و قیمت یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کا آخری پیغمبر، اولین وآخرین کا سردار ایمان والوں کے لئے رحمت ثابت ہورہا ہے۔ وہ صرف رحیم نہیں ہے بلکہ سرتاپا رحمت ہے۔ کریم ہی نہیں ہے از سرتا قدم کرم ہے۔

"لقد جاء كم رسول من انفسكم عزيز عليه ماعنتم حريص عليكم بالمؤمنين رؤف رحيم." (سورة توبه)

"بے شک تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آیا، اس پر تمہاری تکلیف شاق ہے۔ تم پر (تمہاری بہبود کے لئے) حریص ہے۔ مومنوں پر شفیق ومہربان ہے۔)

ایسا نبی، ایسا رسول جو تمہاری تکالیف پر دلگیر ہو، تمہاری فلاح و بہبود کا ہر وقت حریص و خواہشمند ہو، مسلمانوں اور ایمانداروں پر شفیق ومہربان ہو، تم ہی میں پیدا ہوا اور تمہارے رشد وہدایت کا سامان کرے، تمہارے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی، خوش بختی اور سعادت مندی ہوگی۔

رحمت اس لئے رحمت ہے کہ وہ رحیم ہے اور رافت اس لئے ہے کہ وہ رؤف ہے۔

"فلعلك باخع نفسك علىٰ آثارهم ان لم يومنوا بهذا الحديث اسفا."

(سوائے نبی شاید تو اس غم میں کہ وہ اس بات (قرآن) پر ایمان نہیں لاتے، ان کے پیچھے جان کھونے والا ہے)۔

وہ ارشاد وہدایت کا پیغام سنائے اور قوم اس کو کاذب وجھوٹا کہے، وہ حق کی منادی کرے اور قوم اس کو مجنوں بتائے، وہ خدا کی سچی راہ دکھائے اور قوم اس کو ساحر کا خطاب دے، وہ دین ودنیا کی فلاح ونجاح کی راہ دکھائے اور قوم اس کا مذاق اڑائے، اس کو طرح طرح کی تکالیف وایذا پہنچائے، لیکن اس محسن اعظم، رہبر کامل، صاحب الرشد والہدیٰ کو دیکھئے کہ وہ نہ قوم پر غضبناک ہوتا ہے، نہ اس کو بدعائیں دیتا ہے، بلکہ اس کے برعکس اس رنج وغم میں جان گھلائے دیتا ہے کہ میری گمراہ قوم کیوں ہدایت کی طرف نہیں آتی اور ظلمت شک وکفر سے نکل کر نور ایمان سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتی۔

"قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْن."

(اے نبی کہہ دے کہ میں اس (ارشاد وہدایت) پر تم سے کچھ مزدوری نہیں مانگتا اور میں بناوٹی آدمیوں میں سے نہیں ہوں)۔

وہ تو اپنی قوم کی فلاح ونجاح میں اس درجہ مستغرق ہے، کہ قوم کی ہر قسم کی ایذا دہی، دلآزاری کے باوجود اس سے محبت، شفقت اور تواضع کے ساتھ بار بار یہ کہتا ہے کہ میں تم سے اپنی اس ہدایت فرمائی کی اجرت نہیں مانگتا، تم کیوں شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہو، میں نہ بناوٹ کرتا ہوں نہ لگاوٹ، نہ اجرت کا خواہشمند ہوں نہ عوض کا طلبگار ہوں، میں تو قوم کی فلاح کا دردمند ہوں اور ان کی بہبود کا آرزومند۔

"قل لا أقول لكم عندى خزائن الله ولا أعلم الغيب ولا أقول لكم انى ملك ان اتبع الاما يوحى الى."

(اے نبی کہہ دے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور

میں غیب بھی نہیں جانتا اور میں تم سے یہ بھی نہیں جانتا اور میں تم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو بس اسی پر چلتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے)۔

میں نے تم سے کب یہ دعویٰ کیا کہ خدا کی خدائی کے تمام خزانے میرے قبضے میں ہیں، میں تو غیب کا بھی مدعی نہیں ہوں اور نہ میرا دعویٰ فرشتہ ہونے کا ہے۔ میں تو خدا کی وحی کا پیغامبر، داعی اور اس کی راہ کا پکارنے والا ہوں اور اسی وحی کے زیر فرماں فرمانبردار ہوں، تم مجھ کو انسانی ہستی سے برتر ہونے اور خدائی کا مالک بننے کے مطالبے کر کے غلط راہ کی جانب کیوں جاتے ہو اور مجھ کو صرف خدا کا پیغمبر، رسول اور ہادی سمجھ کر میرے کہے کو گوش دل سے کیوں نہیں سنتے۔

میں خزائن اللہ کا مالک نہیں ہوں، بلکہ مالک خزائن السّٰموات ولأرض کا نبی ہوں۔ میں مالک عالم الغیب نہیں ہوں، بلکہ عالم الغیب کا رسول ہوں۔ میں فرشتہ نہیں ہوں، بلکہ فرشتوں کے خالق کا پیغامبر ہوں۔ لہٰذا تم بھی وہی کہو جو میں کہتا ہوں، وہی باور کرو جو میں باور کراتا ہوں۔ اسی کو عقیدہ و ایمان بناؤ جو میں تم کو سکھاتا ہوں۔

"لا تستوی الحسنة ولا السیئة، ادفع بالتی ھی أحسن فاذا الذی بینک وبینه عداوة کأنه ولی حمیم." (حم سجدہ)

(نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں، آپ عمدہ اخلاق کے ساتھ دشمنوں کی مدافعت کیجئے تا کہ وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان عداوت ہے (آپ کے حسن اخلاق کو دیکھ کر) ایسا ہو جائے کہ گویا وہ دوست صادق ہے)۔

تم برا کہو، ایذا پہنچاؤ، مذاق کرو، ہنسی اڑاؤ، تم کو اختیار ہے۔ مجھے میرے خدا نے تلقین کر دی ہے کہ میں ہر برائی کا بدلہ بھلائی کے ساتھ دوں گا اور طعن و تشنیع، توہین و تذلیل کی شمشیر آبدار کا توڑ حسن اخلاق کے ڈھال سے ہی کروں گا۔ تم غصہ کرو گے، میں صبر کروں گا، تم جہالت برتو گے میں حلم و بردباری سے کام لوں گا، تم ایذا پہنچاؤ گے، میں عفو و درگذر

کروں گا، تم گالیاں دو گے، میں تمہاری ہدایت کے لئے دعائیں کروں گا، مجھ سے تو میرے خدا نے جبرئیل کے واسطے سے یہ فرما دیا ہے۔

"صل من قطعک وتعطی من حرمک وتعفو عم ظلمک".

(جو تیرے ساتھ رشتہ منقطع کر لے تو اس کو ساتھ جوڑنے کی کوشش کر اور جو تجھ کو محروم کرے تو اس پر نوازش و کرم کر اور جو تجھ پر ظلم کرے تو اس سے عفو و درگزر فرما)۔

"وما أرسلنک اِلا رحمة للعلمین."

(اور ہم نے تجھ کو (اے نبی) تمام جہانوں کے لئے صرف رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے)۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح خدائے تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کو کسی خاص گروہ، خاص جماعت اور خاص خطے کے لئے مخصوص نہیں کیا، بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ "رب العالمین" کی ربوبیت عامہ کے فیضان سے مستفیض ہے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کر رہا ہے۔ اسی طرح محمدؐ کی ذات قدسی صفات کو بھی اس نے کسی خاص گروہ، خاص جماعت اور خاص خطے کے لئے نہیں، بلکہ تمام عالم اور عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ وہ "رب العالمین" ہے تو اس کا رسول "رحمۃ اللعالمین" ہے۔ اس کی پرورش کا دسترخوان دوست اور دشمن سب کے لئے یکساں بچھا ہے۔

"ادیم زمیں سفرۂ عام اوست بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست"

(تو اس کے پیغمبرﷺ کا دامن رحمت بھی دوست دشمن دونوں پر سایہ فگن ہے)۔

الفاظ روایت، حضرت نعمانؓ بن بشیر اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ تم حسب مرضی کھانے پینے کی چیزیں مہیا نہیں پاتے۔ درآں حالانکہ میں نے تمہارے نبی، پیغمبر رسولﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ کے پاس کبھی پیٹ بھر خشک اور رومی کھجوریں بھی نہ ہوتی تھیں۔

اور یہ سب کچھ ان حالات میں تھا کہ مدینہ طیبہ میں تشریف لانے کے بعد قیصر وکسریٰ کے خزانے، بحرین ویمن کی دولت آپ کے سامنے ہر وقت پڑی رہتی۔ غلام وکنیزوں کی بہتات ہوتی اور سونا چاندی پانی کی طرح قدموں میں بہتا پھرتا، مگر آپ نے اپنی چہیتی اولاد کے، اپنے اہل خاندان کے لئے کبھی اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور ہمیشہ دوسروں ہی کو ترجیح دی۔

''خلق عظیم'' میں سے یہ چند اخلاقی نمونے ہیں جو زیب قرطاس ہیں۔ رسالہ اس کا متحمل نہیں ہے کہ تمام اخلاق یا کسی خلق حسن کی تمام جزئیات کا احاطہ کر سکے۔ آپ کی ذات اقدس کے حسن معاملہ، ایثار، مہمان نوازی، سادگی، مساوات، صدقے سے پرہیز، امارت پسندی سے پرہیز، حیا، عزم واستقلال، زہد وقناعت، شفقت ورحمت وغیرہ جیسے اخلاق حسنہ کے بلند اور رفیع نمونے ہزاروں کی تعداد میں کتب سیر اور احادیث صحیحہ میں پائیں گے۔

☆☆

ذکر جمیل

(اس ذات کا جس کی زندگی معجزہ ہے)

● حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی

بارہویں تاریخ مارچ ۲۴ء کی ہے اور بارہویں تاریخ ماہ رمضان ۲ھ کی بھی، کہ مدینہ سے ایک قافلہ ایک بڑی مہم پر نکلا۔ بڑے میدان کی طرف رواں ہے، فاصلہ بھی کچھ ایسا کم نہیں، کوئی چار منزل قافلہ میں آدمی تین سو سے اوپر اور اونٹ کل سو، نتیجہ یہ کہ ایک ایک اونٹ کے حصہ دار تین تین اور سوار ہونا ایک وقت میں دو ہی کے لئے ممکن تھا، اس لئے ایک ایک ساتھی کے لئے تو لامحالہ پیدل چلنا پڑتا اور یہی صورت قافلہ کے سردار کے لئے، یہ صاحب ادھیڑ عمر کے، یہی کوئی ۵۳-۵۴ سال کی عمر کے۔ دونوں ساتھی سن میں چھوٹے دنوں ادب کے ساتھ اور جذبہ اطاعت ووفاداری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ محترم سردار ہم اپنی باری بخوشی بخشتے ہیں، ہم لوگ پیدل بآسانی چل لیں گے، ہمارے بجائے آپ ہی سواری پر تشریف رکھیں، خلوص بھری ہوئی درخواست فدائیوں کی طرف سے تھی، جو سن میں بھی چھوٹے تھے، مگر سنئے کہ محترم آقا کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے۔ ہمارے آپ کے لفظوں میں یہ کہ، حدیث کے الفاظ ''تم دونوں مجھ سے زیادہ قوی تو ہو نہیں پیدل جیسے تم چل سکتے ہو، میں بھی چل سکتا ہوں اور رہا وہ اجر جو پیدل چلنے کی مشقت سے حاصل ہوتا ہے تو اس کے بھی حاجت مند جیسے تم ویسے میں۔''

جواب آپ نے سن لیا، ملک وقوم کے سردار ذی شان آج بیسویں صدی میں بھی جس

آن بان جس کروفر سے سفر کرتے رہتے ہیں اور اس کے نمونے آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں، ذرا ان نمونوں کو سامنے رکھ کر پھر اس سادے سے جواب کو جانچئے، تولئے، پرکھئے اور اس پر جھوم اٹھئے۔ سوال وجواب آپ سمجھ گئے، کس کے کس کے درمیان رہا؟ درخواست پیش کرنے والے تھے، دونوں صحابی فدائیت کی منزلیں طے کئے ہوئے اور جواب دینے والے تھے، ہمارے رسول اکرمؐ اللہ کے پیارے اور ہم سب کے درس ہدایت دے جانے والے، اب دیکھئے تو، اس مختصر سے بول میں کتنا بڑا اسبق دے گئے، شرافت کا، کسر نفس کا، شفقت کا، مساوات کا، اپنی عبدیت کا، اللہ سے اپنے رابطہ وتعلق کا اور اجر آخرت کی طلب وحرص کا۔

اب آپ میدان بدر تو آ ہی چکے ہیں، تو ایک آدھ منظر اور دیکھتے چلئے، ادھر مقابل لشکر قریش ہر طرح ساز وسامان سے لیس، کیا گھوڑے اور کیا اونٹ، کیا زرہ اور کیا تلوار، ہر اعتبار سے اور ادھر مادی بے سروسامانی ہر معیار سے۔ اب رہی تعداد تو ادھر ایک ادھر تین، ادھر تین سو تیرہ، ادھر ایک ہزار۔ اس پر بھی مردانگی اور خود اعتمادی کا یہ عالم کہ سرور وسردار نے مقابلہ کر ہی کے چھوڑا اور رہتی دنیا تک ایک باقی رہ جانے والا نقش ہمت وحوصلہ کا چھوڑ گئے۔

معرکۂ جنگ تو خیر ۱۷ رمضان یوم جمعہ کو صبح گرم ہونا تھا، اس رات میں دیکھنے والے دیکھتے کیا ہیں کہ یہی دلیر وباہمت سردار ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا اپنے رب سے راز ونیاز میں مصروف ہے، چشم گریاں قلب لرزاں، زبان پر الفاظ کچھ اس طرح کے امنڈ امنڈ کر آرہے ہیں:

روایت کے الفاظ، ''الٰہی گر تو نے ان مٹھی بھر بندوں کو ہلاک کر دیا تو پھر اس زمین میں تیری بندگی کبھی نہ ہوگی، الٰہی تو نے وعہدۂ امداد کا مجھ سے کیا ہے تو اسے پورا فرما، الٰہی تیری ہی مدد کی درخواست ہے۔''

تاریخ کا ورق ذرا سا اور الٹئے، سال ہجری اب ۵ ہے اور مہینہ ذی قعدہ کا یکبارگی سارے دشمنوں نے مل کر حریف پر چڑھائی کی ٹھان لی، قریش خود بھی زر وطاقت میں کیا کم تھے، اب کی اپنے ساتھ کے لئے سارے ہی قوت قبیلوں کو توڑ لیا اور پھر ان سب کی کمک پر

قوم یہود، اس ٹڈی دل نے آ کر شہر مدینہ اور اس کے گرد ونواح کو گھیرے میں لے لیا، مقابلہ کے مسلمانوں نے یہ ٹھہرائی کہ شہر سے باہر نکل کر ارد گرد ایک خندق کھودی جائے خندق جنگی اغراض کے لئے باقاعدہ کھدنے کی یہاں مشق ومہارت کس کو تھی، کام رسول کی رہنمائی میں شروع ہوا اور بغیر کسی سفر بنا پلٹن کی امداد کے، کام آپ نے یوں کرایا کہ جیسے کوئی ماہر فن انجینئر اور اب حال یہ تھا کہ خود بھی کدال اور پھاوڑا ہاتھ میں لے کر دوسروں ہی کی طرح کھدائی کر رہے ہیں، جاں نثار صحابی کی نہیں نہیں کے باوجود، پورا شہر محاصرہ میں، باہر سے رسد کی آمد بند، قحط کی سی صورت نمودار ہوگئی بھوک سے نڈھال صحابیوں نے پیٹ پر پتھر باندھ لئے اور اب جو دیکھا تو ان سے زیادہ فاقہ کشی کا عالم خود سرور دو عالمؐ پر طاری ہے، شکم مبارک پر ایک پتھر کے بجائے دو دو پتھر بندھے ہوئے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے، دنیا کی کس فوج کا سالار اپنے ادنیٰ ادنیٰ سپاہیوں کے ساتھ عمل میں مساوات اختیار کرے گا اور مساوات کیسی، یہاں تو صورت سپاہیوں سے بازی لے جانے کی رہی، جو حکمرانوں میں سے زیادہ عادل اور داناؤں کی صفوں میں سب سے بڑا عاقل اور عالموں میں سے بڑا فاضل تھا، وہ مزدوروں کی قطار میں شامل ہو کر بھی ایک فرد کامل نکلا۔

پاک وپاکیزہ مبارک ومتبرک زندگی کا لب ولباب یا عطر جو کہئے ان ہی دو ایک جھلکیوں میں کھنچ آیا، ان کی شرح کرنے پر آیئے یا واقعات کو تفصیل سے ایک ایک کر کے گنایئے تو منٹ اور گھنٹے کیسے، ساری رات تمام ہو جائے اور یہ ذکر جمیل تقریباً بھی تمام ہونے کو نہ آئے۔ اللہ کا حق سب سے زیادہ ادا کرنے والا، اللہ کی محبت میں رگ رگ سے غرق رہنے والا، اللہ کے بندوں میں سے ایک ایک کا حق پہچاننے والا، ہر مظلوم کا ہمدرد، ہر غمگین کا غمگسار، عاجز درماندہ کا دستگیر، ۳۰ اپریل ۶۳۲ء مطابق بارہ ربیع الاول ۱۱ھ اس دنیا کو خیر برکت سے منور کرنے کو مدینہ کی سرزمین سے اپنے مالک ومولا کے حضور میں روانہ ہوگیا، عمر سنہ قمری کے حساب سے ۶۳ سال کی پائی۔

نبوت کے حصہ میں کل ۲۳ سال کی مدت آئی اور اس میں بھی ۱۳ سال کا زمانہ دعوت وموعظت اور ایک بڑی ہی ضدی اور سرکش قوم کی طرف سے مخالفت کی نذر ہوگیا، مسلمان تو خیر اس ذات کو وسیلۂ نجات سمجھتے ہی ہیں اور اس کشمکش میں:

''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں''۔ باقی اس کی امانت ودیانت، عفت، کرامت، شرافت، حسن اخلاق فہم وفراست، تدبیر، جودوسخا، دلیری، مردانگی کی گواہی جس طرح پچھلے منکروں نے دی اسی طرح آج یورپ وامریکہ کے بڑے بڑے فاضل وعاقل دیتے چلے آرہے ہیں اور اس کے نعت گویوں کی فہرست میں دس بیس، سو پچاس، بلکہ سیکڑوں ہندوؤں کے نام نظر آتے ہیں، اس کے نام کا پاک ذکر آج ساڑھے تیرہ سو سال سے ہر روز پانچ پانچ بار دنیا کے گوشے گوشے سے ہوتی چلی آرہی ہے، وہ کل دس سال کی ننھی سی مدت میں دنیا میں عظیم ترین انقلاب برپا کر گیا، اپنے پیچھے ایک منظّم حکومت ۱۲ لاکھ میل مربع پر چھوڑ گیا اور وہ بھی لاکھوں انسانوں کے قتل کے بعد نہیں، ہزار ہا ہزار جانیں لینے کے بعد نہیں، بلکہ حیرت کے کانوں سے سنئے کہ اس کی ساری لڑائیوں میں دوست دشمن سب ملا کر کل جمع ایک ہزار اٹھارہ انسان کام آئے اور دو سو انسٹھ اپنے سات سو انسٹھ دشمن، ابھی تو انسائیکلو پیڈیا برنا ٹیکا گیارہویں صدی ایڈیشن کا بیان ہے کہ دنیا کی مذہبی شخصیتوں میں سب سے کامیاب وہی گزری ہے۔

اور اس کی لائی ہوئی کتاب قرآن مجید کی بابت انسائیکلو پیڈیا کی گواہی ہے کہ روئے زمین پر سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب یہی ہے اور آج جو امت اس کے نام کا کلمہ پڑھتی ہے اس کی تعداد دنیا کے مختلف ملکوں میں ملا کر ساٹھ کروڑ (۱) بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی ساری زندگی کو اگر ایک مستقل اور مسلسل معجزہ نہ کہیے تو آخر اور کیا کہیے۔

(۱) یہ تعداد مصنف کے زمانے کی ہے اس وقت مسلمانوں کی تعداد پوری دنیا میں ایک ارب بیس پچیس کروڑ سے زائد ہے۔ (ادارہ)

سیرت کا پیغام موجودہ دور کے مسلمانوں کے نام

● مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

سب جانتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی دنیا کچھ ویران اور کوئی قبرستان نہ تھی، زندگی کا چکر جس طرح اس وقت چل رہا ہے، بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس وقت چل رہا تھا، سارے کاروبار آج کی طرح ہو رہے تھے، تجارت بھی تھی، زراعت بھی تھی اور حکومت کا نظام چلانے والے اور ان کی مشنری میں فٹ ہونے والے بھی موجود تھے، اس وقت کی دنیا کے لوگ اس زندگی پر بالکل قانع اور مطمئن تھے اور ان کو اس میں کسی ترمیم یا اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنی زمین کا نقشہ اور دنیا کی یہ حالت بالکل پسند نہ تھی۔ حدیث میں اس زمانہ کے متعلق ہے، روایت کے الفاظ، ''اللہ تعالیٰ نے اہل زمین پر نظر ڈالی اس نے روئے زمین کے تمام باشندوں کیا عرب کیا عجم سب کو بے حد ناپسند فرمایا اور وہ ان سے بیزار تھے۔ سوائے اہل کتاب کے چند افراد کے۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ساتھ ایک پوری قوم کے ظہور کا سامان کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کو کسی ایسے مقصد کے لئے پیدا کیا، جو دوسری قوموں سے پورا نہیں ہو رہا تھا، جو کام وہ سب پورے انہماک اور شوق کے ساتھ انجام دے رہے تھے، اس کے لئے ظاہر ہے کہ کسی نئی امت کو پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی اور انسانی زندگی کے اس پرسکون سمندر میں اس نئے طلاطم کی حاجت نہ تھی، جو مسلمانوں کے وجود سے ظہور میں آیا اور جس نے زمین میں ایک زلزلہ ڈال

دیا، اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ تسبیح وتقدیس کے لئے ہم نیازمند بہت کافی تھے۔ اس کے لئے اس خاکی پتلا کو پیدا کرنے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "**انی اعلم ما لا تعلمون**" گویا ارشاد فرمایا (اور آگے چل کر واضح کر دیا) کہ آدم علیہ السلام صرف اسی کام کے لئے پیدا نہیں ہوئے، جو ملائکہ انجام دے رہے تھے۔ ان سے خدا کو کچھ اور کام لینا ہے۔

اگر مسلمان صرف تجارت کے لئے پیدا کئے جا رہے تھے، تو مکہ ان تاجروں کو جو شام ویمن کا تجارتی سفر کیا کرتے تھے اور مدینہ کے ان بڑے بڑے یہودی سوداگروں کو جن کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے، یہ پوچھنے کا حق تھا کہ اس خدمت کے لئے ہم گنہگار کیا کم ہیں، کہ اس کے لئے ایک نئی امت پیدا کی جا رہی ہے۔ اگر زراعت مقصود تھی تو مدینہ، خیبر، طائف اور نجد کے، شام اور یمن اور عراق کے کاشت کاروں اور زراعت پیشہ آبادی کو یہ پوچھنے کا حق تھا کہ کاشت کاری اور زراعت میں ہم محنت وکوشش کا کون سا دقیقہ اٹھا رکھتے ہیں، کہ جس کے لئے ایک نئی امت کی بعثت ہو رہی ہے، اگر دنیا کی چلتی ہوئی مشنری میں صرف فٹ ہونا تھا اور حکومت کے نظم ونسق اور دفتری کاروبار کو لے کر چلانا تھا تو روم وایران کا کارپرداز سلطنت کو یہ کہنے کا حق تھا کہ اس فرض کی انجام دہی کے لئے ہم بہت ہیں اور ہمارے بہت سے بھائی بے روزگار ہیں، اس کیلئے نئے امیدواروں کی کیا ضرورت تھی۔

لیکن درحقیقت مسلمان بالکل ہی ایک نئے اور ایسے کام کے لئے پیدا کئے جا رہے تھے، جو دنیا میں کوئی نہ انجام دے رہا تھا اور نہ دے سکتا تھا۔ اس کے لئے ایک نئی امت کی بعثت کی ضرورت تھی چنانچہ فرمایا:

"**کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر و تومنون بالله**"۔

(تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے

روکتے اور اللہ پر ایمان لاتے ہو)۔ (آل عمران ۱۱۰)

اسی مقصد کی خاطر لوگ وطن سے بے وطن ہوئے اپنے کاروبار کو نقصان پہنچایا، اپنا عمر بھر کا اندوختہ لٹایا، اپنی جمی جمائی تجارتوں پر پانی پھیرا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کیا۔ اپنے عیش وتنعم کو خیرباد کہا، دنیا کی تمام کامیابیوں اور حالتوں سے آنکھیں بند کر لیں اور زریں موقع کھو دئے، پانی کی طرح اپنا خون بہایا اور بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کیا، ان مقاصد ومشاغل کے لئے جن پر آج مسلمان قانع نظر آتے ہیں۔ ایسے ہنگامہ آرائی اور محشر خیزی کی ضرورت نہ تھی اس کے حصول کا راستہ تو بالکل بے خطر اور ہموار تھا اور اس راستہ پر معاصر دنیا سے کوئی بڑی کشمکش اور تصادم نہیں تھا اور نہ یہ اہل عرب اور دنیا کی دوسری قوموں کے لئے وجہ شکایت تھی۔ انہوں نے تو بار بار انہیں چیزوں کی پیش کش (جو آج عام مسلمانوں کا منتہا ہے) اور ہر بار اسلام کے داعی نے ان کو ٹھکرا دیا، دولت وسرداری، عیش وعشرت اور راحت وتن آسانی کی بڑی پیشکش کو نامنظور کیا، پھر اگر مسلمان کو اسی طرح پر آجانا تھا جس پر زمانہ بعثت کی تمام کافر قومیں تھیں اور اس وقت بھی دنیا کی تمام غیر مسلم آبادی ہے اور زندگی کے انہیں مشاغل میں منہمک اور سرتاپا غرق ہو جانا تھا، جن میں اہل عرب اور رومی وایرانی ڈوبے ہوئے تھے اور انہیں کامیابیوں کو اپنا منتہائے زندگی بنا لینا تھا جن کو ان کے پیغمبر ﷺ ان کے بہترین موقع پر رد کر چکے تھے تو یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر پانی پھیر دینے کے مترادف ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ انسانوں کا وہ بیش قیمت خون جو بدر وحنین اور احزاب اور قادسیہ ویرموک میں بہایا گیا بے ضرورت بہایا گیا۔

آج اگر سرداران قریش کو کچھ بولنے کی طاقت ہو تو مسلمانوں کو خطاب کر کے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم جن چیزوں کے پیچھے سرگرداں ہو اور جن چیزوں کو تم نے اپنا حاصل زندگی سمجھ رکھا ہے انہیں چیزوں کو ہم گنہگاروں نے تمہارے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سامنے پیش کیا تھا۔ وہ تمام چیزیں اس وقت خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حاصل ہو سکتی تھیں۔ تو ایک

ساری جدوجہد کا حاصل اور ان تمام قربانیوں کی قیمت وطرز زندگی ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے اور زندگی واخلاق کی وہی سطح ہے جس پر تم نے قناعت کرلی ہے۔ اگر ان سرداران قریش میں سے جو اسلام کے حریف تھے، کسی کو جرح کرنے کا موقع ملے تو آج ہمارا کوئی بڑے سے بڑا لائق وکیل بھی اس کا تشفی بخش اور مسکت جواب نہیں دے سکتا اور امت کے لئے اس پر شرمندہ ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں، رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں کے متعلق یہی خطرہ تھا کہ وہ دنیا میں پڑ کر اپنا مقصد نہ بھول جائیں اور دنیا کی عام سطح پر نہ آجائیں، آپ نے وفات کے قریب جو تقریر فرمائی اس میں مسلمانوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

''تمہارے بارے میں کچھ فقر وافلاس کا خطرہ نہیں ہے، مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں تم کو بھی وہی کشائش نہ حاصل ہو جائے جیسی تم سے پہلے لوگوں کو حاصل ہوئی، تو تم کو بھی اسی طرح ہلاک کردے جیسے ان کو ہلاک کیا۔'' (بخاری ومسلم)

مدینہ کے انصاریوں نے جن سے اس بات کا ارادہ کیا کہ جہاد کی مشغولیت اور سال کی جدوجہد سے کچھ دنوں کی فرصت حاصل کر کے اپنے باغوں اور کھیتوں کے کاروباروں کو درست کرلیں۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں مجھے ڈرانے دھمکانے کے لئے وہ کچھ کیا گیا کہ کسی دوسرے کے لئے نہیں کیا گیا۔

اللہ کی راہ میں مجھے اتنا دکھ دیا گیا کہ کسی دوسرے کو نہیں دیا گیا۔

اور مجھ پر تیس دن رات (مسلسل) ایسے گذرے کہ میرے اور بلالؓ کے لئے کوئی ایسا کھانا مہیا نہیں ہوسکا جسے جاندار کھاتے ہوں۔ بجز اس شئے کے جسے (جسے پوٹلی بنا کر) بلالؓ اپنی بغل میں دبا لیتے۔'' بہ روایت حضرت انسؓ، مشکوٰۃ، جلد۲ - کتاب الرقاق۔

☆☆

پیغمبر اسلام کا پیغام امن

● حضرت مولانا زین العابدین سجاد میرٹھی

فتنہ وفساد کی ان اندھیری گھٹاؤں میں، جبکہ افق پر کوئی ستارۂ امید نظر نہیں آتا، ظلم وطغیان کی ان ہولناک موجوں میں جبکہ کشتی مراد پاش پاش ہوکر آخری ہچکولے کھا رہی ہے، نومیدویاس کے ان جھکڑوں میں جب کہ گلشنِ آرزو کی آخری کلیاں بھی بکھر گئی ہیں، آپ کو زمانہ جاہلیت کا صحیح تصور کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آئے گی۔ آیئے تاریخ کی سوئی کو چودھ سو سال پیچھے لے چلتے ہیں۔

دنیائے جاہلیت:

یہ ایران ہے۔ یہاں فحاشی وزناکاری جزو دین بنا دی گئی ہے۔ ''دین مزدکی'' نے عصمت وعفت کی چادر انسانیت کے چہرہ سے اتار پھینکی ہے۔ عوام کی بہو بیٹیوں کی عزت امراء کی شہوت پرستی کے ہاتھوں کا کھلونا بن رہی ہے۔ یہ یونان ہے، یہاں غلاموں کو انسانیت کے ابتدائی ''حق زندگی'' سے بھی محروم کردیا گیا ہے۔ آقاؤں کی پیشانی پہ ہر شکن ان کے لئے زنجیر پا بن سکتی ہے۔ ذرا ذرا سے قصوروں پر بپھرے ہوئے شیروں کے سامنے ڈال دینا اور غلاموں کی ہڈیوں کے گوشت سے جدا ہونے کا منظر دیکھنا، ارکانِ حکومت کا ایک دلچسپ تماشا ہے، کمزور بچوں کو بھی یہاں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ پہاڑ کی چوٹی سے غار کی گہرائی تک ان کی منزل زندگی کو مختصر کردیا گیا ہے۔

یہ ہندوستان ہے۔ یہاں انسان کو چار ذاتوں میں تقسیم کر کے حقوق انسانیت کو صرف تین ذاتوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ بیچارہ اچھوت مذہبی کتابوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا اور عبادت گاہوں میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔

یہ ارضِ فلسطین ہے۔ یہاں یہودیوں نے ''نحن ابناء الله و احباء ہ'' کا نعرہ لگایا ہے۔ بنی اسرائیل ہی ان کے زعم میں خدا کے لاڈلے بیٹے ہیں اور کسی کو اس کے فضل وکرم کے سفرۂ عام سے ایک ریزہ اٹھانے کی بھی اجازت نہیں۔

پھر اصولِ انسانیت کی اس تحقیر اور اخلاق ومدنیت کی اس تذلیل ہی پر بس نہیں، بلکہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ انسان کے وجود ہی کو ختم کر دیا جائے۔ ارضِ فلسطین یہودیوں اور عیسائیوں کے خون سے لالہ زار ہو رہی ہے۔ نصرانی حکومت یہودیوں کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔ اس نے یہودیوں کا ملی وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کو یہ اجازت نہیں کہ اپنے شعائر مذہبی کو آزادانہ انجام دے سکیں۔ یہودیوں نے شہر 'صور'' کا محاصرہ کر کے ہزاروں عیسائیوں کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ''جنگ روم وایران'' میں ایرانیوں کے ہاتھوں قید ہونے والے اسی ہزار عیسائی قیدیوں کو خرید کر ان کے خون سے اپنی آتش انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو سرد کر دیا ہے۔ (محمد المثل الکامل جاء مولیٰ بک المصری)

مدائن سے قسطنطنیہ تک کی سرزمین وقت کی دو سب سے بڑی شہنشاہیتوں کی جوع الارض کا لقمہ بنی ہوئی ہے۔ تہذیب پامال ہو رہی ہے۔ شرافت سر پیٹ رہی ہے۔ انسانیت خون کے آنسو رو رہی ہے، مگر شہنشاہیت کا سر پرغرور اونچا ہو رہا ہے اور وہ ان بربادیوں کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے، آبادیاں اجڑ رہی ہیں، گھر لٹ رہے ہیں، کھیتیاں پامال ہو رہی ہیں، مگر انسانوں کی کھوپڑیوں پر قصر قیصری وایوان کسروی کی شاندار بنیادیں اٹھائی جا رہی ہیں۔

''عرب'' سرزمین حرم کا حال نہ صرف یہ کہ بہتر نہیں، بلکہ سب سے بدتر ہے۔ ایام

الحرب کا ایک سلسلہ ہے، جو خون کی موجوں کی طرح سارے جزیرہ میں پھیلا ہوا ہے۔ جنگ وجدال، قتل وخون، سلب ونہب مایۂ فخر وناز ہے۔ امن واطمینان، آرام وسکون باعث شرم وعار، قمار بازی فخر کی بات ہے، شراب نوشی عزتِ نفس کی دلیل ہے، زنا کاری قابل تحسین کارنامہ ہے، معصوم بچیوں کو زندہ درگور کر دینا عظمت وشرافت کا ثبوت ہے۔

ادب جاہلی کی شہادت:

اگر یہ صحیح ہے کہ ہر زمانہ کا لٹریچر، اس زمانہ کی تہذیب واخلاق کا آئینہ ہوتا ہے، تو سنئے! بنی قیس بن ثعلبہ کا ایک شاعر کہتا ہے:

انا محیوک یا سلمیٰ فحیینا
وان سقیت کرام الناس فاسقینا

(اے سلمیٰ (معشوقہ شاعر) ہم تجھے سلام کرتے ہیں، تو بھی ہمیں سلام کر اور اگر تو سرداران قوم کی تواضع شراب سے کرتی ہے، تو ہمیں بھی شراب پلا)

ایک دوسرا شاعر جھوم کر کہتا ہے:

الا ھبی بصحنک فاصبحینا
ولا تبقی خمود الا ندرینا

(ہاں اپنا شراب کا پیالہ لے اٹھ اے محبوبہ اور ہمیں صبوحی پلا اور دیکھ شرابوں میں سے کوئی باقی نہ رکھ)

ایک اور شاعر ابوکبیر ہذلی فخریہ یہ بیان کرتا ہے:

ھمن حملن بہ وھن عواقد
حبک النطاق فشب غیر بھیل

(میں ان جوانوں میں سے ہوں، جن کی ماؤں سے زبردستی ہم بستری کی گئی۔ لہٰذا وہ

جوان ہوئے، اس حال میں کہ چھریرے بدن کے ہیں)

اور رئیس الشعراء امراء القیس نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ومثلک حبلیٰ قد طرقت ومرضع

فالھیتھا عن ذی تمائم محول

(اور تجھ جیسی بہت سی حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں ہیں، جن کے پاس میں رات کے آخری حصے میں پہنچا اور انہیں اپنے شیر خوار بچوں سے غافل کر دیا)

وہ اک بنی یمثل مازنی اپنی ہوس جنگ کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

اذا استنجدوا لم یسالو من دعاھم

لایۃ حرب ام بای مکان

(میں ان بہادروں میں سے ہوں، جب کوئی ان سے مدد مانگتا ہے، تو وہ یہ نہیں پوچھتے کہ کس جنگ کے لئے اور کہاں)

حصین بن ہمام مری کہتا ہے:

نفلق ھاما من رجال اعزۃ

علینا وان کانوا اعق واظلما

(ہم ذی عزت لوگوں کے سروں کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں اگر چہ وہ بڑے ظالم وجابر ہوں)

بنی عقیل کا ایک شاعر اپنے عزیزوں کو خطاب کر کے کہتا ہے:

ونبکی حین نقتلکم علیکم

ونقتلکم کانا لانبالی

(ہم تمہیں قتل کر دینے کے بعد تم پر روتے ہیں، مگر جب قتل کرتے ہیں، تو کوئی پروا نہیں کرتے)

سوار بنی مضرب سعدی کہتا ہے:

وانی لا ازال اخا حروب

اذا لم اجن کنت مجن جان

(میں ہمیشہ لڑائیوں میں گھرا رہتا ہوں۔ اگر خود ظلم نہیں کرتا، تو ظالموں کی سپر بن جاتا ہوں)۔

ندائے صفا:

ظلم وستم، جور وجفا، قتل وغارت، سلب ونہب، عیاشی وفحاشی، عشرت پسندی وشہوت پرستی کی اس دنیا میں یکا یک ایک صدائے حق بلند ہوتی ہے۔ خداوند قدوس کا ایک مقدس بندہ ''حراء'' کی خلوت راز سے باہر آتا ہے اور صفا کی چوٹیوں پر کھڑے ہو کر اعلان کرتا ہے:

''یا ایُّھَا النَّاس اِتَّقُوْ رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْس واحد و خَلَقَ مِنھَا زَوجھَا وَبث مِنھُمَا رجالا کثیرا ونساءَ.''

اے افراد نسل انسانی، تم (اخوت ومحبت کے رشتہ کو توڑتے ہو)

(اپنے اس پروردگار سے ڈرو، جس نے تم سب کو ایک اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔ پھر ان دونوں کی نسل سے گروہ در گروہ مرد اور عورتیں پیدا کیں۔ جو سطح ارضی کے مختلف حصوں میں پھیل گئیں)۔

جب تمہارا پیدا کرنے والا ایک ہے، تمہاری اصل ونسل ایک ہے، تمہاری حقیقت وماہیت ایک ہے، تو پھر ملک وطن کی حد بندی سے رنگ وروپ کے فرق سے، غربت وامارت کے امتیاز سے یہ تزاحم وتصادم کیوں؟۔

اس آیت کے ذیل میں صاحب ''روح البیان'' لکھتے ہیں:

تقویٰ کے حکم کو جو اس واقعہ پر مرتب کیا گیا، تو اس واسطے کہ یہاں انسانوں کو اپنے

اہل خاندان اور اپنے ابناء جنس کے حقوق کی حفاظت کے بارے میں خداوند جل وعلیٰ سے ڈرنے کا حکم دینا تھا اور اس واقعہ کو اس کی تمہید بنانا تھا۔ گویا کہ یہ فرمایا گیا:

''اے انسانو! جس پروردگار نے تم سب کو ایک سلسلہ میں جکڑ دیا ہے اور ایک جڑی کی مختلف شاخیں بنا دیا ہے، اس پروردگار سے تعلقات باہمی کے حقوق کی ذمہ داری کے بارے میں ڈرو۔ ان حقوق کا پورا پورا خیال رکھو اور ان سے غافل نہ ہو۔'' (روح البیان دوم ص ۱۵۹)

پھر چونکہ خطاب تمام کائنات انسانیت سے کرنا تھا اور سب کو ایک اخوت انسانیہ کے رشتہ میں جکڑنا تھا۔ لہٰذا قرآن کریم نے ''**نفس واحدة**'' فرمایا: آدم نہیں فرمایا: اس لئے کہ مختلف اقوام وملل کے درمیان انسانی گھرانے کے جد اعلیٰ کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ یہود اور جمہور اسلام نسل انسانی کی ابتدا آدم علیہ السلام سے مانتے ہیں۔ بعض دوسری قومیں دوسری شخصیتوں کا نام لیتی ہیں۔ مثلاً اہل ہند برہما کو زنجیر انسانیت کی پہلی کڑی بتاتے ہیں۔ حکماء مغرب چند اصولوں کو خاندانِ انسانیت کا مبداء قرار دیتے ہیں۔ (تفسیر المنار سورۃ النساء)

بہر حال اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ ''حقیقت انسانیت'' تمام انسانوں کے درمیان مشترک ہے۔ لہٰذا قرآن کریم اس وحدت حقیقت ہی کی طرف متوجہ کر کے ان سے باہمی الفت ومحبت کا مطالبہ کرتا ہے اور کسی شخصیت کا تعین کر کے دعوت اخوت کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔ پھر اس نے بتایا کہ تم معرفت وشناخت کی آسانی کے لئے خاندانوں اور کنبوں کی حد بندیاں قائم رکھ سکتے ہو، مگر انہیں کسی طرح عزت وذلت، برتی وکمتری کا معیار نہیں بنا سکتے۔ عزت وذلت اور برتری وکمتری کا معیار تو صرف ایک ہے اور وہ ہے تقویٰ وپرہیزگاری کی زندگی اور بس!

''**وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ.**'' (**سورة الحجرات**).

(تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لئے تقسیم کر دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، ورنہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)۔

اس نے اعلان کر دیا کہ اگر حقیقی بلندی وبرتری کی تمنا ہے، تو اس کا طریقہ صرف ایک ہے اپنے معبود حقیقی کے سامنے نیاز مندانہ جھک جاؤ۔ اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرو۔ اس کے کمزور اور ستم رسیدہ بندوں کی مدد کرو اور برائی کو بھلائی کے ساتھ دفع کرو۔

والذين صبروا ابتغاء وجهه ربهم واقاموا الصلٰوة وانفقوا مما رزقنهم سرا وعلانية ويدرؤن بالحسنة السيئة اولٰئك لهم عقبى الدار.

اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ہر تکلیف پر صبر کیا، نمازوں کو ان کے آداب کے ساتھ ادا کرتے رہے اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا اس میں سے کچھ پوشیدہ وعلانیہ ہماری راہ میں خرچ کرتے رہے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے رہے تو یاد رکھو یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کا بہتر ٹھکانہ ہے۔

اس نے دشمنوں کے ساتھ بھی محبت کا سلوک کرنے کا حکم دیا اور بتایا کہ اگر کوئی ایسا کر سکے تو یہ نیکی وسعادت مندی کا اونچا مقام ہے:

''**ولا تستوى الحسنة ولا السيئة ادفع بالتى هى أحسن فاذا الذى بينك وبينه عداوة كأنه ولى حميم، وما يلقها الا الدين صبروا وما يلقها الا ذو حظ عظيم.**''

(نیکی اور بدی کا درجہ برابر نہیں ہو سکتا۔ برائی کا جواب اچھائی کے ساتھ دو۔ اگر تم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو تم دیکھو گے کہ اچانک تمہارا دشمن تمہارا دلی دوست بن گیا ہے۔ البتہ انسانیت کے اس بلند مقام پر وہی پہنچ سکتا ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھے اور جس کی قسمت میں نیکی وسعادت کا حظ عظیم ہو)۔

اس نبی رحمت ﷺ نے ظلم وشقاوت کی دنیا کو امن وسعادت کا گہوارہ بنانے کے لئے دنیا میں بدامنی وخونریزی کے جو اسباب ہو سکتے ہیں، ایک ایک کر کے ان کو ختم کیا۔

شہنشاہیت:

دنیا میں فتنہ وفساد کا بڑا سرچشمہ ''شہنشاہیت'' رہا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ قصر شاہی کی آبادی کی رونق کے رعیت کی جھوپڑیاں ہمیشہ اجڑتی رہی ہیں۔ خدا کی زمین اس کے بندوں کے خون سے اس لئے سیراب ہوتی رہی ہے، تاکہ بادشاہوں کا نخل آرزو برگ وبار لائے۔ پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے سب سے پہلے فتنہ کی اس جڑ کو صاف کیا۔

''**ولا یتخذ بعضنا اَربابا مِن دون اللّٰہ.**''

(اور خدا کو چھوڑ کر، ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا پروردگار قرار نہ دے۔ دنیا خدا کا ملک ہے اور حکم بھی یہاں خدا ہی کا جاری ہوگا)۔

''**لم یکن لہ شریک فی الملک ان الحکم الا اللہ.**''

(آپ ہمارے سردار ہیں۔ تو آپ نے جواب دیا: **السید اللہ تبارک وتعالیٰ** سردار تو اللہ تبارک وتعالی ہے)۔

اس پر ان لوگوں نے عرض کیا: بہر حال شرف وعزت میں تو آپ ہم سے بلند وبرتر ہیں ہی، تو آپ نے جواب دیا: ہاں یہ تم کہہ سکتے ہو۔

اسی لئے اس وقت کی شہنشاہیت کے مظہر اتم اور آقائیت کے مجسمہ کامل ''کسریٰ'' کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: **اذا مات کسریٰ لا کسریٰ بعدہ.** اس خاندان کسروی کے بعد اب اور کسریٰ نہ ہوگا۔

سرمایہ داری:

سرمایہ داری بھی امن عالم کے لئے بڑا فتنہ رہ ہے۔ ساہوکاروں کی مجلس نشاط کا

ساغر احمر میں ہمیشہ غریبوں اور مزدوروں کے خون سے تیار ہوتا رہا ہے۔ پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے زبان وحی ترجمان سے انسانی سوسائٹی کا ایسا نقشہ کھینچا، جس میں ہر انسان کو خدا کے پیدا کئے ہوئے وسائل معیشت سے استفادہ کا موقع دیا گیا اور جد وجہد کے بعد جو کچھ حاصل ہوا، اس میں اس کا حق ملکیت وانفاق بھی تسلیم کیا گیا، مگر طرق واکتساب وانفاق پر ایسی پابندیاں عائد کر دیں جس سے دولت چند افراد کا سرمایہ بن کر نہ رہ جائے۔

''**کَیْ لاَ یَکُوْنَ دَوْلَۃً بَیْنَ الاغنیاءِ مِنْکُمْ.**'' یہ اس لئے کیا گیا تاکہ دولت تمہارے سرمایہ داروں میں ہی گردش کرتی نہ رہ جائے۔ جو لوگ اسلام کے اس عادلانہ نظام معیشت سے بغاوت کریں، اس کے ممنوعہ طریقوں سے دولت جمع کریں، ذاتی تعیش وتنعم پر اسے خرچ کریں اور سوسائٹی کے محتاج وضرورت مند طبقہ کو اس سے محروم رکھیں، ان کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا اور ان کو عذاب الیم کی بشارت دی گئی۔

''**والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم.**''

(جو لوگ چاندی سونے کے ذخیرے جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں عذاب الیم کی بشارت دے دیجئے)۔

''**اِنَّ المبذرین کانوا اِخوانَ الشیٰطین.**'' بے محل دولت کا استعمال کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

سرمایہ داری کے دو بڑے مظاہر ساہوکاری اور جاگیرداری ہیں۔ اسلام نے احتکار اکتناز اور اس کے وسائل سود، قمار وغیرہ کو ممنوع قرار دے کر اور وراثت، زکوۃ، عشر وغیرہ تقسیم دولت کی صورتوں کی لازمی قرار دے کر ان دونوں کے پنپنے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔

وطینت:

وطینت بھی ہمیشہ سے ایک ایسا بت رہی ہے، جس پر ہزار ہا انسانوں کے سروں کے چڑھاوے چڑھتے رہے ہیں۔ ''جرمنی'' جرمنوں کے لئے ہے، انگلستان انگریزوں کے لئے ہے، ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے ہے۔ یہ ایسے نعرے ہیں کہ آج بھی جن سے دنیا کی فضا گونج رہی ہے۔ اگر ان نعروں کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی طاقتور قوموں کو یہ حق نہیں کہ وہ کمزور قوموں کے اسباب حصول دولت پر اپنی طاقت کے بل بوتے پر قابض ہوجائیں تو یہ نعرے درست ہیں، لیکن اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ ملک اور وطن کے نام پر خدا کی مخلوق میں منافرت پیدا کی جائے اور خدا کے بندوں کو اس کی پیدا کی ہوئی زمین کے کسی حصہ سے جائز طریقوں سے فائدہ اٹھانے سے روکا جائے، تو اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کا اعلان یہ ہے:

"لافضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی أسود کلکم من آدم وآدم من تراب."

(عربی النسل کو عجمی النسل پر اور سرخ رنگ والے کو کالے رنگ والے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدمؑ کا مایہ خمیر مٹی ہے)۔

"لیدع رجال فخرھم باقوام انما ھم فحم من فحم جھنم."

(لوگ اپنی قوموں پر فخر کرنا چھوڑ دیں۔ ایسا کرنے والے جہنم کا کوئلہ بنیں گے)۔

"لیس منا من دعا الی عصبیة ان الارض للہ." (وہ ہم میں سے نہیں، جس نے عصبیت کا نعرہ لگایا، زمین اللہ ہی کی ہے)۔

"وجعلنا لکم فیھا معایش." (ہم نے تم سب کے لئے زمین میں سامان معیشت پیدا کردئے ہیں)۔

مذہبی منافرت:

مذہب کے نام پر بھی، جو دنیا میں امن وصلح کا پیغام ہونا چاہئے، جنگ وجدل کے نعرے بلند ہوتے رہتے ہیں۔ بعثت محمد ﷺ کے وقت بھی فضا ان نعروں سے گونج رہی تھی۔ بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ ''ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر خدا کی آواز کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی تھی۔ ان کے نزدیک پریشر صرف پاک آریہ ورت کے باشندوں کی بھلائی چاہتا تھا۔ خدا کی رہنمائی کا عطیہ صرف اسی ملک اور یہیں کے بعض خاندانوں کے لئے محفوظ تھا۔ زردشت خاک ایران کی پاک نژاد کے سوا اور کہیں خدا کی آواز نہیں سنتا تھا۔ بنی اسرائیل اپنے خاندانوں سے باہر کسی رسول اور نبی کی بعثت اور ظہور کا حق نہیں سمجھتے تھے۔ یہ پیغام محمدیؐ ہی ہے، جس نے پورب، پچھّم، اتر، دکھن ہر طرف خدا کی آواز سنی اور بتایا کہ خدا کی رہنمائی کے لئے ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں۔ اس کی نگاہ میں فلسطین، ایران، ہندوستان اور عرب سب برابر ہے۔ ہر جگہ اس کے پیغام کی بانسری اور ہر طرف اس کی رہنمائی کا نور چمکا۔''

قرآن کریم نے اس زمانہ کے ارباب مذہب کے یہود وغرب کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

''وَقَالَتِ الْیَھُودُ لَیسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ وَقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَھُوْدَ عَلٰی شَیءٍ وَھُمْ یَتْلُونَ الْکِتٰبَ ط کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِھِمْ.''

(یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا دین بے بنیاد ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا دین بے اصل ہے، حالانکہ دونوں کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور وہ اسے پڑھتے ہیں۔ ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی جو مقدس کتابوں کا علم نہیں رکھتے)۔

پھر حکم دیا گیا کہ پیغام محمد ﷺ کے قبول کرنے والوں کے لئے تمام پچھلے پیغمبروں اور

ان کے صحیفوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس اقرار کے بغیر کوئی شخص مسلم نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔

"اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ."

(پھر خدا کے ان مقدس بندوں میں نبی ہونے کا لحاظ سے کسی قسم کا فرق کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی):

"کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰئِکَتِہٖ وَرُسُلِہٖ لاَ نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ." (محمد ﷺ اور ان پر ایمان لانے والے) سب ایمان لاتے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اقرار کیا کہ ہم اس کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے)۔

قرآن کریم نے اعلان کردیا کہ شمع نبوت کی یہ روشنی، جو عرب کے ذروں کو جگمگا رہی ہے، کوئی نئی روشنی نہیں، بلکہ مختلف عہدوں میں یہی روشنی زیتون کے مرغزاروں کو اور ہمالیہ کے کساروں کو بھی روشن کرچکی ہے اور اب "پیغام محمدی" کے نظر افروز فانوس میں ساری دنیا کو دعوتِ تماشا دے رہی ہے اور جمال حقیقت اور چشمِ شوق کے درمیان کوئی پردہ باقی نہیں چھوڑ رہی۔

بے شک آفتاب نبوت اپنی عالم افروز اور جہاں تاب کرنوں کو دنیا کے چپہ چپہ میں بکھیرتا ہوا طلوع ہو چکا ہے۔ اس لئے ڈوبے ہوئے چاند اور تاروں سے رہنمائی کی جستجو بے کار ہے:

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الاسلام." (درحقیقت دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے)۔

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

تاہم آفتاب کا کام یہ ہے کہ وہ اندھیرے کو دور کردے اور دنیا کو روشنی سے معمور کردے، لیکن اگر کوئی چادر میں منہ چھپا کر بیٹھ جائے اور روشنی سے فائدہ اٹھانا پسند نہ

کرے، تو اس کی چادر کو کھینچ کر اتار پھینکنا آفتاب کا کام نہیں۔

نور اسلام نے اپنی ظلمت پاش شعاعوں سے حق وبال، معروف ومنکر، طاقت ومعصیت، عدوظلم میں امتیاز پیدا کردیا۔ ہر شخص کے لئے جس کو دیدۂ بصیرت حاصل ہے اب یہ ممکن ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کی شاہراہ پر چل کر منزلِ حقیقت کا سراغ پالے، لیکن اگر کوئی عقل کا اندھا کفر وطغیان کی گھاٹیوں میں ہی ٹامک ٹوئیاں مارنا پسند کرے، تو اس پر کوئی جبر نہیں:

"لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ." (دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ کیونکہ حق اور باطل میں کھلا امتیاز قائم ہو چکا ہے)۔

"اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اھْتَدٰی فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْھَا وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ." (سورة الزمر: آیت نمبر: ۴۱).

(ہم نے یہ کتاب لوگوں کی ہدایت کے لئے آپ پر سچائی کے ساتھ اتاری ہے۔ سو جس کسی نے راہِ ہدایت قبول کی تو اپنے فائدے کے لئے اور جس کسی نے گمراہی اختیار کی تو اپنے نقصان کے لئے اور اے پیغمبر! آپ ان کے ذمہ دار نہیں)۔

ایک اور جگہ رسول اکرم ﷺ کے جوشِ دعوت کی مزاحمت کی جاتی ہے:

"ولو شاء ربک لآمن فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین."

(ہاں البتہ اگر کوئی فرد یا گروہ صداقت کی اس روشنی ہی کو گل کردینا چاہے، یا دوسرے کو اس سے جبراً استفادہ نہ کرنے دے، تو بے شک اس کی مزاحمت کی جائے گی۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی آنکھیں بند کرلے اور ٹھوکر کھا کر گر پڑے مگر دوسروں کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کا حق کسی کو نہیں)۔

"یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون."

(کافر چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو منہ سے پھونکیں مار مار کر بجھا دیں، مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافر اسے پسند نہ کریں)۔

انتقام در انتقام:

انتقام در انتقام کا ذکر بھی ہمیشہ دنیا میں خون کے طوفان برپا کرتا رہا ہے۔ خود جزیرۃ العرب بعثت محمدی سے پہلے اس طوفان کی موجوں میں گھرا ہوا تھا۔ چراگاہوں میں، میلوں میں یا شاعروں کی مجلس میں کسی بات پر جھڑپ ہو جاتی تھی تو سیکڑوں تلواریں نیام سے تڑپ کر نکل آتی تھیں اور پھر برسوں اور قرنوں تک ان کی برق افشانی جاری رہتی تھی۔

انتقام کے اس مجنونانہ جذبے میں مجرم و غیر مجرم اور حق و ناحق کا کوئی فرق باقی نہ رہتا تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ خدا کی مخلوق کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کا فیصلہ خدا ہی کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حکومت کے ذریعہ ہونا چاہیے، جو اس قانون کے نفاذ کے لئے قائم ہوئی ہو۔

"اِنِ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰه." (حکومت اور فیصلہ کا حق صرف خدا ہی کو حاصل ہے)۔

ایسی حکومت کے اربابِ بست و کشاد کے یہ اوصاف بیان فرمائے گئے:

"الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر." (۲۲:۴۱)

قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کا کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی حق نہیں دیا گیا۔ چنانچہ جب اسلام کے نامور خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ کو ابولؤلؤ نامی ایک غلام نے جفینہ نصرانی اور ہرمزان پارسی کے سازش سے شہید کر دیا اور جوشِ غضب میں وارفتہ ہو کر عبداللہ بن عمر نے اپنے باپ کے انتقام میں ہرمزان کو تہ تیغ کر دیا، تو قائم مقام خلیفہ حضرت صہیب کے حکم سے انہیں فوراً گرفتار کر لیا گیا اور جب تک ان کی طرف سے دیت ادا نہ کر دی گئی رہائی

نہ ہو سکی۔

پھر ایک عام حکم دیا گیا کہ دشمن ہوں یا دوست، اپنے ہوں یا غیر، مسلمانوں کو چاہیے کہ کسی سے بھی برتاؤ کرتے وقت عدل و انصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑیں:

"ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی."

(کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس سے بے انصافی پر آمادہ نہ کر دے۔ عدل کو ہاتھ سے نہ جانے دو کہ وہ پرہیزگاری زیادہ قریب ہے)۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہر شخص قانون کے دائرہ میں رہ کر قانون کے ذریعہ جو زیادتی اس پر کی گئی ہے، اس کا بدلہ لے سکتا ہے:

"فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل مااعتدی علیکم."

(جو تم پر زیادتی کرے، تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو جتنی اس نے تم پر کی ہے)۔

پھر بھی عفو درگزر اور مرحمت و مغفرت کا درجہ بلند ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بڑا اجر ہے۔

"ولمن صبر وغفران ذلک لمن عزم الامور."

(اور درحقیقت جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو بے شبہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے)۔

"فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللّٰہ." (۴۲:۴۰)

(اور جس نے معاف کیا اور صلح کی راہ اختیار کی تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے)۔

خود جناب رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اس آیت مبارکہ کی عملی تفسیر ہے۔ دشمنوں نے آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں، آپ کو گالیاں دیں، آپ کو دیوانہ و مجنوں کہا، آپ کا مذاق اڑایا، آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے۔

☆☆

سیرت نبوی میں دعوت وسیاست کا امتزاج

● حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیاست ودعوت جنہیں ہم مسلمان ایک امر دینی ہونے کی حیثیت سے اپنی زندگی کا اہم ترین جزو خیال کرتے ہیں، دونوں اپنے اندر حالات کو بدلنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، باوجود یکہ دونوں کے طریقہ کار جداگانہ اور مختلف ہیں۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ داعیان اسلام مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دعوت وسیاست کے اسباب ودواعی تک پہنچنے کی کوشش کریں اور ان کے نشیب وفراز پر گہری نظر رکھیں۔ یہ ہماری سخت غلطی ہوگی اگر ہم معاملہ کی تفتیش زمانے کے تغیرات اور دعوت وسیاست کے پہلوؤں پر غائر نظر رکھنے کے بجائے صرف خواہشات اور آرزوؤں کے ریگزاروں میں بھٹکتے رہیں اور حالات کے نشیب وفراز سے قطع نظر ان خواہشات کو بروئے کار لانے کے لئے شاٹ کٹ (Shortcut) راستے کی تلاش میں کوشاں وسہل ترین راستے کی جستجو میں سرگرداں رہیں۔

راستہ کتنا ہی طویل اور حالات کتنے ہی نازک ہوں، لیکن وقت کے طریقہ کار کو جہد مسلسل، عمل پیہم، حکمت عملی اور حسن اخلاق کے خطوط ہی پر منظّم کرنا ہوگا، لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ بدلتے ہوئے حالات پر گہری نظر رکھی جائے، ایسی اسکیم بنائی جائے جو وقت نظر اور سلامت فکر کی حامل ہو اور جو حالات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ہی اپنے طریقۂ کار کو اپنانے کی صلاحیت رکھتا ہو، آپ معرکۂ جنگ میں

دیکھتے ہیں کہ ''الحرب خدعۃ'' کے پیش نظر دیگر چیزوں کے مقابلہ میں دشمنوں کی اسکیم اور پلان پر گہری نظر رکھنی ہوتی ہے، اسی بناء پر ذکاوت اور ذہانت اور فہم وفراست کی گہرائی سیاست کا اہم ترین عنصر سمجھا جاتا ہے اور بتقاضائے حال کبھی سیاست شعلہ کی شدت اختیار کر لیتی ہے، تو کبھی شبنم کی سی ٹھنڈک سے دشمنوں کے دل جیتنے کی کوشش کی جاتی ہے، کبھی شمشیر وسنان کے زور پر دشمنوں کو جھکنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو کبھی صرف دفاع میں بہتری سمجھی جاتی ہے، اگر بعض وقت رحمت خداوندی شامل حال نہ ہو تو انسان اپنی فطری کمزوری کی بنا پر مادیات کے تیز دھارے میں بہہ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سیاست میں نفسانی رجحانات اور مادی اغراض سے بچنے کے لئے فکری بیداری اور ذاتی تحفظ بہت ضروری ہے۔

اب اگر گزشتہ ادوار میں دینی کوششیں سیاست سے الگ ہو کر صرف دعوت وصبر کے طریقۂ کار تک محدود رہی ہیں تو شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ سیاست کے میدان میں کبھی کبھی انسانی مصالح اور مادی اغراض کے خاروں سے الجھ جاتا ہے، چونکہ دعوت وتبلیغ کی تنظیم، جہد مسلسل، صبر پیہم، قوت برداشت اور دعاء واخلاص کے خطوط پر ہوتی ہے، لہٰذا نوید قرآنی:

''اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُم وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃ''

(سورہ توبہ: آیت نمبر: ۱۱۱) (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی)، اسی طرح: ''اِنْ تَکُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّھُمْ یَاْلَمُوْنَ کَمَا تَاْلَمُوْنَ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا یَرْجُوْنَ''

(اگر تم الم رسیدہ ہو تو وہ بھی الم رسیدہ ہیں جیسے تم الم رسیدہ ہو اور تم اللہ تبارک وتعالیٰ سے ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ امید نہیں رکھتے) کے پیش نظر اگر منزل مقصود تک رسائی ہوتی ہے تو فبہا ورنہ اجر وثواب کی عطر بیزی سے استفادہ تو یقینی ہے۔

یہی وہ موڑ ہے جہاں دعوت وسیاست کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اور یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ تاریخ انسانی میں پہلی بار اسلام نے دعوت وسیاست کو میدان عمل کے گلدان میں

سجا کر دنیا والوں کے سامنے ایک حسین گلدستہ پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سیاست ودعوت کا امتزاج تاریخ انسانی میں پہلی بار ہوا جو ایک طرح سے نہایت دشوار ہے، کیونکہ سیاست کی بنیاد صرف حصول منفعت پر ہے اور دعوت کی بنیاد حصول منفعت سے قطع نظر صرف اخلاص (بلکہ نفع پہنچانے) پر ہے، اسی وجہ سے اسلام میں سیاست ودعوت کو جدا نہیں کیا گیا، تاریخ بتاتی ہے کہ کئی مرتبہ دانشوران سیاست ورہبران دعوت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے ہیں۔

رہبر عالم ﷺ خوب جانتے تھے کہ منافقین جو جاثاران اسلام اور فداکاران دین کے مال میں حصہ بٹاتے ہیں وہ اسلامی معاشرے کے تناور درخت کی جڑیں کھوکھلی اور اسلام کے قلعہ کو زمین بوس کرنے کی ناپاک کوشش کررہے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ نے اصولاً کوئی انتقامی کارروائی نہیں فرمائی۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ وہ لوگ آپ کے اعزہ میں تھے، یا آپ کے احباب تھے؟ نہیں، بلکہ دعوت اسلامی کا اس وقت یہی تقاضا تھا کہ آپ اس وقت ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ فرماتے، اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ میں جو صلح فرمائی، جبکہ سیاست کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسلمان اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے بڑھے چلے جاتے، چنانچہ اس وقت صحابہ کرامؓ کو اقدام سے روکنے پر ان کے روحانی جذبات کو سخت ترین دھکا لگا، لیکن چونکہ اسلام میں سیاسی مصالح، دعوتی مصلحت کے دست نگر ہیں، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کی ڈھارس باندھی اور انہیں قبول صلح پر آمادہ کرلیا، یہیں پر یہ حقیقت سوالیہ نشان بن کر سامنے آتی ہے کہ جب سیاست ودعوت کے مابین اتحاد ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ مصالح میں بھی ہم آہنگی پیدا نہ کی جائے؟

آج اس کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمانان عالم اسلامی مشن کے لئے ہمہ گیر اور مکمل طور پر اس طریقۂ کار کو اختیار کریں، جس طرح کہ آج سے پہلے نبی کریم ﷺ، داعیان اسلام اور مجاہدین عظام نے اپنایا تھا، وہ سیاست ودعوت دونوں اصول کے جامع تھے،

درحقیقت دعوت وسیاست کے اصول کا نظام ایسا جامع ہے کہ اگر اسلامی معاشرے کی تنظیم اسی خطوط پر کی جائے تو یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ سیاست عین دین ہے، کیونکہ معاشرے کے لئے اس میں ایسی ہم آہنگی ہے کہ جس کی ظاہری ہار میں بھی جیت کا پہلو نمایاں ہے، اس لئے کہ ہر عمل اللہ اور اس کے رسول کے لئے ایثار واخلاص ہی پر مبنی ہوتا ہے، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج مسلمانان عالم اسوۂ رسول ﷺ کو چھوڑ کر اپنی تمام تر کوششوں کی تنظیم مغرب کے اصول کی بنیاد پر کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ مغرب کے ناقص اصول نے مذہب کو سیاست سے الگ نکال پھینکا ہے، ان کے نزدیک تو مکر وفریب، غداری ودھوکہ دہی، بہانے بازی وحیلہ سازی اور کمائی کے ذریعہ تک ہر ممکن کوشش سے پہنچنے اور حالات کے مطابق منصوبہ بدلنے کا نام سیاست ہے، انہیں اس سے مطلب نہیں ہے کہ بھلائی اور خیر ان سے کوسوں دور نہ ہوجائے، ان کی مثال بالکل اسی طرح ہے، جیسے کہ ایک شخص اکتساب مال کرنا چاہتا ہے اگر وہ معروف طریقہ سے اس کو حاصل ہوجاتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ چوری، رشوت، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کے ذریعہ مال ودولت جمع کرتا ہے۔

یہی یورپ کی سیاست ہے جسے ہمارے ملک اور ہماری قوم نے تحفہ سمجھ کر قبول کرلیا ہے، لیکن یہ مسئلہ اس وقت بہت ہی بھیانک رخ اختیار کرلے گا جب یہ ہماری دینی اور دعوتی کوشش میں دخل انداز ہوگا۔

☆☆

رحمتِ عالم ﷺ کا لایا ہوا نظامِ حیات

● حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ

موجودہ دنیا جس برق رفتاری سے آگے جارہی ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ کہاں جا کر دم لے گی، مگر سارے جدید انکشافات اور تمام تر تمدنی اور سائنسی ترقیوں کے باوجود یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں اطمینان وسکون اور امن وسلامتی عوامی خواہش کے مطابق موجود نہیں ہے، گو مختلف ممالک میں مختلف طرزِ حکمرانی کارفرما ہے۔

آج انسان اس تغیر پذیر دنیا میں ایک ایسے نظامِ حیات اور دستور زندگی کے لئے سرگرداں ہے، جو اس کو تمام شعبہ جات زندگی میں سکون واطمینان اور خوشحالی وفارغ البالی کی دولت سے نواز دے جس نظام میں عدل ومساوات، اخوت ومحبت اور ہمدردی اور رواداری کی فراوانی معیشت ومعاشرت میں ہمواری وتوازن اور عفت وعصمت اور جان ومال کا مکمل تحفظ ہو، اسی کے ساتھ اونچ نیچ کی تفریق، رنگ ونسل کا امتیاز اور دھرم ومذہب کے نام پر فتنہ کی گرم بازاری قطعاً نہ ہو۔

ریاست میں حکمرانی کے قوانین واصول ایسے جاری ہوں، جن میں بدلتے ہوئے سماج اور ان کے سیاسی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت ہو، اندرونِ ملک امن وسکون ہو اور بیرونی ممالک سے اس کے تعلقات خوشگوار ہوں اور قانون کی نظر میں امیر وغریب اور شاہ وگدا کی کوئی تمیز نہ ہو، معذور ومجبور افراد کے لئے حکومت کی طرف سے قیام وطعام اور ضروریات زندگی کا انتظام ہو، تعلیم وترقی اور اظہار رائے کی ہر فرد کو پوری

آزادی حاصل ہو، ملک کا مالیاتی نظام اور اس کی فوجی طاقت قابل اعتماد ہو۔

اسلامی آئین حکومت:

انسان اگر تعصب وتنگ نظری سے الگ ہو کر غور وفکر کرے تو اسے ماننا پڑے گا کہ دنیا کے موجودہ نظاموں میں بہتر اور موجودہ پریشانیوں کا مداوا صرف رحمت عالم ﷺ کا لایا ہوا نظام حیات ہے، جو رب العالمین کا عطا کردہ ہے، کیونکہ یہ افراط وتفریط اور نقص وغلو ہر ایک انسانی عیب سے پاک ہے اور کائنات انسانی کے لئے باعث راحت وسکون ہے اور اس کے ظاہر وباطن کی پاکیزگی کا ضامن ہے۔

یہ دستورِ زندگی انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے، بلکہ رب الناس کا بخشا ہوا ہے، اس میں ہر ایک طبقہ اور ہر ایک خطہ کے باشندوں کا یکساں لحاظ وپاس ہے، اس دستور کا نزول اس وقت ہوا جب انسانیت دم توڑ چکی تھی، کائنات انسانی جور وتعدی سے کراہ رہی تھی، عوام وخواص ایک یا چند خاندانوں کے غلام بننے پر مجبور تھے، کمزور وناتواں پس رہے تھے اور دولت مند وطاقتور داد عیش دے رہے تھے، اس وقت جس قدر بھی قوانین سلطنت دنیا میں رائج تھے، وہ افراط وتفریط کے شکار تھے، خواہ وہ لائیکرگس کا قانونِ حکومت رہا ہو، یا قدیم مصر کا نظامِ سلطنت، منومہاراج کا بنایا ہوا قانون زندگی ہو، یا زمانہ جاہلیت کا اصولِ حکمرانی، روم وایران کا آئین ملکی ہو، یا کسی اور ملک ونسل کا دستورِ حیات۔

انسانی عظمت کا اعلان:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رحمت عالم ﷺ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے مشعلِ ہدایت دکھائی اور پروردگار عالم کی طرف سے اعلان فرمایا کہ یہ ساری کائنات انسانوں کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ زمین وآسمان، چاند وسورج، حیوانات وجمادات سب کے سب انسانوں کی راحت رسانی میں مشغول ہیں اور ان سب کی تخلیق اسی لئے عمل میں آئی ہے۔

ارشاد ربانی ہے: ''سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّراتٌ بِاَمْرِهِ اِنَّ فِيْ ذَالِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ.'' (النحل: ۱۲)

(رات ودن، سورج وچاند کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام پر لگا دیا ہے اور سارے اس کے حکم سے تمہارے کام میں لگے ہوئے ہیں، بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں)۔

اسلام نے انسانوں کو اس قدیم توہم پرستی سے نکالا، جو دیمک کی طرح انہیں چاٹ رہے تھے اور یقین دلایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اپنی خلقت میں متناسب الاعضاء ہے:

''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْم.'' (التین)

(بے شبہ ہم نے آدمیوں کو بہترین انداز سے بنایا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو شرف بخشا ہے، اس میں اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں ہے)۔

'' لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ. (بنی اسرائیل''

(بیشک ہم نے اولادِ آدم کو عزت وشرف بخش رکھا ہے۔ انسانوں کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے انہیں مسجودِ ملائک بنایا اور اس کے منکر کو راندۂ درگاہ قرار دیا)۔

''وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ.'' (البقرہ)

(اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ آدم کو سجدہ کرو، پس فرشتوں نے سجدہ کیا، ابلیس نے البتہ سرتابی بھی کی اور کبر ظاہر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا)۔

''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن.''

(میں نے جن وانسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں)۔

دعوتِ توحید:

رحمت عالم ﷺ نے لوگوں کو یہ بھی ذہن نشین کرایا کہ انسانوں کا ملجا وماویٰ رب کائنات ہے اور ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔

اس کو مرکزِ توحید پر لا کر کائنات انسانی میں اتحاد ویگانگت پیدا کی اور ان کے باہمی انتشار وتفریق کو ختم کرنے کی سعی فرمائی، ساتھ ہی دعوت دی کہ آؤ ہم سب مل کر ایک ذات کی عبادت کریں، اہل کتاب کو خطاب کر کے اعلان کیا گیا:

''يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰه وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْأً وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ.'' (آل عمران. آیت نمبر: ۶۴).

(اے اہل کتاب ایک بات کی طرف آؤ، جو ہم میں اور تم میں برابر ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور نہ اس کا کسی شریک ٹھہرائیں اور یہ کہ ہم میں کوئی کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب نہ بنائے)۔

رسالت پر بھی یقین کرنے اور ایمان لانے کی دعوت دی، مگر اس کی وضاحت کردی کہ رسول اللہ خدا اور بندوں کے درمیان سفیر ہوتا ہے جو خدا کے احکام وپیامات بندوں تک پہنچاتا ہے، رسول بشر ہوتا ہے، خدا نہیں ہوتا۔

''قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ.'' (الکهف)

(آپ کہہ دیں میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں، میری طرف وحی الٰہی آتی ہے کہ بلاشبہ تمہارا معبود بس ایک ہے)۔

مساوات اور اخوتِ انسانی:

سرور کائنات ﷺ نے انسانوں کی باہمی تفریق اور باہمی جنگ وجدال پر یہ اعلان

فرما کر خط نسخ کھینچ دیا۔

"یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَۃٍ وَخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالاً کَثِیْراً وَّنِسَاءً وَاتَّقُو اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامِ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْباً." (النساء. ۱)

(اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے پھیلائیں بہت سارے مرد اور عورتیں، اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر تم صلہ رحمی کی درخواست کرتے ہو، بیشک اللہ تم سب کا نگراں ہے)۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اس ارشاد خداوندی کی مزید تشریح فرمائی اور کھل کر اعلان فرمایا۔

"لافضل لعربی علی عجمی ولالعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لأسود علی أبیض الا بالتقویٰ، الناس من اٰدم واٰدم من تراب." (زادالمعاد صفحہ ۲۲)۔

شرافت کا معیار:

خاندان وقبیلہ دنیا میں تعارف کا ذریعہ ہے شرافت ورذالت اس میں محصور نہیں، اسلام میں شرافت وبڑائی کا معیار عقائد کی مضبوطی، اخلاق واعمال کی پاکیزگی اور خدا ترسی ہے رنگ وروپ اور جغرافیائی تقسیم میں کچھ رکھا ہوا نہیں ہے، قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ اعلان ہوا۔

" یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثیٰ وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقَاکُمْ." (الحجرات. ۲)

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد وعورت سے پیدا اور تم کو خاندان وقبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم میں جان پہچان رہے، کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے معزز وہ

ہے جو خدا سے زیادہ ڈرتا ہے)۔

محمد رسول ﷺ نے حضرت زیدؓ کی شادی زینتؓ بن جحشؓ سے کرائی، جو آزاد اور خاندان قریش سے تھیں۔ حضرت بلالؓ غلام تھے، لیکن بڑے بڑے خاندانی محترم افراد ان کا نام بڑے ادب واحترام سے لیتے تھے اور ان کی بزرگی پر رشک کیا کرتے تھے۔

اسلامی عبادت میں مساوات کا مظاہرہ:

مسجد خانۂ خدا ہے دن رات کے پانچ وقتوں میں یہاں باجماعت نماز ادا ہوتی ہے، اس کے داخلہ پر نہ کوئی پابندی اور نہ کوئی تفریق وتمیز، یہاں ایک ہی صف میں سب کے سب کھڑے ہوتے ہیں، صدر جمہوریہ بھی اور ایک معمولی چپراسی بھی اقبال مرحوم کی زبان میں:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

سرور کائنات ﷺ کا اعلان ہے:

"ان أولیائی المقتون حیث کانوا این کانوا" (زاد المعاد)

(میرے ہم کنبہ وہ ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں وہ جہاں کہیں بھی ہوں)۔

نیکوکار کا درجہ:

خلافت ارضی کے سلسلہ میں بھی فوقیت اور برتری نیکوکار کو دی گئی ہے ارشاد خداوندی ہے:

"وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرُ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصَّالِحُوْنَ." (انبیاء:۷)

(ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ زمین کی وراثت کے حقدار میرے نیکوکار بندے ہیں)۔

یہاں صرف ایمان وایقان اور عمل صالح معیار قرار پایا اور واقعہ بھی ہے جو ان

جوہروں سے خالی ہوگا، وہ سب کچھ ہوگا، منصف نہیں ہوسکتا اور خدا کے عام بندوں سے اسے محبت جیسی چاہیے نہیں ہوسکتی، اس لئے خلافت ارضی میں ان کو ہی ترجیح دی جانی چاہئے تھی۔

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِيْ الاَرْضِ." (النور. ۱۲)

انصاف اور عدل:

اسلام میں عدل وانصاف کی بڑی تاکید ہے، تعصب وتنگ نظری کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، دوست ودشمن کی تمیز نہیں، اپنے پرائے میں امتیاز نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ." (المائدہ. ۲)

(اے ایمان والو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے والے، عدل کے ساتھ شہادت دینے والے رہو)۔

بسا اوقات عداوت منصف کے قدم میں جنبش پیدا کر ڈالی ہے اور وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی پر مجبور سا ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن مقدس میں خصوصی طور پر تاکید کی گئی۔

"لَايَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعدِلوا اِعْدلو هُو اَقربُ لِلتقوىٰ."

(کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے ہرگز انصاف کا دامن نہ چھوڑنا)۔

انصاف میں کوئی جذبہ حائل نہ ہونے پائے:

حالات سے مجبور ہو کر عقل وفہم جب عدل وانصاف سے روگردانی پر مجبور کرے اس وقت بھی منصف کو حکم ہے کہ انصاف کا رشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، کیونکہ اسلام میں محبت وعداوت دونوں جچی تلی ہوتی ہیں، کسی سخت سے سخت موقع پر بھی بے قابو ہونے کی اجازت نہیں ہے، اسلام میں محبت وعداوت کی جگہیں متعین ہیں اور اسی طرح غیض وغضب کے مقامات بھی مذہب اور دین کے نام پر بھی اس قانون میں انصاف سے

سرمو ہٹنے کی اجازت نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"وَلا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قومٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الاِثْمِ وَالْعُدْوان وَاتَّقُوا اللّٰه اِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ العِقَاب." (المائدة)

(اس قوم کی دشمنی جو تم کو حرمت والی مسجد سے روکتی تھی، اس کا باعث نہ ہو کہ زیادتی کرنے لگو۔ آپس میں نیکی اور پرہیزگاری پر مدد کرو، گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ کا عذاب سخت ہے)۔

انصاف کے تخت پر بیٹھنے کے بعد کبھی معاملہ بڑا سنگین سامنے آتا ہے اور احترام واکرام، محبت وشفقت اور خونی رشتہ ارادوں میں کمزوری پیدا کر دیتا ہے اور منصف کا قلم فرد انصاف مرتب کرنے میں کپکپانے لگتا ہے، ایسے وقت کے لئے خصوصی تاکید فرمائی گئی ہے۔

"يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَوِالْوَالِدَيْن وَالاقْرَبِين." (النساء)

(اے مومنو! اللہ کے واسطے انصاف کیا کرو اور اس پر قائم رہو گو تمہارے والدین کا یا تمہارے رشتہ داروں کا نقصان ہو)۔

یہ تاریخی حقائق ہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے ایسے مواقع پر بھی قانون خداوندی پر ہی عمل کیا، خود ہمارے ہندوستان کی تاریخ میں بھی اس طرح کے واقعات کی کمی نہیں۔

مشورہ کی اہمیت:

اسلام میں معاملات ان لوگوں کے مشورے سے طے ہوتے ہیں جو ذی رائے، معتمد اور نیک وصالح ہوتے ہیں، انتخاب امیر کا طریقہ بھی یہی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"وأمرهم شورىٰ بينهم" (شورىٰ. ۴)

(وہ آپس کے مشورہ سے کام کرتے ہیں)۔

ایک جگہ اس کا حکم بھی دیا گیا ہے:

"وشاورهم في الأمر" (آل عمران. ۱۷) (معاملات میں ان سے مشورہ کرلیا کرو)۔

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا، یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جس میں شریعت کی کوئی اجازت یا ممانعت وارد نہ ہو تو اس وقت کے لئے آپ کا کیا ارشاد ہے، آپ نے فرمایا:

تشاوروا العلماء والعابدين (طبرانی) اہل علم اور عبادت گزاروں سے مشورہ کرلیا کرو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

"ولا تمضوا رائی خاصة" (طبرانی) کسی خاص آدمی کی رائے نافذ نہ کرو۔

سقیفہ ساعدہ میں ابوبکر صدیقؓ نے جو خطبہ دیا تھا اس پر یہ بھی فرمایا تھا:

"اے گروہ انصار، ہم مہاجرین امیر ہیں اور آپ ہمارے وزیر ہیں، آپ کے مشورہ کے بغیر امور طے نہیں کئے جائیں گے۔"

صحابہ کرامؓ کا عمل:

چنانچہ خلفاء راشدین کا اسی پر عمل تھا، دارمی میں ہے:

"اگر صدیق اکبرؓ کو کوئی مشکل مسئلہ پیش آجاتا اور کتاب وسنت میں اس کا حکم نہ ملتا تو آپ مسلمانوں کے سرداروں اور علماء کو بلاکر مشورہ کرتے اور جب کسی رائے پر متفق ہوجاتے تو اس کے موافق فیصلہ فرماتے، حضرت عمرؓ کا بھی اسی پر عمل تھا، کوئی دشوار مسئلہ سامنے آتا اور کتاب وسنت میں حکم نہیں ملتا تو صدیق اکبرؓ کو مشورہ کے لئے طلب کرتے اور ان سے مشورہ کرتے اور جب کسی رائے پر متفق ہوجاتے تو فیصلہ فرماتے۔"

امیر جماعت کی اطاعت:

جس مشورہ سے کوئی شخص خلیفہ منتخب ہوجائے تو حکم ہے کہ اس کی باتوں پر عمل کرو۔

"اسمعوا وأطيعوا ان ولى عليكم عبد حبشى" (جمع الفوائد)

رسول الثقلینؐ کا دستور تھا کہ ذمہ داری کا عہدہ اس شخص کے سپرد نہیں فرماتے جو اس کا طلب گار ہوتا، ایک دفعہ ایک شخص نے حاضر خدمت ہوکر عرض کیا کہ مجھے والی بنادیا جائے یہ سن کر آپ نے فرمایا:

"انا والله لانولى هذا العمل احدا سأله او احدا حرص عليه" (جمع الفوائد: ج ۱ ص ۳۱۷)

حکمران کے فرائض:

حکمران طبقہ کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنے فرائض میں خیانت کرے گا، اس پر جنت کی بو بھی حرام ہوگی اور وہ رب العزت کے یہاں مطعون قرار پائے گا۔ (جمع الفوائد ص ۳۱۶ ج ۱)

اسی وجہ سے حکم ہے کہ ذاری کا عہدہ بہترین افراد کے سپرد کیا جائے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"اذا كان أمراء كم خياركم وأغنياء كم سمحاء كم وأمور كم شورى بينكم فظهر الأرض خير لكم من بطنها، واذا كانت امراء كم شراركم وأغنياء كم بخلاء كم و أمور كم الى نساء كم فبطن الأرض خير لكم من ظهرها" (جمع الفوائد)

(جب تمہارے امراء تمہارے بہترین افراد ہوں اور تمہارے باثروت لوگ سخی اور

تمہارا باہمی معاملہ مشورہ سے طے ہو تو اس وقت زمین کی پیٹھ تمہارے لئے اس کے پیٹ سے بہتر ہے اور جب تمہارے ذمہ دار لوگ تم میں سے بدترین ہو جائیں اور تمہارے مالدار افراد تم میں بخیل شمار کئے جائیں اور تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں آجائیں تو پھر تمہارے لئے زمین کا اندرونی حصہ اس کے ظاہری حصہ سے بہتر ہوگا)۔

ایک صحابی کی تقریر:

معاذ بن جبلؓ ایک جلیل القدر صحابی ہیں یہ ایک مرتبہ بحیثیت سفیر قیصر روم کے دربار میں تشریف لے گئے وہاں ایک موقع پر فرمایا:

الفاظ روایت ''ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے، اگر ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر ﷺ کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اس کو اپنا سردار باقی رکھیں گے اور اگر وہ ان کے سوا کسی اور چیز پر عمل کرے تو ہم اسے معزول کر دیں گے، اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں، اگر زنا کرے تو سنگسار کریں اور اگر وہ کسی کو برا بھلا کہے تو اس کو بھی اسی کا حق ہوگا اور اگر کسی کو زخمی کرے تو تو اسے اس کا بدلہ دینا پڑے، وہ ہم سے چھپ کر پردے میں نہیں بیٹھتا، وہ ہم سے غرور کے ساتھ پیش نہیں آتا، مال غنیمت میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دیتا، وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے۔'' (جمع الفوائد)

خلیفہ وقت کا فرض ہے کہ وہ اپنے فرائض حسن وخوبی سے انجام دے، پبلک کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرے، رسول اللہ ﷺ کی دعا ہے ''اے اللہ! جو ذمہ دار حکومت پبلک اور رعایا پر سختی کرے تو بھی اس کے ساتھ سختی سے پیش آ اور جو نرمی کا معاملہ کرے تو بھی اس پر نرمی فرما۔''

خلیفہ راشد فاروق اعظمؓ کا یہ واقعہ ہر خاص وعام جانتا ہے کہ جب قحط پڑا تو آپ نے قسم کھالی تھی کہ جب تک قحط دور نہ ہوگا دسترخوانِ خلافت پر گھی اور شہد کا استعمال بند رہے گا

اور جب مدینہ منورہ سے بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئے تو اونٹ ایک ہی تھا۔ باری باری آپ اور آپ کا غلام دونوں اس پر سوار ہوتے تھے۔ چنانچہ شہر میں داخلہ کے وقت غلام کی باری آگئی، مگر اس کے عرض کرنے کے باوجود آپ نے اونٹ پر اسی کو بٹھایا اور خود نکیل پکڑ کر پیدل چل رہے تھے۔

جنگ وانتقام:

جنگ اور انتقام کا نام کس قدر خوفناک ہے، یہاں اعتدال کو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا، مگر اسلامی قانون میں یہاں بھی انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا ہے، قتال کا حکم ہے، مگر ان لوگوں سے جو ان سے لڑنے کا عزم رکھتے ہوں، ہر کسی سے نہیں اور اس صورت میں بھی ظلم وجور سے منع کیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے:

''وَقَاتِلُوا فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُونَكُم وَلَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ''(البقرہ. ۱۹۰)

(اللہ کے راستہ میں ان سے قتال کرو، جو تم سے قتال کرتے ہیں اور تعدی نہ کرو، بلاشبہ! اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)، اسلام میں جنگ پر صلح کو ترجیح دی گئی ہے، کہ اسلام نام ہی امن وسلامتی کا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

''وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ.'' (انفال. ۶۱)

(اگر وہ لوگ صلح کے لئے مائل ہوں، تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو)۔''فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَیْكُمُ السَّلَمَ فَمَاجَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَیْهِمْ سَبِیْلًا.'' (النساء ۹۰)

(اگر وہ تم سے علاحدہ رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور صلح پیش کریں۔ تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر راہ نہیں دی ہے)۔ حکم ہے کہ جہاں جاؤ سوچ سمجھ کر اور تحقیق کے

بعد جاؤ۔ اقدام میں عجلت نہ کرو، قتل وخونریزی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اِذا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوْا ." (النساء. ۹۳)

(اے ایمان والو! جب تم جہاد کے لئے نکلو تو تحقیق کرلیا کرو)۔

جذبہ صلح وآشتی:

اگر کوئی زبان سے ایسا کلمہ کہے جو اس کے باایمان ہونے کو بتاتا ہو یا اطاعت کا اعتراف کرلے تو اس کو معاف کردیا جائے۔

"وَلاَ تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقیٰ اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا." (النساء ۹۴)

(اور جو تم سے سلام علیک کرے اس کو یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں)۔

قانون اسلام میں برائی کا بدلہ برائی سے دیا جاسکتا ہے، مگر افضل یہ ہے کہ درگزر سے کام لیا جائے۔

"وَجَزٰؤُا سَیِّئَۃٍ مِثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ ط اِنَّہٗ لاَ یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ." (شوریٰ. ۴)

(برائی کا بدلہ اس کے برابر برائی ہے، پس جو شخص معاف کردے اور اصلاح کرلے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا)۔

درگزر کا درجہ:

قرآن مقدس میں درگذر کی تعریب بھی کی گئی ہے اور اس کا فائدہ بھی بتایا گیا ہے ارشاد ہے: "لَا تَسْتَوِیْ الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ وَمَا یُلَقّٰھَا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰھَا اِلَّا

ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ." (حم السجدہ. ۳۵)

(نیکی اور بدی برابری نہیں، نیک برتاؤ سے بدی کو دفع کریں پھر آپ میں اور جس میں عداوت تھی وہ ایسا ہوجائے گا جیسا دلی دوست ہوتا ہے، یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہیں اور بڑے صاحبِ نصیب ہیں)۔

انسانیت کا لحاظ:

کمزوروں، نہتوں، عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا ہے، غزوہ احد میں جس خاتون نے حضرت حمزہ کی کچی کلیجی نکال کر چبائی تھی، جب حضرت ابودجانہؓ کی تلوار ان پر پڑی تو عورت ذات دیکھ کر فوراً روک دی اور فرمایا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد ہے کہ عورتوں پر تلوار نہ چلائی جائے۔

یہی چیز تھی کہ جہاد پر ایک لشکر کو روانہ کرتے ہوئے صدیق اکبرؓ نے تاکید فرمائی تھی:

''دیکھو خیانت نہ کرنا، دھوکہ نہ دینا، مال نہ چھپانا، کسی کے اعضاء نہ کاٹنا، بوڑھوں بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے درختوں کو نہ جلانا، پھلدار درختوں کو نہ کاٹنا، کھانے کے سوا کسی بکری گائے یا اونٹ کو نہ کاٹنا، تمہارا گزر ایک قوم پر ہوگا جو دنیا چھوڑ کر خانقاہوں میں بیٹھی ہوگی تم ان کو نہ چھیڑنا۔''

دین کے سلسلہ میں زبردستی نہیں:

آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ پہلے اپنے مخالفین پر دولت اسلام پیش فرماتے اور اگر اس پر راضی نہ ہوتے تو جزیہ کا مطالبہ کرتے کہ حکومت کے وفادار بن جاؤ اور غداری نہ کرو، اس کو بھی کوئی نہیں مانتا تو آخری مرحلہ میں جنگ کی بات کرتے، اسلام کا حکم ہے۔ ''لااکراہ فی الدین'' (سورہ آل عمران) دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔

اقتدار تسلیم کرلینے کے بعد غیر مسلموں کو اسلامی حکومت میں وہی حقوق حاصل ہوتے

جومسلمانوں کے لئے ہیں، اس کی تفصیل کے لئے خاکسار کی کتاب ''اسلام کا نظام امن'' مطالعہ کیا جائے۔

آنحضرتؐ کا عمل:

کون ایسی اذیت ہے جو صنادید قریش نے آنحضرت ﷺ کو نہیں پہنچائی اور قتل کی کونسی سازش ہے، جس میں وہ شریک نہیں رہے مگر جب ۸ھ میں آپ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو کس شان سے آپ نے فرمایا:

''من دخل دار ابی سفیان فھو أمن ومن أغلق بابه فھوا من ومن دخل المسجد فھوا أمن ''(جمع الفوائد صفحه: ٦٢ جلد٢)

(جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اس کو امن ہے جو اپنے گھر کا دراوزہ بند کرے اسے امن ہے جو خانہ خدا میں داخل ہو جائے اسے امن ہے)۔

''ومن القی السلاح فھو امن'' (ایضاً) (اور جو ہتھیار دے اسے بھی امن ہے)۔

چنانچہ اس پر پورا پورا عمل ہوا۔ فتح مکہ کے بعد تمام صنادید کعبہ میں جمع کئے گئے وہ آج اس یقین کے ساتھ آئے تھے کہ اسلام کی تلوار انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گی، مگر سرورِ کائنات ﷺ کے جب یہ کلمات انہوں نے اپنے کانوں میں سنے:

''لا تثریب علیکم الیوم یغفر الله لکم وھو أرحم الرحمین.''

(آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کریں وہ ارحم الرحمین ہیں)۔

''کانما نشروا من القبور.'' (شرح معانی الآثار ٢ ص ١٩٢)

فتنہ ختم ہونے کے بعد امن:

اسلام کا قانون ہے کہ جب فتنہ دب جائے تو پھر قتال بند کر دیا جائے۔

''وقٰتلوھم حتیٰ لا تکون فتنة ویکون الدین لله.'' (البقرہ.٩٣)

(ان سے اس وقت تک قتل کرو تا آنکہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو)۔

جہاد کی اجازت کب ہے:

جہاں جہاد کی اجازت دی گئی ہے، وہاں صراحت موجود ہے۔

''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ. اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَق اِلَّا اَنْ یَقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ.'' (الحج ٦٠)

(جن لوگوں سے ناحق جنگ کی جاتی ہے ان کو اس بنا پر جنگ کی اجازت دی جاتی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ ان کو غالب کر دینے پر قادر ہے، جو بے وجہ اپنے گھروں سے نکالے گئے، محض اتنی بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے)۔

جب کسی پر بے جا ظلم و تعدی ہو اور بے وجہ اپنے گھر سے بے گھر کیا جائے تو وہ اپنی مدافعت اور جور و تعدی کو ختم کرنے کے لئے کیسے ہاتھ پیر مارنے کی سعی نہیں کرے گا، جب کہ اسلام نے بتایا ہے کہ جو اپنی جان، عزت و آبرو یا اپنے مال کی حفاظت کے سلسلہ میں قتل کیا جائے شہید ہے۔ جہاد کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت میں روکاٹ بننے والوں کو دفع کرنا اور **امر بالمعروف اور نھی عن المنکر** ہے۔

''ولولا دفع الله الناس'' اگر اللہ ایک کی دوسرے سے مدافعت نہ کرتا تو راہبوں کے خلوت خانے اور یہود و نصاریٰ کے معابد اور مسلمانوں کی مسجدوں جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے سب ڈھا دئے جاتے۔ (الحج:)

دوسری حکومتوں سے تعلقات:

اسلام میں خواہ مخواہ لڑنے کا حکم نہیں ہے، بلکہ اجازت مقصد کے تحت ہے، چنانچہ جو لوگ فتنہ و فساد کو ہوا نہیں دیتے، مظالم نہیں ڈھاتے، ان سے اور ایسی غیر مسلم حکومتوں سے تعلقات خوشگوار رکھے جائیں گے۔ جو مسلمانوں سے برسر پیکار نہیں۔ ذیل کی آیت میں

اس کی صراحت موجود ہے ارشاد ربانی ہے:

آیت کے الفاظ، ''اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان وانصاف سے نہیں روکتا جو دین کے معاملہ میں تم سے نہیں لڑتے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔'' (الممتحنہ: ۲۰)

آیت کے الفاظ، ''صرف ان لوگوں سے تم کو دوستی سے روکتی ہے، جو تم سے دین کے بارمیں لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور نکالنے والوں کی مدد کریں، جو ایسوں سے دوستی کرے گا وہ گنہگار ہوگا۔'' (الممتحنہ:)

رواداری:

معلوم ہوا کہ غیر مسلم ممالک میں سے جو ممالک محارب ومخالف کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ ان سے تعلقات خوشگوار رکھے جائیں گے۔ اسلام چاہتا ہے دنیا سے ظلم وستم ہو اور عدل ومساوات کی حکومت قائم ہو، اسلام میں جیسی رواداری ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: آیت کے الفاظ، ''آج تمہارے لئے حلال چیزیں حلال رکھی گئی ہیں اور جن کو کتاب دی گئی ہے ان کا ذبیحہ تم کو حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے اور مسلمان پارسا عورتیں اور اہل کتاب پارسا عورتیں جب تم ان کو ان کا معاوضہ دے دو اس طرح سے کہ تم ان کو بیوی بناؤ۔ ان سے نہ اعلانیہ بدکاری کرو اور خفیہ طور پر اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے گا تو اس کا عمل غارت ہو جائے گا اور وہ آخر میں بالکل خسارہ میں رہے گا۔'' (المائدہ)

اسلام میں چھوت چھات کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اہل کتاب کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے شادی کی اجازت غیر قوموں سے تعلقات کی استواری کی دلیل ہے۔

رستم کے پوچھنے پر صحابی رسول زہرہؓ نے کہا تھا کہ ہمارا مقصد خدا کے بندوں کو

انسانوں کی بندگی سے نکال کر خدا پرستی پر لگانا ہے، اس لئے کہ سارے انسان آدم وحوا کی اولاد ہیں اور ایک ماں باپ سے ہونے کی وجہ سے بھائی بھائی ہیں۔

اسلامی ریاست میں اس کا پورا پاس ولحاظ ہے کہ سارے انسانوں کو پیٹ بھر کھانا، ستر پوشی اور پوشاک کے لئے کپڑے اور رہنے سہنے اور گرمی سردی سے بچنے کے لئے گھر میسر ہو، ملک میں کوئی بھوکا، ننگا اور بے گھر نہ ہو، سبھوں کے لئے اس قدر انتظام اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔

محتاجوں اور معذوروں کے لئے انتظام:

اسلام میں غریبوں اور محتاجوں کے لئے زکوٰۃ اور صدقات کی مد قائم کی گئی ہے اور اس کی ادائیگی ہر صاحب نصاب پر ضروری قرار دی گئی ہے، رحمت عالم ﷺ کی وفات کے بعد جب بعض قبائل نے زکوٰۃ بند کرنے کا ارادہ کیا اور خلیفہ رسول صدیق اکبرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اعلان فرمایا کہ ایسے لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانا فرض ہے، فاروق اعظمؓ نے عرض کیا کہ جو کلمہ اسلام کا اقرار کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا اور صرف زکوٰۃ روکتا ہے، اس کے خلاف تلوار کیسے اٹھانا درست ہوگا، صدیق اکبرؓ نے جواب میں فرمایا:

''واللّٰہ لا قاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوۃ فان الزکوۃ حق المال واللّٰہ لو منعونی عقالا لأقاتلنھم علی منعہ.'' (ریاض الصالحین ص ۴۸۵)

خدا کی قسم میں اسی سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، زکوٰۃ حق مال ہے، اگر کوئی ایک معمولی رسی بھی روکے گا تو بخدا اس روکنے پر اس سے جنگ کروں گا)۔

اسلام اسے برداشت نہیں کرتا ہے کہ کوئی خزانے رکھے اور کوئی ایڑی رگڑ کر جان دے، اس کا حکم ہے:

آیت کے الفاظ، ''تم ان کے مال سے صدقہ وصول کر کے انہیں پاک کرو اور اس

کے ذریعہ سے بابرکت بناؤ۔'' (توبہ)

مال والوں سے ایک مخصوص رقم لی جائے گی اور حاجت مندوں پر مستحق قرار پائیں گے تقسیم کی جائے گی۔ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا:

''ان اللہ افترض علیھم صدقة تو خذ من اغنیائھم وتردد علی فقرائھم.'' (ریاض الصالحین)

اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض قرار دی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں کو دی جائے گی۔

نقدی پر چالیسواں حصہ فقرا و مساکین کا ہے، مال تجارت کی قیمت لگائی جائے گی اور سال پورا ہونے کے بعد ڈھائی فیصد غربا کے لئے نکالا جائے گا۔ اسی طرح زمین کی پیداوار میں دسواں اور بیسواں حصہ مساکین کے لئے مخصوص ہے۔ سونا چاندی کے زیورات میں بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

اس کے ساتھ اسلام کا یہ قانون بھی ہے کہ اگر ضروری مدات کی وصولی اور تقسیم کے بعد بھی خدانخواستہ کچھ لوگ فاقہ سے ہوں اور کچھ لوگوں کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ غلہ یا نقد رقم ہو تو خلیفہ وقت مالداروں سے فاضل رقم لے کر مفلسوں اور بھوکے مرنے والوں پر خرچ کرے گا۔

پھر ان تمام صورتوں کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے، جن سے غریبوں کا خون چوسا جاسکتا ہے، جیسے سود، رشوت، احتکار، اسراف، اور بخل وغیرہ وغیرہ۔

اسلام کا معاشی نظام اشتراکی نظام سے بہت بہتر ہے اور مفید تر بھی ساتھ ہی مضبوط بھی، زکوٰۃ و عشر اور صدقات نافلہ کے علاوہ بھی بہت سارے حقوق ایک کے دوسرے پر رکھے گئے ہیں۔ شخصی ملکیت کو جائز قرار دیا گیا ہے، تاکہ توانائی میں فرق نہ آنے پائے اور انسان انسان باقی رہے جانوروں کی صف میں لاکر کھڑا نہ کیا جائے، مرنے کے بعد میراث

کا قانون ہے کہ مرنے والے کی دوست اور جائیداد ورثہ پر تقسیم ہوگی۔

اسلام نے خودرو پودوں، چشموں، دریاؤں، سمندر کی مچھلیوں اور پرندوں پر کوئی پابند عائد نہیں کی ہے، اس طرح کی چیزوں پر ٹیکس، محصول اور ٹھیکہ جائز نہیں ہے۔

قانون امن وسلامتی:

اسلام میں امن وامان اور سکون وسلامتی کے لئے جو قوانین ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان کے اجرا کے بعد بدامنی، قتل وخون ریزی اور چوری ڈکیتی کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا ہے، پہلے اسلام انسان کے دلوں پر مذہب کی راہ سے حکومت قائم کرتا ہے۔ عالم گیر اخوت ومحبت کا درس دیتا ہے۔ حقوق کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی اہمیت دلوں میں جاگزیں کرنے کی سعی کرتا ہے، بغض وحسد اور بدظنی کی مذمت کرتا ہے۔ لوٹ مار، غارت گری اور چوری ڈکیتی کے نتائج وعواقب پر روشنی ڈالتا ہے، فتنہ وفساد اور مردم آزاری کے نقصانات بتاتا ہے اور مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔

اس کے بعد جان کی قدر و قیمت اور اس کی حفاظت، قتل وخونریزی کا وبال اور اس کی سزا، حدود وقصاص کے مسائل واحکام سب کی تفصیل بیان کرتا ہے، باطن وظاہر دونوں راستوں سے انسانوں کی انسانیت کو آواز دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

آیت کے الفاظ، ''جن جانوں کو اللہ نے محرم بنایا ہے ان کو حق کے سوا کسی اور طرح قتل نہ کرو۔'' (بنی اسرائیل)

قاتل کے لئے قصاص کا حکم دیا گیا، ارشاد ہے:

''تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص فرض کیا گیا، آزاد آزاد کے بدلے اور غلام غلام کے بدلے اور عورت عورت کے بدلے۔ (البقرہ)

قصاص کو زندگی تعبیر کیا اور قرآن نے بتایا:

آیت کے الفاظ، ''اورتمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقل مندو۔''
(بقرہ:۲۲)

ورثاء مقتولین قاعدہ کے مطابق قصاص میں قاتل کے قتل ہوجانے کے بعد ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں،لیکن اگر کوئی وارث مقتول اس کو بنیاد بنا کر پوری فضا خراب کرنے کی سعی کرنا چاہے تو اس کو اختیار نہیں دیا جائے گا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

آیت کے الفاظ، ''پھر جو اس فیصلہ کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔'' (بقرہ)

قتل کی اہمیت جتائی گئی اور اس کے نقصانات کی طرف اشارہ کر کے اعلان کیا گیا:

آیت کے الفاظ، ''اور اسی سبب سے ہم نے بنی پر لکھ دیا کہ جو کوئی کسی ایک جان کو بلاعوض جان کے یا بغیر ملک میں فساد کے قتل کردے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے ایک جان کو زندہ رکھا تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ کر دیا۔'' (المائدہ)

فساد اور ڈاکہ زنی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کو پھانسی دی جائے یا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹ ڈالے جائیں۔

آیت کے الفاظ، ''ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا پھانسی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں۔ یا شہر بدر کر دئے جائیں۔'' (المائدہ)

چور کی سزا یہ تجویز کی ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ گٹوں سے کاٹ ڈالے جائیں:

''والسارق والسارقة فاقطعوا ايديهما جزاء بما كسبا نكالا من الله.''
(المائدہ: ٦)

(اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت ان کے ہاتھوں کو کاٹ ڈالو، ان کے کرتوت کی سزا میں تنبیہ ہے اللہ کے طرف سے)۔

حدود وقصاص میں قطعاً کسی کی رعایت درست نہیں ہے، جو بھی جرم کا مرتکب ہوگا اور اس پر مقرر کردہ سزا مرتب ہو کر رہے گی ایک مخزومیہ خاتون کی سفارش پر نبی کریم ﷺ نے برافروختہ ہو کر فرمایا تھا کہ خدا کی قسم اگر محمد ﷺ کی لاڈلی فاطمہ بھی چوری کرے گی تو اس کا ہاتھ بھی شریعت کے مطابق کاٹا جائے گا۔

عفت وعصمت کا پاس:

جان کے برابر بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ قیمت عفت وعصمت اور پاک دامنی کی ہے ،اسلام میں اس کی حفاظت کا بھی پورا سامان فراہم کیا گیا اور خلاف ورزی پر سخت سزا تجویز کی گئی ہے،اسلام نے حکم دیا۔

آیت کے الفاظ، ''تم اپنے بے بیاہوں اور غلاموں اور لونڈیوں کا جو نکاح کے لائق ہوں نکاح کر دو اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو مالدار بنا دے گا۔'' (النور)

نکاح ایک عبادت ہے اور زن وشوہر کی زندگی محبت وپیار کی زندگی ہے:

''وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اِنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ''(روم.۳)

(اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی قسم سے جوڑے بنائے تا کہ تم ان کے پاس آرام کرو اور اس نے تم دونوں کے درمیان پیار اور مہربانی رکھ دی ہے)۔

پاک دامنی کو جو بھی غلط طور پر داغدار کرنے کی سعی کرے گا اسلام میں اس کے لئے سخت سزا ہے۔ چار عینی گواہ پیش نہ کرنے کی صورت میں اَسّی درے لگائے جائیں گے۔

''وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شهدآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا.'' (نور)

جولوگ پاک دامن والی عورت کوتہمت لگائیں پھر نہ لائیں چار مرد گواہ تو ان کو اَسّی درے لگاؤ اور کبھی ان کی کوئی گواہی قبول نہ کرو۔

آیت کے الفاظ، زنا سے بچنے کی جو تدبیریں بتائی گئی ہیں اگر کوئی اس کے باوجود زنا کا مرتکب ہوگا، تو غیر شادی شدہ کو سو درے لگائے جائیں گے اور شادی شدہ کو سنگ سار کیا جائے گا۔

''زنا کرنے والی عورت اور مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو درے مارو اور تم کو ان پر اللہ کا حکم چلانے میں ترس نہ آنے پائے، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا مسلمانوں کی ایک جماعت دیکھے۔'' (النور)

تعلیم وتربیت:

اس نظام میں تعلیم وتربیت پر بھی کافی زور دیا گیا ہے، حدیث میں جگہ جگہ علم کی فضیلت اور ترغیب ہے قرآن پاک کی اولین آیات جو نازل ہوئیں ان کا تعلق جبری تعلیم سے ہے، خود سرور کائناتﷺ جنہوں نے رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی، حضرت جبریلؑ نے اپنی پہلی آمد پر آپ کو پڑھنا سکھایا اور جب تک آپ نے قرآنی آیات کی تلاوت نہیں کی وہ بار بار تلاوت کے لئے فرماتے رہے:

''اِقْرَأ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَق'' (العلق)

اپنے رب کے نام سے پڑھ، جو سب کا پیدا کرنے والا ہے، انسان کو جمے ہوئے لہو سے بنایا۔

قرآن پاک میں علم کی فضیلت کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

''ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون ''(الزمر)(کیا سمجھ والے (اہل علم) اور بے سمجھ برابر ہو سکتے ہیں)۔

کہیں ترغیب کا پہلو اختیار کیا گیا اور فرمایا گیا:

''وما أوتیتم من العلم الاقلیلا '' (تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے)۔

زیادتی علم کے لئے دعا کا حکم دیا گیا ارشاد ہوا:

''قل رب زدنی علما '' (طہ۔۶) (آپ کہیں اے رب میرے علم میں زیادتی عطا فرما)۔

علم کی قدر و قیمت، علم والوں کی منزلت کے سلسلہ میں نبی کریمﷺ نے فرمایا:

فقیہ واحد افضل عنداللہ من الف عابد (مشکوٰۃ) ایک فقیہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہزار عبادت سے افضل ہے۔

رحمت عالمﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ طلبہ کی روشنائی شہدا کے خون سے زیادہ قیمتی ہے، کبھی فرمایا کہ طلبہ کے لئے روئے زمین کی ساری چیزیں دعا کرتی ہیں حتیٰ کہ مچھلیاں پانی کے اندر ان کے لئے دعا کرتی ہیں، یہ بھی ارشاد فرمایا کہ علم کا حاصل کرنا ہر مرد و عورت کے لئے فرض ہے اور جہاں سے اور جیسے ممکن ہو علم طلب کرو۔

دنیا میں علم کا ذوق سرورِ کائناتﷺ کی ترغیب کا نتیجہ ہے ابتدا میں مسلمانوں ہی سے علوم وفنون کا چرچا پھیلا اور دنیا کی دوسری قوموں میں علم وفن کا شوق پیدا ہوا، سائنس وفلسفہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو مسلمانوں کا رہین منت نہ ہو۔

اخلاق واعمال کی پاکیزگی:

رحمت عالمﷺ نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبہ جات کو سنوارا، وہیں آپ نے اخلاق واعمال کی بلندی وپاکیزگی پر بھی کافی توجہ دی اور یہ واقعہ ہے کہ اعمال واخلاق پر جو توجہ اسلام نے دی ہے، کہیں وہ موجود نہیں، غیر مہذب قومیں ان تعلیمات کی بدولت مہذب بن گئیں۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق قرآن کریم نے اعلان کیا:

"**انک لعلیٰ خلق عظیم**" (القلم۔۱) بیشک آپ بڑے خلق پر پیدا ہوئے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی پوری زندگی اخلاق وصداقت کا نمونہ تھی اور اسلام کی اشاعت میں آپ کی صداقت اور آپ کے اخلاق واعمال کو بڑا دخل ہے آپ کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے:

"**لقد جاء کم رسول من أنفسکم عزیز علیه ماعنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم.**) (توبه. ۱۲۸)

(تم میں سے تمہارے پاس ایک رسول آیا، جس سے تم کو تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ اس پر بھاری ہے اور تمہاری بھلائی بہت چاہنے والا ہے اور ایمان والوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے)۔

اس امت کو اس کا خصوصی شرف حاصل ہے کہ وہ مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے، اس امت کے سلسلہ میں ارشاد ربانی ہے:

"**کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر**". (آل عمران. ۱۱۰)

آنحضرت ﷺ نے اپنے متعلق صراحت فرمائی ہے:

"**انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**" (مشکوٰۃ) میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کو مکمل کروں۔ زندگی کے مختلف مراحل ہوتے ہیں، اسلام نے ہر مرحلہ میں اس کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے، حسن ادب پر زور دیا ہے اور احترام واکرام کی تاکید کی ہے۔

☆☆

سیرت رسولؐ میں عصر حاضر کے مسائل کا حل

● حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

رسول اللہ ﷺ کی سیرت دراصل تمام مسلمانوں کے لئے روشنی کا بلند اور عظیم الشان مینارہ ہے، جس کے ذریعہ وہ جاہلیت، غفلت اور گمراہی کی تاریکیوں کے ماحول سے رشد وہدایت اور عزت وسرفرازی کے وسیع میدان میں پہنچ سکتے ہیں اور ایک کشادہ شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ آج بھی اگر مسلمان اپنی کمزوری، بے بسی اور غلامی کے اسباب تلاش کریں اور اپنی ذلت ومسکنت اور رسوائی نیز باہمی عدم تعاون اور پسماندگی کا راز معلوم کرنا چاہیں تو ان تمام چیزوں کا بنیادی سبب اور اصل راز رسول اللہ ﷺ کے قائم کردہ نشان راہ سے انحراف اختیار کرنے میں مضمر نظر آئے گا، جسے آپ واضح اور تابناک بنا کر اس دار فانی سے رخصت ہوئے تھے، مسلمان آج بھی اپنی اور اپنی ملت کی کمزوری کے اسباب تلاش کر سکتا ہے، وہ اگر بنظر غائر اس کا جائزہ لے تو اس کو یہ کمزوریاں اپنے کردار، اپنی سیرت اور طرز زندگی میں محسوس طور پر نظر آئیں گی، جو اس کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب ہیں اور اس کو اصل الاصول کی حیثیت سے اپنائے ہوئے ہے، یہ طرز حیات اور روش سیرت نبوی سے مختلف اور بسا اوقات متعارض ومتضاد بھی ہے۔ اس کردار کا رسول اللہ ﷺ کے کردار سے کوئی تعلق نہیں، وہ کردار نبوت جس کا خاکہ آپ نے قولی وعملی حیثیت سے اپنی زندگی میں پیش کیا ہے۔

کیا نبی کریم ﷺ نے سنجیدہ اور ٹھوس لہجے میں ببانگ دہل یہ اعلان نہیں فرمایا دیا:

"لایومن أحدکم حتیٰ یکون هواه تبعاًلما جئت به " (تم میں کا کوئی شخص اس وقت تک حقیقی اور کامل مومن نہیں ہوسکتا، جب تک اس کی تمام خواہشات میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہوجائیں) ایک دوسرے موقعہ پر آپ کا ارشاد گرامی ہے:

"لایومن احدکم حتی یحب لأحبه مایحب لنفسه" (تم میں سے کوئی بھی مومن کامل قرارنہیں دیا جائے گا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز نہ پسند کرنے لگے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔ ان دونوں حدیثوں میں غور وفکر کرنے سے مندرجہ ذیل سوالوں کا تشفی بخش جواب ملتا ہے:

(۱) ہم ایمان ویقین کے اعتبار سے کیوں کمزور ہیں جب کہ ہمارے دشمن ہر اعتبار سے طاقتور ہیں۔

(۲) ہم زوال وانحطاط اور پسماندگی کا شکار کیوں ہیں، جب کہ وہ ہم سے زیادہ ترقی یافتہ اور کارزار حیات میں پیش رفت ہیں۔

(۳) ہم نصرت وتائید خداوندی سے کیوں محروم ہیں۔

(۴) ہم لایعنی اور اپنی شان سے فروتر چیزوں میں کیوں مصروف ہیں۔

(۵) ہم باہم دست وگریباں کیوں ہیں جب کہ دشمنان اسلام محبت والفت اور تعاون باہم کے اصول پر عمل پیرا ہیں۔

اور یہ اس طرح کے بے شمار سوالات کا انتہائی بہتر اور اطمینان بخش جواب ان دونوں حدیثوں میں موجود ہے۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ مسلمان ہوا پرستی میں مشغول، خواہشات کے نفس کے سامنے سرنگوں ہیں اور وہ اس حقیقت کو یا تو یکسر بھول گئے ہیں، یا نسیان کا مظاہرہ کررہے ہیں'' کہ ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک دین محمدی اور پیغام خداوندی کی مکمل پیروی نہ کرنے لگیں'' بایں معنی کہ کچھ بھی ہوجائے کیسے بھی حالات پیدا ہوجائیں، دنیا کے ارزاں

مجموعه القاسم: جلد دوم
سیرت محسن انسانیتؐ

مال ومتاع اور خواہشات نفس، ضروریات زندگی سے دین کے مقابلے میں یکسر نظریں پھیرلیں، ہوا وہوس سے مغلوب نہ ہوں، ان کے دلوں تک پہنچنے کا شیطان کو کوئی موقع نہ ملے، ان کے سینوں میں اغراض ومفاد پرستی کا کوئی گزر نہ ہو، اس لئے کہ وہ متبعین رسول ہیں، نہ کہ خواہش ونفسانیت کے اطاعت گزار اور اغراض اور خواہش نفس کے غلام۔

لیکن مسلمان اپنی قدیم روش پر باقی نہ رہے، جو پاک طینتی، پاک بازی، احتیاط، تقویٰ، خدا اور رسول خدا سے سچی محبت، ایمان کامل اور حقیقت ایثار وقربانی سے عبارت ہے۔ بلکہ حق بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو سیرت پیش کی اور جس کے ذریعہ لوگوں کو ہلاکت وبربادی کے گڑھے سے، جس کی طرف بڑی بے تابی اور برق رفتاری سے بڑھ رہے تھے، نکال کر روشنی کے کشادہ وپرامن راستے پر لا کھڑا کیا۔ مسلمانوں نے اس سیرت سے بے اعتنائی برتی اور غیروں نے اس کے بڑے حصے کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ مسلمانوں کی ذلت ورسوائی، شکستگی اور بلندی کے بجائے پستی، متاع عزت وشرف کے بجائے اسباب شقاوت، بے بہا دولت کے بدلے حقیر اور معمولی چیزوں کو اختیار کرلینے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے؟

کیا مسلمان اپنی تمام خواہشات کو حضور ﷺ کے لائے ہوئے دین کے تابع کئے بغیر عزت وسربلندی اور سرخ روئی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ جذبہ ایثار وقربانی کے بغیر قوموں میں قبول عام حاصل کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ کیا وہ فتح ونصرت کی توقع رکھتے ہیں۔ جب کہ وہ دشمنان اسلام کی حاشیہ برداری میں مشغول اور ظلم وزیادتی کرنے والوں کی ہم نوائی میں مصروف ہیں؟ کیا وہ رحمت الٰہی کے مستحق ہوسکتے ہیں جب کہ وہ غیروں کے لطف وکرم کی امید میں سراپا انتظار بنے ہوئے ہیں؟ کیا مسلمان زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی تعلیمات کو از سر نو نافذ نہیں کریں گے؟ کیا وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو پھر سے اپنے سینے سے لگا کر اپنا رہنما ومقتدیٰ اور تاریک زندگی کے لئے شمع ہدایت قرار

دے کر اپنی پوری زندگی اور سارے معاشرے میں اس کو عملی جامہ نہیں پہنائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ بلاکم وکاست اپنی پوری جامعیت وکمال کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ لہٰذا اس کا از سر نو اور باندازِ نو مطالعہ کرنا ضروری ہے اور اس کی روشنی میں زندگی گزارنے کا شوق انتہائی لازمی امر ہے۔

صحابہ کرام وتابعین عظام کی پوری زندگی مکمل طور پر ہمارے لئے سامنے ہے، جنہوں نے سیرت نبوی کو حرز جاں بنایا اور ہر حال میں اس کی پیروی کی، ہمیں ان کی زندگیوں میں غور وفکر کی ضرورت ہے، تاکہ اس ذخیرہ نایاب میں کوئی جوہر آب دار ہم کو دستیاب ہو جائے اور ہماری زندگی کا نقشہ یکسر بدل جائے اور تاریخ کا رخ یک لخت مڑ جائے اور وہ اپنی نئی اسلامی تاریخ کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

ذرا سنو! نبی کریم ﷺ کس قدر پرزور و پرشور انداز سے خطاب فرما ہیں اور ہمیں ایک اصول کی تلقین فرما رہے ہیں۔

"عَلَیکُم بِسُنَّتی وَسُنة الخلفاء الراشدینَ، عَضُّوا عَلَیُها بالنَّواجذ."

(اے لوگو! میری سنت اور توفیق یافتہ خلفائے راشدین کے طریقہ حیات کو سینے سے لگالو اور اس پر مضبوطی سے کاربند ہو جاؤ!)

☆☆

حقوق نسواں تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں

● حضرت مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی

رسالت ونبوت کے امین فخر الاوّلین والآخرین خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ کی حیات طیبہ کا ہر گوشہ اور آپ ﷺ کی پرنور زندگی کا ہر پہلو ارباب محبت کے قلوب اور اصحاب عشق کے دلوں کو ہمیشہ سے اپنی طرف کھینچتا رہا ہے اور بمصداق اس شعر کے:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اصحاب بصیرت آپ ﷺ کے دامن سے وابستگی اور آپ کے نقش پا کی پیروی کو سرمایۂ سعادت سمجھتے ہیں۔ آپ ﷺ کی ہر ادا پر اہل نظر کی جبین نیاز خم ہوئی ہے اور خم ہوتی رہے گی اور آپ ﷺ کے ہر طریقہ پر سر تسلیم جھکا ہے اور جھکتا رہے گا، انشاء اللہ۔

آپ کی سیرت مقدسہ مردہ لوگوں کے لئے آب حیات، گم گشتگان کے لئے خضر راہ، ظلمت وتاریکی میں سرگرداں لوگوں کے لئے مشعل راہ، جہاں وآوارگی میں بھٹکنے والے کے لئے منارہ نور بنی رہی ہے اور آئندہ بھی بنی رہے گی انشاء اللہ۔

شمس نبوت کے طلوع ہونے سے پہلے انسانیت کراہ رہی ہے، انسانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جارہے ہس۔ انسان دوسرے انسان کے جان ومال کا بھوکا نظر آرہا ہے۔ بعض انسانوں کے ساتھ نسلی وخاندانی اور علاقائی تفوق کی بنیاد پر یا شریف ورذیل کے امتیازی علامت کے طور پر جانور کا سا معاملہ کیا جارہا ہے یا صنف نازک کے حقوق انسانی کو سلب

کر کے محض ایک جانور یا گھریلو سامان کی حیثیت اس کو دے دی گئی ہے جس میں وراثت جاری ہوئی تھی۔ آتش پرست اپنی بہن بیٹی کو گھر میں ڈال لیا کرتے تھے، عرب کے ملحد اپنی حقیقی والدہ کو چھوڑ کر اپنے باپ کی تمام بیویوں کو اپنی لونڈیاں بنالیا کرتے تھے، یہ حال خاص جزیرۂ عرب تک محدود نہ تھا، بلکہ انسانیت کے حقوق کی پامالی اور انسانیت ہر ظلم وستم کے بادل الگ الگ رواج اور جدا جدا طریقوں سے پورے عالم میں چھائے ہوئے تھے۔

ایسے دور میں آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین بنا کر دنیا کے لئے امن وسلامتی راحت وعافیت کا پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا اور آپ کی ذات وسلامتی راحت وعافیت کا پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا اور آپ کی ذات والا صفات پر کلام الٰہی کی آیات نازل ہو کر اس کی عقدہ کشاء کرتی ہے، قرآن پاک نے بلاغت کے معجزانہ الفاظ میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا، پوری انسانیت کے اس کے حقیقی مقام ومرتبہ سے آشنا کیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"**ولقد کرمنا بنی آدم.**" (بلاشبہ ہم نے آدم کو معزز ومکرم بنایا ہے)۔

"**لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم.**" (**سورہ التین: ۳**) بلاشبہ ہم نے انسان کو سب سے عمدہ وپسندیدہ ساخت پر پیدا کیا ہے۔ انسان (اولاد آدم) کالا ہو یا گورا عربی ہو یا عجمی، شہری ہو یا بدوی، دولتمند ہو یا فاقہ مست، خالق ارض وسماء نے ساری ہی اولاد آدم کو معزز ومکرم بنایا ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر کوئی برتری وتفوق حاصل نہیں ہے بجز تقویٰ کے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "**ان أکرمکم عنداللہ اتقاکم.**" (**سورہ الحجرات:**) (اللہ کے نزدیک تم میں سب سے مکرم ومعزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار اور متقی ہو)۔ دنیا میں بسنے والے انسان کے کانوں میں جب یہ پیغام پہنچا تو درد وکرب سے ڈوبے ہوئے انسانوں کو اپنے مقام ومرتبہ سے آشنائی حاصل ہوئی اور ان کو پر عافیت زندگی کا ابدی سہارا ملا، سسکتی ہوئی انسانیت کے تن مردہ میں تازہ جان پیدا ہوئی اور ایسا معاشرہ تشکیل ہوا کہ:

نجاشی شاہ حبشہ، جیفر شاہ عمان، اکیدر شاہ دومۃ الجندل، نجد کے وحشی، تہامہ کے بدو اور یمن کے مسکین کے دوش بدوش کھڑے ہونے پر نازاں ہو رہے ہیں۔

یہودیوں کا زرخرید غلام سلمان فارسیؓ منا اہل البیت کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے اور بت پرستوں کے زرخرید غلام بلال حبشیؓ کو فاروق اعظمؓ بھی جن کی سطوت وہیبت سے قیصر وکسریٰ کے اندام پر لرزہ تھا سید سید (آقا آقا) کہہ کر پکار رہے ہیں۔ اسی پاکیزہ معاشرہ کے خوشنما اثرات تھے کہ امیر المؤمنین کا غلام اونٹ پر سوار ہے اور امیر المؤمنین عمرؓ اونٹ کی نکیل پکڑے بیت المقدس کی طرف سفر کر رہے ہیں اور ایک موقع پر امیر المؤمنین حضرت علیؓ قاضی شریح کی عدالت میں اپنے خصم کے بالمقابل مساویانہ انداز پر کھڑے ہو کر انصاف کے فیصلہ کے طالب ہیں۔

اس معاشرہ میں رنگتوں کا اختلاف، زبانوں کا تباین، قومیت کا تفرقہ، ملکی خصوصیات کا امتیاز سب کچھ جاتا رہا تھا، حسب ونسب کی شرافت کا زبان پر لانا کمینگی کی دلیل بن گیا تھا، یہ سب کرشمے اس پاک تعلیم کے تھے جو آہستہ آہستہ دلوں کو فتح کرتی جا رہی تھی۔ آپ ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات نے دلوں کو بدل دیا تھا اور روح کو پاکیزہ بنا دیا تھا۔

اسی طرح صنف نازک کی حالت صرف ملک عرب ہی میں نہیں، بلکہ دنیا میں موجود ہر سوسائٹی اور معاشرہ میں ایک جانور یا گھریلو سامان کی حیثیت سے زائد نہیں تھی۔ کلام الٰہی نے انسانیت کے مساویانہ حقوق کے دروازے کھولے اور اسلوب بلاغت کے اعلیٰ انداز میں یہ اعلان دنیا کو سنایا:

"**ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف.**" ان عورتوں کے لئے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے تمہارے ان کے اوپر صنف نازک کی حقوق تلفی، بلکہ ان کے حقوق کو تسلیم ہی نہ کرنا اور زور زبردستی سے اپنے ہی حقوق حاصل کرتے رہنا کے باطل پر زبردست ضرب لگائی اور معاشرتی زندگی کے مروجہ پورے نظام کو بدل کر ایک خوشنما اور پرسکون نظام قائم کیا۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات عالیہ اور عملی زندگی کے ذریعہ اس نظام کی مکمل تشریح ووضاحت فرمائی کہ صنف نازک کے ماں کی حیثیت سے ''اس کے پیروں کے نیچے جنت قرار دیا'' روایت کے الفاظ، ماں کو محبت بھری ایک نظر دیکھنے پر حج مقبول کا ثواب دئے جانے کا وعدہ کیا'' ''جو مسلمان اپنی ماں کی خدمت میں اجر وثواب کی نیت سے صبح سویرے سلام ومزاج پرسی کے لئے حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا ایک دروازہ کھول دیتے ہیں'' روایت کے الفاظ، ''اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ماں باپ کی خوشنودی میں ہے اور اللہ کی ناراضگی ماں باپ کی ناراضگی میں ہے'' روایت کے الفاظ، جس مسلمان کی ماں اس سے ناراض ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ناراض ہیں۔

بیوی کی حیثیت سے اس کے حقوق کو پہچاننے، اس کی رعایت اور دل جوئی کرنے کے لئے ایسے تاکیدی کلمات ارشاد فرمائے جس نے صنف نازک کو عزت ووقار شرافت وبلندی کا اونچا مقام عطا کیا۔ ارشاد فرمایا:

''**استوصوا بالنساء خیرا.**''(**ریاض الصالحین للندوی، مسلم**)

میں عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی تم کو تاکید کرتا ہوں اس کو قبول کرو۔ آپ نے خطبہ حجۃ الوداع میں جم غفیر کے سامنے جہاں اطراف عالم اور قبائل عرب کے نمائندے موجود تھے برملا یہ اعلان فرمایا:

''**فاتقوا اللہ فی النساء فانکم أخذتموھن بأمان اللہ واستحللتم فروجھن بکلمۃ اللہ**'' لوگو! بیویوں سے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو خدا کے نام کے ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا ہے اور خدا کے کلام سے تم نے ان کے جسم کو اپنے لئے حلال بنایا ہے۔

آپ نے ارشاد فرمایا روایت کے الفاظ، ''جیسا تم کھانا کھاؤ ان کو بھی کھلاؤ اور جیسا تم کپڑا پہنو ویسا (اس درجہ) ان کو بھی پہناؤ۔'' آپ کی تعلیمات نے عورت کو ذلت کی

گہرائیوں سے نکال کر شرافت وعزت کے عروج پر پہنچایا انسان کے کمال ایمان کی علامت عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کو قرار دیا اخلاقی بلندیوں پر پہنچنے کے لئے عورتوں کے ساتھ حسن اخلاق کا برتاؤ کرنے کو ضروری ٹھہرایا۔

ارشاد فرمایا: ''**اکمل المؤمنین ایمانا احسنھم خلقا وخیارکم خیارکم نساء کم.**'' (تمام مسلمانوں میں ایمان کے لحاظ سے کامل وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اعلیٰ ہوں اور تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ (برتاؤ کرنے میں) بہتر ہوں)۔

دنیا کی نفع بخش سودمند چیزوں میں ''نیک عورت کو سب سے بہترین چیز قرار دیا'' اور روایت کے الفاظ، ''اپنی پسندیدہ چیزوں میں عورت کو قرار دیا'' روایت کے الفاظ، جس سے عورت کا مقام ومرتبہ کس قدر بلند ہوگیا۔ لڑکی کو ہر معاشرہ میں کمتر وبے قدر سمجھا جاتا تھا اسے والدین کے لئے ایک بوجھ اور باعث ننگ وعار چیز تصور کیا جاتا تھا۔ قرآن پاک نے اس تصور باطل کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کھوٹی ذہنیت کے چول، بلادئے، ارشاد فرمایا:

اور جب خوشخبری ملے ان میں کسی کو بیٹی کی سارے دن میں منہ اس کا سیاہ اور جی گھٹتا رہتا ہے، چھپتا پھرے لوگوں سے مارے برائے اس خوشخبری کے جو سنی اس کو رہنے دے ذلت قبول کرکے یا اس کو داب دے مٹی میں سنتا ہے برے فیصلہ کرتے ہیں۔

آپ نے لڑکی کے وجود کو باعث رحمت اور مدد خداوندی کا ذریعہ قرار دیا اور ارشاد فرمایا ''جب کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کے یہاں فرشتے بھیجتے ہیں جو آکر کہتے ہیں اے گھر والو! تم پر سلامتی ہو اور لڑکی کو اپنے پروں کے سایہ میں لیتے ہیں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ کمزور جان ہے حوا کی کمزور جان سے پیدا ہوئی ہے جو اس بچی کی نگرانی وپرورش کرے گا قیامت تک خدا کی مدد اس کے شامل حال رہے گی۔'' روایت کے الفاظ۔

لڑکیوں اور بیٹیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ان کی اچھی تعلیم وتربیت کرکے ان کے نکاح سے فارغ ہوجانے پر دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنے اور ایک روایت میں جنت کے اعلیٰ مقام میں اپنی معیت کا وعدہ فرمایا۔

آج کا دور حقوق انسانی کو پامال کرکے اور حقوق نسواں کو ضائع کرکے ان کی حیثیت کو بے وقعت کرنے میں ساڑھے چودھ سو سال قبل کے دور سے مختلف نہیں ہے۔ آزادی نسواں کا پرفریب ڈھونگ اور حقوق انسانیت کے تحفظ کا بے معنیٰ دعویٰ سیاسی بازی گری سے کم نہیں ہے۔ اگر انسانیت کو اس کے اصلی مقام پر رکھنا ہے اور انسانوں کے جان ومال اور عزت کا تحفظ صحیح معنوں میں کرنا ہے اور عورتوں کو ان کا اصلی مقام حقیقی اور واقعی مقام ومرتبہ دینا ہے۔ ان کے حقوق کو پہچاننا ہے تو اس کے لئے آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے ان اوراق کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے جس میں آپ ﷺ نے حقوق انسانیت اور حقوق نسواں کو صرف قولی طور پر نہیں، بلکہ عملی طریقہ سے برت کر اور عمل پیرا ہوکر دکھلایا ہے اور صرف خود اپنی ذات ہی سے عمل نہیں کیا، بلکہ انسانی معاشرہ کو اس کی دعوت دی ہے اور تاریخ وسیرت کے اوراق گواہ ہیں کہ حقوق انسانیت کے تحفظ اور حقوق نسواں کی بحالی سے ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں نہ زور وزبردستی ہے اور نہ ہی بے چینی واضطراب ہے، بلکہ چین وسکون ہے، خدا ترسی ہے۔ حقوق کی ادائیگی نہ کرنے پر آخرت کی بازپرس کا احساس وخوف ہے اور شخص حقوق حاصل کرنے کی فکر سے زیادہ حقوق ادا کرنے کا فکرمند ہے۔

آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ نے جس طرح قرون اولیٰ میں عالم انسانیت کو چین وسکون، عزت وعافیت کی دولت عطا کی آج بھی آپ کی سیرت وتعلیمات ترقی وفلاح عزت وکامیابی، سکون واطمینان کی ضامن ہے۔

آج کے اس دور میں جبکہ ہر طرف حقوق کی پامالی کا ڈنکا بج رہا ہے، ظلم وستم زور وزبردستی کا دور دورہ ہے جس کے نتیجہ میں چہار سو حقوق طلبی کا شور برپا ہے، مانگ پوری

کرنے اور حقوق کی بازیابی کے لئے جنگ وجدل لڑائی جھگڑا، نفرت وعداوت کا بازار گرم ہے۔ ایسے دور کے لئے مظلوم وستم رسیدہ، دبے اور پسے انسانوں کی تسلی کے واسطے نبی امی فداہ ابی وامی ﷺ سکون بخش، مسرت افزا اور مبنی پر صداقت یہ وعدہ ارشاد فرما گئے ہیں:

عن ابی اُمامۃ الباہلیؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: **انا زعیم بیت فی ربض الجنۃ من ترک المراء وان کان محقا وبیت فی وسط الجنۃ لمن ترک الکذب وان کان مازحاً وبیت فی اعلیٰ الجنۃ لم حسن خلقہ.** (حدیث صحیح رواہ ابوداؤد۔ بحوالہ ریاض الصحالین ص ۱۱۷)

(امامہ باہلیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اس شخص کے لئے جس نے جھگڑے کو چھوڑ دیا ہے چاہے حق بجانب ہی کیوں نہ ہو جنت کے کنارے ایک مکان کا ذمہ دار ہوں اور جس نے جھوٹ (غلط بیانی) کو ترک کردیا اگرچہ مذاق ہی کے طور پر، جنت کے درمیانی حصہ میں ایک مکان کا ذمہ دار ہوں اور جس کا اخلاق بلند واعلیٰ ہو اس کے لئے جنت کے اعلیٰ حصہ میں ایک مکان کا ذمہ دار ہوں)۔

آپ ﷺ جس طرح ظالموں وستم گروں کے محسن ہیں کہ ان کو عدل وانصاف نرمی وحسن اخلاق کا راستہ دکھلایا، اسی طرح مظلوموں وستم زدوں کے بھی محسن ہیں کہ ان کے حقوق سے دنیا کو باخبر کیا اور انصاف کے بند دروازوں کو آپ نے ان کے لئے مفتوح فرمایا۔

پھر بھی کوئی ستم گر اگر ستم سے باز نہیں آتا، مظلوم کو اس کا حق نہیں مل پاتا تو آپ ﷺ نے ایسے حقوق سے محروم ومظلوموں کو تسلی وتسکین کے کلمات سے جنت کے اعلیٰ مقامات کی بشارت سنائی ہے۔

☆☆

حضور اکرم ﷺ اور تعدد ازدواج

● مولانا محمد جعفر شاہ

مقالہ لکھنے کا سبب:

اس وقت یہ مقالہ سپرد علم کرنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ ایک طرف عموماً مسیحی اور دوسرے غیر مسلم اوران کے ہمنوا آزاد خیال حضرات کی نظروں میں حضور اکرم ﷺ کا بیک وقت نو بیویاں رکھنا بہت کھٹکتا ہے اور دوسری طرف خود مسلمان حضور ﷺ کی صحیح پوزیشن کو نہ سمجھنے کے باعث ہر حال میں تعدد ازدواج کو ایک ''سنت'' قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں نظریئے نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ اس لئے ہم ہر ایک پر الگ الگ بحث کریں گے۔

متعدد شکوک:

تعدد ازواج پر ایک شبہ یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری سوکن لانا ایک بے رحمی کا پہلو رکھتا ہے، کیونکہ عورت اسے کبھی ٹھنڈے دلوں کو گوارا نہیں کرتی۔ ہم یہاں پہلے ایک عقلی سوال پیش کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص سے جس کی بیوی موجود ہے اور اسے کوئی دوسری عورت بری طرح دل دے بیٹھتی ہے۔ اب دیکھئے اگر وہ اسے حبالۂ عقد میں لے آتا ہے، تو بیوی کی دل شکنی ہوتی ہے اور اگر ایسا نہیں کرتا تو دوسری عورت کی زندگی خراب ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ایک ایک خرابی لازم ہے۔ لہٰذا کسی ایک کو ''أهون البليتين'' (Lesser Evil) کے طور پر اختیار کرنا پڑے گا اور ایسے مواقع پر صحیح راہ عمل یہی ہوگی کہ بیوی کا حق چونکہ مقدم ہے، اس لئے دوسری عورت کی دل

شکنی یا اس کی زندگی کی خرابی کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر خود مرد کا اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے اسی طرح کا قلبی تعلق پیدا ہو جائے، تو اس صورت میں بھی اسے اپنی بیوی کی خاطر اپنے تمام جذبات کو دبانا چاہیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس طرح مذکورہ صورت میں بیوی کے مقابلے میں اپنی، یا دوسری عورت کی رعایت نہ کرنا ''أهون البليتين'' ہے۔ اسی طرح کسی موقع پر خود بیوی کی رعایت نہ کرنا ''أهون البليتين'' ہوسکتا ہے یا نہیں؟ ہماری عقل کہتی ہے کہ ہوسکتا ہے۔ (یہ ضرورتیں کیا ہوسکتی ہیں ان کا ذکر آگے آئے گا)

دوسرا شبہ:

حضورؐ کے تعدد ازدواج پر غیر مسلموں کا ایک ناگفتہ بہ الزام یہ بھی ہے کہ خاکم بدہن اس کا سبب ہوائے نفسانی کا غلبہ تھا۔ ذرا سوچئے:

الف۔ کیا اس انسان کے متعلق ہوائے نفسانی سے مغلوب ہونے کا وہم بھی ہوسکتا ہے، جس نے پچیس سال کا زمانۂ تجرد کمال عفت و پاکبازی سے گزارا ہو اور اس پچیس سال کی عمر میں نکاح بھی کیا ہو، تو ایک ایسی عورت سے جو اس سے پندرہ سال بڑی، یعنی چالیس کی ہے جو پہلے دو شوہروں کی بیوی رہ چکی ہے اور صاحب اولاد بھی ہے اور جو خود پیغام نکاح دیتی ہے؟

ب۔ اسے ایک دوشیزہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں، کیونکہ وہ خود تندرستی و جمال میں یگانۂ روزگار ہے، ساری قوم کا محبوب ہے، خاندانی وقار کا مالک ہے، عرب میں عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور جس کا جی چاہے دس دس عورتیں رکھ لیتا ہے۔

ج۔ پچاس سال کی عمر تک، یعنی پورے پچیس سال اسی ایک بوڑھی صاحب اولاد اور گزشتہ دو شوہروں کو دیکھنے والی عورت کی رفاقت پر قانع رہتا ہے اور اشارۃً بھی کسی دوسری رفیقۂ حیات کی خواہش نہیں کرتا۔

د۔ اس رفیقہ (حضرت خدیجہؓ) کی وفات کے بعد اپنی عمر کے پچاسیویں سال بالکل اپنی ہم سن پچاس سال کی بڑھیا (سودہؓ) سے نکاح کرتا ہے اور اپنی عمر کے پچپن سال تک اسی ایک بوڑھی عورت کا رفیق بنا رہتا ہے اور کسی دوسری کی طرف رخ بھی نہیں کرتا۔

ہ۔ اس کے بعد پچپن سال کی عمر سے انسٹھ سال کے درمیان میں جو نو عورتیں حبالۂ عقد میں آتی ہیں ان میں ساری عورتیں ایسی ہیں، جو ایک، دو اور تین تین شوہروں کی بیویاں رہ چکی ہیں۔

کیا ان تمام حقائق پر نگاہ رکھتے ہوئے یہ گمان بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس انسان میں غلبۂ نفسانی کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی موجود تھا؟ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ۵۵ سال سے ۵۹ سال تک کے درمیان فقط پانچ سال کے لئے (نعوذ باللہ) ساری ہوسناکیاں دفعتہً پیدا ہوگئیں؟ کیا نفسانی ہیجان صرف ۵۵ سال کی عمر تک ہوا کرتا ہے؟ نہ پہلے نہ بعد میں؟

و۔ پھر یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ہوائے نفسانی کی تکمیل کا تو بہترین موقع اسی وقت تھا جب (۵ یا ۶ نبوی میں) تبلیغ دین روک دینے کے عوض میں ساری قوم دولت، سیادت اور حسین ترین عورتیں پیش کر رہی تھی۔ اس سے بہتر موقع ہوسناکیوں کی تکمیل کا اور کیا ہوسکتا تھا؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت حرم سرائے نبوت میں ایک ساٹھ سال کی صاحبِ اولاد بڑھیا (خدیجہؓ) کے سوا اور کوئی بھی موجود نہیں۔

ز۔ اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ سارے عرب پر اقتدار و فرمانروائی قائم ہو چکنے کے بعد نو بیویوں پر مزید اضافے سے کیا چیز روک سکتی تھی؟

ح۔ ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے کہ جن لوگوں کو حضورؐ سے واسطہ تھا، ان میں عربی و عجمی، دوست و دشمن، جاہل و متمدن سب ہی قسم کے لوگ تھے۔ حضورؐ میں اگر ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ ہوسنا کی ہوتا، تو دشمن کو اس سے بہتر پروپیگنڈے کا اور کیا حربہ ہاتھ آ سکتا تھا؟ انہوں نے شاعر کہا، مجنون کہا، خواہشمند اقتدار ہونے کا طعنہ بھی دیا۔ سارے الزام

لگائے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کوئی سخت سے سخت دشمن بھی نفسانی ہوسنا کیوں کا الزام نہیں لگاتا۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ جن لوگوں کی آنکھوں کے سامنے حضور ﷺ نے تعداد ازدواج فرمایا تھا، وہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ اونچا انسان مغلوب النفس نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کی مصلحتیں وہی ہوسکتی ہیں جو اس کی ساری زندگی کے حرکت وسکون میں جھانکتی ہیں۔

تیسرا شبہ:

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ امت کے لئے تو "مثنیٰ و ثلث و ربع" (سورہ النساء:) کے نزول کے بعد چار تک کی تحدید کر دی گئی اور جن امتیوں کے پاس چار سے زائد بیویاں تھیں، ان سے چار کے علاوہ کو جدا کرا دیا گیا، لیکن خود حضورؐ نے اس پر عمل نہیں فرمایا بلکہ جو نو بیویاں نزولِ آیت کے وقت تھی وہ بدستور رہیں۔ اپنے لئے یہ رعایت اور امت کو اس رعایت سے محروم رکھنے میں کیا مصلحت ہوسکتی ہے؟

بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے لئے یہ رعایت ہے اور امت اس رعایت سے محروم ہے، لیکن دراصل معاملہ برعکس ہے۔ مندرجہ ذیل حقائق پر غور فرمائیے۔

ا۔ ہر مسلمان کے لئے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیوں سے نکاح جائز ہے، لیکن حضور کے لئے ان سے اسی صورت میں نکاح جائز ہے، جب کہ ان عورتوں نے ہجرت کی ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے: "وَبنٰت عمک وبنک عمّتک وبنٰت خالک خالتک التی خرجن معک."

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کے سگے اور مہربان چچا ابو طالب کی بیٹی ام ہانی حضور کے لئے حلال نہ تھیں، کیونکہ وہ ایمان ہی فتح مکہ کے بعد لائی تھیں، جب کہ ہجرت ختم ہو چکی تھی۔

ب۔ ہر امتی بشرطِ عدل وضرورت چار بیویاں رکھ سکتا تھا، لیکن قانوناً وہ ان سب کو یا

بعض کو الگ کر کے دوسری عورتوں کو حبالہ عقد میں لا سکتا تھا، وہ اس طرح قانون سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سیکڑوں نکاح کر سکتا تھا، لیکن رسول ﷺ کے لئے ان نو عورتوں کے بعد ہمیشہ کے لئے نکاح کا دروازہ بند ہے۔ ارشاد قرآنی ہے کہ: ” **لا حل لک النساء من بعد ولا أن تبدل بهن من أزواج ولوا عجبک حسنهن.** “

(اے رسولؐ! اب ان موجودہ نو ازواج کے بعد آپ کے لئے دوسری عورتیں حلال نہیں اور نہ ان کو الگ کر کے دوسری ازواج کرنا حلال ہے، اگر چہ ان دوسری عورتوں کا حسن آپ کو بھاتا ہو)

ان آیات سے جو واضح نتیجہ نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ:

۱۔ امت کا کوئی فرد ایک بیوی کی وفات کے بعد یا ضرورت ہو تو زندگی میں دوسری اور یوں ہی تیسری، چوتھی جتنی بھی چاہے بیویاں کر سکتا ہے، لیکن رسولؐ کے لئے ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے بعد یہ دروازہ بند ہے۔

۲۔ امت کے لئے بیویوں کو طلاق دے کر اس کی بجائے دوسری بیویاں کرنے کا امکان موجود ہے، لیکن رسولؐ کو اس کی بھی اجازت نہیں۔

۳۔ امت کے لئے ناموافقت مزاج یا کسی دوسری عورت کی کشش حسن تبدیل زوج کا بہانہ بن سکتی ہے، لیکن رسول ﷺ کے لئے یہ راہ بھی مسدود ہے۔

ذرا انصاف سے دیکھئے! رعایتیں امت کے لئے ہیں یا رسول کے لئے؟ یہاں زیادہ سے زیادہ چار کی تحدید ہے، لیکن موتِ زوجہ، ناموافقت مزاج اور کسی کی کشش حسن تبدیل وتجدید ازواج کے بہانے بن جاتے ہیں، لیکن وہاں ایک کے سوا ساری عورتیں سنِ رسیدہ بیوہ ہونے کے باوجود نہ تحدید بعد الموت کی اجازت ہے نہ تبدیل بعد الطلاق کی اور نہ نو پر کسی اضافے کی۔ غور سے دیکھئے رعایت امت کے لئے زیادہ ہے یا خود رسول ﷺ کے لئے؟

یہ بتانے کے بعد کہ حضورؐ کے تعدد ازدواج میں ہوائے نفسانی کے غلبے کا کوئی شائبہ

تک نہ تھا، اب ہم ان مصالح کا ذکر کریں گے جن کی وجہ سے حضور ﷺ کو متعدد نکاح کرنے پڑے۔ یہ مصالح ذاتی نہ تھے، سراسر قومی و دینی تھے۔ ان کا افادی پہلو صرف اس قدر نہ تھا کہ کرنے میں ملی فائدے تھے، بلکہ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ نہ کرنے میں بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوتی تھیں۔ ہم بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ کسی اہم واقعے پر غور کرتے وقت اپنا ماحول پیش نظر رکھتے ہیں، حالانکہ ہر واقعے کو اس کے اپنے زمان و مکان اور اپنے احوال وظروف کی Setting میں رکھ کر دیکھنا چاہئے۔ اب امہات المؤمنین کے مصالح عقد پر غور کیجئے!

۱۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا:

ان کا پہلا نکاح سکران بن عمرو بن عبدود سے ہوا تھا۔ یہ اپنے شوہر سے پہلے ایمان لے آئی تھیں اور ان ہی کی ترغیب سے ان کے شوہر بھی اسلام لے آئے۔ حضرت سودہؓ نے اپنے خاوند اور والدہ کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ ادھر سکران کا حبش میں اور ادھر حضرت خدیجہؓ کا مکہ میں انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر بھی پچاس سال کی تھی اور حضور ﷺ کی عمر بھی اتنی ہی تھی۔ حضورؐ نے ان کی قربانیوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے مصائب کو ختم کرنے کے لئے اپنے نکاح میں لے لیا۔ ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ ایک پچاس سال کی ہم عمر اور بیوہ عورت سے یہ نکاح صرف سودہؓ اور ان کے خاندان کی قربانیوں، سبقت الی السلام اور ہجرت حبشہ وغیرہ ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ نفسانیت کا تو اس میں شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت سودہؓ کا یہ حال تھا کہ انہوں نے صاف لفظوں میں فرمایا کہ مجھے حضورؐ کی کنیزی کا شرف بہت کافی ہے۔ اس لئے میں اپنی باری عائشہؓ کو دیتی ہوں۔

۲۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ:

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد باوجود اس کے پچاس سال کی بوڑھی حضرت سودہؓ سے نکاح کر لیا تھا، لیکن حضرت خدیجہؓ کی جدائی سے حضور اکرم ﷺ مغموم سے رہتے۔

کیونکہ یہ سنِ میں حضورؐ سے پندرہ سال بڑی ہونے کے باوجود اول مومنہ تھیں۔ زندگی بھر مالی ایثار کرتی رہیں اور ہر سرد وگرم کو جھیلتی رہیں۔ ایسی رفیقہؓ حیات کی جدائی سے حضور کا ملول ہونا قدرتی بات تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کو بھانپ لیا اور اپنی لختِ جگر کو حضور کی کنیز میں دینے کی درخواست کی۔ کیا حضورﷺ اس صدیق کی درخواست کو رد فرما سکتے تھے، جس نے اسلام لانے میں سب سے پہلے قدم بڑھایا۔ متعدد سعید روحوں کو اسلام کی رغبت دلائی اور ہر ہر قدم پر ایثار میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا اور رفاقت میں ''ثانی اسلام وغار و بدر و قبر'' ثابت ہوا۔

۳۔ حفصہ بنتِ عمر بن الخطاب:

پہلا نکاح خنیس ابن حذافہ سلمی سے ہوا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو فطرۃً ان کے عقد ثانی کا خیال ہوا۔ پہلے آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے نکاح کر لینے کو کہا، مگر آپ خاموش رہے، پھر حضرت عثمانؓ سے ذکر کیا۔ اس وقت حضرت عثمانؓ کی پہلی بیوی رقیہؓ بنت رسول اللہ قضا کر چکی تھیں۔ اس لئے حضرت عمرؓ کو خیال تھا کہ شاید ضرور حفصہؓ سے رشتہ کر لیں گے، لیکن حضرت عثمانؓ نے ٹال دیا۔ اس سے حضرت عمرؓ کو کچھ ملال ہوا اور حضورؐ سے اس ملال کا ذکر کیا۔ حضورؐ نے ایک عجیب بلیغ جملہ فرمایا کہ: **یتزوج عثمان من ھو خیر من حفصة ویتزوج حفصة من ھو خیر من عثمان.** یعنی عثمان کو حفصہؓ سے بہتر بیوی اور حفصہ کو عثمان سے بہتر شوہر ملے گا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کا حضورؐ نے دوسری دختر حضرت ام کلثومؓ سے نکاح کر دیا اور حضرت حفصہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہؓ کا ذکر فرمایا، تو میں خاموش رہا تھا، جس سے شاید تمہیں کچھ خیال پیدا ہوا ہو، لیکن بات یہ تھی کہ مجھے پہلے ہی حضور کے عندیے کا پتہ چل چکا تھا۔ اس لئے میں خاموش رہا کہ جب تک حضورؐ صاف

لفظوں میں انکار یا اقرار نہ فرمالیں۔ میں بھی انکار یا اقرار نہ کروں۔ حضرتؓ حفصہ بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح کچھ تیز مزاج سی تھی اور حضرت عثمانؓ نے غالباً اسی وجہ سے ان سے نکاح کرنا ناپسند کیا ہوگا۔ بہر کیف حالات یہ تھے کہ حضرت حفصہؓ کو کوئی معقول رشتہ نہ ملتا تھا اور باپ کو فطرۃً اس کی فکر تھی۔ باپ بھی ایسا جو زندگی بھر اسلام کی راہ میں ہر ایثار کے لئے وقف رہا۔ اس کی دلداری کا اس سے بہتر اور کیا سامان ہوسکتا تھا جو حضورؐ نے کر دیا۔

۴۔ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ:

ان کا پہلا نکاح طفیل بن حارث بن عبدالمطلب سے دوسرا عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب سے اور تیسرا نکاح عبداللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ یہ عبداللہ بن جحش ام المؤمنین زینت بنتِ جحش (جن کا ذکر آگے آئے گا) کے بھائی اور حضور کے پھوپھی زاد برادر ہیں۔ یہ غزوہ احد میں شہید ہوئے، تو حضورؐ نے نہ فقط قرابت کا لحاظ فرمایا، بلکہ شہادت احد سے پیدا ہونے والی ملی پیچیدگی کو دور فرمانے کے لئے ان سے نکاح فرمالیا۔ یہ دراصل قدردانی (Noitaicepra) تھی ان جانثاروں کی قربانیوں کی، تاکہ راہِ خدا میں جان دینے والوں کے اہل وعیال بے سہارا نہ رہیں اور دوسروں کو بھی اس نوع کی قدردانی کی ترغیب ہو۔

۵۔ حضرت ام سلمہؓ:

ان کا پہلا نکاح ابوسلمہ سے ہوا تھا یہ حضورؐ کے رضاعی بھائی ہیں اور گیارہویں مسلمان ہیں۔ انہوں نے ہجرتِ حبشہ بھی کی تھی اور پھر مکہ واپس آکر ہجرت مدینہ سے بھی سرفراز ہوئے۔ جب یہ ہجرت مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو ان کے بچے سلمہ کو ان کے خاندان والوں نے اور ان کی بیوی ام سلمہ کے خاندان والوں نے یہ کہہ کر چھین لیا کہ تم جہاں چاہو جاؤ، مگر ہم اپنے خاندان کے کسی فرد کو تمہارے ساتھ نہ جانے دیں گے۔ ابوسلمہ نے اس

کے باوجود عزم ہجرت کو پورا کیا۔ام سلمہ ہر روز شام کو اس مقام پر آ کر رویا کرتی تھی، جہاں ان کے شوہر سے ان کو چھینا گیا تھا۔ایک سال تک وہ اسی طرح رویا کرتی تھیں، مگر ترکِ اسلام کا بھی خیال بھی نہ آیا۔آخر سنگدلوں کے دل بھی پسیج گئے اور وہ بھی مدینے پہنچ گئیں۔ ان کے شوہر ابوسلمہؓ بدری ہیں اور غزوۂ احد میں بھی شریک ہوئے جہاں زخمی ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔وفات کے وقت انہوں نے دعا کی کہ ''**اللھم اخلصنی فی أھلی بخیر.**'' (خداوندا میرے کنبے کی اچھی طرح نگہداشت فرما) دو خوردسال لڑکے عمر و اور سلمہ چھوڑے اور دو لڑکیاں زینت اور درہ۔غور کیجئے، رضاعی بھائی ہے، جس نے سبقت الی الاسلام بھی کی اور حبشہ و مدینہ دونوں کی ہجرتوں سے بھی سرفراز ہوا۔ہجرتِ مدینہ کے وقت کڑی آزمایشوں میں پڑا اور کھرا اترا۔وہ چار بچے چھوڑ کر مرتا ہے اور بیوی ام سلمہ کی قربانیاں بھی کم نہیں۔ابوسلمہ اور ام سلمہ کی ان قربانیوں کا کیا صلہ ہونا چاہیے تھا اور معصوم بچوں کی کفالت کی کیا شکل پیدا کرنی چاہئے تھی جس کے لئے ابوسلمہ نے مرتے وقت دعا بھی کی تھی؟ انہیں اہم سوالوں کا جواب تھا ام سلمہ کا ام المومنین بن جانا۔

۶۔حضرت زینب بنت جحش:

یہ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ان کا پہلا نکاح زید بن حارثہ کے ساتھ حضور نے خود کر دیا تھا، تاکہ زید کے ساتھ مصنوعی غلامی کی جو حقارت بلاوجہ وابستہ ہے، وہ ختم ہو جائے اور ساتھ ہی خاندانی تفاخر کا بھی خاتمہ ہو جائے۔زید کا پہلا نکاح ایک حبشی الاصل خاتون حضرت ام ایمن سے ہوا تھا جو زید سے دو چند بڑی تھیں۔ان دونوں کی زندگی خوشگواری کے ساتھ گزری، لیکن زینب بنت جحش زید کے ساتھ نہ نباہ سکیں۔نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ حضورﷺ اگر زینب سے خود نکاح فرمانا چاہتے تو ہزاروں جان سے زینب اسے منظور فرما لیتیں اور حضور کنوارے پن ہی میں ان سے نکاح فرما لیتے، لیکن حضورؐ تو صرف غلام

و آزاد کی اونچ نیچ کے فرق کو مٹانا چاہتے تھے۔اس لئے زید سے زینب کو بیاہ دیا، لیکن طلاق کی نوبت آنے کے بعد زینب کے ٹوٹے ہوئے دل کو کس طرح جوڑا جا سکتا تھا؟ اور اس سے زیادہ اہم ایک اور چیز بھی سامنے آ گئی۔عرب کے دستور کے مطابق منھ بولا بیٹا حقیقی فرزند کی طرح حقوق رکھتا تھا۔وہ وارث ہوتا تھا اور اس کی بیوی حقیقی بہو کی طرح باپ کے لئے حرام سمجھی جاتی تھی۔حضورﷺ کو جہاں زینب کی طلاقی تحقیر کو عزت سے بدل کر اشک شوئی منظور تھی وہاں ہمیشہ کے لئے ایک قانون بھی دینا تھا، کہ منہ بولے فرزند کا رشتہ حقیقی فرزند جیسا نہیں ہوتا، جو اس کی بیوی منہ بولے باپ پر حرام ہو جائے۔یہ معاملہ اتنا اہم تھا کہ ازواج مطہرات میں صرف زینب ہی ایسی عورت ہیں جن کے لئے قرآن میں'' **زوجنکم**'' (ہم نے ان کو تم سے بیاہا ہے) کا لفظ آیا ہے اور تنہا زید ہی ایک ایسے صحابی ہیں، جن کا نام بھی قرآن میں آیا ہے۔اس بے معنی رسم تبنیت اور اس پر مصنوعی تعمیر قرابت و وراثت وغیرہ کو توڑنے کے لئے ایک زبردست عملی نمونے کی ضرورت تھی اور یہی ضرورت نکاحِ زینب کا باعث ہوئی۔ورنہ اگر صرف زینب کی چاہت ہوتی تو نکاحِ زید سے پہلے ہی اس سے کونسی چیز روک سکتی تھی؟

۷۔حضرت جویریہؓ بنت الحارث:

یہ بنوخزیمہ، یعنی بنومصطلق کے خاندان سے تھیں۔یہ غزوہ مریسیع، یعنی غزوۂ مصطلق میں اسیر ہو کر آئی تھیں اور ثابت بن قیس بن شماس کے حصے میں آئیں۔ان کا پہلا نکاح ایک مصطلقی فرد مسافح بن صفوان سے ہوا تھا۔ثابت سے انہوں نے رہا کر دینے کی درخواست کی، مگر انہوں نے زرِفدیہ طلب کیا۔یہ حضورؐ کے پاس آئیں اور ''مدارج النبوۃ'' کی روایت کے مطابق اسلام بھی لے آئیں اور حضورؐ سے عرض کیا کہ میں سردار قوم حارث بن ابی کی بیٹی ہوں، لہٰذا مجھ سے بہتر سلوک کیا جائے۔حضورؐ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر سلوک نہ ہوگا کہ

میں تمہاری طرف سے زرفدیہ دے کر آزاد بھی کردوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لوں؟ حضرت جویریہؓ نے اسے بخوشی منظور کرلیا۔ یہ بھنک پہنچتے ہی تمام لوگوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اگر جویریہؓ ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا تو ہم رسول اللہ ﷺ کے اصہار (سسرالی رشتہ داروں) کو بطور اسیر نہیں رکھیں گے۔ بنومصطلق کے قیدی چھ سو کی تعداد میں تھے، جن میں سیکڑوں جویریہؓ کے رشتہ دار تھے۔ یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اگر حضور ﷺ ان سے نکاح کے خواہشمند ہوتے، تو ثابت بن قیس کے حصے میں ان کو دینے کے بجائے خود ہی اپنے حصے میں لے سکتے تھے، لیکن اب معاملے میں پیچیدگی یوں پیدا ہوگئی کہ اگر ان کو زرِ فدیہ دے کر آزاد کردیا جاتا ہے، تو یہ تنہا آزاد ہوکر گھر چلی جاتیں ہیں، لیکن اگر حضور سے نکاح ہوجاتا ہے تو خود ان کے سیکڑوں رشتے دار اور ساتھ ہی دوسرے قیدی (جن کو ملا کر چھ سو قیدیوں کی تعداد ہوتی ہے) ایک لحظے میں آزادی کی سانس لیتے ہوئے گھروں کو واپس ہوجاتے ہیں، خود سوچئے کہ انسانیت اور اس کی اقدار کی محافظت کا ایسے موقع پر کیا تقاضا ہونا چاہئے تھا؟ یہ نکاح انسانیت کے لئے اتنا بابرکت تھا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

''ما راینا امراۃ کانت أعظم برکۃ علیٰ قومھا منھا'' (رواہ ابوداؤد) (اپنی قوم کے لئے جویریہؓ جیسی بابرکت عورت میں نے کوئی نہیں دیکھی)۔

۸۔ام حبیبہؓ:

یہ ابوسفیان بن حرب کی صاحبزادی ہیں، باپ آخری وقت تک حضور کی دشمنی کرتا رہا، مگر یہ مومنہ تھیں اور اپنے پہلے شوہر عبیداللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کرگئیں۔ عبیداللہ دائم الخمر تھا اور عیسائیوں کی صحبت میں عیسائی ہوگیا۔

ایک عورت جو محض اسلام کی خاطر خویش واقارب اور وطن کو چھوڑ کر حبشہ آئی تھیں، ارتدادِ شوہر کی وجہ سے بے سہارا ہوگئی، مگر ترکِ اسلام کا خیال ایک لحظے کے لئے بھی اس

کے دل میں نہیں آیا۔ اس غریب الدیار کی ان قربانیوں اور استقامت علی الدین کا اسے کیا صلہ ملنا چاہتے تھا؟

حضور ﷺ نے اسی خیال سے عمرو بن امیہ فہری کو بھیجا اور شاہِ حبشہ نے ایک باندی کو بھیج کر حضور ﷺ کا پیغام دیا۔ ام حبیبہ نے مارے خوشی کے اپنے سارے زیور جو اس وقت زیب تن تھے، اتار کر اس باندی کو انعام میں دے دئے۔ اب اس سے اس مسرت کا اندازہ کرنا دشوار نہیں، جو انہیں ارتداد شوہر کے صدمے کے بعد بطور تلافی حاصل ہوئی ہوگی۔

ان کے ایمان اور ادب رسول ﷺ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب ان کا باپ ابوسفیان تجدید معاہدہ حدیبیہ کے لئے مدینہ آیا، تو اسے آتا دیکھ کر ام حبیبہؓ نے رسول اللہ کا بستر لپیٹ کر الگ رکھ دیا تھا۔ ابوسفیان نے پوچھا کہ تو مجھ کو بستر سے دور رکھنا چاہتی ہے، یا مجھ سے بستر ے کو؟ ام حبیبہؓ نے جواب دیا کہ تو ابھی تک مشرک ہے اور تو اس قابل نہیں کہ رسول اللہ کے بستر ے پر بیٹھ سکے۔

۹۔حضرت صفیہؓ:

ان کا پہلا نکاح سلام بن مشکم سے اور دوسرا کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا تھا۔ کنانہ غزوہ خیبر میں مارا گیا تھا اور صفیہ بطور اسیر آئی تھیں اور دحیہ کلبی کی درخواست پر ان کو دینے کا ارادہ فرمایا۔ اس پر لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں کہ یہ ایک بڑے یہودی سردار حی بن اخطب کی بیٹی ہیں، جو بنوقریظہ اور بنونضیر دونوں کا سردار تھا۔ لہٰذا اسے کسی بڑے سردار ہی کے پاس جانا چاہئے اور حضورؐ سے بڑا سردار کون ہوسکتا تھا۔ اس پر حضورؐ نے صفیہ کو پہلے آزاد کردیا۔ اس کے بعد ام المومنین ہونے کا شرف بخشا۔

اس دو شوہروں کو دیکھنے والی عورت کو اگر حضور پہلے ہی لینا چاہتے تو دحیہ کلبی کے حوالے کرنے کا ارادہ بھی نہ فرماتے، لیکن بات یہ تھی ایک اسیرہ جو ایک سردار کی بیٹی بھی ہے

اوراس کا شوہرابھی جنگ میں مارا بھی گیا ہے، کے احترام کو باقی رکھتے ہوئے اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا اور کوئی سہارا اس کے سوا نہ تھا، کہ وہ ام المومنین بننے کا ابدی شرف حاصل کریں۔ پھر دیکھے حضورﷺ نے انہیں پہلے آزاد فرمایا۔ جس کے بعد وہ مختار تھیں کہ خواہ حضورﷺ کے پیامِ نکاح کو قبول کریں یا نہ کریں۔ اس کے بعد ان کا پیامِ نکاح کو بخوشی قبول کر لینے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ حضورؐ سے بہتر اور کوئی پناہ گاہ ان کی نظروں میں نہ تھی۔

۱۰۔ حضرت میمونہؓ:

یہ عبداللہ بن عباسؓ اور خالد بن ولید کی خالہ ہیں، اسماء بنت عمیس (جو یکے بعد دیگرے جعفر طیار ابوبکر صدیق اور علی مرتضٰی کی بیوی بنیں) ان کی اخیافی بہن ہیں نیز حضرت حمزہ کی بیوی سلمٰی بنت عمیس اور ام المومنین زینب بنت خزیمہ کی بھی اخیافی بہن ہیں۔ میمونہ کا پہلا نکاح جویطب بن عبدالعزیٰ سے ہوا۔ یہ دوسرے نکاح کے بعد جب بیوہ ہوگئیں، تو حضرت عباس بن عبدالمطلب نے ان کی بیکسی کا ذکر فرمایا اور حضورؐ نے ان سے نکاح فرمالیا۔

نتیجہ: ان تمام نکاحوں پر ایک غائر نظر ڈالئے، تو بات صاف ہوجائے گی کہ:

۱۔ ان میں سے ایک کے سوا ساری عورتیں وہ ہیں، جس کا ایک یا دو یا تین نکاح پہلے ہو چکے ہیں۔

۲۔ یہ نکاح اس لئے کئے گئے کہ ان عورتوں یا ان کے رشتہ داروں کی قربانیاں فراموش نہیں کی جاسکتی تھیں۔

۳۔ یا اس لئے کہ ان کا روحانی سہارا حضورؐ سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

۴۔ یا اس لئے کہ ان کی اور ان کی اولاد کی معاشی کفالت کا سامان کرنا تھا۔

۵۔ یا اس لئے کہ ان کا خاندانی احترام باقی رکھنا مقصود تھا۔

دیگر مصالح:

لیکن بات یہیں نہیں ختم ہوجاتی، مصالح اور بھی ہیں، جن میں ایک حصہ متاہل لوگوں کے لئے درس معاشرت کا ہے اور دوسرا حصہ قیمتی نتائج کا حامل ہے۔ پہلے ان شاندار نتائج کو دیکھئے، جو ان نکاحوں کے بعد ظاہر ہوئے۔ ان میں چند خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ توسیع دین:

ازدواج کے بعد اصہار، یعنی سسرالی رشتے داروں سے حسنِ تعلقات و ہمدردی کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات ہے اور اس سے بڑے بڑے فوائد حاصل ہوتے ہیں، حضورﷺ کے ان نکاحوں سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مختلف قبائل سے راہ و رسم پیدا ہوگئی اور ان کے قریب ہوجانے سے وہ تمام غلط فہمیاں دور ہوگئیں، جو دشمنوں کے جھوٹے پروپیگنڈے سے یا کھنچے کھنچے رہنے سے پیدا ہوگئی تھیں۔ اس طرح نظام حق کی اشاعت و توسیع کے لئے مختصر مدت میں زمین ہموار ہوگئی۔ حضورﷺ کی کوئی دو زوجہ بھی ایک خاندان کی نہ تھیں۔ حضرت ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان بنو امیہ سے ہیں اور نسباً سب سے قریب حضرت میمونہؓ بنت حارث بنو عیلان سے ہیں اور نسب میں سب سے زیادہ دور۔ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد بنی عزی سے ہیں، حضرت سودہؓ بنت زمعہ بنی عامر سے ہیں۔ حضرت عائشہ بنت ابی بکر بنی تمیم سے ہیں۔ حضرت حفصہؓ بنت عمر بنی عدی سے ہیں، حضرت زینب بنت جحش بنی اسد سے ہیں حضرت ام سلمہؓ بنت ابی امیہ بنی مخزومہ سے ہیں، حضرت جویریہؓ حارث بن مصطلق سے ہیں، حضرت صفیہؓ بنت حیی خاندان سیدنا ہارون سے ہیں اور حضرت زینبؓ بنت خزیمہ بنی ہال سے ہیں۔ عرب کی قبائلیت اور اس کے مؤثرات سے جو لوگ واقف ہیں، ان کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ عرب کے اتنے مختلف قبائل اور ان کی شاخوں سے خوشگوار صہری

تعلقات قائم ہونے کے بعد ملنے جلنے کے کس قدر مواقع پیدا ہوئے ہوں گے اور صہری تعلقات کی وجہ سے کم سے کم مدت میں نظام حق کی توسیع میں کتنی مدد ملی ہوگی۔

۲۔اصلاح وقیامِ امن:

اسی کا نتیجہ تھا کہ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کے ازدواج ۶ ہجری کے بعد ابوسفیان کی مخالفت ڈھیلی پڑ گئی اور کچھ دنوں کے بعد یہ اور ان کے دونوں فرزند معاویہ ویزید ایمان لے آئے۔ام المومنین حضرت جویریہؓ بنت حارث کا نکاح ۸ ہجری کے بعد حارث اور ان کا سارا خاندانِ مصطلق پیشہ رہزنی سے تائب ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیی ہارونیہ سے ازدواج ۷ھ کے بعد نجد کے سارے فتنے ختم ہوگئے۔غرض جس قبیلے یا ملک کی عورت آئی، وہاں کے فتنے سلامتی سے، وہاں کا افراق اتحاد واتفاق سے اور وہاں کی بدامنیاں امن سے بدل گئیں۔کون ہے جو ان خوشگوار نتائج امن واصلاح کو دیکھتے ہوئے ان نکاحوں کی اہمیت سے انکار کرسکتا ہے۔

۳۔آدھی دنیا کی تعلیم:

ان ازواج مطہرات کے ذریعے جس کے سبب بڑے مقصد کی تکمیل ہوئی، وہ نصف انسانی دنیا کی تعلیم ہے، قرآن نے اصولی طور پر عورتوں کے ضروری مسائل بتادئے ہیں، لیکن بے شمار جزئیات ایسے ہیں جن کی تشریح حضورﷺ کو فرمانا پڑی۔تعلیم نساء کا یہی انداز بہتر ہوسکتا تھا اور ہوا کہ امہات مومنین نے حضورؐ سے وہ مسائل معلوم کئے اور ان سے دوسری عورتوں نے حاصل کئے۔نسائی مسائل کی بہت سی گتھیوں کو سلجھانے میں ازواجِ مطہرات کا غیر معمولی دخل ہے اور ان ہی سے ایسے بہترے مسائل مروی ہیں۔

نصف دین کی تکمیل:

اب ایک دشواری پر بھی نظر ڈالئے ایک طرف حضورؐ کی حیا کا یہ عالم ہے کہ روایتوں

میں ہے کہ حضورﷺ کنواری پردہ نشین سے بھی زیادہ باحیا تھے۔نیز حضورﷺ کا ارشاد ہے کہ:" الحیاء شعبة من الایمان."(شرم وحیا ایمان کا ایک حصہ ہے)

روایتوں میں ہے کہ نبوت سے بہت پہلے حضورﷺ ایک بار محض بے ستری کے خوف سے بیہوش ہوکر گر پڑے تھے۔یہ بھی روایت ہے کہ حیائے نبویﷺ حرم سرا کے اندر بھی کبھی بے نقاب نہ ہوئی۔کیا اس قدر غیر معمولی حیا کے ہوتے ہوئے حضورؐ سے یہ توقع ہوسکتی تھی کہ برسرِ منبر حضورؐ ان مسائل کو کھول کر بیان فرماتے ہوں گے کہ جن کو پڑھاتے ہوئے آج بھی طلبا ومدرسین آنکھیں نیچی کرلیتے ہیں؟ یہ طہارت ونجاست کے مسائل ہیں، حیض ونفاس کے دقائق ہیں، جن کا جاننا زن ومرد کے لئے ضروری ہے، ایک طرف ان مسائل کا علم ضروری اور دوسری طرف ان کے اظہار سے حیا مانع۔اس پیچیدگی کا حل اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا تھا کہ ازواج مطہرات کے ذریعے عورتوں کو اور ان عورتوں کے وسیلے سے مردوں کو مسائل ضروریہ کی تعلیم حاصل ہو۔بلاشبہ حرم سرائے نبوت کے اندر بھی حضور کی حیا، اسی طرح پردہ حجاب میں رہتی تھی، لیکن بہر حال اپنی بیویوں سے حیادارانہ مسائل کا اظہار مشکل نہ تھا۔آدھے معمورہ عالم اور نصف دنیا کی تعلیم اور نصف دین کی تکمیل کی اس سے بہتر کیا شکل ہوسکتی تھی؟ واقعات شاہد ہیں کہ عبداللہ بن عباس کی فقاہت، علی مرتضیٰؓ کی دقیقہ رسی، صدیقؓ وفاروق کی عقدہ کشائی جن مسائل میں آکر اٹک جاتی تھی، وہاں ان کی گرہ کشائی کے لئے بعض ازواج النبیﷺ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔کیونکہ خلوت گاہ نبوت کا راز دار امہات مومنین کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔شمع نبوت کے پروانے خلوت کی زندگی سے واقف نہ تھے اور امہات مومنین حقائق خلوت کی بھی راز دار تھیں۔ہم تو یہاں تک دیکھتے ہیں کہ بعض امہات تفسیر وفقہ کے حقائق ودقائق بھی ان واقف کاران جلوت کو بتاتی ہیں۔ظاہر ہے کہ نصف دین کی تکمیل اور دنیا کی آدھی آبادی کی تعلیم کا یہ عظیم کام ایک دو عورتوں سے نہیں چل سکتا تھا۔

صرف نو کی تعداد کو دیکھ کر جس کا جی چاہے شبہات پیدا کر لے، لیکن اس کا یہ روشن وعیاں پہلو ایسا ہے جس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا مصلح بھی گزرا ہے جس نے اپنی بیوی کو مصلحات امت، مبلغاتِ دین، معلّماتِ مسائل اور مدرساتِ فقہ بنا کر پیش کیا ہو اور نصب دین کی تکمیل ان ہی کے ذریعہ کرائی ہو؟

ذرا ان روایات کے اعداد وشمار کو دیکھئے، جو ازواجِ مطہرات سے مروی ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے دو ہزار دو سو دس روایات مروی ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ سے تین سو اٹھہتر، حضرت میمونہؓ سے چھہتر، حضرت ام حبیبہؓ سے پینسٹھ، حضرت حفصہؓ سے ساٹھ، حضرت صفیہؓ سے دس اور حضرت سودہؓ سے پانچ روایتیں مروی ہیں۔ یہ صرف وہ روایات ہیں جو ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ نہ پہنچ سکنے والی روایات کے شمار کا اللہ کو علم ہے، پھر زینب بنت جحش کی مرویات اس فہرست میں موجود نہیں ہیں، حالانکہ ۵ ہجری میں ان کو شرفِ زوجیت حاصل ہوا اور ۲۰ھ تک زندہ رہیں۔ ابطال تبنیت سے متعلق جتنے مسائل ہیں، جو بسلسلہ واقعۂ زید بن حارثہ ظہور میں آئے، ان سب کا تعلق ان ہی زینب بنت جحش سے ہے قرآن میں اس واقعہ کا صراحتہً ذکر ہے۔ پھر ان سے کسی روایت کا نہ ہونا مشکل سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ یقیناً دیگر امہات مومنین کی طرح ان سے بھی صحابہ وصحابیات نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ بہر حال یہ فہرست صرف ان ہی روایات کی ہے، جو ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ ان کے علاوہ اور معلوم نہیں کتنی روایتیں ہوں گی جو ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ تو صرف تین ماہ زندہ رہیں اور حضرت خدیجہؓ روایات کے دور سے پہلے ہی رحلت فرما چکی تھیں۔ اس لئے ان دونوں سے روایات کا نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن زینب بنت جحش سے کسی روایت کا نہ ہونا قابلِ غور ہے۔

بہر کیف کہنا یہ ہے کہ ان روایات میں بے شمار نسائی مسائل بھی ہیں اور بلا شبہ شطر دنیا کی تعلیم اور نصف دین کی تکمیل کا بوجھ ان ہی امہات مومنین کی گردن پر تھا جس کا اٹھانا ایک

دو کے بس کی بات نہ تھی اب دوسری نوع کے مصالح پر غور کیجئے۔

نسل انسانی کی بقا کا نمونہ کس کی زندگی میں ہے؟

حسن معاشرت کا درس اور گھریلو زندگی کے چند انمول نمونے:

حضور ﷺ کی سیرت کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی زندگی سراپا عمل ہے۔ محض وعظ ونصائح نہیں۔ حضورؐ کی زندگی سے ہر کہ ومہ، ہر شاہ وگدا، ہر اسود واحمر، ہر عربی وعجمی اور ہر جماعت وفرد یکساں طور پر اپنی زندگی کے لئے نمونۂ عمل حاصل کرسکتا ہے۔ معاشرے کے لئے سب سے پہلا سنگِ بنیاد ازدواجی زندگی ہے جس مصلح میں تاہل اور ازدواجی زندگی کا نمونہ نہ ہو وہ کامل لیڈر نہیں بن سکتا۔ عیسائی اپنی کمزوری کو محسوس کرنے پر مجبور ہیں، کیونکہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی زندگی میں ایک متاہل کے لئے کوئی عملی نمونہ موجود نہیں۔ نہ انہوں نے شادی بیاہ کیا، نہ اپنا کوئی گھر بنایا، عیسائیوں کو اس خلاء کو پر کرنے اور اسی کمزوری کو چھپانے کی صرف یہی تدبیر نظر آئی کہ حضورؐ کے تعدد نکاح پر تمام مصالح کی طرف سے آنکھیں بند کرکے صرف تعدد پر اعتراضات اور حملے کئے جائیں۔ ان سے پوچھئے کہ اگر نسل انسانی کا خاتمہ مقصود نہ ہو تو نمونہ کس کی زندگی ہے، بے زوج انسان کی یا متعدد ازواج رکھنے والے کی؟ پھر ان سے یہ بھی دریافت کیجئے کہ تم ان انبیاء کے متعلق کیا کہتے ہو، جنہوں نے ایک سے زیادہ نکاح کئے؟ ذرا ملاحظہ ہو:

سیدنا ابراہیمؑ کی تین بیویاں تھیں: ہاجرہ، سارہ اور قنطورہ

سیدنا یعقوبؑ کی چار بیویاں تھیں: لیاہ، زلفہ، زاخل اور بلہاہ۔

سیدنا موسیٰؑ کی بھی چار بیویاں تھیں: صفورہ، حبشیہ، قینی اور بنت حباب

ان چار کے علاوہ بھی حضرت موسیٰ کے متعلق ''خداوندان کے خدا'' کا فرمان سنئے:

جب تو اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے نکلے اور خداوند تیرا خدا ان کو تیرے ہاتھ میں

کر دے اور تو ان کو اسیر کر لائے اور اسیروں میں کسی خوب صورت عورت کو دیکھ کر تو اس پر فریفتہ ہو جائے اور اس کو بیاہ لینا چاہئے، تو اسے اپنے گھر لے آنا اور وہ اپنا سر منڈائے اور اپنے ناخن ترشوائے اور اپنی اسیری کا لباس اتار کر تیرے گھر میں رہے اور ایک مہینے تک اپنے ماں باپ کے لئے تمام کرے۔ اس کے بعد تو اس کے پاس جا کر اس کا شوہر ہونا اور وہ تیری بیوی بنے ۱۰ استثناء:۲۱:۱۱تا۱۳)

سیدنا داؤدؑ کی تو بیویوں کے نام تو سیموئیل ۱۸:۲۷ اور سیموئیل ۳:۲ تا ۵ اور ۱۱:۲۶ وغیرہ میں ہیں۔ ان کے علاوہ دس اور حرموں اور جوڑوں کا ذکر سیموئیل۲ ۵۲:۱۲ میں ہے۔

سیدنا سلیمانؑ کے متعلق بھی کچھ سن لیجئے: اس کے پاس سات سو شاہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں۔ (سلاطین ۔۱۱:۳)

دوسرے غیر مسلم: اسی طرح بدھسٹوں سے دریافت کیجئے کہ ایک متاہل اور صاحب اہل وعیال انسان کے لئے مہاتما بدھ کی زندگی اسوہ ونمونہ بن سکتی ہے جن کو بال بچوں میں رہ کر تلاشِ حقیقت ناممکن نظر آئی اور جنہوں نے آخر کار اپنی بیوی اور بچے پر ایک آخری حسرت بھری نگاہ ڈال کر جنگل کی راہ کی۔

یونہی ہنود سے سوال کیجئے کہ کیا بال بچوں والے انسان کے لئے رام چندر جی مہاراج کی زندگی نمونہ بن سکتی ہے، جنہوں نے چودہ سال بن میں ساتھ دینے والی وفادار بیوی کو جدا کر دیا۔ ان سے یہ بھی پوچھئے کہ وہ راجہ دسرتھ کے متعلق کیا کہتے ہیں، جن کی تین بیویاں تھیں۔ پٹ رانی کوشیلا، رانی ست مہری، رانی کیکئی اور ان کا کیا خیال ہے۔ شری کرشن جی کی بابت جن کی گوپیوں کی تعداد وہم وخیال سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی یا ہنود اگر انہیں اپنے بزرگوں کی تعداد ازواج پر کوئی اعتراض نہیں تو ایک ایسے پیغمبر کے احترام کو بھی قائم رکھیں گے جس کے ساتھ نکاحوں کے بے شمار انسانی مصالح وابستہ ہیں اور جس کے خوشگوار نتائج سے کوئی انصاف پسند

آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ ان کی تشریح کچھ اوپر گزر چکی ہے اور باقی ذکر آگے آتا ہے۔

اوپر ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضورؐ کی زندگی جہاں ہر شعبۂ حیات کے لئے زندہ نمونہ ہے، وہاں ازدواجی زندگی رکھنے والوں کے لئے بھی حسن معاشرت کا اعلیٰ اسوہ ہے اور چونکہ تاہل کی زندگی ہی معاشرے کا پہلا سنگِ بنیاد ہے، اس لئے کوئی ایسا شخص دنیا کا کامل لیڈر نہیں ہوسکتا، جس کی زندگی اس خاص شعبۂ حیات میں بھی اعلیٰ نمونہ نہ رکھتی ہو۔ حضورﷺ کا اسی سلسلے میں ایک دوسرا کمال دیکھئے کہ کن کن جہتوں سے حضورﷺ کی زندگی تمام انسانوں کے لئے واحد نمونہ ہے۔ ایک عفاف پسند مجرد انسان کے لئے حضورﷺ کی زندگی نمونہ ہے کہ عرب جیسے بے لگام ملک میں پچیس سال تک کمال عفت وعصمت کی زندگی گزارتے ہیں، پھر اپنی اصلی ازدواجی زندگی ایک بیوہ صاحب اولاد اور اپنے سے پندرہ سال بڑی عورت (خدیجہؓ) کے ساتھ پچاس سال کی عمر تک گزارتے ہیں اور اس دوران میں اعلیٰ سے اعلیٰ پیشکش کے باوجود کسی دوسری عورت کی طرف رخ بھی نہیں فرماتے۔ اس ایک رفیقہ کی زندگی کے ساتھ حسنِ معاشرت کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ ساری عمر میں کبھی کوئی تلخی نہیں پیدا ہوئی، بیوی نہ فقط قربان ہوتی رہی، بلکہ حیرت یہ ہے کہ اس فلک نیلگوں کی چھت کے نیچے اور اس زمین کی پشت پر سب سے پہلے جو ہستی حضورﷺ کی نبوت پر ایمان لاتی ہے، وہ یہی خدیجہؓ ہے۔

بیوی اپنے شوہر کے تمام رازہائے درون پردہ سے واقف ہوتی ہے۔ اس کی نگاہوں سے شوہر کا کوئی عیب وہنر پوشیدہ نہیں ہوتا۔ نبوت تو بڑی چیز ہے، وہ تو معمولی ولایت کی بھی کبھی قائل نہیں ہوتی۔ کردار یا معاشرت کی معمولی کمزوری بھی ہو، تو کسی دعوے کے جواب میں عورت دھجیاں بکھیر کر رکھ دے، لیکن ذرا نگاہِ غور سے دیکھئے خدیجہؓ دو شوہروں کو پہلے بھی دیکھ چکی ہیں اور اب پندرہ سال مسلسل حضورؐ کی ایک ایک ادا کا تجربہ کر چکی ہیں، زندگی کے ایک ایک گوشے میں حضورؐ کو پرکھ چکی ہیں۔ کتنا بلند کردار رکھنے والا اور کیسے عدیم

النظیر حسن معاشرت کا مالک ہوگا۔ وہ انسان جس کے متعلق خدیجہؓ صرف انسانیت کی قائل نہیں ہوتی، بلکہ نبوت پر ایمان لے آتی ہے اور اپنی عمر کے بقیہ دس سال اس طرح ساتھ دیتی ہے کہ جان و مال سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ ہر امتحان میں کھری اترتی ہے، ہر خطرے کا مقابلہ کرتی ہے اور ایمان میں ایک لحظے کے لیے بھی کسی قسم کا تزلزل نہیں آیا، کیا یہ حسن معاشرت انسان کا آخری کمال نہیں؟ اور کیا ازدواجی زندگی کے لئے یہ سب سے اعلیٰ نمونہ نہیں؟۔

- پھر اس کے بعد دوسرا نمونہ یہ ہے کہ پیغمبر اس اصلی رفیقۂ زندگی کی رحلت کے بعد نکاح کرتا ہے تو بالکل اپنی ہم عمر پچاس سال سودہؓ سے۔ کیا یہ بجائے خود عفاف کا اعلیٰ نمونہ نہیں۔ اس رفیقہ زندگی کو اپنے شوہر پر کتنا زبردست اعتماد تھا کہ اس نے اپنے دل سے سوت پن کی تمام آلایشوں کو باہر نکال کر اپنی باری ایک دوسری بیوی کو بخش دی۔ کیا یہ اعتماد حسن معاشرت کے بغیر ہی حاصل ہوگا۔

- آگے چلنے سے پہلے اپنی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ اپنی پسند سے ایک بیوی لانے والوں کا بھی یہ حال ہے کہ عمر میں کوئی ہفتہ باہمی نوک جھونک سے خالی نہیں جاتا اور اگر خدانخواستہ ایک سے زیادہ رفیقہ زندگی، تو ایک کے ہاتھ میں سر کے بال اور دوسری کے ہاتھ میں داڑھی کے بال ہوتے ہیں، لیکن اس انسان کی عظمت محبوبیت، کردار کی بلندی اور حسنِ معاشرت کا اندازہ کیجئے، جس کے پاس پچپن سال کی عمر کے بعد نوایسی بیویاں یکجا ہو جاتی ہیں، جو مختلف عمر کی ہیں، مختلف قبائل کی ہیں، مختلف تمدن کی ہیں، مختلف مزاج کی ہیں اور گھروں میں فقر و فاقہ ایک مسلسل مشغلہ ہے، لیکن ساری زندگی میں باہمی تلخی کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ صرف ایک ہی لطیف سی جھلک نظر آتی ہے، جس کے بعد ایلا (اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے، تو اسے ''ایلا'' کہتے ہیں) کا مسئلہ رحمتِ الٰہی بن کر نازل ہوا، ورنہ اس سے پہلے ایلا اور طلاق ایک ہی چیز متصور ہوتی تھی۔

- پھر یہ بھی دیکھئے کہ ان ازواج مطہرات میں کس کس نوع کی بیویاں ہیں۔ ان میں عائشہؓ جیسی کنواری بھی ہیں۔ ان میں سودہؓ، حفصہؓ، ام سلمہؓ، جویریہؓ اور ام حبیبہؓ جیسی ایک ایک شوہر کی بیوائیں بھی ہیں۔ ان میں خدیجہؓ، صفیہؓ، میمونہؓ جیسی دو دو شوہروں کی بیوائیں بھی ہیں، ان ہی میں زینبؓ بنت خزیمہ جیسی تین تین شوہروں کی بیوہ بھی ہیں، ان ہی میں زینتؓ بنت جحش جیسی مطلقہ بھی ہیں، پھر ان کے قبائل ان کے تمدن، ان کے مزاج اور ان کی عمریں متفاوت اور مختلف ہیں۔ کسی کو شاہانہ اخراجات نہیں ملتے، بلکہ بعض اوقات کئی کئی مہینے کھجور اور پانی پر گزارا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود حسنِ معاشرت نے کیسا زبردست اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ جب کثرتِ غنائم کو دیکھ کر امہاتِ مومنین نے مزید گزارے کا مطالبہ کیا، تو ایک ہی مسئلہ تخییر (جب ازواج مطہرات نے اضافہ اخراجات کا مطالبہ کیا تو کچھ دنوں کے بعد آیات تخییر نازل ہوئیں جس کی غرض یہ تھی کہ اگر تم دنیا چاہتی ہو تو تمہیں بہت کچھ دے کر الگ کر دیا جائے اور اگر رضائے الٰہی چاہتی ہو تو نبوی زندگی پر قناعت کرو۔ اس پر سب نے دنیا کے مطالبات سے دستبرداری دے کر اللہ، رسول اور آخرت کو پسند کیا۔) نازل ہونے کے بعد سب نے اپنے مطالبے واپس لے لیے۔ کیا یہ انسانیت کا معمولی کمال ہے اور کیا کسی بڑے سے بڑے انسان کی زندگی میں حسنِ معاشرت کے ایسے نمونے مل سکتے ہیں کہ ہر نوع کی عورت ایک ساتھ ہونے کے باوجود اس کا حسن معاشرت سارے عالم کے لئے نمونہ بن سکے؟ یہ حقیقت آخر کیوں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا صرف یہی انسان کامل ہے، جو یہ اعلان کر سکے کہ ''**خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لأھلی**'' (یعنی تم میں بہترین انسان وہ ہے، جو اپنے اہل و عیال کے لئے سب سے بہتر ہو اور میں اس لحاظ سے تم سب میں بہتر ہوں) ہم نے بڑے بڑے مصلحین کو دیکھا، جو ایک رفیقۂ زندگی سے بھی نہ نباہ سکے، اسے اپنا ہم نوا نہ بنا سکے۔ بعض تو ساری عمر بیوی سے مقدمہ بازی کرتے رہے۔ پس کیا نو مختلف ازواج سے ایسا غیر معمولی

نباہ اس انسان کا آخر کمال نہیں اور کیا کسی ایک نوع کی رفقہ زندگی رکھنے والے کے لئے حضورﷺ کی زندگی ایک بہترین نمونہ نہیں؟ پھر وہ ایسی حالت میں کہ حضورﷺ کو تنہا یہی ایک کام نہیں کرنا تھا، بلکہ ایک طرف ساری امت کی اصلاح کا کمر کو توڑنے والا بوجھ بھی ہے اور ساری رات خدا کی بندگی کا فرض بھی ادا کرنا ہے۔

خانگی زندگی کی سچی شہادت:

یہ نکتہ کبھی فراموش نہیں ہونا چاہئے کہ حقیقی مصلح وہی ہے، جس کے ظاہری اور باطنی دونوں کے دو حصوں میں زندگی کو تقسیم کر دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پبلک اسٹیج پر اپنی زندگی کا کوئی خوشگوار پہلو پیش کر دینا مصلح کے لئے مشکل نہیں۔ مکمل قیادت کا صحیح پتہ اس وقت چلتا ہے، جب اس کی اندرونی زندگی بھی آئینے کی طرح سامنے آجائے۔ یوں تو حضورﷺ کی خانگی زندگی کی شہادت کے لئے تنہا خدیجہؓ ہی کافی ہوسکتی تھیں، لیکن اس تنہا شہادت پر تو شبہے وارد ہوسکتے تھے، مگر ان نو شاہدات عادلات میں سے کس کس کی گواہی پر شبہے کئے جاسکتے ہیں؟

اسلام نے کسی بات کے ثبوت کے لئے گواہوں کی جو بڑی سے بڑی تعداد رکھی ہے، وہ چار مردوں، دوسرے لفظوں میں آٹھ عورتوں کی گواہی ہے، لیکن جن امور شنیعہ کے ثبوت کے لئے گواہوں کی یہ تعداد مقرر کی گئی، ان سے حضورؐ کی پاک ترین اخلاقی زندگی اس درجے بعید ہے کہ تعداد کی برابری بھی سوءِ ادب ہے۔ اس لئے آٹھ عورتوں کی بجائے نو عورتوں کی شہادت تاریخ کے سامنے ہے۔ تاریخ ان شاہدات عادلات سے دریافت کرے کہ حضور کی پرائیویٹ اور خلوتی زندگی کیا تھی، خلوتی زندگی کا پتہ نہ بیٹی دے سکتی ہے، نہ فرزند، نہ خادم و خادمہ، نہ دوست، نہ دشمن، نہ داماد، نہ بہو، نہ معتقد، نہ شاگرد، یہاں سچی اور کھری گواہی بیوی ہی دے سکتی ہے، کیونکہ خلوت کی زندگی کی صحیح رازدار یہی ہوتی ہے۔ یہ

بتا سکتی ہے کہ اس کا شوہر کیا کیرکٹر رکھتا ہے؟ اہل و عیال سے اس کا سلوک کیسا ہے؟ اس کی راتیں کس طرح گزرتی ہیں؟ اسے اپنے مقصد کے ساتھ کتنی لگن ہے؟ اس کی زندگی کا کیا نقشہ ہے؟ اپنوں اور پرائیوں کے ساتھ اس کے انسانی تعلقات کیسے ہیں؟ اور خود خدا کے ساتھ اسے کیا وابستگی ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب اگر نو شاہدات عادلات یک زبان ہو کر دیں اور وہ بھی وہ، جن سے اندرونی زندگی کا کوئی راز چھپا ہوا نہ ہو، تو دنیا کی کون سی عدالت اسے رد کر سکتی ہے؟ کثیر الازواج مصلحین تو دنیا میں اور بھی بہت سے گزرے ہیں، لیکن کسی ایسے مصلح کا نام لیجئے جس کی اتنی بیویاں اس کے پرائیویٹ کیرکٹر کی ایسی ہی گواہ ہوں، جن کے نکاح سے ہزارا انسانی مصالح وابستہ ہوں اور جو مصلحات امت بنا کر پیش کی گئی ہوں۔

ان تمام تصریحات مذکورہ بالا کے بعد یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ کے تعددِ ازواج کا مقصد کچھ قربانیوں کی قدردانی و حوصلہ افزائی تھی، یا بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری، یا خاندانی احترام کی بقا اور اس کے ساتھ ہی حسن معاشرت کا عملی درس دینا۔ صنف ضعیف کے درجے کو بلند کرنا، انہیں معلماتِ امت بنانا، معاشرے کی اصلاح کرنا، صہری تعلقات کے ذریعے دین کی توسیع کرنا اور امن و امان قائم کرنا وغیرہ۔ ان انسانی مصالح کے بغیر ہی مطلق تعدد ازدواج کو سنت قرار دینا درست نہیں۔ سنت صرف تعدد ازواج ہی نہیں حضورﷺ کی پوری زندگی ہے۔ حضورﷺ کی دوسری 'کڑوی' سنتوں سے اعراض برت کر صرف ''میٹھی'' سنتوں کو اختیار کرنا معاشرے کو جتنا فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس سے زیادہ مفاسد پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورﷺ کی اصل اور آئیڈیل ازدواجی زندگی وہی ہے، جو خدیجہؓ کے ساتھ بسر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ساری مناکحتیں ایک ہنگامی اور ناگزیر قومی و ملی مصالح کے تحت ہوئی تھیں اور ایسے وقت میں ہوئی تھیں، جبکہ حضورؐ اس کی بشری ضرورت نہ رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بجز خدیجہؓ الکبریٰؓ کے اور کسی ام المومنین سے حضورؐ کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

ایک بھونڈی تاویل:

ہمیں بعض لوگوں کا یہ انداز دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ تعدد ازواج النبیؐ کی تاریخی حقیقت کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن چونکہ چار سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا اور حضورؐ قرآن کے خلاف نہیں جاسکتے تھے، اس لئے یہ قصہ ہی غلط ہے کہ حضورؐ کی نو بیویاں تھیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تاریخی حقائق کو اس طرح جھٹلانے سے قرآن کی کیا خدمت ہوسکتی ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ قرآن کا رجحان تو حد زوج ہی کی طرف ہے، کیونکہ وہ عدل بین النساء کو ضروری قرار دینے کے ساتھ اس عدل کو انسانی طاقت سے باہر بھی بتاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں ایسی لچک بھی رکھی ہے کہ ملت کی ہنگامی ضرورتوں کے وقت تعدد ازواج مستحب، بلکہ ضروری بھی ہوجاتا ہے۔ ان ہی ضرورتوں کے تحت حضورؐ نے نو ازواج ایک ساتھ رکھیں اور چونکہ قرآن نے ان کو الگ کرنے کی صریح ممانعت کردی تھی، اس لئے حضورﷺ کا ان سب کو زوجیت میں باقی رکھنا بھی ناگزیر تھا۔ ان مادرانِ امت کو فرزندان امت کے حوالے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

☆☆

رسول اللہ ﷺ کا تعلیمی انقلاب

● حضرت مولانا محمد عیسیٰ منصوری

اسلام سے قبل کے دور کو دور جہالت یا جاہلیت سے موسوم کیا جاتا ہے، اس لئے کہ جہالت وناخواندگی تمام دینی ودنیوی خسران وتباہی کا موجب ہوتی ہے۔ نزول وحی سے قبل عرب میں گنتی کے چند افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ نزول قرآن کی برکت سے اس طرح علم کا دور دورہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لاکھوں افراد زیور علم سے آراستہ ہوگئے اور تعلیم وتعلم کا ایسا ماحول قائم ہوا کہ اب ڈھونڈنے سے بھی کوئی ناخواندہ نہیں ملتا۔ گویا دنیا میں پہلی بار لازمی تعلیم کا انطباق دور نبوت اور دور خلفائے راشدین میں ہوا۔ یہ سب فیضان تھا قرآن اور صاحب قرآنﷺ کی تعلیمی جدوجہد کا۔ آیئے مختصر طور پر آنحضرت ﷺ کے لائے ہوئے اس تعلیمی انقلاب کا جائزہ لیں۔

قرآن مجید کی سب سے پہلی آیت میں پڑھنے کا حکم دیا گیا:

اسلام کا آغاز اس وقت ہوا جب حضرت محمدﷺ پر چالیس سال کی عمر میں وحی اتری، اس بات کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ نوعمری میں آپﷺ نے لکھنے پڑھنے کے فن میں حصہ لیا ہو۔ آپﷺ عمر بھر امی ہی رہے۔ اس کے باوجود کس قدر اثر انگیز واقعہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے پاس سے جو آپ کو سب سے پہلی وحی آئی اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو حکم تھا کہ ''اقــرأ!'' یعنی پڑھ! اور قلم کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی کہ جملہ انسانی علوم اس سے ہیں،

پڑھ اپنے رب کے نام سے جو خالق ہے، جس نے انسان کو ایک خون کے جمے ہوئے قطرے سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا بزرگ رب ہی ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی اور انسان کو وہ اچھی چیزیں بتائی جو نہ جانتا تھا۔ (سورہ علق ۱-۴)

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ قریب قریب وہ تمام آیات جن میں لکھنے پڑھنے یا علم سیکھنے کا ذکر ہے، وہ مکی آیات ہیں۔ اس کے برخلاف مدنی آیات میں کام کرنے کا حکم اور تعمیل کرنے پر زیادہ زور ہے۔

حصول علم کے لئے سفر ناگزیر ہے:

اس سلسلے میں قرآن کریم نے ایک مکی سورہ (کہف) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا ہے کہ کس طرح وہ طلب علم کے لئے گھر سے نکلے، سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اس قصے کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص، خواہ کتنا ہی عالم ہو جائے ہر چیز نہیں جان سکتا اور یہ کہ علم کی زیادتی کی خواہش کے لئے دور دراز کا سفر ناگزیر ہے۔ بلاشبہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا بڑا مقصد علم بھی ہوتا تھا، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں'' حقیقت میں تعلیم وتعلم لازم وملزوم ہیں۔ خاص طور پر ایسے شخص کے لئے جو مذہب وسیاست میں تفریق کا قائل نہ ہو۔

مدینہ منورہ میں سب سے پہلے معلم:

اسلام کے ابتدائی دور میں بیعت عقبہ ثانیہ جو ہجرت سے دو سال قبل ہوئی تھی، تقریباً ایک درجن اہل مدینہ نے اسلام قبول کیا تھا ان کی خواہش پر آنحضرت ﷺ نے ان کے ساتھ مکہ مکرمہ سے ایک تربیت یافتہ معلم حضرت مصعب بن عمیرؓ کو کر دیا تھا جو انہیں قرآن کریم کی تعلیم دے سکیں، بلاشبہ اس ابتدائی زمانہ میں تعلیم سے مراد عقائد دین اور عبادت

کے طریقوں کی تعلیم ہی ہو سکتی ہے، اس سلسلے میں ایک اہم چیز یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ ہجرت سے قبل آنحضرت ﷺ نے کاتبوں کو مقرر کر رکھا تھا جن کا کام یہ تھا کہ جیسے جیسے وحی نازل ہوتی جائے وہ اس کو لکھ لیں، چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لانے لگے تو انہیں قرآن مجید کی چند سورتیں اپنی بہن کے گھر لکھی ہوئی ملی تھی اور بظاہر ان کی بہن بھی پڑھنا نہیں جانتی تھی۔

اسلام کی سب سے پہلی درس گاہ:

مدینہ منورہ آنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھی مسجد ہی کے ایک حصے میں سائبان اور چبوترہ (صفہ) بنایا گیا تھا۔ یہ اولین اسلامی اقامتی جامعہ تھی، رات کو طلباء یہیں رہتے تھے۔ ایسے اساتذہ وہاں مقرر کئے گئے تھے جو وہاں لکھنے پڑھنے اور مسائل دینیہ کی تعلیم دیتے تھے، کتابت یا لکھنا سکھانے والے اساتذہ میں حضرت عبداللہ بن سعید بن عاص اور حضرت عبادہ بن صامتؓ وغیرہ تھے جو خوش نویس تھے۔ اس مدرسہ میں مقیم شب باش طلبا ستّر، اسّی تک ہو جاتے تھے۔ اس اقامتی درسگاہ میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ جو تعلیم دی جاتی تھی وہ فقہ، دینی مسائل، قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرنا، فن تجوید اور دیگر اسلامی علوم تھے۔ اسی طرح عبادات اور معاشرت بھی سکھائی جاتی تھی، جس کی نگرانی خود حضور ﷺ ذاتی طور پر فرماتے تھے اور وہاں رہنے والوں کی غذا وغیرہ کا بندوبست فرماتے تھے۔ یہ طلباء اپنے فرصت کے اوقات میں طلب روزگار میں بھی مصروف ہوا کرتے تھے۔ مقیم طلبا کے علاوہ مدینہ منورہ کے لوگ بھی مسجد میں شریک درس ہوتے اس کے علاوہ دور دراز کے قبائل سے بھی شائقین علم آتے اور نصاب کی تکمیل کے بعد اپنے وطن واپس ہو جاتے۔ یہ لوگ عموماً صلہ میں ٹھہرا کرتے تھے، اس لئے بعض اوقات طلبا کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جاتا، اسی لئے بعض مؤلفین صفہ کے

چار سو طلباء کا ذکر کرتے ہیں۔

پہلا معلم اور ناظم تعلیمات:

رسول کریم ﷺ خود بھی ذاتی طور پر تعلیم دیا کرتے تھے جس میں جلیل القدر صحابی شریک ہوتے تھے۔ نیز آپ ﷺ مسجد نبوی کے حلقہ درس کا اکثر معائنہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ اگر وہاں کوئی بے توازنی نظر آتی تو فوراً تدارک فرما دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ''ترمذی شریف'' میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے قضا وقدر سے منع فرما دیا اور ارشاد فرمایا کہ تم میں بہت سے گزشتہ امتیں اس سلسلے میں الجھ کر گمراہ ہوئی تھیں۔ غرض پہلے معلم اور ناظم تعلیمات آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی تھی۔

عہد نبویؐ میں مدینہ کی دیگر درس گاہیں:

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی ہی واحد درسگاہ نہیں تھی، بلکہ یہاں کم از کم نو مسجدیں خود عہد نبوی میں بن چکی تھیں اور ہر مسجد اپنے محلے اور آس پاس والے لوگوں کے لئے درسگاہ کی ہی حیثیت رکھتی تھی۔ خاص کر بچے بھی وہاں پڑھنے آیا کرتے تھے۔ بعض احادیث میں رسول کریم ﷺ کے عام احکامات ان لوگوں کے بارے میں محفوظ ہیں جو اپنے محلے کی مسجدوں میں تعلیم چاہتے تھے۔ نیز آپ ﷺ نے یہ بھی حکم صادر فرمایا تھا کہ لوگ اپنے پڑوسیوں سے بھی تعلیم حاصل کریں۔ مدینہ منورہ میں ساتویں ہجری میں ایک اور اقامتی درسگاہ دار القراء کا بھی پتہ چلتا ہے جو مخدوم بن نوفل کے مکان میں قائم تھی۔

دور دراز علاقوں میں تربیت یافتہ معلّمین کا بھیجنا:

آنحضرت ﷺ نے علم کی توسیع واشاعت کے لئے ہر ممکن ذرائع استعمال فرمائے، چنانچہ بدر میں ستر کے قریب اہل مکہ گرفتار ہوئے تو آپ ﷺ نے ان لوگوں کی رہائی کے

لئے جو مالدار نہ تھے، یہ فدیہ مقرر فرمایا کہ مدینہ کے دس دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ اس کے علاوہ جب قبائل کے وفود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ اپنے کسی تربیت یافتہ معلم کو ان کے ساتھ کر دیتے تھے کہ وہ اس علاقے میں جا کر دینیات کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد وہ معلم مدینہ منورہ واپس آجاتے تھے، بئر معونہ کے مشہور واقعہ میں ستر قراء (معلم) آپ ﷺ نے ان کے ساتھ کر دئے تھے جنہیں نجد کے علاقے اور دیگر قبائل میں کام کرنا تھا۔

آنحضرتؐ کی تعلیمی کوششوں کے نتائج:

شرح خواندگی میں اس تیزی سے ترقی ہوئی کہ ہجرت کو چند ہی سال گزرے تھے کہ قرآن مجید میں لین دین اور تجارتی معاملے جس میں رقم ادھار ہو تحریری طور پر انجام دینے کے متعلق ایک طویل اور مفصل ہدایت والی آیت اتری جس کا مطلب یہ تھا۔ تجارتی دستاویز پر کم از کم دو اشخاص کی گواہی لی جائے، اس کا مقصد قرآن کے الفاظ میں یہ تھا کہ اس طرح تحریری گواہی خدا تعالیٰ کے نزدیک زیادہ منصفانہ ہے اور بوقت ضرورت شہادت (گواہی) کے اغراض کے لئے زیادہ مستحکم وسیلہ ہے اور شہادت پیدا ہونے کی صورت میں رفع شک کے لئے اس زمانے میں پیشہ ور کاتبوں (منشی ووکیل) کا بھی پتا چلتا ہے۔ تاریخ نے حضور ﷺ کے کوئی ڈھائی تین سو خطوط محفوظ رکھے ہیں، صحیح مقدار اس سے بہت زیادہ ہونی چاہئے، کیونکہ آپ کی حکومت دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر تھی جس میں آپ وقتاً فوقتاً احکامات صادر فرماتے تھے اور تقریباً دس سال تک آپ ﷺ نے حکمرانی کے فرائض انجام دئے۔

عہد نبوی میں مختلف علوم میں تخصص اور ماہرین السنہ:

عہد نبوی میں فنی ذوق یا تخصص بھی ترقی کر گیا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جس کو قرآن سیکھنا ہو وہ فلاں صحابی کے پاس جائے اور جس کو تجوید یا تقسیم ترکہ کا حساب

یا فن سیکھنا ہو وہ فلاں صحابی کے پاس جائے۔ اسی طرح ساری دنیا کی اقوام کو خدا کا پیغام پہنچانے اور ایک مملکت کے حاکم اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے آپ ﷺ کو مترجمین کی بھی ضرورت ہوا کرتی تھی جو غیر زبانیں جانتے ہوں۔ حضرت زید بن ثابتؓ جو دربار نبوت کے میر منشی (سکریٹری اسٹیٹ) کہے جاسکتے ہیں وہ فارسی، عبرانی اور یونانی جانتے تھے، اس زمانے کی یہی تین عالمی اور علمی زبانیں تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ عبرانی خط لکھنا پڑھنا سیکھیں اور چند ہفتوں میں وہ اس میں طاق ہوگئے تھے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ وہ کثیر زبانیں جانتے تھے۔

عہد نبوی ﷺ کا نصاب تعلیم:

نصاب تعلیم کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس کو پوری صحت کے ساتھ بیان کرنا دشوار ہے۔ ہمارے پاس جو محدود مختصر مواد ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ہر جگہ ایک ہی نصاب جاری نہ تھا (یعنی ہر علاقے کی ضروریات ونفسیات کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا) معینہ کتب پڑھانے کی جگہ معین مدرس کے پاس لوگ جایا کرتے تھے اور جو علوم وہ پڑھا سکتا تھا پڑھتے تھے۔ علم کے زیادہ شائقین لوگ اس کے بعد دوسرے مدرس کے پاس پھر تیسرے مدرس کے پاس جاتے۔ بہر حال اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کے ہمہ گیر نصاب کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا تھا کہ نشانہ بازی، تیراکی، تقسیم ترکہ کی تعلیم، ریاضی، معیاری طب، علم ہیئت، علم انساب اور علم تجوید قرآن کی تعلیم دی جایا کرے۔

خواتین کی تعلیم کے انتظامات:

عورتیں بھی اس تعلیمی سیاست کا اہم موضوع تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دن مقرر فرمالیا تھا جس میں آپ ﷺ عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لے جاتے تھے اور ان کو تعلیم دیتے تھے اور ان کے سوالات کے جوابات دیتے۔ قرآن کریم نے بھی رسول اللہ ﷺ

کی بیویوں پر ایک فریضہ عائد کیا ہے وہ یہ کہ وہ دوسروں کو تعلیم دیا کریں۔ ایک حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک خاتون سے خواہش کہ آپ ﷺ کی ایک بیوی کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ نے آپ ﷺ کی اجازت سے اپنی ایک رشتہ دار خاتون شفا بنت عبداللہ سے (جو خوب پڑھی لکھی تھیں) لکھنا سیکھ لیا تھا۔ حضرت عائشہؓ کو فقہ اور دیگر اسلامی علوم، نیز ادب، شاعری اور طب میں بڑا دخل تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا، تہائی علم عائشہؓ سے حاصل کرو۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ جس کے پاس کوئی لونڈی ہو وہ اسے تعلیم دے، اس کی تربیت کرے اور اچھی طرح تربیت کرے پھر اس کو آزاد کر کے باضابطہ نکاح کرے تو اس کو دوگنا ثواب ملے گا۔

دس لاکھ مربع میل کے وسیع علاقہ کے لئے بنیادی تعلیم کا انتظام:

رسول اللہ ﷺ کی یہ طے شدہ سیاست تھی کہ صرف وہی لوگ قوم کی سیادت (قیادت) سرداری اور رہنمائی کریں اور مسجدوں میں امام بنیں جو قرآن مجید اور سنت کے زیادہ ماہر ہیں۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مفتوحہ رقبہ دس لاکھ مربع میل میں پھیلا ہوا تھا، جس کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کا عظیم منصوبہ حضور ﷺ کے پیش نظر تھا۔ عہد نبوی کے اختتام پر اسلامی حکومت باوجود اس قدر وسیع رقبے پر مشتمل ہونے کے دینیات اور عصری تعلیمی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے لگی تھی، کچھ تو مرکز (مدینہ منورہ) سے بڑے بڑے مقامات پر تربیت یافتہ معلم بھیجے جاتے تھے اور کچھ صوبہ داروں اور گورنروں کے فرائض منصبی میں یہ امر صراحت کے ساتھ شامل کر دیا جاتا تھا کہ وہ تعلیم کا نظم کریں۔ رسات مآب ﷺ نے لکھا تھا جس میں گورنر کو ہدایت ہے کہ لوگوں کے لئے قرآن، حدیث، فقہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ اس دستاویز میں ایک

دلچسپ جملہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس بات کی نرمی سے ترغیب دو کہ وہ دینیات کی تعلیم حاصل کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاطر خواہ دنیوی وعصری تعلیم کا بھی انتظام تھا۔

گشتی ناظم تعلیمات کا انتظام:

صوبہ دار درس گاہوں کا معیار بلند کرنے کے لئے رسول کریم ﷺ نے صوبہ یمن میں ایک صدر ناظم تعلیمات مقرر کیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ مختلف اضلاع وعلاقہ جات میں ہمیشہ دورہ کرتا رہے اور وہاں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی نگرانی کرے۔ کوئی تعجب نہیں کہ وہ دیگر صوبہ جات میں بھی اسی طرح مامور ہو گئے ہوں۔

اشاعت علم کے لئے بے مثال طرز تعلیم:

دور نبوت میں تعلیم وتعلم کے اس قدر وسعت وفروغ کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے علم کی تحصیل ہر مرد وعورت پر ضروری قرار دی اور اس کے لئے ایسا بے نظیر نظام قائم فرمایا جس کی بدولت بغیر اخراجات کے تعلیم کا ایسا فروغ ہوا کہ آج کروڑوں اربوں روپے خرچ کر کے بھی نہیں ہو پاتا۔ تعجب خیز امر ہے کہ آپ ﷺ نے تعلیم کے لئے کوئی بجٹ منظور نہیں کیا، نہ اسلامی ریاست میں مالی اسکیم پیش فرمائی۔ بلکہ اس کے لئے نہایت سادہ اور فطری طریقہ اختیار فرمایا وہ یہ کہ تعلیم وتعلم کے مراکز مساجد کو بنایا، جہاں ہر مسلمان روزانہ پانچ مرتبہ حاضری دیتا ہے اور علم کی تحصیل کے لئے ان بالغ افراد کو منتخب کیا جو عقائد، عبادات اور معاملات کے مکلّف ہیں اور ان بالغ افراد کے ذریعہ گھروں میں عورتوں اور بچوں میں تعلیم کو جاری فرمایا۔ ہر علم سیکھنے والے کو اس پر عمل اور اس کی اشاعت ضروری قرار دی اور جب تحصیل علم ہر فرد کا بنیادی فرض تھا تو نہ کبھی اہل ثروت سے مالی اپیل کی گئی اور نہ کسی طور پر ان کو شرمندہ احسان ہونا پڑا۔ آنحضرت ﷺ نے تعلیمی سیاست کے لئے کسی خاص طبقے کو منتخب نہیں فرمایا، بلکہ حصول علم ہر مسلمان پر فرض قرار دیا، پھر ان میں جو

صاحب استعداد ہوئے وہ علم کے خواص بنائے گئے، جیسے حضرت معاذ بن جبلؓ، کعب بن احبارؒ، زید بن ثابتؓ۔ مدارس تعلیم کے لئے نہیں، بلکہ تکمیل کے لئے ہوتے تھے۔ اس لئے مدارس، خواہ کتنے ہی قائم ہو جائیں امت کے ہر فرد کو تعلیم نہیں دے سکتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے اس بے مثال نظام کی بدولت ایک طرف ہر فرد بشر بہ آسانی اور بغیر کسی خرچ کے اپنی مسجد میں دین ودنیا کا بنیادی علم حاصل کرتا۔ دوسری طرف ان ہی میں سے ذی استعداد افراد مختلف علوم وفنون میں کمال مہارت حاصل کر کے دنیا میں تمام علوم وفنون کی سیاست وقیادت کر رہے تھے۔ اس طرح قرآن اور صاحب قرآن نے خاموشی سے دنیا میں ایسا زبردست علمی انقلاب برپا کیا جس کے نتیجے میں مسلمان تقریباً سات سو سال تک تمام علوم و فنون میں دنیا کی قوموں سے فائق رہے ہیں اور دنیا کی علمی سیادت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رہی۔

☆☆

تحفظ حقوق انسانی کا عالمی منشور

(معلم انسانیت ﷺ کا خطبہ حجۃ الوداع)

''لوگو! میری بات سنو! مجھے نہیں معلوم، غالبًا میں تم سے اس سال کے بعد اس مقام پر کبھی مل سکوں گا۔ تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہے، جس طرح آج کے دن کی، موجودہ مہینے کی اور موجودہ شہر کی حرمت ہے۔

سن لو! جاہلیت کی ہر چیز میرے پاؤں تلے روند دی گئی، جاہلیت کے خون بھی ختم کردئے گئے اور ہمارے خون میں سے پہلا خون جسے میں ختم کررہا ہوں وہ ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون ہے۔ یہ بچہ بنوسعد میں دودھ پی رہا تھا کہ بنو ہذل نے اسے قتل کردیا.....اور جاہلیت کا سود ختم کردیا گیا اور ہمارے سود میں سے پہلا سود جسے میں ختم کررہا ہوں وہ عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا سود ہے۔ اب یہ سارا سود ختم ہے۔

ہاں! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کیوں کہ تم نے انہیں اللہ کی امانت کے ساتھ لیا ہے اور اللہ کے کلمہ کے ذریعہ وہ تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں۔ ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہاری خواب گاہ میں کسی شخص کو نہ آنے دیں۔ جو تمہیں گوارا نہیں، اگر ایسا کریں تو تم انہیں مار سکتے ہو، لیکن سخت مار نہ مارنا اور تم پر ان کا حق یہ ہے کہ تم انہیں معروف طریقے سے کھلاؤ اور پہناؤ۔

اور میں تم میں ایسی چیز چھوڑے جارہا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا

تو اس کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے اور وہ ہے اللہ کی کتاب اور میری سنت۔

اور تم سے میرے متعلق پوچھا جائے گا۔ تو کیا کہو گے؟ صحابہ نے کہا ''ہم شہادت دیں گے کہ آپ نے تبلیغ کردی، پیغام دیا اور خیر خواہی کا حق ادا فرمادیا۔

یہ سن کر آپ نے شہادت کی انگلی کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور لوگوں کی طرف جھکاتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! تو گواہ رہ! اے اللہ تو گواہ رہ!

☆☆

سیرت طیبہؐ کی پیروی
انسانیت کی اصلاح کی ضامن

● حکیم محمد سید

حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ انسان کی زندگی کے تمام شعبوں کے لئے دائمی مشعل راہ اور کامل ترین نمونہ عمل ہے۔ اگر حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا مینارہ نور سامنے نہ ہوتا تو انسان کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کا سلیقہ اور قرینہ راہ حق کا ادراک کبھی میسر نہ ہوتا۔ توحید کی وہ حقیقت بھی عیاں نہ ہوتی جس نے عالم انسانی کو وحدت، اخوت اور محبت کا جذبہ بے مثال عطا کیا اور عداوت ونفرت کے شعلہ زاروں میں مہر والفت کا چمن کھلا دیا۔

یہ خاتم الانبیاء حضرت محمدؐ ہی کی سیرت طیبہ کا فیضان ہے کہ افراد کی ساری قوتیں ایمان کے نقطہ کار پر جمع ہو کر تخریب سے تعمیر کی راہ پر لگ گئیں اور بغض وعناد کی آگ بھڑکانے والے اور اس سہارے زندگی گزارنے والے امن وآشتی کے نقیب اور سارے عالم کے لئے سکون وسلامتی کے داعی بن گئے۔

انبیائے کرام علیہم السلام پہلے بھی آتے رہے تھے اور اس طرح بندگی رب کا پیغام انسانوں کو ہمیشہ پہنچتا رہا، مگر ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والوں کے لئے عالمگیر اور دائمی نمونہ عمل آپ ﷺ ہی کی سیرت طیبہ کو کہا گیا اس لئے کہ نبوت اور رسالت کا سلسلہ آپ کی ذات اقدس پر تمام ہوا اور احکام الٰہی کی عملی تصویر نقوش سیرت کے ذریعہ منزل تکمیل تک پہنچادی گئی۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت، پیغمبرانہ صفات کی جامعیت اور محاسن اخلاق کے سارے دلکش نمونے سیرت طیبہ میں شان انفرادیت کے ساتھ موجود ہیں، مگر جو چیز مرکزی نکتے اور عطر سیرت کی حیثیت رکھتی ہے وہ اللہ کے بندوں پر آپ کی شفقت، انسانوں سے آپ ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کا وہ خلق عظیم جس کا مہر عالمتاب سب کے سروں پر ضوفشاں نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ نے پتھر جیسے دلوں کو اپنی شفقت ومحبت ہی سے ایسا گداز عطا کیا کہ وہ ساری انسانیت کے غم خوار بن گئے، اگر آپ ﷺ کا رحم وکرم تمام عالم کے لئے عام نہ ہوتا اور آپ ﷺ مرکز دل ونگاہ نہ ہوتے، قرآن مجید میں ہے:

آیت کے الفاظ، ''اے نبی یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو سب تمہارے گرد وپیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کردو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔''
(آل عمران:۱۵۹)

کاشانۂ اقدس میں مہینوں چولہا نہ جلتا، مگر اللہ کے بندوں کی لاچاری اور فاقہ کشی آپ ﷺ کو گوارہ نہ تھی۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک بھوکا شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اس وقت خانہ نبوی ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا جو شخص آج کی رات اس شخص کو اپنا مہمان بنائے گا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ ایک انصاری بصد شوق اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کچھ گھر میں ہے؟ انہوں نے کہا کہ صرف بچوں کا کھانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بچوں کو سلادو اور چراغ بجھادو ہم دونوں رات کو بھوکے رہیں۔ ہم مہمان پر یہ ظاہر کریں گے کہ ہم بھی اس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا صبح کو آپ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری مہمان نوازی اور حسن سلوک اور ایثار کی خبر دی اور تم سے اپنی خوشنودی کا اظہار قرآن میں فرمایا:

کسی کو گرفتار مصیبت دیکھ کر آپ کا دریائے رحمت جوش میں آجاتا۔ آپ فوراً آگے

بڑھتے اور اللہ کے اس بندے کو جب تک اس مصیبت سے نجات نہ دلا دیتے آپ کو سکون نہ ہوتا۔ ہر مصیبت زدہ اور مظلوم انسان اپنی چارہ سازی کی درخواست اس یقین کے ساتھ کرتا تھا کہ آپؐ اس پر ضرور کرم فرمائیں گے۔

ایک صحابی نے جنگ سے واپس آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نہایت ہمت وشجاعت کے ساتھ لڑ رہا تھا کہ اچانک میرے سامنے ایک کافر آیا اور اس نے لا الہ الا اللہ کہا، مگر میں نے اسے مار ڈالا۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب اس نے کلمہ پڑھ لیا تو پھر کیوں مارا۔ انہوں نے عرض کیا حضور ﷺ مجھ کو یہ خیال ہوا کہ شاید جان کے ڈر سے اس نے کلمہ پڑھا آپ ﷺ نے سخت برہمی کے عالم میں فرمایا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ وہ صحابی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی اس برہمی کا تصور جب بھی میں کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

انسان تو بہر حال خلیفۃ اللہ ہونے کی وجہ سے موجودات میں ایک قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی فلاح وسعادت اور اس کی حرمت وکمال کا آپ ﷺ کی شفقت ورحمت کا امتیاز تو یہ ہے کہ حیوانوں پر بھی رحم کی تلقین فرمائی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص کہیں سفر پر تھا راستے میں اس کو سخت پیاس لگی۔ سامنے کنواں تھا۔ وہ اس میں اتر گیا۔ جب باہر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے گیلی زمین چاٹ رہا ہے اس نے کہا کہ پیاس سے جو میرا حال ہو رہا تھا وہ اس کا بھی ہے۔ پھر وہ کنویں میں اترا اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھر کر ان کو دانتوں سے دبایا کنویں سے نکل کر اس کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کو قبول فرمایا اور اس کی مغفرت فرما دی۔ لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا جانوروں کے معاملہ میں اللہ نے اجر رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہر اس مخلوق کے ساتھ سلوک میں جو جان رکھتی ہے اجر ہے۔

جس ذات اقدس کی طرف سے جانداروں پر رحم کی ایسی تاکید کی گئی ہو، انسان اور اس کے سارے طبقات کے لئے لطف وکرم اور احسان وعنایت کا کیسا اہتمام کیا گیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شفقت ومحبت کے یہی ابدی نقوش اسلامی معاشرے کے افراد کے مابین اخوت اور دائمی محبت کے لئے چراغ راہ بنے۔ آپ ﷺ نے جس معاشرے کی تشکیل فرمائی اس کی اساس قدر ومحبت اور اخوت ہی ہے۔ دلوں کی نرمی، اخلاق کی پاکیزگی، دوسروں کے کام آنے کا حوصلہ، مصیبت، غربت، جہالت اور عسرت کے خلاف جدوجہد میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، نیکیوں کے فروغ کی مشترکہ جدوجہد اور باہمی ربط واتحاد ہے۔ یہ اسلامی معاشرے کے وہ خدوخال ہیں جو اس کے لئے سرمایہ افتخار وامتیاز ہیں۔

اس محبت واخوت کی حقیقت آپ ﷺ نے اس طرح ذہن نشیں کرائی کہ یہ صفات کمال ایمان کی علامت بن گئیں۔ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔

حدیث کے الفاظ، ''کامل ترین ایمان یہ ہے کہ تم دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔''

یہ صرف ایک اخلاقی نکتہ نہیں ہے، بلکہ اجتماعی زندگی کی فلاح وسعادت کے تمام رموز اس میں پنہاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک انسان کے لئے اپنی خوش خیالی، کامیابی، فلاح وترقی، عزت ومحبت، راحت وعافیت کی تمنا اس کی سرشت میں داخل ہے۔ نبی رحمت ﷺ نے باہمی محبت کو شرط ایمان قرار دیا۔ اس طرح آپ ﷺ نے اس فطری تقاضے کو ساری مخلوق تک پھیلا کر اسے اسلام کے نظام اخلاق کا ایک اصول قرار دیا کہ آدمی جو کچھ اپنے لئے پسند کرے اسے دوسروں کے لئے بھی ایسا ہی پسند کرنا چاہئے۔''

حدیث کے الفاظ، حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں

ہو سکتے ہو جب تک ایمان نہ لاؤ اور جب تک تمہارے دلوں میں باہمی محبت نہ ہوگی۔ اس وقت تک تمہارا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔''

حضورؐ نے مسلمانوں کی باہمی محبت کو معاشرے کی اساسی قدر بنا کر ان تمام چیزوں سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی جن سے ربط و اتحاد میں کمی آتی ہو اور اخوت کا رشتہ کمزور ہوتا ہو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا حدیث کے الفاظ،''کسی مسلمان کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی کرے یا اس کو برا کہے'' آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ'' **سباب لامؤمن فسق وقتاله كفر**'' (''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس کو قتل کرنا کفر کے برابر ہے۔'')

انفرادی اور اجتماعی عزت ووقار کے تحفظ کے لئے آپؐ نے اتہام اور بہتان طرازی کا دروازہ بند فرمایا۔ تجسس اور عیب جوئی کی ممانعت فرمائی۔ ایک دوسرے کے ساتھ بغض اور حسد اور کینہ وعداوت سے بچنے کی شدید، تاکید فرمائی۔ انسانوں کے نام آپؐ کا اہم پیغام یہ تھا کہ " **یا عبادالله كونوا اخوانا**'(''اللہ کے بندو، بھائی بھائی بن جاؤ۔'')

آپ ﷺ نے ایک ایک کر کے وہ تمام دروازے بند کردئے جس سے باہمی محبت کی دیواروں میں رخنے پڑتے ہوں۔ آپ ﷺ کی نگاہ معجزانہ سے انسانوں کی وہ کمزوریاں پوشیدہ نہ تھیں جن سے دلوں میں فاصلے بڑھتے اور نفرت کے شعلے بھڑکتے ہیں اس لئے آپ ﷺ نے غرور، تکبر، نفاق، فریب اور کسی کی عصبیت سے بچنے کی تاکید فرمائی اور آپ ﷺ نے بتایا کہ ظلم وزیادتی کے کاموں میں اپنی قوم کی اعانت بھی داخل معصیت ہے۔ باہمی محبت کے جذبے کو محرک عامل بنانے کے لئے غصے کو پی جانے اور لوگوں کے ساتھ عفو ودرگزر سے کام لینے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''**حل من فطعک و أحسن من أساالیک** ''(جو تمہارے ساتھ جہالت سے پیش آئے اس کے ساتھ حلم سے پیش آؤ جو تم پر ظلم کرے اسے معاف کردو، جو تمہیں محروم

کرنے کی کوشش کرے اسے دو جو تم سے قطع تعلق کرے تم اس کے ساتھ تعلق قائم رکھو)۔

ان ہی اصولوں کی بنا پر تعاون، محبت اور یکجہتی کی فضا پیدا ہوتی ہے اور ایسی اخوت فروغ پاتی ہے جس میں ہر دل کے لئے مستعد اور ایک دوسرے کے رنج وغم میں برابر کا شریک اور ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور دلسوزی سے پر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو کر تمام مسلمان جسد واحد بن جاتے ہیں ان میں سے کسی ایک تکلیف پر معاشرے کی مصیبت بن جاتی ہے ہر شخص ایک دوسرے کی اعانت کو اپنے ایمان کا تقاضا سمجھتا ہے۔

اخوت اور محبت کا یہی مثال جذبہ تھا جو نبی اکرم ﷺ نے اپنی تربیت سے لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا تھا۔ کوئی کسی کی محروم دیکھ سکتا تھا، نہ کسی کی تکلیف گوارہ کرسکتا تھا، ہر شخص ایک دوسرے کے لئے سینہ سپر ہوجاتا تھا۔ یہ رحمت نبی ﷺ کی تربیت کا اعجاز تھا۔

☆☆

عہد نبویؐ میں معاشرتی انقلاب

● مولانا اسرار الحق قاسمی

یہ وادی کھیتی باڑی کے قابل نہیں ہے، جہاں پہاڑوں اور ریگستانوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، تاریخی پس منظر سے واقفیت رکھنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن چاہے کسی زمانہ میں اوج کمال پر رہا ہو، لیکن آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب وتمدن کی وہ حالت نہیں تھی، جو ترقی یافتہ اور متمدن قوموں کی علامت ہوتی ہے، عربی زبان کی تمام تر وسعتوں کے باوجود جن چیزوں کا تمدن اور اسباب معاشرت سے گہرا تعلق ہے ان کے لئے عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے اور یہ بات احادیث صحیحہ سے بھی ثابت ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ تک عیش ونعمت کے سامان بہت کم تھے۔ مسئلہ حجاب کے شان نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں بیت الخلاء نہیں تھے، عورتیں رفع حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں، ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا وہی آٹا ہوتا تھا۔ بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے۔ (سیرۃ النبی: ۱، ۷۷، ۸۷) یہ ان کی تہذیبی اور تمدنی حالت تھی، دوسری طرف ان کی اخلاقی حالت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی شجاعت وجرأت کا نشانہ اپنے ہی بھائیوں کو بنا رکھا تھا۔ بے کاری اور کاہلی نے جوا اور شراب کی عادت پیدا کر دی تھی۔ تعریف ان کا پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا۔ بتوں پر آدمیوں کا چڑھاوا

چڑھایا جاتا تھا۔ باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی۔ حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہ تھی۔ قمار بازی، شراب نوشی، زنا کاری کا رواج عام تھا اور بے حیائی کی یہ حالت تھی کہ سب سے بڑا شاعر امراء القیس جو شہزادہ بھی تھا، قصیدہ میں پھوپی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزے لے کر بیان کرتا ہے اور حد یہ ہے کہ یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔ لڑائیوں میں لوگوں کو زندگی جلا دینا، مستورات کا پیٹ چاک کرنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا عموماً رواج تھا۔

اہل خرد اور صاحب علم دانش جان سکتے ہیں کہ جس قوم کی یہ حالت رہی ہو، جن کے قلوب اس قدر سخت ہوں وہاں خیر کا کبھی گزر ہی نہ ہوا ہو، کسی کے لئے ان کے دل میں رحم اور شفقت نہ ہو، جہاں خاندان اور قبائل کی بنیاد پر برسہا برس جنگیں لڑی جاتی ہوں، ان قوموں کو ایک صف میں کھڑا کر دینا، امیر وغریب، چھوٹے اور بڑے، کالے اور گورے، مالک اور مملوک اور خادم ومخدوم کے فرق کو مٹانا کس قدر مشکل اور دشوار کام تھا۔ کسے اس خار دار وادی میں آبلہ پائی کی سکت تھی، کسے یہ امید تھی کہ ۲۳ سال کی مختصر سی مدت میں یہ بگڑا ہوا معاشرہ اس قدر مہذب اور مثقف ہو جائے گا۔ عدل وانصاف، ادب واحترام اور حقوق واجبات کا اس قدر پاس ولحاظ رکھا جائے گا، کہ یہ بدوی معاشرہ جو کل اپنی عیاشیوں اور قتل وخونریزی کے لئے مشہور تھے، اب زمانہ کے لئے ہادی اور رہنما بن جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کے لئے اپنے فرض منصبی کو کیسی خوش اسلوبی، صبر وحلم، استقامت اور تحمل سے شروع کیا، کیونکر تہذیب وتمدن اور علم واخلاق کو پھیلایا، کیسے قوموں اور ملکوں کو ایک بنایا، کس طرح انسان کا درجہ بلند کیا، کس طرح توحید کی اشاعت کی اور انسان کے دل پر اللہ کی عظمت وکبریائی کا نقش قائم کرنے کے بعد کس طرح جملہ اشیاء واسباب کا خادم انسانیت ہونا ثابت کیا اور خدا کا یہ پیغام ان کو سنا دیا۔ ''**هوى الذى خلق لكم مافى الارض جميعاً.**''

رسول کریمؐ کس طرح نسل اور قومیت کی خصوصیت اور ملک ومقام کی حالتوں، امیری وغریبی کے امتیاز، فاتح اور مفتوح کے تفاوت، مختلف زبانوں، مختلف رنگوں کے مابہ الامتیاز سے قطع نظر کر کے کیسی خوش اسلوبی سے سب کو دین واحد کے رشتہ سے متحد ومتفق، یکساں ومساوی، ہم سطح وہم خیال، ہم اعتقاد وہم آواز بنایا اور جب آپؐ اس عظیم الشان کام کو انجام دے چکے، بندوں کو خدا سے نزدیک اور قوموں کو قوموں سے قریب بنا چکے، نفرت وعداوت کی جگہ نصرت واخوت کو بٹھا چکے، ظلمت اور جہالت کو نکال کر ان کے دل ودماغ پر نور صداقت وعلم کو متمکن کر چکے، تب کیسی فارغ البالی، کشادہ پیشانی اور مسرت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپؐ نے چند سالوں میں لوگوں کے قلوب میں وحدت کا بیج اس طرح بویا کہ نجد کے وحشی، تہامہ کے بدو اور یمن کے مسکین دوش بدوش کھڑے ہونے پر نازاں وفرحاں نظر آنے لگے۔

عبداللہ بن سلام یہودیت، روقہ بن نوفل عیسائیت اور عثمان بن طلحہ ابراہیمیت کی مسند ہائے امامت کو چھوڑ کر اسلام کے خادم شمار کئے جانے پر فخر کرتے ہیں۔ یہودیوں کے زرخرید غلام سلمان فارسی ''منا اہل البیت'' کے درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں اور بت پرستوں کے زرخرید غلام بلال حبشیؓ اور فاروق اعظم بھی جن کی سطوت وہیبت سے قیصر وکسریٰ کے در دیورا اندام پر لرزہ تھا۔ سید سید (آقا آقا) کہہ کر پکار رہے ہیں۔ رنگتوں کا اختلاف زبانوں کا فرق قومیت کا تفرقہ، ملکی خصوصیات کا امتیاز سب کچھ جاتا رہا۔ حسب ونسب کی شرافت کا ذکر زبان پر لانا کمینگی کی دلیل بن گیا۔ دین واحد نے سب کو ملت واحد بنا کر ایک ہی ولولہ دلوں میں، ایک ہی خوشی طبیعتوں میں، ایک ہی خیال دماغوں میں ایک ہی آوازہ توحید زبانوں پر جاری کر دیا ہے۔

دشمن دوست بن گئے، جان لینے والے جاں نثار ثابت ہوئے۔ وہ عمرو بن عاص جو حبش میں نجاشی کے پاس قریش کا سفیر بن کر گیا تھا کہ مسلمانوں کو بطور مجرمین کے حاصل

کرے۔ چند سال کے بعد وہی عمان کے بادشاہ کے پاس داعی اسلام بن کر جاتا ہے اور ہزاروں افراد کے مسلمان ہو جانے کی بشارت رسول اللہؐ کی خدمت میں لاتا ہے۔ وہی خالد بن ولید جو جنگ احد میں مشرکین کی فوج کی کمانڈ کرتا ہوا مسلمانوں کو تباہ کرنا اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد سمجھتا تھا، کچھ عرصہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوتا ہے اور اسلامی فتوحات میں گرم جوش جنرل کا درجہ پاتا ہے۔ وہی عروہ بن مسعود جو حدیبیہ میں آنحضرتؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لئے قریش کا سفیر بن کر آیا تھا، خود بخود مدینہ میں حاضر ہوتا ہے اور اپنی قوم میں دعوت اسلام کی اجازت حاصل کر کے اسی کی خدمت میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ وہی سہل بن عمر جو حدیبیہ میں بت پرستوں کی جانب سے کمشنر معاہدہ تھا اور جس نے عہد نامہ میں اس پاک محمدؐ کے ساتھ لفظ ''رسول'' لکھے جانے پر انکار کیا تھا۔ وفات نبوی کے بعد بیت اللہ میں کھڑے ہو کر اسلام کی صداقت اور دین الٰہی کی تائید میں ایسی زبردست تقریر کرتا ہے جو سیکڑوں دلوں میں سکینہ اور ایمان بھر دیتی ہے۔ وہی عمر فاروقؓ جو تلوار لے کر گھر سے آنحضرتؐ کا سر قلم کرنے کے لئے نکلا تھا، وفات نبوی کے دن شمشیر برہنہ لے کر کہہ رہا ہے کہ جو کوئی کہے گا کہ ''آنحضرتؐ نے وفات پائی اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ وہی وحشی جس نے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، کلیجہ نکالا، اعضاء کاٹے، کچھ دنوں بعد جب مسلمان ہو جاتا ہے، شرم وخجالت سے منہ سامنے نہیں کرتا ہے اور بالآخر مسیلمہ کذاب کے قتل کو اپنی حرکت سابقہ کی تلافی سمجھتا ہے۔

وہی ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب جو حقیقی چچا کا بیٹا ہو کر بھی نبیؐ کی ہجو میں متواتر اشعار کہا کرتا تھا، جذبہ توفیق سے خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور جنگ حنین کے میدان میں وہی اکیلا رکاب نبوی تھامے نظر آتا ہے۔

وہی سفیان بن حرب جو سات برس تک برابر آنحضرتؐ کے مقابلہ میں فوجیں لاتا رہا اور مسلمانوں کے خلاف سارے ملک میں آتش فساد بھڑکاتا رہا، اسلام لاتا ہے اور

نجران کے عیسائی علاقہ میں حاکم بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ وہ طفیل دوسی جو مکہ میں روئی کی ڈاٹ کان میں لگا کر پھرتا تھا کہ محمد کی آواز کان میں نہ پہنچے، بالآخر اپنے وطن میں گھر گھر پھرتا اور محمد ﷺ کی آواز کو پہنچاتا ہے۔

الغرض اسی طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جن کو پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن بطور مثال اور نمونہ کے کچھ لوگوں کے حالات ذکر کئے گئے، تاکہ ان سے ان تبدیلیوں کا اور عظیم اسلامی انقلاب کا ایک خاکہ اور نقشہ ذہن میں آجائے کہ کس طرح سے اتنی قلیل مدت میں لوگوں کے اندر اس قدر زبردست تبدیلی پیدا ہوئی، ظاہر ہے کہ یہ سب کرشمے اس پاک تعلیم کے تھے جو آہستہ آہستہ دلوں کو فتح کرتی جاتی تھی۔ اکثر انبیاء علیہم السلام نے معجزے دکھائے، ان کے ذریعہ لاٹھی، سانپ، پتھر، دریا اور آگ کی قلب ماہیت یا سلب خاصیت کا نظارہ دیکھنے کو نظر آیا، لیکن نبی کریم ﷺ نے عظیم الشان معجزہ یہ دکھایا کہ دلوں کو بدل دیا اور روح کو پاکیزہ بنا دیا۔

کاش مسلمان اس پاکیزہ تعلیم کی قدر کریں، کاش وہ نبی کریم ﷺ کے پاک مقصد سے آگاہی حاصل کریں، کاش وہ اسلام کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھیں، کاش! مسلمان اسلام کی بقا کو اپنی جانوں، اپنے بچوں، اپنے باپ اور بزرگوں کی حیات و بقا سے زیادہ ضروری سمجھنے لگیں اور آپ ﷺ کے اس فرمان کو عملی تصویر پیش کر سکیں۔ ''تم میں سے کوئی سچا پکا مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے لئے سب سے زیادہ محبوب شخص نہ ہو جاؤں۔ اس کے والد سے، اس کے بچہ سے اور دیگر تمام لوگوں سے۔''

اگر محبت الٰہی اور عشق رسول کی سچی آگ دلوں میں لگ جائے تو پھر وہی عبدیت، فنائیت اور اخلاق و کردار کی عظمت پیدا ہو سکتی ہے اور پورا معاشرہ جو آج اسلامی تعلیمات سے کوسوں دور ہے اور نت نئی برائیوں کے جال میں لوگ پھنستے جا رہے ہیں، ان کے لئے ان برائیوں سے نکلنا اور معاشرہ کو پاکیزہ بنانا، زنا کاری، شراب نوشی، جوابازی، چوری،

ڈاکہ زنی، رہزنی اور اخلاق سوز جرائم جو ہر دن صبح سویرے اخبار کی پیشانی پر لکھے جاتے ہیں، اس سے معاشرہ کو پاک کرنا آسان ہو جائے گا۔ پھر وہی محبت، وہی پیار، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، معاملات میں صفائی، عبادت و ریاضت میں خشوع و خضوع دعا والتجا میں الحاح وزاری اور فغان صبح گاہی میں درد دل کی آمیزش پیدا ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے اور معاشرہ کی بھلائی اور اچھائی کے لئے کی جانے والی کوششوں کو بار آور کرے۔ **وماذالک علی اللہ بعزیز.**

تو مجھے نواز دے تو یہ تیرا کرم ہے ورنہ
تیری رحمتوں کا بدلہ میری بندگی نہیں ہے

☆☆

رحمت عالم، بہار عالم

● علامہ محمد اکرام علی

ربیع الاوّل کے مہینہ میں ہم سب کے آقا ومولیٰ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تھی۔ آپ ﷺ کے وجود اور آپ ﷺ کی زندگی میں پورے عالم کی زندگی ہے۔ آپ ﷺ کے آتے ہی بیجان دنیا میں جان آ گئی۔ آپ ﷺ تشریف لائے تو دنیا میں قرآن آیا۔ دین اسلام آیا، صدیقؓ آئے، فاروقؓ آئے، ذوالنورین آئے، شیر خدا آئے، صحابہ آئے، تابعین آئے، قطب آئے، ابدال آئے، اولیاء کرام آئے، ائمہ کرام آئے، امام آئے، ابوحنیفہؒ آئے، امام مالک آئے، امام شافعی آئے، امام احمد بن حنبل آئے، امام بخاریؒ آئے، امام مسلم، نسائی آئے، امام ترمذی آئے، سارے ائمہ حدیث، فقہا وعظام آئے، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ آئے، جنید بغدادیؒ آئے، خواجہ معین الدین اجمیریؒ آئے، آپ ﷺ کیا آئے کہ آفتاب وماہتاب آ گئے۔

''آپ ﷺ کیا تھے اور آپ ﷺ میں کیا تھا'' جس طرح خدا کی حقیقت خدا ہی جانتا ہے کوئی دوسرا نہیں جانتا، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی حقیقت انبیاء علیہم السلام ہی جانتے اور اپنی حقیقت وہی بتا سکتے ہیں۔ ''**لا یعرب النبی و لا النبی و لا یعرب الولی الا الولی.**'' ولی را ولی می شناسد۔ اس لئے ہم لوگ اپنے آقائے دوجہاں ﷺ سے دریافت کریں! آپ ﷺ اپنی حقیقت خود بیان فرمادیں، تاکہ ہمارا ایمان تازہ ہوجائے، اب آپ آنحضرت ﷺ کی حقیقت آپ ﷺ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مرتبہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ علیہ عنہا نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کیا بات ہے کہ

آپ قضاء حاجت کے لئے بیت الخلاء تشریف لے جاتے ہیں اور آپ ﷺ کے فوراً بعد میں جاتی ہوں تو آپ کا پاخانہ زمین پر نہیں دیکھتی ہوں، البتہ بیت الخلاء خوشبو سے معطر ہوتا ہے، آخر ماجرا کیا ہے۔ اس پر آنحضورؐ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عائشہ تجھے اتنی خبر نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے اجسام جنتوں کی روح سے بنائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ انبیاء علیہم السلام کے جسم سے جو کچھ نکلے اس کو اپنے اندر جذب (نگل جائے) کرے، اس کو زمین پر پڑا نہ رہنے دے۔'' اب آپ اس سے اندازہ لگائیے کہ جو حال ہماری روحوں کا ہے وہ حال انبیاء علیہم السلام کے جسموں کا ہے۔ روح لطیف ہے تو انبیاء علیہم السلام کے جسم لطیف ہیں جس طرح موت کے بعد ہماری روح سڑتی گلتی نہیں، اسی طرح انبیاء کے اجسام موت کے بعد سڑتے گلتے نہیں۔ جمہور اہل سنت والجماعت کا نظریہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر تھوڑی دیر کے لئے موت آتی ہے پھر قبر میں زندگی واپس کردی جاتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے: ''**ان اللہ حرم علی الأرض ان تأکل أجساد الأنبیاء.**'' یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ انبیاء علیہم السلام کی اجسام کو زمین ہضم کرلے ان کے جسم جوں کے توں محفوظ رہتے ہیں ایک اور حدیث میں ''**الانبیاء احیاء فی قبورھم**'' (انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور وہ زندگی صاف قبر والی زندگی نہیں ہوتی)۔ برزخی تو ہر مرد کو نصیب ہے، بلکہ انبیاء علیہم السلام کو قبر میں برزخی زندگی کے ساتھ دنیوں زندگی بھی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرنے کے بعد انبیاء علیہم السلام کے متروکہ مال کو وارثوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ ان کی بیویوں سے کوئی نکاح نہیں کرسکتا ہے۔ مرنے کے بعد نبی کا فیض دنیا میں اسی طرح پہنچتا رہتا ہے۔ اگر نبی کا فیض آنا بند ہوجائے تو ایمان ہی دنیا سے رخصت ہوجائے۔ شیخ ابوالحسن شاذیؒ کا مقولہ ہے کہ ''اگر میرے اور آنحضور ﷺ کے درمیان ایک سیکنڈ کے لئے بھی حجاب ہوجائے تو پھر ایمان کا باقی رکھنا ہی مشکل ہوجائے''۔ ایک حدیث میں ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز پڑھ رہے ہیں۔

معراج میں جاتے ہوئے آنحضورﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ تلبیہ پڑھتے ہوئے آرہے ہیں۔ کہیں حضرت یونس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ واقعہ حرہ جو یزید کے زمانہ میں ہوا حضرت سعید بن المسیب اور حضرت سعید بن عبدالعزیز مسجد نبوی میں رہ گئے تھے، پورا مدینہ خالی ہوگیا تھا۔ تین دن تک مسجد نبوی میں اذان اور نماز نہیں ہوئی، نماز کے اوقات میں قبر اطہر سے اذان کی آواز سن کر نماز کے اوقات ان دونوں کو معلوم ہوتے تھے، حضرت سعید احمد رفاعیؒ جب ۵۵۵ھ میں حج سے فارغ ہوکر روضۂ انور کی زیارت کے لئے مدینہ منورہ آئے تو روضہ انور کے مقابل کھڑے ہوکر سوز دل سے یہ تمنا ظاہر کی کہ یارسول اللہ اپنا دست مبارک قبر سے باہر نکالیں کہ میں ان کو بوسہ دوں اس پر قبر شریف سے دست مبارک باہر نکلا اور انہوں نے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً نوے ہزار کا مجمع مسجد نبوی میں اس وقت موجود تھا اور تمام لوگوں کو دست مبارک کی زیارت ہوئی۔ اس مجمع میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی موجود تھے۔ ابن جلا کہتے ہیں کہ میں مدینہ آیا میں کئی دن سے بھوکا تھا میں قبر مبارک کے قریب حاضر ہوا اور عرض کیا حضور میں آپﷺ کا مہمان ہوں کچھ دیر بعد کچھ غنودگی سی ہوئی تو مجھے آنحضورﷺ کی زیارت ہوئی۔ مجھے آپﷺ نے ایک روٹی عنایت فرمائی۔ اس میں سے آدھی کھائی اور جب میں بیدار ہوا تو آدھی روٹی میرے ہاتھ میں تھی (فضائل حج) بہرحال آپﷺ زندہ ہیں، اس لئے آپﷺ کا فیض جاری ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ''فیوض الحرمین'' میں لکھا ہے کہ میں نے روضہ اقدس کے پاس مراقبہ کیا تو میں نے دیکھا کہ روضہ اطہر سے نور کی ایک لکیر نکل رہی ہے اور وہ لکیر ان تمام لوگوں کے سینہ سے لگی ہوئی ہے جو حدیث کے پڑھانے میں مصروف ہیں۔ اس امت میں ایسی برگزیدہ ہستیاں گزری ہیں سب کو بیداری میں آنحضورﷺ کی زیارت ہوئی۔ ائمہ شافعیہ میں امام غزالیؒ، ابن سبکی اور یافعی نے اس کی تصریح کی ہے۔ مالکیہ میں امام قرطبی، حافظ ابن ابی حمزہ، ابن الحاج وغیرہ حضرات ہیں۔ انہوں نے بعض اولیاء کے

حالات میں لکھا ہے کہ وہ کسی فقیہ کی مجلس میں تشریف لے گئے تو اس فقیہ نے کوئی روایت بیان کی یہ ولی بولے کہ یہ روایت تو غلط ہے۔ اس فقیہ نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیسے کہہ دیا تو اس ولی نے کہا کہ یہ آنحضرتﷺ تیرے سامنے تشریف فرما ہیں اور فرمارہے ہیں کہ یہ حدیث میں نے بیان نہیں کی۔ اس فقیہ کو بھی اس کا انکشاف ہوا اور انہوں نے بھی آنحضورﷺ کو دیکھ لیا۔ شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ، حافظ جلال الدین سیوطی سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرتﷺ کو بحالت بیداری ستّر سے زیادہ مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ حافظ سیوطی نے آنحضورﷺ سے پوچھا یارسول اللہ میں جنتی ہوں۔ فرمایا ہاں، میں نے پوچھا کیا عذاب کے بغیر فرمایا۔ جاؤ تمہارے لئے یہ بھی صحیح۔ شیخ عطیہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے شیخ سیوطیؒ سے درخواست کی کہ میری ایک ضرورت کے متعلق آپ سلطان غوری سے سفارش فرمادیں تو شیخ سیوطی نے جواب دیا۔ عطیہ میں بحالت بیداری آنحضرت کی محفل میں حاضر ہوتا ہوں مجھے خطرہ ہے کہ اگر میں سلطان غوری کی محفل میں جاؤں تو کہیں اس سعادت سے محروم نہ ہوجاؤں۔ اس کے بعد فرمایا کہ صحابہ کو فرشتے سلام کرتے تھے۔ انہوں نے ایک مرض کی وجہ سے جسم پر لوہے کا داغ دے کر علاج کیا تو وہ اس سعادت سے محروم ہوگئے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے واقعہ لکھا ہے کہ مولوی قلندر صاحب، جلال آبادی حضوری تھے۔ روزانہ آنحضورﷺ کی زیارت ہوتی تھی۔ سفر مدینہ میں ان کے اونٹ چلانے والے لڑکے سے غلطی ہوگئی۔ مولوی قلندر صاحب نے اس لڑکے کو ایک تھپڑ مارا بس آنحضورﷺ کی زیارت بند ہوگئی۔ بہت پریشان ہوئے مدینہ پہنچ کر مشائخ سے ذکر کیا۔ لوگوں نے کہا کہ ایک مجذوب عورت ہے ان سے جاکر کہو شاید یہ گرہ کھل جائے۔ اس مجذوب عورت کو تلاش کیا معلوم ہوا وہ عورت روضہ مبارک پر حاضر ہوا کرتی ہے۔ مولوی قلندر صاحب اس مجذوب عورت کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا۔ اس عورت کو جوش آیا اور روضہ اطہر کی طرف اشارہ کرکے کہا: شف، یعنی دیکھ۔ انہوں نے جو ادھر دیکھا تو بیداری میں حضورﷺ کی

زیارت ہوگئی (ملفوظات حکیم الامت) یہ واقعات ہیں جن کی اوپر کی احادیث سے تائید ہوتی ہے۔ ان احادیث اور واقعات سے حضورﷺ کی حیاۃ دنیوی اور اس دنیا سے آپ ﷺ کے بے پناہ تعلق کا اندازہ ہوتا ہے اور فیض رسانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام پاکیزہ فطرت ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا خاکی قلب گو بظاہر وہی تھا جو عام انسانوں کا ہوتا ہے، مگر ان کا جوہر، فطرت ایسا پاکیزہ ہوتا ہے کہ ان کو حرف معصیت سے ذرا آشنائی بھی نہیں ہوتی اور اس کے ساتھ خدا کی طرف سے طرح طرح سے پاک وصاف کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کے ان کے خواب و بیداری کی دونوں کیفیت یکساں ہوتی ہے۔ وہ اپنے خواب کی حالت میں بھی عام انسانوں کی بیداری سے زیادہ بیدار ہوتے ہیں۔ ان کا خواب بھی وہی ہوتا ہے۔ وہ سو بھی جائیں تو ان کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ خوشی اور ناراضگی ہر حال میں وہ انصاف پسند اور حق گو ہوتے ہیں۔ ان کی معصومیت اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ ان کی معصومیت پر فرشتوں کی معصومیت رشک کرتی ہے۔ ان کو پیدائشی طور پر وہ نفس مرحمت ہوتا ہے جو فطرتاً ان کو معصیت سے نفرت ہوتی ہے اور ہر وقت عبدیت کا نشہ ان پر سوار رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ولادت کے بعد ہی زبان مبارک سے جو کلمہ نکلا تھا وہ یہ تھا ''انی عبداللہ'' اب آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ اپنے غیر شعوری دور میں بھی عبدیت کا کتنا شعور رکھتے ہیں۔ جب پیدا ہونے کے بعد ہی سے اللہ کا اتنا استحضار ہے تو بڑے ہو کر کتنا استحضار ہوگا، بلکہ ان کی پاک مجلس میں ان کے فیض محبت سے غیروں کو اتنا استحضار ہو جاتا تھا تو خود ان کے استحضار کا کیا عالم ہوگا۔ حضرت عوف بن مالکؓ سے ایک بار آنحضورﷺ نے دریافت فرمایا کہ عوف کیا حال ہے؟۔ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! بہت اچھا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یا عوف یہ تو تمہارا دعویٰ ہوا، دعویٰ کی تکمیل ہوتی ہے تمہارے اچھے ہونے کی کیا دلیل ہے۔ فرمایا یارسول اللہ رات جاگ کر گزار دیتا ہوں اور دن کی گرمی میں پیاسا رہتا ہوں اور عالم آخرت کا اتنا استحضار ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا عرش میری نگاہوں کے سامنے

ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنتی جنت میں خوشی کی باتیں کر رہے ہیں اور جہنمی کو پاؤں میں بیڑی ڈال کر جہنم میں ڈالا جا رہا ہے اور ان کے آہ و بکا کو سن رہا ہوں۔ آنحضورﷺ نے فرمایا تم نے سچ کہا اس حالت کو ہمیشہ باقی رکھنا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں ایک مرتبہ رسول اللہﷺ نے ایک نقش دار کمبلی میں نماز ادا فرمائی نماز کی حالت میں آپ کی نظر مبارک ذرا سا اس کے پھولوں پر جا پڑیں جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ اس کمبلی کو تو ابوجہم کو جا کر دے دو اور ان کی وہی موٹی کمبلی مجھے لا دو۔ اس نے تو مجھے ابھی نماز سے غافل کر دیا ہوتا۔ اشکال یہ ہے کہ جب یہ چادر آپ ﷺ نے اپنے لئے ناپسند فرمایا تو پھر اس کو ابوجہم کے لئے کیسے پسند فرمایا۔ محدثین نے اس کے بہت سارے جوابات دئے ہیں۔ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ نے جواب دیا ہے کہ ہمارے نزدیک نبی کی تو وہ شان ہوتی ہے کہ جس کو وہ غفلت سے تعبیر کرتا ہو، اگر دوسروں کو میسر آجائے تو ان کی ہزاروں حضوریوں سے بلند تر ہوگی۔ نبی کریمﷺ کی عظمت شان کا یہ حال ہے کہ کسی کو خواب میں شیطان آپ ﷺ کی شکل میں متشکل ہونے کی بھی طاقت نہیں رکھتا ہے اور کسی کے دین کی شدت سے تو اتنا مرعوب ہو جاتا ہے کہ جس طرف سے اس کا گزر ہو جائے تو راستہ ہی کترا کر نکل جاتا ہے۔ نبی کی عظمت کا اندازہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حالات کتنی نزاکت اختیار کر چکے تھے، یعنی جس طرف سے انکار کا شبہ ہو سکتا تھا اب اسی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت دی جا رہی ہے۔ جوانی ہے اور بے مثال حسن ہے اور بالکل تنہائی ہے۔ صورت حالات کی نزاکت کو اس آیت میں ظاہر کیا گیا ہے ''**ولقد همت به وهم بها لو لا أن رأ برهان ربـــه.**'' (یعنی ایک جانب تو ارادہ ہو ہی چکا تھا اور اس بنا پر دوسری جانب میں حفاظت کے سارے اسباب موجود ہو گئے تھے اور نقشہ کچھ ایسا بن گیا تھا کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے رب نہ آجاتے تو اس طرف سے بھی ارادہ ہو جانا کچھ بعید نہ تھا)۔ اس بلند مقام کو

ظاہر کرنے کے لئے جو تعبیر یہاں اختیار کی گئی ہے وہ بھی کتنی بلند ہے۔ یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے یوسف علیہ السلام سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیا یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے یوسف کو برائی سے پھیر دیا، یعنی پھیرنے کا تعلق جو کچھ بھی رہا ہو ''سوء'' اور ''فحشا'' کے ساتھ رہا۔ اس کا تعلق یوسف کے ساتھ کچھ نہ تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ سوء اور فحشاء خود بڑھ کر یوسف کے طرف آ رہا تھا۔ اس لئے پھیرنے کا تعلق اسی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ حضرت یوسف چونکہ بدستور اپنی جگہ ثابت قدم رہے، اس لئے یوسف کو پھیرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مقام کی نزاکت کو دیکھئے اور یوسف علیہ السلام کی ثابت قدمی ملاحظہ کیجئے، قرآن کریم انبیاء علیہم السلام کی عصمت بیان کرنے میں کتنے احتیاط سے کام لیتا ہے۔ آنحضورﷺ کی عصمت کا نقشہ ایک جگہ اس طرح کھینچا ہے۔ آپﷺ کے سامنے منافقین نے ایک مسلمان پر جھوٹی تہمت لگائی اور اس کے لئے اس قسم کے قرائن اور شہادتیں مہیا کر دیں کہ ایک خالی انسان کے لئے ان کے موافق فیصلہ دئے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ اس لئے اگر آپﷺ یہاں مسلمان کے خلاف فیصلہ فرما دیتے تو بالکل قرین قیاس ہوتا، مگر خدائی حفاظت نے آپﷺ کو ایسے فیصلہ سے بچالیا اس کو قرآن کریم نے کس انداز سے بیان کیا ہے۔ یہاں بھی احتیاط کے جتنے پہلو تھے ان سب کی رعایت کی گئی ہے۔ یعنی جس بات کا خطرہ ظاہر کیا گیا ہے وہ آپﷺ کا کوئی عملی قدم نہ تھا، بلکہ صرف طبیعت کا میلان تھا پھر اس پر لفظ کدت اضافہ فرما کر بتایا گیا کہ آپ کا وہ میلان ہوا بھی نہ تھا، بلکہ حالات اس کے قریب آ گئے تھے کہ اگر ہم سنبھال لیتے تو ایسا ہو جاتا ہے، پھر اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ ''شیئاً'' کے ساتھ ''قلیلا'' کی صفت بڑھا کر اور تنبیہ کر دی گئی کہ اگر آپﷺ کا رجحان ہوتا تو وہ بہت ہی معمولی ہوتا۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضورﷺ فجر کی نماز میں مورد روم تلاوت فرما رہے تھے اور اٹک گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد آپﷺ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال کہ اچھی طرح وضو کئے بغیر میرے پیچھے نماز میں شریک ہو جاتے ہیں اور ان کے خراب

وضو کا میری قراءت پر اثر پڑتا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ طبیعت میں کتنی لطافت ہے کہ دوسروں کے وضو کا اثر بھی آپﷺ پر پڑ جاتا ہے پھر ایسی پاک ہستی کے گناہ کرنے کا کیا سوال ہو سکتا ہے۔ کہنے والے نے صحیح کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خود چلتے نہیں، بلکہ چلائے جاتے ہیں۔ ان کا ہاتھ خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور انہیں سنبھال کر چلاتے ہیں۔ قطعاً اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہیں نافرمانی کا مادہ نہیں ہے۔ عام انسانوں کی طرح ان میں بھی ہے، مگر فرق یہ ہے کہ عام انسان خارجی اثرات سے متاثر نافرمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، مگر انبیاء علیہم السلام پر خارجی اثرات سے جب یہ داعیہ پیدا ہوتا ہے تو قدرت اس کی نگہبان بن جاتی ہے اور ایسے حالات میں ان کو غلط اقدام سے محفوظ کر لیتی ہے اور بجائے نافرمانی کے فرمانبرداری کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ یعنی نافرمانی کے اسباب ان کے لئے فرمانبرداری کے اسباب بن جاتے ہیں۔ زنان مصر نے جب حضرت یوسف علیہ السلام میں عصمت وعفت کا نقشہ دیکھا تو ان کو اپنے چشم دید یقین میں بھی شبہ گزرنے لگا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا..... گناہ کے اسباب ودواعی کے باوجود معصیت سے نفرت جتنا قابل تعجب ہے ان اسباب کے نہ ہونے کی صورت میں معصیت سے نفرت قابل تعجب ہیں۔ فرشتہ اگر پاکبازی دکھلائے تو یہ اس کی فطرت ہے۔ ''انبیاء علیہم السلام کے کمالات اظہر من الشمس ہوتے ہیں'' انبیاء علیہم السلام کی خوبیوں کا انسان تو انسان جانوروں کو بھی احساس ہوتا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں ہے کہ آنحضورﷺ بعض غزوہ میں اپنے سفید خچر پر سوار تھے (جو ملک ایلہ نے ہدیہ میں دیا تھا) جب مشرکین کی طرف مٹی پھینکنے کا ارادہ فرماتے تو خچر زمین کی طرف فوراً جھک جاتا تھا کہ آپﷺ بیٹھے بیٹھے زمین سے مٹی اٹھا لیتے تھے۔ ابوداؤد میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب آنحضورﷺ مٹی میں اونٹ کی قربانی کرنے لگے تو ہر اونٹ انتہائی اشتیاق کے ساتھ آپﷺ کی طرف بڑھتا تھا کہ سب سے پہلے مجھے آپﷺ کے دست مبارک سے قربان ہونے کی سعادت حاصل ہو جائے، جس خچر کا ذکر سیرت کی کتابوں میں آتا ہے آنحضورﷺ

کی وفات کا اس خچر کو اتنا صدمہ ہوا کہ خود زمین کھود کر منہ ڈال کر جان دے دی۔ سیرت ابن ہشام میں یہ واقعہ ہے کہ ایک بار آنحضورﷺ مکہ کی آبادی کے باہر سے پیدل تشریف لا رہے تھے۔ اتفاق سے اسی وقت ابوجہل بھی اونٹ پر سوار ہو کر آ رہا تھا۔ بھتیجہ کو پیدل آتے دیکھ کر گوارا نہیں ہوا کہ میں اونٹ پر رہوں اور بھتیجہ پیدل جائے۔ انہوں نے آنحضورﷺ سے کہا کہ بھتیجہ تم بھی میری اونٹنی پر میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ تعمیل حکم میں آپﷺ ابوجہل کے پیچھے بیٹھ گئے اب اونٹنی بے حال ہوگئی۔ ابوجہل نے ہزار کوشش کی، مگر اونٹنی آگے نہ بڑھی یہ دیکھ کر آپﷺ نے فرمایا کہ چچا اتار دیجئے جب اونٹنی چلے گی۔ چنانچہ آپﷺ کو اتار دیا اونٹنی چلنے لگی اس پر ابوجہل نے کہا کہ بھتیجہ اب آجاؤ پھر تعمیل حکم میں آپﷺ ابوجہل کے پیچھے بیٹھ گئے، پھر اونٹنی رک گئی۔ ہزار کوشش کے بعد بھی آگے نہ بڑھی۔ پھر آپﷺ نے فرمایا چچا مجھے اتار دیجئے جب اونٹنی چلے گی پھر آپﷺ کو اتار دیا اور اونٹنی چلتی ہی نہیں تھی جب آپﷺ نے دیکھا کہ ابوجہل میرے بغیر تنہا سوار ہونا نہیں چاہتا ہے تو فرمایا کہ چچا اگر آپ کی خواہش ہے کہ میں اونٹ پر چلوں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ میرے پیچھے بیٹھ جائیں اور مجھے اپنے آگے بٹھا دیں۔ ابوجہل نے ایسا ہی کیا تو اونٹنی پہلے سے زیادہ تیز رفتار ہوگئی۔ یہ واقعہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے ذکر فرما کر لکھا ہے کہ بخدا ابوجہل سے اس کی اونٹنی زیادہ سمجھدار تھی۔ اونٹنی تو سرکار دو عالمﷺ کے مقام کو پہچان گئی اور ابوجہل انسان ہو کر آپﷺ کا رتبہ نہ پہچان سکا۔ اونٹنی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ امام الانبیاء ابوجہل کے پیچھے بیٹھے۔ مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہمارے گھر میں ایک جنگلی جانور تھا جب آپﷺ باہر چلے جاتے تھے تو گھر میں ادھر ادھر دوڑتا اور کھیل کرتا اور جوں ہی آپﷺ گھر میں تشریف لے آتے اور وہ آہٹ محسوس کر لیتا تو فوراً وہ ایک کونہ میں دبک جاتا اس خیال سے کہ مبادا آپﷺ کو تکلیف نہ ہو۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ مسجد نبوی میں فجر سے قبل مسجد کے ایک ستون سے سہارا لے کر آپﷺ خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب مسجد میں ممبر

بن کر آ گیا اور آپﷺ اس ستون کی بجائے ممبر پر تشریف فرمائے تو وہ ستون فراق نبی میں بلبلا کر رونے لگا جیسے کوئی بچہ ستایا ہوا روتا ہو۔ حاضرین اس کے رونے کی آواز سن رہے تھے، جب آنحضورﷺ نے ممبر سے اتر کر اس ستون کو سینہ مبارک سے چمٹا لیا تو وہ اس طرح سسکنے لگا جیسا روتے ہوئے بچہ کو بہلا کر خاموش کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی زندگی کا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ جب کبھی ہم آنحضورﷺ کے ساتھ مکہ کے اطراف میں نکلتے تو جو پہاڑ یا درخت آپﷺ کے سامنے پڑتا وہ یقیناً آپﷺ کو السلام علیکم یا رسول اللہ کہتا۔ مسلم شریف میں یہ روایت ہے کہ آنحضورﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میں مکہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو بعثت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا۔ بیشک اب بھی میں اس کو پہچانتا ہوں۔ یہ اور اس طرح کے واقعات بکثرت حدیث میں آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں بے پناہ کشش ہوتی ہے اور ان کا ادب واحترام سب ہی کرتے ہیں۔

سبق:

مگر انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان کہلانے والی قوم زبان سے نبی کا کلمہ پڑھتی ہے اور عشق ومحبت کا زبانی دعویٰ کرتی ہے، مگر عمل سراسر نبی کے خلاف اس زمانے میں مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ نبی کریمﷺ جس زندگی کو مٹانے آئے تھے آج مسلمان اس زندگی کو اپنے سے زندہ کر رہے ہیں اور جس زندگی کو آپﷺ زندہ کرنے آئے تھے مسلمان اس زندگی کو اپنے عمل سے مٹا رہے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ ذلیل ترین عرب کی قوم نے اپنے آپ کو آپﷺ کی بدلتی ہوئی زندگی کے کوسانچے میں ڈھال لیا تو دنیا کی سب سے بہترین باعزت قوم بن گئی اور بنے بنائے ہوئے مسلمانوں نے آپﷺ کی پائی ہوئی زندگی کو چھوڑ دیا تو بہترین قوم بدترین قوم بن گئی، پہلے عزت ان کے قدم چومتی تھی اور اب ذلت کی زندگی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کہاں تو نبی کا ادب واحترام حیوان اور درخت پتھر بھی کریں

اور کہاں امت محمد ﷺ اپنے نبی کی مخالفت میں کمر بستہ نظر آ رہی ہے۔ کیا مسلمان اپنے نبی ﷺ کی حقیقت سے ناواقف ہیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ امت اپنے ہی نبی ﷺ کو جانتی ہی نہیں، بلکہ خوب پہچانتی ہے۔ اگر ابوجہل، ابولہب جیسے کٹر دشمنان رسول اللہ ﷺ آپ کو جان لیتے تو آپ ﷺ کے قدموں میں جان دے دیتے۔ حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ کو جانا نہیں تھا تو آپ ﷺ کا سر قلم کرنے کے لئے گھر سے نکلے اور جب راستہ ہی میں آپ ﷺ کو جان لیا تو آپ کے قدموں سے ایسا چمٹ گئے کہ وفات کے بعد ہی اپنا سر نبی کریم ﷺ کے قدم مبارک کے پاس رکھ کر قبر میں آرام فرما ہیں۔ بخدا اگر ابولہب اور ابوجہل کو بھی آپ کی ویسی ہی پہچان ہو جاتی تو آج ان کا بھی وہی حال ہوتا۔ خود آنحضور ﷺ نے دشمنان اسلام کو یہ کہہ کر دعا دی: ''**اللھم اھد قومی فانھم لا یعلون**'' کیا مسلمان اپنے نبی کو جانتے ہیں، ہاں جانتے ہیں، ہاں جانتے ہیں، پہچانتے بھی ہیں، مگر انہوں نے بدعملی اور نافرمانی کی ٹھان لیا ہے اور عمل سے ایسا لگتا ہے کہ ہر قوم نے نافرمانی ہی کو فرمانبرداری اور ذلت ہی کو عزت سمجھ رکھا ہے۔ اس کی زندہ مثال 12 ربیع الاول کا جلوس ہے کس شان سے مرد و عورت کا مخلوط جلوس نکلتا ہے۔ سرکاری روڈ کو جام کر لیتے ہیں جو رہ گزر کو بھی سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اور جلوس کے دھن میں نماز تک کا خیال نہیں رہتا ہے۔ کیا اس طرح کے جلوس کی عہد صحابہ میں کوئی مثال ملتی ہے؟، کیا مرد عورت کے مخلوط مجمع کی دین محمدی میں کوئی گنجائش نکلتی ہے، کیا سرکاری راستہ پر سواریوں کا حق چھین کر لینا اس کی اسلام میں اجازت ہے؟۔ نمازوں کو ہضم کر لینے کا کیا تک ہے۔ یاد رکھو اپنے نفس کو خوش کر کے اللہ کے رسول کو ناراض کرنا بربادی اور تباہی کا راستہ ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھ دے۔ (آمین ثم آمین)

☆☆

زمان و مکان کی تمام تر نامساعدت کے باوجود حق پر ثابت قدمی

سیرت طیبہ کا اہم ترین درس

● مولانا نور عالم خلیل امینی
(ترجمہ: محمد جسیم الدین قاسمی)

شمع الٰہی، یعنی اسلام کو روز اول سے ہی بجھائے جانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی روشنی کو کفار و مشرکین، منافقین اور اعداء اسلام کی ناپسندیدگی کے باوجود پھیلا کر رہے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''**یُرِیْدُوْنَ أَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِأَفْوَاھِھِمْ وَیَأْبَی اللّٰہُ اِلَّا أَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہ وَلَوْکَرِہَ الْکَافِرُوْنَ.**'' (التوبہ/ ۳۲)

(وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ بدون اس کے کہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا دے، مانے گا نہیں، گو کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں)۔ (بیان القرآن)

''**یُرِیْدُوْنَ أَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِأَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ. ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْکَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ.**'' (الصف- ۸-۹)

(یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے نور کو

کمال تک پہنچا کر رہے گا۔ گو کافر کیسے ہی ناخوش ہوں، وہ ایسا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے، تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں)۔ (بیان القرآن)

اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو زمانے کے تمام تر حوادثات کے باوجود توسیع واشاعت، پیہم کامیابی، بلکہ روز افزوں ترقی پاتا رہا۔ حتیٰ کہ مشرق ومغرب میں پھیل گیا اور اپنی قوت کو سارے عالم پر نافذ کیا، کالے گورے کے امتیاز کو ختم کیا، دور اور قریب کو اپنے حلقے میں لایا نتیجتاً لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور ہمیشہ اعدائے اسلام کا رکاوٹوں کے باوجود لوگ اسلام میں داخل ہوتے رہے ہیں۔

یہ صرف اس لئے کہ نبی اسلام سرکار دو عالمؐ اسلام کی تبلیغ واشاعت کے حوالے سے مستقر پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہے۔ ان کے نیک مقاصد میں ہر قسم کی ناپاک ومذموم کوششیں مانع نہ بنیں۔ جنہیں گمراہ اور سرکش قوتوں نے اسلام کی ہمہ جہت وسعت کو روکنے کے لئے کی تھیں۔ پھر نبی کریم ﷺ کو جو کامیابی ملی وہ کسی دوسرے انبیاء ومرسلین کو نہ مل سکی، چہ جائے کہ ان کے علاوہ عام مصلحین کو ملے۔

حالات ایسے تھے کہ نبی کریم ﷺ کو جس دعوت کا مکلّف بنا کر مبعوث کیا گیا تھا اس پر ثابت قدم نہ رہنے دینے والے تھے، چونکہ آپ ﷺ نے ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولیں میں سرداری نسل در نسل رہی ہے یہ وہ گھرانہ ہے جس کی فرمانبرداری ہوتی رہی ہے۔ سرزمین مکہ میں انہیں دائمی عزت اور باقوت سلطنت ملی، ان کے قبیلہ قریش کو خانہ کعبہ کی نگہ بانی، سقایہ مہمان نوازی اور دین عرب کی محافظت، ان کے معبودوں کی نگرانی، بتوں کی نگہ بانی وغیرہ میں امتیازی مقام حاصل تھا یہ وہ تمام مناسب وذمہ داریاں جو اہل عرب کے نزدیک باعث رفعت وبلندی تھیں انہیں حاصل تھیں اور عرب کے وسیع معاشرہ میں ان کا ہر سوچہ چا تھا اور یہ تمام چیزیں ان کی عزت ووقار میں اضافہ کا باعث تھیں۔

لیکن وراثت میں ملی خالص عزت وجاہ اور دائمی شرافت کا یہ بڑا سرمایہ، حق پر ثابت قدمی اور حق کی یاد آوری میں رکاوٹ نہ بنا اور نہ ہی اس امانت کی ادائیگی میں جس کا انہیں مکلّف بنایا گیا۔ اس کے پیغام رسانی کی جو ذمہ داری ان پر ڈالی گئی اس کے لئے سعی پیہم سے انہیں کوئی چیز نہ روک سکی۔ جیسا کہ موروثی شرافت کا معمولی حصہ بھی عموماً اکثر لوگوں کو طلب حق اور اس کی سعی میں رکاوٹ بنتا ہے اور اس پر ثابت قدمی سے روک دیتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے قبائلی شرافت، قومی عزت خاندانی وجاہت کو خاطر میں نہ لایا، بلکہ اپنے آباواجداد کے عقلمندوں کو عقل وخرد سے عاری ثابت کیا۔ ان کے معبودوں کی حقیقت بتائی اور وہ نظام جو اہل عرب کے نزدیک قابل فخر اور اپنے خاندانی وجاہت کا باعث تھا اس کو ختم کرنے کی دعوت دی، نبی کریم ﷺ کو اپنے خاندان کے سرداروں کی جو سرپرستی ورہنمائی ملی وہ انہیں دین حق سے آبائی دین کی طرف لے جانے کے لئے کافی تھی، لیکن آپؐ نے حق کے سوا کسی چیز کو ترجیح نہ دی، چنانچہ نبی کریم ﷺ کو شروع ہی سے بنی عبد مناف، بنو ہاشم ومطلب کی جو سرپرستی ملی وہ اس خاندان کے دیگر کسی بچے کے حصہ میں نہ آئی۔ آ ﷺ اولاد واحفاد میں منفرد تھے جو اپنے دادا سید القوم عبدالمطلب کے فرش پہ فروکش ہوتے۔

تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ محفوظ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے لئے خانہ کعبہ کے سایہ میں فرش بچھایا جاتا تھا، پھر ان کی ساری اولاد واحفاد فرش کے اردگرد بیٹھ کر ان کی آمد کا انتظار کرتی، تا آنکہ وہ جلوہ افروز ہوتے، اس دوران ان کی عزت واحترام اور جلالت شان کی وجہ سے ان کے فرش پر کسی کو بیٹھنے کی جرأت نہ ہوتی، لیکن نبی کریم ﷺ ہی ایسے تھے کہ آتے ہی اس فرش پر بیٹھ جاتے، آپ ﷺ کو آپ کے سبھی چچا اس عمل سے روکنے کی بھرپور کوشش کرتے تو عبدالمطلب انہیں روک دیتے اور یہ فرماتے کہ میرے بچے کو چھوڑ دو، اس لئے کہ اس کی الگ شان ہے۔ پھر آپ ﷺ کو اپنے پاس بٹھا لیتے اور لاڈ

پیار کرتے، آپ کی معصومانہ حرکت پر خوش ہوتے۔

آپؐ کے چچا ابوطالب جب ملک شام میں اپنی تجارت کی تیاری کرتے تو آپ ﷺ ان سے چمٹ جاتے پھر ابوطالب آپ کے ساتھ الفت ومحبت سے پیش آتے اور اپنے ساتھ سفر میں لے جاتے، لیکن چچا محترم کی یہ عفو وملاطفت حق کو اس وقت بھی غالب کرنے سے نہ روک پائی جب لیڈران قریش کا وفد ابوطالب کے پاس آکر سخت دھمکی آمیز لہجہ میں کہا کہ آپ اپنے بھتیجے کو حد سے تجاوز کرنے سے منع کردیں، یا پھر ہم ان سے اور آپ سے سمجھ لیں گے۔ یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی ایک فریق ختم ہوجائے گا۔ اس معاملہ کو آپ کے مشفق چچا ابوطالب نے اہمیت دی، لیڈران کی طرف سے دی گئی دھمکیوں سے اندیشہ محسوس کرتے ہوئے اس مسئلہ کو سنجیدگی سے لیا، چنانچہ انہوں نے آپ کو بلا بھیجا اور کہا۔

''میرے بھتیجے تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے اور دھمکی دی، ذرا میری جان کا بھی خیال کرو اور اپنی جان کا بھی، مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جس کو میں اٹھا نہ سکوں۔''

اسے سن کر آپ ﷺ نہ گھبراتے ہیں اور نہ خوف کھاتے ہیں، نہ بال برابر حق سے دستبردار ہوتے ہیں اور نہ ہی دین کے خلاف بھاؤ تاؤ پر رضامند ہوتے ہیں، خواہشات کے بندوں اور غرض کے غلاموں کی طرح سود وزیاں کو اہمیت دیتے ہیں اور نہ کچھ لو اور دو کی پالیسی کو اپناتے ہیں، بلکہ غیر متزلزل عزم وارادے کے ساتھ اعلان فرماتے ہیں، چچا جان! خدا کی قسم اگر وہ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں اور یہ چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو غالب کرے، یا میں اس راستے میں ہلاک ہوجاؤں تب بھی میں اس سے باز نہ آؤں گا۔ آپ وہاں سے روتے ہوئے اٹھے اور تشریف لے جانے لگے تو ابوطالب نے آپ کو آواز دی اور کہا میرے بھتیجے ادھر آؤ! آپ آئے پھر انہوں نے کہا جاؤ بھتیجے جو تمہارا دل چاہے کہو اور جس طرح چاہو تبلیغ کرو خدا کی قسم میں تم کو کبھی بھی ان کے حوالے نہ کروں گا۔

اپنے بھتیجے پر زمانے بھر میں بے نظیر وبے مثال شفقت کرنے والے اپنی قوم سے انتہائی درجہ کی تحدید کا سامنا کررہے ہیں اور اپنے بھتیجے سے شفقت بھرے لہجے میں سرگوشی کرتے ہیں کہ وہ حق سے تھوڑا سا دست بردار ہوجائے اور اپنی رائے سے تھوڑا سا پیچھے ہٹ جائے، لیکن وہ آپ ﷺ کی جانب سے کلی انکار دائمی اصرار ونا قابل تغیر ثابت قدمی پاتے ہیں، ایسا موقف سرکار دوعالم ﷺ کے علاوہ کسی کو بھی میسر نہ آیا جو طوفان بلاخیز سے گھرا ہو اور شرفاء قوم عرب کی سختیوں اور دھمکیوں کے بیچ میں یہ سب حالات آپؐ کے حق پر ثابت قدمی اور اس عقیدہ پر راسخ ہونے پر دال ہے جسے لے کر آپ مبعوث ہوئے۔ اسی طرح آپؐ کی چشم پوشی کشادہ دلی، رواداری ووفاداری، انس باہمی، رائے کی آزادی شدائد میں اقربا کے ساتھ صبر واستقامت جیسی عظیم صفات جن سے آپ کے عم محترم آراستہ تھے جو اپنے آبائی دین پر تھے، لیکن مذکورہ بالا صفات کے ساتھ آپ نے اپنے بھتیجے کے ساتھ بے نظیر برتاؤ کیا۔

قریش کا ایک زبردست نوجوان حمزہ بن عبدالمطلب جو اس وقت اسلام نہ لائے تھے جنہیں نہ صرف شکاری سے محبت تھی، بلکہ وہ شکار کے عادی تھے، شکار کے لئے پابندی سے باہر نکلا کرتے تھے، شکار سے واپسی پر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ ایک دن شکار سے واپسی کے بعد خانہ کعبہ کا طواف اور بتوں کی پرستش کرتے وقت ایک لونڈی (باندی) آپ سے کہتی ہے کہ ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) نے محمد ﷺ کو گالی دی ہے اور اذیت پہنچائی ہے، جبکہ محمد ﷺ نے اسے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ حضرت حمزہ باندی کی بات سنتے ہی غصہ میں آگئے اور ابوجہل کا رخ کیا، دیکھا کہ ابوجہل اپنے آدمی کے بیچ بیٹھا ہوا ہے، وہ اس کے قریب گئے اور بالکل سر کے اوپر کھڑے ہوکر کمان اس کے سر پر ماری اور اس کو سخت زخمی کردیا اور کہا کہ تمہاری یہ جرأت کہ تم ان کو برا بھلا کہو اور گالی دو، حالانکہ میں انہی کے دین پر ہوں اور وہ جو کہتے ہیں وہی میں کہتا ہوں۔

بے شک حمزہ محمد ﷺ کے ساتھ حد درجہ وفادری و بردباری کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنے آبائی دین سے پھر جاتے ہیں اور اپنے بھتیجے کے اعزاز واکرام کے لئے اور ان لوگوں سے ناراضگی پر جو انہیں آزادئ رائے وعقیدہ سے روکتا ہے، برانگیختہ ہوتے ہیں۔

لیکن چچا جان کی یہ عظیم مہربانی وجانثاری نے اپنے عقیدے سے نہیں ہٹایا اور ذرہ برابر بھی راہ حق سے دور نہیں کیا اور نہ ثبات قدمی میں تزلزل لایا، بلکہ نسبی شرافت، خاندانی جذبات، اچھے تاثرات کے ساتھ ڈٹے رہے۔ جو آپ کے ساتھ نرمی وملاطفت کا باعث ہوئی اور جسے برتنے کے لئے آپ کے عم محترم نے خوب کوشش کی، تاکہ وہ حق بجانب ثابت ہوں۔

نبی کریم ﷺ کو عتبہ بن ربیعہ سے متعلق حد درجہ کامیابی حاصل کرنے میں سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ابوالولید عتبہ بن ربیعہ رؤسا قریش اور جاہلیت کے سردار تھے جو صاحب الرائے ذوالحلم والفضل تھے۔ مؤثر خطیب بھی تھے، قریش نے انہیں محمد ﷺ سے مفاہمت اور گفت وشنید کے لئے بھیجا، خانۂ کعبہ کے ایک گوشہ میں اجتماع منعقد ہوا عتبہ بن ربیعہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا اور کہا کہ میرے بھتیجے! تم ہمارے درمیان جس حیثیت کے مالک ہو اس کا تمہیں علم ہے، تم نے ایک بڑے جھگڑے کی بات اپنی قوم میں کھڑی کردی ہے، تم نے ان کے شیزہ کو منتشر کیا، ان کو بے وقوف وجاہل ٹھہرایا، ان کے معبودوں اور ان کے مذہب پر عیب لگایا، ان کے اسلاف اور آبا واجداد کے طریقے کا انکار کیا، اب میں کچھ باتیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں ممکن ہے اس میں سے کوئی بات تمہارے لئے قابل قبول ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ابوالولید'' کہو میں سن رہا ہوں! اس نے کہا کہ میرے بھتیجے! جو طریقہ اور دین تم لائے ہو اگر اس سے تمہارا مطلوب ومقصود مال ودولت ہے تو ہم یہ مال ودولت تمہارے لئے اتنا اکٹھا کردیں گے کہ تم ہم میں سے سب سے زیادہ مالدار

ہوجاؤ گے، اگر عزت اور ناموری چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار تسلیم کرلیں گے اور کوئی فیصلہ تمہاری مرضی کے بغیر نہیں کریں گے، اگر بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تم کو بادشاہ بنالیں گے، اگر آسیب اور جن وغیرہ کے اثر سے یہ بات ہے جس کا دفعیہ تمہارے پاس نہیں ہے تو اس کے لئے ہم معالجین فراہم کرسکتے ہیں اور اس پر پوری فیاضی سے اپنا مال خرچ کرسکتے ہیں، یہاں تک کہ تم کو اس سے نجات کامل حاصل ہوجائے گی۔ جب عتبہ بن ربیعہ نے اپنی بات مکمل کرلی تو رسول اللہ نے ابوالولید سے مخاطب ہوکر فرمایا:

''بِسۡمِ اللّٰہِ الرحمٰن الرحیم حٰمٓ تَنۡزِیل مِّنَ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم کِتابٌ فُصِّلَتۡ اٰیاتُہ قُرۡآنًا عَربِیًا لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ بَشِیۡراً وَّ نَذِیۡراً فَاعۡرَضَ اَکۡثرھُمۡ فَھُمۡ لا یَسۡمَعُوۡن''۔ (فصلت:۱-۴)

(شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے، حم کلام رحمٰن رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے، یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں، یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی ہے، ایسے لوگوں کے لئے جو دانشمند ہیں، بشارت دینے والا ڈرانے والا ہے)۔ (بیان القرآن)

یہ آیتیں قریش کی جانب سے پیش کی گئی وہ باتیں جو عتبہ کی زبانی سامنے آئیں ان کا جواب تھا، آپ ﷺ اپنے متعلق اشتعال انگیز رایوں سے نہ متاثر ہوئے اور نہ ہی نرمی وملاطفت اثر انداز ہوسکی، نبی کریم ﷺ حق پر ثابت قدمی میں اپنی مثال آپ تھے، حالانکہ مادی ومعنوی محرکات کا تقاضہ تھا کہ کچھ نہ کچھ منحرف کردے۔ خاندانی عزت اور قبائلی شرافت، قومی وقار، خاندانی رفعت، نیکی ورہنمائی جو چچا، دادا اور خاندان کی طرف سے ملی وہ ذرا سا بھی کامیاب نہ ہوسکی کہ آپ ﷺ کو ان کے آفاقی دین سے برگشتہ کردیں۔ نبی امی ﷺ کو حرص وطمع، پرفریب دھوکے حسبی ونسبی تفاخر، قومی سرداری اور موروثی شرافت حق سے دور کرنے کے لئے کارگر نہ ہوسکی۔

یہ کارنامے قابل ریکارڈ، لائق اقتدا اور قابل تقلید ہیں اور رہیں گے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ رب العزت اور محمد ﷺ کے نبی اور رسول ہونے پر ایمان رکھتا ہے۔ بے شک نبی کریم ﷺ کا یہ طرز عمل کفار مکہ کے لئے نہایت پریشان کن تھا جس کی پاداش میں قریش مکہ کی جانب سے بے جا دھمکیاں، اذیتوں اور اہانتوں کا سامنا ہوا۔

حضور ﷺ کی تمام حرکات وسکنات اور تصرفات مؤمنین کے لئے قابل تقلید نمونہ ہیں ان کا طرز عمل ان اشتعال انگریز حالات میں بھی اس طرح حق پر ثابت قدمی اور دعوت دین کے لئے پیہم کوشش زیادہ لائق اتباع اور قابل تقلید ہے۔ اس زمانہ میں بھی جہاں دین اور اسلام دشمن طاقتیں دین کو ختم کرنے کے لئے مسلمانوں کو ایسی تہمتوں سے متہم کر رہی ہیں کہ شیطان وابلیس کے خیال میں بھی نہ ہوں گی، لیکن آج کے دور جاہلیت میں جدید ٹکنالوجی اور نئے نئے رنگوں اور نئی نئی تہذیبوں کی صورت میں بے راہ روی عام ہے۔ جنہیں خیالی تہذیب وتمدن اور پیش رفت کا نام دیا جا رہا ہے جو شخص انہیں نہ اپنائے گویا وہ وحشی اور درندہ، رجعت پسند، قدامت پرست اور جدت پسندی کا منکر ہے۔

بے شک موجودہ حالات ایسے ہی ہیں جیسے ماضی میں تھے، حرص وطمع اور دین سے برگشتہ کرنے کے حربے ہیں اور نرمی ومحبت کی صورت میں مکر اور چالاکی وعیاری، ظاہری وباطنی دشمنی، اعلانیہ جنگ اور کھلے چیلنجز وغیرہ کو روبہ عمل لائے جا رہے ہیں، لیکن ہم میں عقلمند اور دانشمند وہی شخص ہے جو رسول کریم ﷺ سے درس عبرت لے اور کسی اسباب ودعاوی سے متاثر ہوئے بغیر حق پر ثابت قدم رہے، اس لئے کہ حق ہی قابل اتباع ہے اور حق کی طرف لوٹنا باطل میں مزید آلودہ ہونے سے بہتر ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت تمام قدروں، جلد حاصل ہونے والی منفعتوں، نہ رہنے والی کمائیوں، بے قیمت چیزوں اور دنیاوی شہرتوں سے بلند وبالا ہے۔

زندگی طویل ہے اور اس کی دشوار گزار راہیں نہایت پر پیچ ہیں ہم مسلمان کبھی تھک ہار

کر راہ مستقیم پر چلنے سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں، یا سیدھی راہ کو چھوڑ کر دشوار گزار پر پیچ وادیوں میں بھٹک جاتے ہیں، پھر ہمیں حق کی طرف آگے بڑھنے میں شدید مصائب کا سامنا ہوتا ہے، کبھی بے سمت میدان میں بھٹکنے لگتے ہیں اور دینی وایمانی معرکہ آرائیوں سے دوچار ہوتے ہیں، پس ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ہر لحظہ اور ہر دم یہ ذہن نشیں رکھیں کہ نبی کریم ﷺ نے کس طرح سیدھی راہ اختیار کر کے اپنی حیات مبارکہ بسر کی کہ انہیں تند وتیز ہوائیں بال برابر بھی راہ مستقیم سے نہ ہٹا سکیں اور نہ کوئی فتنہ اثر انداز ہو سکا۔ حرص وطمع جس پیمانے پر ہوا ثر نہ ڈال سکی اور نہ ہی تضحیک متزلزل کر سکی۔

ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم حق کے متلاشی بنیں خواہ باطل کا حملہ جس طرح اور جس پیمانے پر ہو، حق بہر حال حق ہے اور جھوٹ، جھوٹ ہے۔ جھوٹ سچ اور سچ جھوٹ بن کر ظاہر ہو رہا ہے، دوست دشمن ہوتا نظر آ رہا ہے اور قریبی اجنبی ہوتا نظر آ رہا ہے، جانا پہچانا اجنبیت اختیار کر رہا ہے، حتیٰ کہ اہل خانہ بھی اجنبی ہو رہے ہیں، سرکار دوعالم ﷺ نے ہمارے لئے ہر میدان، ہر حال، ظاہری وباطنی امور، سلامتی وجھگڑے، امن وخوف، انفرادی واجتماعی امور، بازار ومسجد، خرید وفروخت، دوست ودشمنی، اقارب واجانب، مسلم وغیر مسلم ہر ایک حوالے سے بلند وبالا مثالیں قائم کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:

”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيراً.“ (الاحزاب/۲۱) (تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ اور روز آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ ﷺ کی ذات ایک عمدہ نمونہ تھی)۔ (بیان القرآن)۔

☆☆

پیغمبر اسلام کا غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک

● مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام ﷺ کی صورت میں رحمت کی گھٹائیں کائنات پر اتاری ہیں، اس نے مسلمان ہو یا غیر مسلم اور انسان ہو یا حیوان، سبھوں کو آبیار کیا ہے اور ظلم و جور کو مٹا کر عدل وانصاف اور انسانی بھائی چارہ کو تقویت پہنچائی ہے۔ آپ ﷺ نے تمام انسانیت کو حضرت آدم علیہ السلام سے جوڑا، اخوت و بھائی چارگی کے رشتہ میں سب کو ایک دوسرے سے منسلک فرمایا اور پوری انسانیت کے ساتھ رحم دلی کی تعلیم دی۔ فرمایا کہ: جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا، یہ بھی ارشاد ہوا کہ: تم اہل زمین پر رحم کرو، تو تم پر وہ رحم فرمائے گا، جو آسمان میں ہے۔ ارشاد ہوا کہ: تم میں سے کوئی مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ لوگوں کے لئے اسی سلوک اور رویہ کو پسند نہیں کرے جو اپنے آپ ﷺ کے لئے پسند کرتا ہے، آپ نے مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر فرمایا: وہ مومن نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو، ایک روایت میں ہے کہ وہ شخص مومن نہیں جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ ہو۔

قرآن مجید میں پڑوسی کے لئے دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں: ''والجار ذی القربیٰ والجار الجنب'' یہاں مفسرین کے نزدیک 'جار جنب' سے غیر مسلم پڑوسی مراد ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے بکری ذبح کروائی اور پڑوسیوں کو بھیجنے کی ہدایت کی۔ واپسی پر دریافت کیا کہ کیا یہودی ہمسایہ کو اس میں حصہ بھیجا گیا؟ جواب نفی میں ملا، تو آپؓ نے خاص طور پر اس پڑوسی کے یہاں بکرے کا گوشت بھیجا۔

غیر مسلم رشتہ دار سے حسن سلوک:

اگر کوئی رشتہ دار غیر مسلم ہے تو بحیثیت رشتہ دار جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہی سلوک اس غیر مسلم کے ساتھ بھی کیا جائے گا۔ چنانچہ قرآن میں والدین کے بارے میں فرمایا: ''گویا والدین اگر غیر مسلم بھی ہوں تو اس کے ساتھ حسن سلوک میں کوئی فرق نہیں آنے دیا جائے۔'' اسلام میں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی اور بحیثیت بیوی اس کے وہی حقوق رکھے گئے جو ایک مسلمان بیوی کے ہیں، گو موجودہ حالات میں اہل کتاب خواتین سے نکاح کرنا کراہیت سے خالی نہیں، کیونکہ آج مسلمان جس ذہنی مرعوبیت اور ثقافتی بے سمتی کے دور سے گزر رہے ہیں اس میں ایسی شادیاں ایمان واسلام سے محرومی کا باعث بھی ہوسکتی ہیں، اسی طرح دوسرے غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ بھی اچھے برتاؤ اور بہتر اخلاق سے پیش آنے کا حکم ہے، حضرت عمرؓ کے بارے میں ثابت ہے کہ انہوں نے ایک مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا، امام مجاہد فرمایا کرتے تھے کہ مشرک رشتہ داروں کا قرض معاف کرنا باعث اجر وثواب ہے۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار درہم تقسیم فرمایا تھا، پس قرابت داری اور رشتوں کے لحاظ میں اسلام نے گویا مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک ہی درجہ میں رکھا ہے۔

عام حسن سلوک:

عام غیر مسلموں کے ساتھ بھی انسانی بنیادوں پر بہتر اخلاق اور برادرانہ سلوک کی تلقین فرمائی گئی ہے، آپ ﷺ نے خود ایک یہودی نوجوان کی عیادت فرمائی جو آپ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا اور اخیر وقت میں اس پر اسلام پیش فرمایا، نوجوان نے اپنے والد کی نگاہ کی طرف دیکھا اور والد کے اشارہ پر اسلام قبول کرلیا، آپ ﷺ سے منافق کی عیادت اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی آخری رسومات کے موقع پر تشریف لانا بھی ثابت ہے،

آپ ﷺ نے اپنے محسن، لیکن کافر چچا حضرت ابوطالب کی بھی عیادت فرمائی اور آخیر وقت تک ان کو قبول اسلام کی دعوت بھی دی ہے۔

انسانی احترام اور تکریم کے تقاضے کے تحت ایک یہودی کا جنازہ گزرنے پر آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آخر وہ بھی تو انسان تھا، غزوۂ خندق کے موقع پر ایک مشرک فوجی خندق عبور کر کے مسلمانوں کی طرف آگیا اور حضرت علیؓ کے ہاتھوں مارا گیا، کفار مکہ نے لاش کی قیمت ادا کر کے لاش حاصل کرنی چاہی، لیکن آپ ﷺ نے یہ قیمت نہیں لی اور یوں ہی ان کی لاش ان کے حوالہ کردی، نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ آیا تو آپ ﷺ نے نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ ان کو مسجد میں ٹھہرایا، ایک صاحب جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے آپ ﷺ کے یہاں مہمان ہوئے اور گھر میں جو کچھ تھا سب کچھ کھا گئے، آپ ﷺ نے کچھ برا نہیں مانا۔

یہودیوں کی عادت تھی کہ وہ موقع بہ موقع آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو اذیت پہنچاتے تھے، لیکن آپ ﷺ صبر وتحمل کے ساتھ ایسی باتوں کو سہہ جاتے، ایک یہودی نے مسلمان سے درمیان گفتگو کہا: اس ذات کی قسم! جس نے موسیٰ کو تمام عالم پر فضیلت عطا فرمائی، مسلمان نے پوچھا محمد ﷺ پر بھی؟ اس نے کہا: ہاں! مسلمان اس پر برہم ہوگیا اور تھپڑ رسید کردیا، حالانکہ مسلمان اس تنبیہ میں حق بجانب تھا، کیونکہ آپ ﷺ کا تمام رسولوں سے افضل ہونا بائبل سے بھی ثابت ہے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے اپنے مسلمان ساتھی کو تنبیہ کی اور فرمایا کہ قیامت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سب سے پہلے ہوش میں آئیں گے، ایک یہودی خاتون نے آپ ﷺ کی دعوت کی اور زہر کھلا دیا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی حفاظت فرمائی، لیکن اتنے بڑے جرم کے باوجود آپ ﷺ نے اسے درگزر فرمایا، البتہ جب اس زہر خورانی کے واقعہ میں ایک دوسرے صحابی کی موت ہوگئی تو بصورت قصاص ان کو قتل کیا گیا، بعض یہودی اپنی بدبختی کی بنا پر آپ ﷺ کو ''السام علیکم'' کہہ کر مخاطب کرتے

تھے، جو ایک بددعائیہ لفظ تھا، بعض صحابہ رضی اللہ عنہ کو اس طرح کی بات سن کر طیش آجاتا، لیکن آپ ﷺ کبھی خوش اخلاقی کا دامن نہیں چھوڑتے اور جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہنے پر اکتفا کرتے۔

مالی اعانت:

غرباء اور محتاجوں کی مدد کے معاملے میں بھی پیغمبر اسلام ﷺ نے غیر مسلموں کو نظر انداز نہیں فرمایا، قرآن وحدیث میں جابجا اسیروں، یعنی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان پر خرچ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قیدی غیر مسلم ہی ہوا کرتے تھے، خود آنحضور ﷺ سے ایک غیر مسلم گھرانہ پر صدقہ کرنا ثابت ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور بہت سے فقہاء کے نزدیک غیر مسلموں کو صدقۃ الفطر دیا جاسکتا ہے، بعض مشہور اہل علم جیسے ابومیسرہ، عمرو بن میمون اور عمرو بن شرجیل کے بارے میں منقول ہے کہ صدقۃ الفطر سے عیسائی راہبوں کی مدد فرمایا کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے ایک یہودی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا اور وجہ دریافت کی، بھکاری نے کہا: جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے بھیک مانگ رہا ہوں، حضرت عمرؓ اس کو اپنے ساتھ لائے بیت المال سے بہت سارا تعاون فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ انصاف کی بات نہیں ہے کہ جوانی میں ہم ان کی کمائی سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں ان کو بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ دیں، اسی طرح قربانی اور دوسرے صدقات سے بھی (سوائے زکوٰۃ کے) غیر مسلم بھائیوں کی مدد کی جاسکتی ہے۔

جان اور زندگی کا تحفظ:

جو غیر مسلم مسلمانوں سے آمادۂ پیکار اور برسر جنگ نہ ہو، ان کی جان اور خون کی اسلام کی نگاہ میں وہی قیمت ہے، جو مسلمانوں کے جان کی ہے، قرآن نے بلاتفریق مذہب حکم دیا ہے کہ ''**قتل علیکم القصاص فی القتلیٰ**''، یعنی قاتل کو مقتول کے عوض قتل کیا

جائے گا، تا کہ انسانیت کے تحفظ کا سروسامان ہو سکے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ''**ان النفس بالنفس**'' یعنی ایک انسانی جان کے بدلہ دوسری انسان جان جو قاتل کی ہو قتل کر دئے جانے کے لائق ہے۔ ایک مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کر دیا تو آپ نے بطور قصاص اس مسلمان کو قتل کرا دیا اور فرمایا جو غیر مسلم اپنے عہد کو پورا کرے میں اس کا احترام کروں گا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے 'حیرہ' کے ایک غیر مسلم کا قتل کر دیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر مقتول کے اولیاء راضی نہ ہوں تو اس کو قتل کر دیا جائے، حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں بھی اسی طرح کا ایک واقعہ پیش آیا۔ تو آپ ﷺ نے قاتل کو قتل کر دینے کا حکم فرمایا۔ یہ تو دنوی مواخذہ ہے، مسلمان ہر معاملہ کو آخرت کی نظر سے دیکھتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کسی ذمی، یعنی مسلم ملک میں آباد غیر مسلم کو قتل کر دے وہ جنت کی خوشبو نہیں پا سکے گا۔

آج کے جمہوری دور میں بھی خون اور خون کی قیمت میں فرق کیا جاتا ہے، ہمارے ملک ہندوستان کا حال یہ ہے کہ اگر پنجاب اور کشمیر میں کسی ہندو کی جان جائے تو اس کے خون کی قیمت لاکھ دو لاکھ روپے ہے اور اگر مسلمان فساد میں مارا جائے تو اس کی جان کی قیمت پچاس ساٹھ ہزار روپے ہے، یا کچھ بھی نہیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسی کوئی تفریق نہیں فرمائی اور اصول مقرر فرما دیا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جانوں کی اہمیت یکساں ہے۔ ''**دمائهم كدمائنا**'' چنانچہ آپ ﷺ نے خود جو خون بہا مسلمانوں کا تھا وہی خون بہا ایک غیر مسلم کا ادا فرمایا، حضرت اسامہ بن زیدؓ سے مروی کہ آزاد مسلمان کی جو دیت ہے وہی دیت آپ ﷺ نے معاہد کی رکھی، حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ادوار میں مسلمانوں اور یہودی وعیسائی کی دیت ایک ہی رہی ہے۔ ان وضاحتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں بلا تفریق مذہب انسانی جان اور زندگی کی کیا اہمیت ہے؟

مال وجائداد کی حفاظت:

اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی نگاہ میں جو حرمت اور اہمیت ایک مسلمان کے مال کی ہے، وہی اہمیت غیر مسلم بھائیوں کے مال وجائیداد کی بھی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ''**على لا حل أموال المعاهدين ألا بحقها**'' کہ کسی غیر مسلم کا مال ناحق طور پر حاصل کرنا قطعاً جائز نہیں۔ یہ بات آپ ﷺ نے اس موقع پر بیان فرمائی جب جنگ خیبر کے بعد صلح ہو جانے کے بعد بھی بعض پر جوش لوگوں نے دست درازی سے کام لیا، جس طرح ایک مسلمان کا مال چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص غیر مسلم کا مال چوری کر لے وہ بھی اسی سزا کا مستحق ہوگا، حضرت ابن حدرد رضی اللہ عنہ کے یہاں ایک یہودی کا قرض باقی تھا، اس نے مطالبہ کیا اور کسی قدر شدت کے ساتھ تقاضہ کیا اور آپ ﷺ سے شکایت کی، آپ ﷺ نے صحابی مذکورہ کو ادا قرض کا حکم دیا، ابن حدرد رضی اللہ عنہ نے معذرت کی اور عرض کیا کہ سوائے ان دو چاروں کے میرے پاس اور کچھ نہیں ہے، لیکن جب آپ نے سہ بارہ تاکید فرمائی، تو بازار تشریف لے گئے اور ایک چادر کو تہہ بند بنایا اور ایک چادر فروخت کر کے قرض ادا کیا۔ اس سے آپ کا مقصود اس بات کی تعلیم دینا تھا کہ غیر مسلموں کے قرض سے بے اعتنائی اختیار نہیں کی جا سکتی۔

سب سے اہم مسئلہ کسی مذہب کے دوسرے مذہب اور اہل مذہب کے ساتھ رواداری اور دوسرے مذاہب کے تئیں احترام کا ہے، اسلام کی نگاہ میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ دوسری قوموں کے ساتھ مذہبی امور میں ''لو اور دو'' کا معاملہ کیا جائے، مسلمان اپنے عقیدہ، مذہبی اعمال اور تہذیب وثقافت کے معاملہ میں اس طرح کی سودا بازی کو قبول نہیں کر سکتے، یہ رواداری نہیں، بلکہ ضمیر فروشی اور ایمان فروشی ہے، رواداری سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کے مذہبی جذبات کا پاس ولحاظ رکھے اور ان کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت

نہیں کرے، اس معنیٰ میں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے انسانیت کو حد درجہ مذہبی رواداری اور تحمل اور باہمی احترام کی تعلیم دی ہے اور بقائے باہم کے اصول پر زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھایا ہے، قرآن مجید نے صاف اعلان کردیا کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے، مذہبی رواداری کی بہترین مثال وہ معاہدہ ہے جو آپ ﷺ نے مدینہ میں آنے کے بعد مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکین کے درمیان کرایا تھا اور اس معاہدے کے تحت ہر ایک کو اپنے مذہب پر چلنے کی پوری پوری آزادی تھی، قرآن مجید نے ان کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا جس کی دوسری قومیں پرستش کرتی ہوں، قرآن نے یہ بھی کہا کہ اللہ نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں اور ان پر خود اس قوم کی زبان میں اللہ کا کلام نازل ہوا ہے، یہ عقیدہ اور ہدایت قرآن مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ دوسرے پیشوایان مذاہب اور مصلحین عالم کے ساتھ احترام اور توقیر کا رویہ اختیار کریں اور ان کے بارے میں اپنی زبان، بلکہ اپنے ذہن وخیال کی بھی حفاظت کریں، کیونکہ عجب نہیں کہ آج جن شخصیتوں کی پرستش کی جارہی ہے وہ اپنے وقت کے رسول اور دعوت توحید کے علمبردار رہے ہوں۔

آپ ؐ کی انہی تعلیمات کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلم بھائیوں کے اس حق کو تسلیم کیا کہ اگر وہ کسی مسلم ملک میں رعایا کے طور پر زندگی بسر کررہے ہوں تو ان کو شخصی اور سماجی معاملات میں اپنے مذہبی قوانین پر چلنے کی آزادی ہوگی۔ مشہور حنفی فقیہ صاحب ''ہدایہ'' نے لکھا ہے کہ اگر آتش پرستوں کے یہاں اپنی ماں یا بہن سے نکاح کی گنجائش ہو اور مسلم ملک میں کوئی آتش پرست ان محرم رشتہ داروں سے نکاح کرلے تب بھی مسلمان حکومت کو اس کی نجی زندگی کے مسائل میں دخل دینے کی گنجائش نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اگر کوئی ایک فریق اپنے معاملات ہماری عدالت میں لائے تب بھی ہم ایسے معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتے، جب تک کہ دونوں فریق اسلامی عدالت سے رجوع نہ کرلیں، اسی لئے اسلامی عہد میں اور خود ہمارے ملک کی مسلم بادشاہتوں میں ہمیشہ اقلیتی پرسنل لاء کا تحفظ کیا گیا ہے۔

غیر مسلموں کی عبادت گاہیں:

یہی فراخ دلی کا برتاؤ پیغمبر اسلام ﷺ نے عبادت گاہوں کے بارے میں کیا ہے، آپ ﷺ نے جنگ کے موقع سے عبادت گاہوں سے متعلق مذہبی شخصیتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کو ہدایت فرمائی کہ کوئی کلیسا اور آتش کدہ منہدم نہیں کیا جائے، حضرت عمرؓ جب فتح بیت المقدس کے موقع پر تشریف لے گئے اور کلیسا کے متولی کی اجازت، بلکہ خواہش پر ایک چرچ میں نماز ادا کی تو پھر اس چرچ کے لئے ایک خصوصی دستاویز مرحمت فرمائی کہ کہیں مسلمان اس کو مسجد میں تبدیل کردینے کی کوشش نہ کریں، حضرت معاویہؓ نے جب دمشق کی جامع مسجد تعمیر فرمائی تو اس سے متصل ایک چھوٹا سا چرچ تھا، آپؓ نے عیسائیوں سے پیش کش کی کہ یہ منھ مانگی قیمت لے کر مسجد کو دے دیں، تاکہ مسجد کے صحن کو وسعت دی جاسکے، مگر عیسائیوں نے نہیں مانا، پھر مروان نے بھی اپنے زمانہ حکومت میں اسی طرح کیا، عیسائیوں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا، پھر عبدالملک نے اپنے زمانہ حکومت میں عیسائیوں کو آمادہ کرنا چاہا، لیکن وہ اپنی رائے پر مصر رہے، مروان نے جوش میں آکر خود اپنے ہاتھ میں کدال لی اور گرجا کو منہدم کرنا شروع کیا اور بالآخر جامع دمشق میں شامل کردیا، جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے اور عہد اموی کے گزشتہ مظالم اور رستم اندازیوں کی تلافی شروع کی تو دمشق کے یہ عیسائی بھی عرض کناں ہوئے کہا ان کے چرچ جبراً گروائے گئے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے گورنر شام کو خط لکھ کر ہدایت فرمائی کی مسجد کا وہ حصہ جس میں پہلے چرچ تھا عیسائیوں کو واپس کردیا جائے، بالآخر مسلمانوں نے کسی طرح اپنے عیسائی بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اس حصہ سے دستبردار ہوجائیں اور اس طرح مسجد منہدم کئے جانے سے بچ گئی۔

خود آپ ﷺ کی مذہبی رواداری کا یہ حال تھا کہ یمن کا ایک بڑا عیسائی عالم اسقف ابی

الحارث ساٹھ عیسائیوں کے وفد کے ساتھ خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوا، انہوں نے اپنے عقیدے کے مطابق نماز ادا کرنی چاہی تو آپ ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ کے گوشہ میں انہیں نماز کی اجازت مرحمت فرمائی اور انہوں نے اپنے مذہب کے مطابق نماز ادا کی۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی انہیں تعلیمات اور خلفاء راشدین کے عملی نمونہ کو سامنے رکھ کر فقہاء نے غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی رواداری اور مذہبی آزادی کے احکام دئے ہیں اور مسلمانوں کے لئے اس بات کو ناجائز قرار دیا گیا ہے کہ غصب کی ہوئی زمین پر نماز پڑھیں، یا مسجد تعمیر کریں، اس لئے جو لوگ مسلمانوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں کہتے ہیں کہ انہوں نے غیر مسلمانوں کی عبادت گاہوں پر جبراً قبضے کر لئے ہیں اور مسجدیں تعمیر کی ہیں، وہ شخص غلط فہمی اور غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔

مفتوحین کے ساتھ فراخ دلانہ رویہ:

آپ نے دشمنوں کے ساتھ نہایت فراخ دلانہ سلوک کی تعلیم دی ہے اور عفو و درگزر کا راستہ اختیار کرنے کو فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں فتح مکہ کا واقعہ اپنی مثال آپ ہے، آج دس ہزار جاں نثار آپ ﷺ کے قدموں میں ہیں اور وہ سارے لوگ آپ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے حسرت و یاس کی تصویر بن کر کھڑے ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کی ایذاء رسانی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا، جنہوں نے آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، پشت مبارک پر اوجھڑی ڈالی تھی، گلے میں پھندا ڈالنے کی کوشش کی تھی، قتل کے منصوبے بنائے تھے، آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے خاندان کا بائیکاٹ کیا تھا اور بنو ہاشم کے بچوں کو لقمہ لقمہ کے لئے ترسایا تھا، آپ ﷺ کی صاحبزادی کو طلاق دلوائی تھی، محبوب چچا کے دل و جگر چاک کئے تھے اور کمزور مسلمانوں کو گرم ریتوں پر گھسیٹا اور سلگتے ہوئے انگاروں پر لٹایا تھا، پھر مسلمانوں کی چھوٹی سی بستی مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے کی بھی بھرپور اور ناکام کوشش کی

تھی، انہیں میں ابوسفیان تھے جنہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی قیادت کی، ہند تھیں جنہوں نے عم رسول ﷺ حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا، انہی میں اسلام کے بدترین دشمن اور امت کے فرعون ابوجہل کے بیٹے عکرمہ تھے، جنہوں نے فتح مکہ تک بھی اسلام کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا تھا۔

لیکن آج آپ ﷺ نے ان تمام لوگوں سے کوئی انتقام نہیں لیا، جب آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم لوگ مجھ سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟ تو لوگ بے ساختہ کہہ پڑے اسی سلوک کی جو ایک شریف بھائی اپنے بھائی کے ساتھ اور ایک شریف بھتیجا اپنے چچا کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ ''انت اخ کریم وابن أخ کریم.'' آپ ﷺ نے اس موقع پر امن عام کا اعلان فرمایا اور ارشاد ہوا کہ آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

آپ ﷺ نے عفو و درگزر ہی پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ آگے بڑھ کر ان کی عزت نفس اور تکریم کا بھی خیال رکھا، ابوسفیان سردار قریش تھے، ان کے بارے میں فرمایا کہ جو ان کے گھر میں پناہ لے وہ مامون ہے۔ حضرت عکرمہؓ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر پوری سیر چشمی کے ساتھ ان کا خیر مقدم فرمایا اور آپ ﷺ نے صحابہؓ سے بھی فرمایا کہ ابوجہل کو برا بھلا نہ کہنا، یہ مناسب نہیں کہ ایک مسلمان بیٹے کو اس کے کافر باپ کی وجہ سے اذیت پہنچائی جائے، اسی طرح کی بات آپ ﷺ نے اس وقت بھی فرمایا جب ابولہب کی صاحبزادی حضرت درہؓ مشرف بہ اسلام ہوئی۔ انسانی تاریخ کا ورق ورق پڑھتے جائیے اور تاریخ عالم کا حرف حرف دیکھ جائیے، کیا کسی نقارہ جنگ کے ساتھ اس طرح بھی ابر رحمت کو سایہ فگن ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے؟

جنگی قیدیوں کے ساتھ آپ کا سلوک:

اسلام سے پہلے، بلکہ اس کے بعد بھی سب سے مظلوم جنگی قیدی رہے ہیں، اسلام

سے پہلے روم ہو یا فارس، یا خود عرب، ان قیدیوں کو غلام بنایا جاتا تھا اور ان کے ساتھ حیوانوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ یوروپ میں اس مقصد کے لئے بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے، جہاں ایک خاص کھیل 'سیافی'' کے نام سے ہوا کرتا تھا۔اس میں غلاموں کا جنگلی جانوروں سے مقابلہ کرایا جاتا تھا اور اس کی موت کے تماشے دیکھے جاتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی نئی مثال قائم فرمائی، غزوہ حنین کے چھ ہزار قیدیوں کو بغیر کچھ لئے ہوئے رہا کر دیا گیا، غزوہ بدر میں ستر قیدی بنائے گئے اور آپ ﷺ نے ان کو اس شان واعزاز کے ساتھ رخصت فرمایا کہ ان کے لئے جوڑے بھی سلائے۔آپ ﷺ نے ان قیدیوں کو صحابہؓ پر تقسیم فرما دیا تھا اور صحابہؓ کا حال یہ تھا کہ خود بھوکے رہ کر ان کو کھلاتے اور کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے۔ایک طرف پیغمبر اسلام ﷺ کی اس حسن سلوک اور انسانیت پروری کو دیکھا جائے اور دوسری طرف یوروپ کی اس شرافت اور انسانیت دوستی کو بھی کہ نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ وہ ان کے کھانے پینے کے سامان کو ایک بوجھ تصور کرتا تھا۔

اسے تاریخ کا عجوبہ ہی کہا جائے گا کہ جس پیغمبر رحمۃ اللعالمین ﷺ جس پر پہلی آیت علم اور قرأت کی نسبت سے نازل ہوئی ہے، جس نے صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر یکہ وتنہا توحید کی منادی کی، جس نے بدر کے میدان میں بھی ہاتھ میں تلوار رکھنے کی بجائے دین التجا کو خدا کی چوکھٹ پر بچھائے رکھا، جو فتح مکہ کے موقع پر اس شان سے مکہ میں داخل ہوا کہ تواضع وفروتنی سے اس کا سر جھکا ہوا تھا اور جبین مبارک بار بار اونٹنی کے کوہان سے لگ جاتی تھی، جس نے بدر کے ان قیدیوں کو جو ان کو بے گھر کرنے اور اس کے محبوب شہر سے نکالنے میں پیش پیش تھے، تعظیم وتکریم کے ساتھ اور نئے جوڑے ان کے زیب تن کر کے رخصت کیا اور جس نے فتح مکہ کے بعد خون کے پیاسوں اور جانی دشمنوں پر ایک نگاہ خشمگیں کا وار کرنا بھی مناسب نہ سمجھا اور عفو عام کا اعلان فرمایا۔اس کو ایک ایسی شخصیت کی صورت میں پیش

کیا جائے جو مخالفت کے ساتھ نہایت سخت گیر واقع ہوا ہو اور اس کا اسٹیج اس طرح بنایا جائے کہ گویا ایک متشدد مزاج شخص اپنے ہاتھوں میں تلوار لئے ہوئے ہے، تاریخ میں شاید اس سے برا کوئی جھوٹ بولا گیا ہو، اس میں صرف دوسروں کا نہیں، بلکہ ہمارا اپنا قصور بھی ہے کہ ہم نے کبھی اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی سنجیدہ مثبت اور مسلسل کوشش ہی نہیں کی، ہم روایتی جلسے تو خوب کرتے ہیں، جلوس نکالنے اور کانفرنسیں منعقد کرنے میں بھی ہمارا جواب نہیں، لیکن کبھی ہم نے اس بات کی سعی نہیں کی کہ اپنے غیر مسلم بھائیوں اور خود اپنی قوم کی اس نئی نسل تک پہنچیں جس نے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو مستشرقین کی کتابوں سے پڑھا اور سمجھا ہے اور ان کا ذہن اسلام اور سیرت طیبہ ﷺ کے بارے میں پراگندہ ہے اور بدگمان ہے۔کاش! ہم اس اہم کام کی طرف متوجہ ہوں اور اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں۔

☆☆

مسائل کا حل سیرت کی روشنی میں

● پروفیسر محسن عثمانی ندوی

مشکلات اور مسائل سے ہمیشہ زندہ قومیں دوچار ہوتی ہیں۔ان ہی سے ان کی قوت اور زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ان ہی سے ان کے اندر مدافعانہ قوت کی نشونما ہوتی ہے۔جو لوگ سخت سردی اور سخت گرمی کے موسم میں رہنے کے عادی ہوجاتے ہیں ان کی جسمانی قوت مدافعت زیادہ بہتر ہوتی ہے۔افراد کی طرح قومیں بھی مخالفت کی آندھیوں کے درمیان رہ کر خود کو زیادہ طاقتور اور ناقابل تسخیر اور حوصلوں سے معمور بنالیتی ہے۔ان کے لئے سخت اور جاں گسل حالات قدرت کی طرف سے انعام ہوتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے مکی دور میں بہت سی پریشانیاں برداشت کیں، مشکلات کے خاردار صحرا میں وہ ثابت قدم رہے۔یہ ان کی ثابت قدمی تھی کہ مدینہ میں ان کی وہ طاقتور حکومت قائم ہوئی جسے کوئی زیر نہیں کرسکا۔صدیوں تک مسلمانوں نے وقت کے ہر چیلنج کا مقابلہ کیا اور چیلنج کرنے کے لئے ہر عہد میں مسلمانوں میں صاحب عزیمت شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں اور ان کا ایمان اور حسن کردار تھا کہ خدا کی مدد نازل ہوتی رہی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کے تاریخی پس منظر کو تھوڑا جاننے کی ضرورت ہے۔ہندوستان میں ۷۱۲ عیسوی میں محمد بن قاسم سندھ کی سرزمین میں فاتحانہ داخل ہوا تھا۔مسلمان تاجروں کی ہلاکت کے بعد ان کی عورتوں کی واپسی سمندری راستہ سے ہورہی تھی ان کے جہاز پر ہندوستانی بحری قزاقوں نے حملہ کیا تھا۔ان خواتین اور ان

کے سامانوں کی باعزت واپسی کی گفتگو میں ناکامی کے بعد حجاج بن یوس نے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں مہم بھیجی تھی۔اس مہم کے نتیجہ میں سندھ کا علاقہ فتح ہوا تھا۔مسلمان اس سے پہلے جنوبی ہندوستان میں تجارت کے لئے آتے رہتے تھے اور ان کے قدم وہاں جم گئے تھے۔ توحید اور انسانی مساوات کا پیغام مسلمانوں کے ذریعہ اس سرزمین پر پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ کا اس ملک میں حسن آغاز تھا، بعد میں اس ملک میں مسلمانوں کی مضبوط اسلامی سلطنت قائم ہوئی۔زمانۂ امن میں عام طور پر ہندو اور مسلمان صلح وآشتی کے ساتھ اس ملک میں رہتے آئے اور ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوئے۔جب اس ملک میں آخری مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہوگیا اور اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں آیا تو انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل کیا، اختلاف کو ہوا دی، نفرت کے بیج بوئے اور اسی ماحول میں انگریزی اقتدار ختم ہوا اور ملک آزاد ہوا اور ملک کے دوٹکڑے بھی ہوگئے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مسلمانوں کی جانب سے کھوئے ہوئے وقار اور اقتدار کی بازیابی کی آخری کوشش تھی اس کے بعد مسلمان انگریزوں کی آنکھ کا کانٹا اور ان کے ظلم وستم کا نشانہ بنے رہے اور ملک کی آزادی کے بعد ہم وطنوں کی ناانصافیوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔آزاد ہندوستان میں ہندو مسلم منافرت کی جو فضا ہے بڑی حد تک انگریز اس کے ذمہ دار ہیں۔انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار چھینا تھا اس لئے قدرتی طور پر اس کا صدمہ مسلمانوں کو زیادہ تھا اور انگریزوں کے انتقامی کارروائی میں مسلمان ہی آگے آگے تھے۔اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو اعلیٰ درجہ کی سول ملازمتوں سے اور فوجی عہدوں سے محروم ہونا پڑا۔انگریزوں نے مسلمانوں کو جس حد تک ممکن ہوسکا کچل کر اور زیردست اور محکوم بنا کر رکھا اور تمام انتظامی عہدے برادران وطن کو دئے جاتے تھے۔ فوج سے بھی مسلمانوں کا مکمل انخلاء عمل میں آیا تھا مروجہ تعلیمی نظام میں بھی مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔مسلمانوں کی بے بسی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

آر ایس ایس کے آئیڈیل ہٹلر اور مسولین:

دوسری طرف برادران وطن کے ایک طبقہ میں مسلمانوں کے خلاف عداوت کی آگ سلگ رہی تھی۔ انگریزوں کے ایک ایجنٹ اور مجاہدین آزادی پر سب وشتم کرنے والے ہیڈگوار نے ناگپور میں مسلمانوں کے خلاف ۱۹۲۵ء میں راشٹریہ سویم سیوک کے نام سے ایک تنظیم قائم کی، مقصد کے اعتبار سے یہ ایک فسطائی تنظیم تھی، جس کا مقصد ہندو نوجوانوں کو عسکری تربیت کے ذریعہ تشدد پر آمادہ کرنا اور ہندو راشٹر قائم کرنا تھا۔ ایک مذہب اور تہذیب اور تہذیب کی بالادستی کے نظریہ کے تحت پورے ملک میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں۔ نازی جرمنی کے ہٹلر اور اٹلی کے مسولینی اس تنظیم کے آئیڈیل تھے۔ جرمنی میں نازیوں نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کا قتل عام کیا تھا۔ ڈاکٹر ہیڈگوار کے دست راست اور شاگرد ڈاکٹر ایس منجے نے اٹلی کا دورہ بھی کیا اور مسولینی سے ملاقات کی تھی اور فسطائی تنظیم کے تنظیمی مراکز کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کے خلاف فرقہ وارانہ فسادات میں مسلم مخالف فضابندی میں اسی تنظیم اور اس کے زیر اثر جماعتوں کا ہاتھ رہا ہے۔ ملک کی آزادی کے وقت اگر گاندھی کے نظریات اور سوشلزم اور سیکولرازم کے حامی لوگ طاقت ور نہ ہوتے تو ملک کے دروبست پر آر ایس ایس کے لوگ حاوی ہوجاتے، لیکن آخر کار رفتہ رفتہ اس تنظیم کے سیاسی بازو کے لوگ حاوی ہوگئے اور مرکز میں اور کئی ریاستوں میں ان کی حکومت قائم ہوگئی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف بحیثیت مجموعی عادلانہ دستور ہے اور دوسری طرف مسلم دشمن جماعتوں کا مخالفانہ منشور ہے۔ دستور اور منشور کے اسی تضاد کو دور کرنے کے لئے بار بار دستور پر نظر ثانی کی بات کی جاتی ہے۔ بابری مسجد کا معاملہ ہو، پرسنل لاء کی مخالفت کا یا مسلمانوں کے دینی مدارس کے خلاف الزامات کی مہم، یا فرقہ وارانہ فسادات کا ان سب کا پس منظر یہی ہے۔ اسی مخالفانہ فضا نے مسلمانوں کے لئے

مسائل پیدا کئے ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی اقتصادی پسماندگی اور دین سے دوری نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ بدلتے ہوئے حالات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی جو ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی تھی وہ انہوں نے پوری نہیں کی۔ غیروں کے تعصب کے ساتھ اپنی غفلت اور کوتاہی نے مسلمانوں کو انتظامی معاملات سے بالکلیہ بے دخل کردیا۔ تعلیم سے محرومی کے نتیجہ میں تعلیمی اداروں میں اور پیشہ وارانہ مہارت کے میدانوں میں بھی مسلمانوں کا درجہ نقطہ صفر تک پہنچ گیا۔ تقسیم سے پہلے ہندو کی جانب سے اشتعال انگیزیوں کے جواب میں بقول ڈاکٹر عابد حسین مسلمانوں کے غیر عاقلانہ ردعمل نے مشکلات میں اضافہ کیا' ملک کی تقسیم سے تھوڑے پڑھے لکھے مسلمانوں سے بھی ہندوستان کی ملت اسلامیہ محروم ہوگئی اور مسلمانوں کا خون اتنا بہا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں بھی اتنا نہیں بہا تھا اور تقسیم کے نتیجہ میں مسلمانوں کے خلاف برادران وطن کے جذبات شدید سے شدید تر ہوگئے۔ مذہب، تہذیب اور اردو زبان، مسلمانوں کے مذہبی ادارے ہر چیز جارحیت کی زد میں آگئی اور منافرت کے بیج جو انگریزوں نے بوئے تھے وہ اب تناور درخت بن چکے ہیں اور مسلمانوں کو دہشت گرد، غدار، پاکستان کا وفادار اور ملک دشمن سمجھا جانے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے زیادہ امن پسند مذہب کوئی نہیں۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں اقلیتیں خوشحال اور خوش اقبال ہیں، ان کی تجارت فروغ پا رہی ہے، لیکن ہندوستان میں اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے مسلمان پسماندہ طبقات اور درج فہرست ذاتوں سے بھی بدتر حال میں ہیں۔ پسماندہ طبقات کو وہ تحفظات حاصل ہیں جو مسلمانوں کو حاصل نہیں جو کبھی خسروے اقلیم وطن تھے، جاروب کشوں کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں۔ ترقی میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ سیاست میں ان کا کوئی مقام نہیں، اسلام جو دین امن ہے، اس کی تصویر اس کے برعکس بنائی گئی ہے۔ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ زوروں پر ہے۔ ان کی لیڈرشپ ختم ہوتی جارہی ہے۔ اس میں قصوروار خود مسلمان بھی ہیں، چونکہ اسکولوں میں اردو نہیں پڑھائی جاتی، اس

لئے گھروں سے بھی مسلمانوں نے اردو کو نکال دیا ہے۔ ہندوستان میں صوفیاء کرام نے جس طرح خود کو غیر مسلموں کے لئے بھی عقیدت کا مرکز بنالیا تھا بعد کے مسلمان خود کو ناگزیر اور روحانی اور اخلاقی طور پر بھی دوسروں کے لئے مرکز کشش بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس طرح سے مسلمانوں کی تاریخ کا جو حسن آغاز تھا وہ بتدریج نکبت اور ناسازگاری کے انجام کی شکل میں اب پورے طور پر سامنے آگیا ہے۔

مسائل کے اس مختصر تجزیہ سے معلوم ہوا کہ موجودہ عہد میں برادران وطن کے جارحانہ رویہ نے مسلم اقلیت کے لئے بہت مسائل پیدا کردئے ہیں اور انصاف کے حصول میں اس نے رکاوٹ کھڑی کردی ہے۔ مسلمانوں کے خلاف تعصب اور تنگ نظری مشکلات کی اصل جڑ ہے، لیکن ایسا نہیں کہ رہنمائی نہ ملتی ہو۔ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ کتاب اللہ یا حدیث میں یا سیرت میں اس کی طرف رہنمائی نہ ملتی ہو۔ کتاب اللہ میں مخالفین کے تعصب اور مخالفانہ برتاؤ کا حل بتایا گیا ہے۔ اگر دین میں برادران وطن کے ساتھ فراخدلانہ اور فیاضانہ رویہ اختیار کرتے، لیکن ہم نے قرآن کے پیش کردہ حل پر کبھی توجہ نہیں کی اور نہ اس کا تجربہ کیا اور نہ برادران وطن کو اپنے حسن سلوک سے متاثر کرسکے۔ قرآن کی آیت ہے: ''**لا تستوی الحسنة ولا السیئة ادفع بالتی هی احسن فاذا الذی بینک وبینه عداوة کأنه ولی حمیم ولا یلقاها الا الذین صبروا وما یلقاها والا ذو حظ عظیم.**'' (سورہ حم سجدہ) (نیکی اور بدی کبھی برابر نہیں ہوسکتی اور سب سے بہتر نیک کام سے برائی کو دور کرو پھر تم دیکھو گے کہ جس کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے وہ گویا تمہارا دوست بن گیا لیکن یہ مقام صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جو صبر کرتے ہیں اور بڑے خوش نصیب ہیں)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسائل سنگین ہیں، لیکن مسائل اور مشکلات کے اس بھنور سے باہر نکلنے کا طریقہ بحیثیت مسلمان کے ہمیں کتاب اللہ اور سیرت طیبہ میں ڈھونڈنا

چاہئے۔ اس کے مکلّف بھی ہیں اور پابند بھی ہیں۔ مشکلات سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ خدائی قانون یہ کہ جب رات کے زلف برہم کی سیاہی پھیل جاتی ہے تو نگار آفتاب طلوع ہوتا ہے اور دنیا روشنی سے معمور ہوجاتی ہے۔ جب درجہ حرارت ناقابل برداشت حد تک پہنچ جاتا ہے، تو پانی سے بھرے ہوئے بادل آسمان پر چھانے لگتے ہیں اور بارش رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ ہر زحمت کے بعد رحمت ہے ہر عسر کے بعد یسر کا زمانہ آتا ہے۔ قرن اوّل میں جب مخالفتوں کی بدصرصر چل رہی تھی تو قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تھی: ''**واخری تحبونها نصر من الله وفتح قریب.**'' (سورہ الصف:) (خدا ایک دوسری چیز بھی جو تمہیں محبوب ہے عطا کرے گا اور وہ ہے خدا کی مدد اور فتح قریب اور آپ اہل ایمان کو خوشخبری سنادیں)۔ مذکورہ آیت میں مدد اور فتح کی بشارت جن لوگوں کو سنانے کا حکم دیا گیا ہے انہیں صفت ایمان سے متصف بتایا گیا۔ ''**بشر المؤمنین**'' بالفاظ دیگر اگر ایمان اور اس کے لوازم عمل ہم اپنے اندر پیدا کرلیں تو یہ جانگسل حالات تبدیل ہوسکتے ہیں۔ حالات جب غیر معمولی ہوں تو حل کے لئے بھی غیر معمولی کوشش درکار ہوتی ہے۔ نصرت الٰہی کی شدت کے ساتھ احتیاج ہوتی ہے اور نصرت الٰہی کے لئے کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے اور سیرت طیبہ سے روشنی حاصل کرنا لازمی ہوجاتا ہے۔ کتاب وسنت کا بنیادی نکتہ ایمان ہے۔ ولایت، پادشاہی، علم، اشیاء کی جہاں گیری، یہ سب کیا ہیں فقط ایک نقطہ ایمان کی تفسیریں۔

ایمان تو یوں چند حرفی لفظ ہے، لیکن جب یہ انسان کے اندر داخل ہوجاتا ہے تو ایک بھونچال بن جاتا ہے اور انسان کی پوری شخصیت کو پورے طور پر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ شخصیت اپنے ماحول کو متاثر کرتی ہے۔ وہ ایک آگ کے الاؤ کے مانند ہوتا ہے۔ جس کی گرمی اور روشنی دور دور تک پہنچتی ہے۔ یہی وہ ایمان ہے جس کے متصف لوگوں کی ایک جماعت تیار ہوجائے تو ان کو روئے زمین پر خلافت بھی دی جاتی ہے اور یہی دین اسلام کا

غلبہ ہے ''لیظھرہ علی الدین کلہ'' (سورہ الصف :) اور ''لیغلبن انا ورسلی'' دیگر آیتوں میں ان کی بشارت سنائی ہے۔

مسلمانوں کے فکری اور عملی انحطاط کا دور:

اس وقت مسلمان جس دور سے گزر رہے ہیں وہ انحطاط کا دور ہے۔ یہ انحطاط ذہنی سطح پر بھی رونما ہے اور عملی سطح پر بھی نمایاں ہے، یہ زار وزبوں حالت جس میں وہ گرفتار ہیں اس کا مداوا اللہ کی کتاب میں اگر ڈھونڈھا جائے تو ایمان کا مفقود ہونا اور اس کے لوازم عمل کا نہ پایا جانا ہے۔ یہ امت اپنا نصب العین بھی کھو چکی ہے، اپنا اخلاقی کردار بھی کھو چکی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی آ گئی ہے کہ ہر فرد کو ایمان کی طرف لوٹنے کی دعوت دی جائے۔ یہ کوئی مولویانہ بات نہیں، بلکہ خدائی کلام ہے: ''یایھا الذین آمنوا آمنوا'' ضرورت ہے کہ ایمان کے جو عملی تقاضے ہیں ان کی بھی وضاحت کی جائے، تاکہ آخرت کی کامیابی اور دنیا میں سربلندی کی راہ پورے طور پر واضح ہو جائے۔ حسنِ یقین کو لذت کردار سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایمان بیج ہے اور کردار اس کا پھل۔ اگر درخت پر پھل نہیں تو اس کا مطلب یہ کہ بیج میں جڑوں کی کوئی خرابی ہے۔ ایمان کے استحکام کے لئے تعلیم وتربیت کی فضا کی ضرورت ہے۔ تاکہ درخت پر حسن عمل کے، خوش ذائقہ پھل لگ سکیں نیکیوں کے غنچے کھل سکیں۔ معاشرہ صالح وتندرست ہو، دنیوی ترقی کے اسباب حاصل ہوں۔ نصرت کا وعدہ خداوندی ایمان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر حالت ادبار وتنزل کو بدلنا ہے تو بحیثیت مسلمان ترقی کی راہ قرآن وسنت میں ڈھونڈھنی ہوگی۔ ورنہ کس نے مجبور کیا ہے کہ اپنے کو مسلمان بھی کہو اور خدا اور سنت کے سوا کسی اور نظریہ، ازم اور فلسفہ پر ایمان لاؤ اور اس کو اپنا طبیب اور معالج سمجھو۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ایمان اور اس کے تمام تقاضوں پر عمل ہو اور سیرت رسول اور اسوۂ صحابہ نمونۂ عمل ہو۔

ایمان کا مرکزی نقطہ توحید ہے اس عقیدہ کو شرک کے شائبہ سے بھی پاک رکھنا ہوگا۔ اللہ کی ذات کو تنہا کائنات کا خالق اور مالک سمجھنا ہوگا، سر صرف اسی کے سامنے جھکنا ہوگا، لو اسی سے لگائی جائے گی، دل میں اس عقیدے کو مضبوط کرنا ہوگا کہ نفع اور نقصان اور شکست وفتح صرف اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، وہی ذات ڈرنے کے لائق ہے۔ وہ مہربان ہے وہ نگہ بان ہے۔ ''دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است'' اگر وقتی طور پر دشمنوں کا غلبہ ہو گیا ہے اور مخالفوں کو بول بالا حاصل ہو گیا ہے، تو یہ اہل ایمان کی سرزنش کے لئے ہے۔ ''فلنذیقنھم من العذاب الأدنی دون العذاب الأکبر لعلھم یرجعون'' (ہم انہیں ضرور عذاب اکبر سے پہلے دنیا کا مزہ چکھائیں گے۔ شاید کہ وہ رجوع کریں) ایمان کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ آخرت پر یقین مستحکم ہو۔ قرآن میں اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے ''وبالآخرۃ ھم یوقنون'' اگر دنیا میں عزت اور کامرانی کی طلب ہے تو سب سے پہلے اپنی زندگی کو آخرت رخی بنانا ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر نمازوں کا اہتمام نہیں۔ مسجدوں کی جانب قدم رنجہ ہوتے ہوئے شرم آتی ہے، تو ایمان کے شعاروں کے بارے میں استخفاف ہوتا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ زندگی ترجیح آخرت کی آئینہ دار نہیں ہے۔ جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ قیامت آنے والی ہے، ایک دن نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا، آسمان وزمین شکست وریخت سے دوچار ہوں گے، یوم العمل ختم ہوگا اور یوم الجزاء شروع ہوگا تو انسان اقامت صلوٰۃ کا بھی اہتمام کرے گا۔ عبادت کا بھی اہتمام کرے گا، زیادہ سے زیادہ نیکیاں اس دن کے لئے جمع کرنے کی کوشش کرے گا۔ کوئی ترغیب کوئی ترہیب اس کو جادۂ حق سے منحرف نہیں کر سکے گی۔ پھر ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ خدا سے اور اس کے رسول سے محبت اور ہر محبت وطاعت کو مستلزم ہوتی ہے خدا اور اس کے رسول کی محبت اس درجہ کی ہونی چاہئے کہ ساری محبتیں اس محبت کی تابع ہو جائیں۔ سیرت طیبہ زندگی کے لئے ماڈل ہونا چاہئے اور اس کا بار بار مطالعہ کرنا چاہئے۔ کہ اسی نمونہ پر عمل کرنے سے ہر مشکل کا

حل نکلے گا اور اسی کلید سے فتح یاب اور ملک و معاشرہ میں انقلاب کا آغاز ہوگا، دنیا بھی سنور جائے گی اور آخرت میں بھی سرخروئی حاصل ہوگی۔

حضور اکرم ﷺ کی زندگی تمام مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ قرآن میں ہے: ''لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ'' (سورہ احزاب:) اس لئے مسلمان جہاں بھی ہوں، اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں ہوں، رنج و تکلیف میں ہوں یا اقتدار و آسائش میں ہوں، کانٹوں کے خاردار میں ہوں یا گنج چمن میں ہوں اور موسم بہار میں ہوں، سیرت طیبہ ان کی زندگی کے لئے پورے طور پر رہنما ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے تعلیم حاصل کرنے اور لکھنا پڑھنا سیکھنے کی طرف توجہ دلائی، محنت اور مزدوری کر کے اپنی معیشت کو مستحکم کرنے کی ترغیب دی۔ خود تجارت کر کے دوسروں کے لئے نمونہ قائم کیا۔ خود کفیل ہونے کا حکم دیا اور معاشی طور پر دوسروں کا دست نگر رہنے سے منع فرمایا۔ مکارم اخلاق کی تعلیم دی، صحت اور جسمانی قوت کی اہمیت بتائی، قوی مومن کو ضعیف مومن سے بہتر بتایا۔ اجتماعیت کا نظام قائم کیا اور ایسا اتحاد پیدا کیا کہ مسلمان سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے، ان سب کے ساتھ آپ ﷺ نے صحابہ کے اندر داعیانہ کردار پیدا کیا اور یہی وہ داعیانہ کردار تھا جس نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں ایک ذات واحد کی عبادت کرنے والوں کی قابل لحاظ جماعت پیدا کر دی تھی اور اب اس داعیانہ کردار سے دست برداری کے نتیجہ میں دنیا کے ہر گوشہ میں مسلمانوں نے اپنی اقدامیت کھو دی ہے اور مسائل کے ہجوم میں گھر گئے ہیں۔

دین کا تعارف:

حضور اکرمؐ کی بعثت سے پہلے عرب قبائل میں بہت سے لوگ تھے جو بت پرستی سے بیزار تھے ان کو حنفاء کہا جاتا تھا وہ ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیف پر قائم تھے، جب ان کا تعارف اس دین سے ہوا، جو بت پرستی کا مخالف تھا اور انہوں نے قرآن کی آیتیں سنیں تو

دلوں کے اندر یہ دین تیر نیم کش کے مانند گر گیا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ بت پرستی سے ایک خاص حلقہ میں بیزاری جس طرح عرب قبائل میں تھی ہمارے ملک ہندوستان میں بھی پائی جاتی ہے۔ خود ہندوؤں میں اصلاحی تحریکیں اٹھیں ہیں جنہوں نے بت پرستی کی مخالفت کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وید میں ایسے اشلوک ہیں جن سے توحید کا درس ملتا ہے۔ مسلمان داعی ان اشلوکوں کو ہندوؤں کے مجمع میں سنا سکتا ہے اور توحید کی دعوت دے سکتا ہے۔ کلمہ توحید کا ایک جزء اس سے مکمل ہو جاتا ہے۔ داعی حکمت کے ساتھ سیرت طیبہ کو اور خاص طور پر اخلاقی تعلیمات کو پیش کر کے مجمع کو اسلام سے قریب کر سکتا ہے اور مناسب طریقہ سے اسلام کی دعوت دے سکتا ہے۔ انہیں سمجھا سکتا ہے کہ اسلام کے نظام حیات میں عقل سے پوری مطابقت پائی جاتی ہے اور ہر مسئلہ کا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ آج کی دنیا کا ایک اہم مسئلہ نابرابری اور نسلی امتیاز ہے، اپنے ملک کے اندر تو یہ برائی صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ ذات پات کی تفریق کے بندھنوں میں پورا سماج بندھا ہوا ہے۔ خود یوروپ میں کالے اور گورے کا فرق موجود ہے۔ اسلام کا داعی احادیث اور سیرت طیبہ کی روشنی میں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ اسلام کا نظریہ مساوات اور اخوت انسانی اس مسئلہ کا حل ہے، اس دین میں کمزور طبقات کو طاقت اور عزت کا مقام دیا گیا ہے اور پوری نسل انسانی کو آدم اور حوا کی اولاد بتایا گیا ہے۔ پیغمبر آخر الزماں عرب میں مبعوث ہوئے اور انہوں نے خود عربوں کے سامنے واضح اعلان کر دیا کہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر کوئی امتیاز حاصل ہے، جو اللہ سے ڈرنے والا نیکوکار ہے صرف اسی کو فضیلت حاصل ہے۔

اسلام میں خواتین کی عظمت اور مقام:

دنیا میں اسلام سے پہلے عورت کو کوئی سماجی حیثیت حاصل نہ تھی عربوں میں لڑکیوں کو زندہ

درگور کیا جاتا تھا، ہندوستان میں عورت شوہر کی چتا کے ساتھ جلائی جاتی تھی۔عورت کو یہاں کی کتاب مقدس وید پڑھنے کی اجازت نہ تھی اسلام نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ عورت کو عزت کا درجہ دیا اور مرد کے ساتھ وراثت میں حصہ دلایا اور لڑکیوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش پر بڑے ثواب کا اور جنت کا وعدہ کیا۔آج بھی پوری دنیا عورت کو اس کا صحیح مقام نہیں دے سکی ہے اور افراط وتفریط کا شکار ہے اور مسئلہ زن سلجھانے کی کوششوں کے باوجود آج بھی وہیں کا وہیں ہے۔اس مسئلہ میں اسلام کی تعلیمات معتدل بھی ہیں اور عادلانہ بھی ہیں، عقل کے مطابق بھی ہیں۔اسلام میں انسانی جان ومال کے احترام کی تلقین ہے۔حکومت کا سیاسی نظام استبدادی نہیں بلکہ شورائی ہے جس کی روح جمہوریت ہے۔اسلامی قانون کو خلیفہ پر برتری حاصل ہے۔فرد کو حکام پر تنقید کا حق ہے۔حاکم وقت اسلامی عدالت میں اگر اس کے خلاف کوئی استغاثہ ہے تو جواب دہ ہے۔بیت المال حاکم کی ملکیت نہیں، بلکہ وہ رفاہ عام کے لئے ہے اور وہ صرف اس کا ٹرسٹی ہے۔اسلام کے اقتصادی نظام سے زیادہ بہتر کسی عادلانہ نظام کا تصور نہیں کیا جاسکتا جس میں اہل ثروت کے مال ودولت میں غریبوں کا حق مقرر کیا گیا ہے اور اہل ثروت کو مقررہ حق سے زیادہ خرچ کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور اجر وثواب کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔حقوق انسانی کے سلسلہ میں آج کی متمدن دنیا جہاں پہنچی ہے وہاں اس دین اسلام کی برکت سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہی اہل اسلام پہنچ گئے تھے، دین اسلام میں دین اور دنیا روحانیت اور مادیت کے درمیان مکمل توازن پایا جاتا ہے، نہ تو دین کے حصول میں مانع ہے اور نہ دنیا کی جائز راحتیں انسان کے دین میں کوئی رخنہ پیدا کرتی ہیں۔الغرض اس عہد کے اور انسان کو مسئلوں میں سے کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا اسلام کی روشنی میں حل موجود نہ ہو۔

دین اسلام پوری دنیا پر احسان عظیم ہے:

دین اسلام پوری انسانیت پر احسان عظیم تھا اور ہے اور اس کے قبول کرنے میں دنیا

وآخرت دونوں کا فائدہ ہے، مذہبی عقائد میں داعی مدعوں کو توحید کے فائدے سمجھائے جاسکتے ہیں، شرک کے نقصانات سے آگاہ کیا جاسکتا ہے۔برادران وطن کا فکری سانچہ شرک کے باوجود توحید کے خیال سے بالکل خالی نہیں، اگر حکمت کے ساتھ دعوت دی گئی تو بہت سے لوگ ہم خیال ملیں گے، جیسا کہ سرزمین عرب میں مل گئے تھے۔وید بن عمر بن نفیل عربوں میں ان احناف میں تھے جو بت پرستی کے مخالف تھے ان کا انتقال آپ کی بعثت سے پہلے ہوگیا تھا، حضور اکرم ﷺ نے ان کو امت واحدہ قرار دیا تھا۔ان کے بیٹے سعید بن زید نے اپنے والد کی حنفیت کے زیر اثر دعوت اسلام قبول کرنے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کیا۔داعی کی اصل توجہ عقیدۂ توحید پر مرکوز ہونی چاہیے کہ یہی طریقہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کا تھا۔

دعوت دین کا کام ملت کا بنیادی فریضہ:

حضور اکرم ﷺ نے مکی زندگی میں دعوت کے مختلف طریقے اختیار فرمائے۔ایک تو یہ کہ ہر شخص کو دعوت کا مخاطب بنایا، محلوں میں گئے، گھروں میں ملاقاتیں کیں اور بازاروں میں، جلسوں میں، حج کے اجتماعات کے موقع پر مختلف قبیلے والوں سے مکہ مکرمہ کی زیارت کے لئے آنے والے مسافروں سے ملے اور ان کو دین توحید کی دعوت دی۔عام لوگوں کے علاوہ قبائل کے سرداروں سے بھی آپ ملاقاتیں کرتے، ان کو کھانے پر مدعو کرتے، تحفے تحائف دیتے، رفاہ عام کے کاموں میں شریک ہوتے، تبلیغ اور دعوت میں آپ کا طریقہ مصالحانہ، ہمدردانہ اور خیر خواہانہ اور حکیمانہ ہوتا تھا، معاندانہ اور مخاصمانہ، متکبرانہ اور مجادلانہ نہ تھا۔آپ کے اخلاق عالیہ سے سب متاثر تھے، آپ ﷺ کا لقب صادق اور امین رکھ دیا تھا۔دعوت کے میدان میں کامیابی کے لئے مدعو کے ساتھ ہمدردانہ اور خیر خواہانہ اور حکیمانہ ہوتا تھا۔معاندانہ اور مخاصمانہ اور مجادلانہ نہ تھا۔آپ کے اخلاق عالیہ سے سب متاثر تھے۔

آپ کا لقب صادق اور امین رکھ دیا گیا تھا، دعوت کے میدان میں کامیابی کے لئے مدعو کے ساتھ ہمدردی اور دلسوزی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ کشیدگی پیدا کرنے اور کشمکش رکھنے سے دلوں کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ دل کو گھائل کرنے کے ساتھ دل کو مائل کرنے کا کام نہیں ہوسکتا ہے اور اسی طرح صرف عقلی دلائل اور منطق کا استعمال زیادہ سودمند نہیں ہوتا اور یہ طریقہ صرف چند فلسفانہ طرز رکھنے والوں اور معروضی مطالعہ کرنے والوں پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ جب تک داعی اپنے اخلاق سے دل نہ جیت لے، دعوت میں اس کو نمایاں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ ملنے والوں کے سامنے قرآن مجید کی آیات تلاوت فرماتے تھے۔ توحید کی تعلیم اور نیکیوں کا درس دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے ابتدائی تین سال خاموشی کے ساتھ تبلیغ کی، بلکہ نمازیں بھی خفیہ طور پر ادا کی جاتی تھیں اور جب آیت ''**فاصدع بما تومر**'' نازل ہوئی تو آپ نے اعلانیہ دعوت کا کام شروع کیا۔ خاموش دعوت سے بہت سے قریب کے لوگ ایمان لائے اور ان قریبی صحابہ کی کوششوں سے دور اور نزدیک کے قبائل نے اسلام قبول کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتی کام کی بنیاد کے مستحکم ہونے تک اگر حالات کا واقعی تقاضا ہو تو، خاموشی کے ساتھ کام کیا جاسکتا ہے، تاکہ بالکل ابتداء ہی میں دین اسلام کے خلاف رکاوٹیں نہ کھڑی ہوجائیں، لیکن اس میں غیر ضروری احتیاط بھی مناسب نہیں، اندیشہ یہ بھی ہے کہ جو ملت صدیق سے اپنے دعوتی فریضہ سے دست بردار ہوچکی ہو، اس کے لئے خفیہ اور پس پردہ کام کی تلقین اس میدان میں مکمل جمود کا بہانہ نہ بجائے۔ ایک شخص جو پہلے ہی سے کھانا پینا چھوڑ چکا ہو اور اس کے نتیجہ میں دبلا ہوتا جارہا ہو، اسے اگر غذا سے ڈرایا جائے تو پھر اس کا کام تمام ہوجائے گا۔ ایسے مریض کے لئے کھانے کے لئے اشتہا پیدا کرنی چاہئے، نہ کہ اسے کھانے سے ڈرانا چاہئے۔ اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ استعداد اور اعلیٰ اخلاقی قوت کے ساتھ دعوت کا کام زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ دعوتی کام کو ہر قیمت پر جاری رکھنا ضروری ہے، کیونکہ دعوت ملت مسلمہ کا بنیادی کردار ہے۔ یہ

کام بحیثیت خیر امت مسلمانوں کا فریضہ اور ختم نبوت کا بنیادی تقاضہ ہے۔

مدینہ میں آپ نے فرماں روانِ عالم کو دعوتی خطوط بھی لکھے۔ دعوتی خطوط حل وعقد کے ارباب، کو غیر مسلم رفقاء واحباب کو اب بھی لکھے جاسکتے ہیں۔ قلم کے ذریعہ دنیا کی مختلف زبانوں میں کتابیں لکھی جاسکتی ہیں اور اسلام کی اشاعت ہوسکتی ہے۔ یہ سب اہم چیز دعوت اسلام کے لئے خاموشی کے ساتھ انفرادی ملاقاتوں کا سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام نے مکہ میں جاری رکھا تھا۔ یہ ایک معیار اور کسوٹی ہے۔ یہ چیز نہیں ہے تو گویا دعوت کا کام نظریاتی اور تصوراتی حد سے آگے بڑھ کر خالص عمل کے میدان میں داخل نہیں ہوا۔ دعوت کے میدان میں محض کاغذی گھوڑے دوڑانے کو دعوت نہیں کہتے، دعوت نہیں ہے جب تک کہ دعوتی ملاقاتیں نہ کی جائیں، البتہ ملاقاتوں کے بعد تعلیم یافتہ لوگوں کو دین اسلام کے تعارف پر کوئی کتاب پڑھنے کو دینا عملی اقدام ہے۔ آج کے مسلمان عام طور پر روایتی طور پر مسلمان ہیں ان میں نومسلموں کا دعوتی جوش وخروش نہیں پایا جاتا ہے۔ جوش تو انقلاب بردوش سے ہوا کرتا ہے۔ ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں اسلامی انقلاب جوش دعوت کا مرہون منت رہا ہے۔ سیرت کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام قبول کرنے والے حضرات اپنے اپنے قبیلہ اور شہر میں دعوت کا کام شروع کردیتے تھے، ایک بار اسلام قبول کرنے والوں کا سلسلہ اگر شروع ہوجاتا ہے، تو نومسلم کے تعلیم وتربیت کے بعد خاندان اور برادری میں دعوت کا کام سب سے بہتر طور پر انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ ان سے ان نومسلموں کے گھریلو تعلقات ہوتے ہیں اور رشتہ قرابت ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ اسلام قبول کرنے والے شخص کو یہ کہتے ''جاؤ اور اپنی قوم میں دعوت پیش کرو'' (**ارجع الی قومک فاخبرھم**) ہر نومسلم میں دینی جذبہ ہوتا ہے بسا اوقات پورے کا پورا قبیلہ نومسلموں کے جوش تبلیغ سے اسلام قبول کرلیتا تھا۔ اس وقت مسلم قوم کا سب سے بڑا خسارہ یہ ہوا کہ ان کا داعیانہ کردار کھو گیا ہے۔

سماجی تحفظ کی کوشش:

داعیانہ کردار سیرت طیبہ کا سب سے نمایاں وصف ہے اور مسلمانوں کے لئے کامیابی کی اصل کلید ہے۔ جان ومال کے تحفظ کے لئے بھی روشنی ہمیں کتاب اللہ اور سیرت واحادیث میں ملتی ہے۔ایک ایسے ملک میں جہاں خون مسلم ارزاں ہوگیا ہو،مسلمانوں کوحتیٰ المقدور مسلم آبادی میں رہنا اور بسنا چاہئے۔ انبیاء کی پچھلی امتوں نے بھی جن کو چیرہ دستیوں کا سامنا تھا، رہنے کے لئے اپنی آبادی الگ رکھی تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو بنی اسرائیل راتوں رات فرعون اور قبطیوں کے شہر کو چھوڑ کر روانہ نہیں ہوسکتے تھے۔فرعون کو خبر ہوئی اور اس نے تعاقب کیا اس وقت بنی اسرائیل آبادی سے بہت دور دریا قلزم کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے درمیان قیام کرے،(ابوداؤد: کتاب الجہاد) ترمذی کی حدیث ہے ''لاتساکنوا المشرکین'' یعنی مشرکوں کے ساتھ سکونت نہ اختیار کرو،آپ نے یہ حکم غیر اسلامی اثرات سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے بھی دیا تھا۔ جہاں مسلمان ایک جگہ رہتے ہوں وہاں دفاع بھی آسان ہوتا ہے۔ ہندوستان کے فسادات میں جہاں مسلمانوں نے جمع ہوکر جم کر مقابلہ کیا وہاں ان کو نقصان نسبتاً کم پہنچا۔ جان ومال کی اور اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہوئے جو جان دیتا ہے زبان رسالت ﷺ نے اسے شہادت کا درجہ عطا فرمایا ہے۔ مسلمانوں کی کمزوری اور دوسروں کی دست درازی کی وجہ آپ نے ''حب الدنیا وکراھیۃ الموت'' بیان فرمائی ہے۔یعنی دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔شہادت تو وہ مقام ہے جس کی تمنا کرنی چاہیے اور اس کے لئے موت کو گلے لگانے کے لئے تیار ہونا چاہئے اور موت کی آرزو رکھنے والوں کا مقابلہ بزدل حملہ آور نہیں کرسکتے ہیں۔فرقہ وارانہ فسادات کی نئی شکل اب یہ سامنے آئی ہے کہ انتظامیہ اور پولیس میں شریک ہونے لگی ہے،

لیکن اس کے باوجود تجربہ یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں نے اپنی آبادی کا انخلا نہیں کیا اور مقابلہ کیا وہاں ان کا نقصان نسبتاً کم ہوا۔اس لئے مسلمانوں کو اپنی جان ومال کی حفاظت کے لئے حفاظت خود اختیاری پر عمل کرنا ہوگا اور شہادت کی تمنا رکھتے ہوئے بے خوفی سے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس کے لئے اپنی آبادی کی قلعہ بند کرنی ہوگی۔ عام حالات میں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے اپنے تعلقات بہت بہتر بنانے ہوں گے۔صرف اپنے خول میں بند رہنے کی عادت کو ختم کرنا ہوگا اور اپنی اعلیٰ تعلیم اور صلاحیتوں کا سکہ بھی جمانا ہوگا۔ اپنی صلاحیتوں کے ساتھ ملازمتوں میں دخیل ہونا پڑے گا۔اپنی حب الوطنی کا نقش بھی قائم کرنا ہوگا، حملہ آوروں کا مقابلہ تو کرنا ہوگا، لیکن جو لوگ حملہ آور ہوں ان کے ساتھ ان کا معاملہ مختلف ہوگا۔خود کو انتقامی جذبات سے اتنا بلند کرنا ہوگا کہ مسلمانوں کا کوئی فرد غیر حملہ آوروں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، کیونکہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

مظالم سے بچنے کے طریقے:

ہندوستان میں مسلمانوں کے مجموعی سماجی تحفظ کے لئے مکہ کے سماجی تحفظ کو بھی سامنے رکھنا چاہئے۔مکی زندگی میں مذہبی آزادی برائے نام تھی، یعنی بعض لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ کی حد تک محدود تھی، ورنہ لرزہ خیز ایذا رسانی اور تعذیب کی کوئی قسم نہ تھی جو کلمہ لا الہ الا اللہ کہنے والوں پر روا نہ رکھی گئی ہو۔جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جاتے۔ جوئے خون سروں سے گزر جاتی اور زبان پر احد احد کا کلمہ جاری رہتا۔قرآن کا حکم تھا۔''کفوا ایدیکم واقیموا الصلوٰۃ'' (یعنی اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو) یعنی تلوار اٹھانے اور بدلہ لینے کی ممانعت تھی خدا کے سامنے تبتل اور نماز قائم کرنے کا حکم تھا۔اس وقت مکہ میں مظالم سے بچنے کے لئے مسلمانوں نے دو طریقے اختیار کئے تھے ایک جو عرب قبائل میں جاری تھی

یعنی قریش مکہ کا کوئی ممتاز شخص یا قبیلہ جب کسی کو جوار عطا کرتا تو اس کی جان و مال کی حفاظت کا وہ ذمہ دار ہوتا۔ آپ ﷺ نے رحم دل چچا ابوطالب اور ہمدرد رفیقہ حیات حضرت خدیجہ کے انتقال کے بعد دعوت کے علاوہ اس مقصد کے لئے بھی طائف کا سفر فرمایا تھا۔ بہت سے مسلمانوں کو یہ جوار حاصل تھا اور بہت سے لوگوں کو حاصل نہ تھا۔ جن کو حاصل نہ تھا وہ صبح شام ستائے جاتے اور وہ مظالم برداشت کرتے اور جس عقیدہ کو انہوں نے دل میں بسالیا تھا اس سے دست کش ہونے کو تیار نہیں ہوتے۔ دوسرا طریقہ ہجرت کا تھا خود حضور ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا تھا اور تقریباً سو مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی جہاں ایک منصف عیسائی بادشاہ نجاشی حکمران تھا۔ سیرت کے ان واقعات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ وقت اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق سماجی تحفظ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک ہجرت کا تعلق ہے ہندوستان کے پندرہ بیس کروڑ مسلمان نہ تو کہیں ہجرت کرسکتے ہیں اور نہ کوئی ملک ان کو قبول کرسکتا ہے۔ یہ اتنی بڑی آبادی ہے کہ ان کے لئے اقلیت کا لفظ استعمال کرنا بھی پورے طور پر درست نہیں کہ انہیں اس ملک میں دستوری طور پر دوسرے تمام طبقوں کے ساتھ مساوی درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے اس ملک پر تقریباً آٹھ سو سال حکومت کی ہے، ان کے لئے بار بار اقلیت استعمال کرکے ان کی اقدامی اور دعوتی صلاحیتوں کو مردہ کرنا اور انہیں احساس کمتری میں مبتلا کرنا کوئی مناسب بات نہیں، یوں تو اقلیت ایک سادہ لفظ ہے، لیکن اس سے جو نفسیاتی مزاج بنتا ہے، وہ صحت مند نہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ مکہ اور حبشہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے اقلیت کی اصطلاح سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتی اور حنفی فقہ کی تقدیری جزئیات کے باوجود فقہ الاقلیات کبھی ترتیب نہیں دی گئی۔ دنیا کے مختلف مسلکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے لئے دینی اور فقہی احکام مرتب کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ ان کی نفسیات کی تشکیل میں محکومیت کا عنصر داخل نہ ہونے پائے اور وہ

اپنے مشن سے غافل نہ ہوں۔ دنیا میں ایک مشن کے لئے زندہ رہنے والوں کے لئے تعداد کی کمی کبھی پریشان کن نہیں ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ان کے لئے دوسری بڑی اکثریت کا لفظ استعمال کرنا ہی زیادہ مناسب ہے، لیکن اس آئیڈیلز کے باوجود یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اسی ملک میں گجرات جیسے واقعات پیش آتے ہیں اور بار بار پیش آتے ہیں۔ یہاں نہ جوار کا طریقہ رائج ہے اور نہ ہجرت ممکن ہے۔ مکہ کے قبائلی نظام کے بجائے یہاں سیاسی پارٹیوں کا نظام رائج ہے۔ اندرون ملک ایک خاص نوعیت کی ''رسم جوار'' یہ ہوسکتی ہے کہ مسلمان ''حلف الفضول'' کو سامنے رکھ کر برادران وطن کے ساتھ رفاہی کاموں میں شرکت کریں اور سماجی اشتراک کے ساتھ ساتھ ان سیاسی پارٹیوں کے حامی بنیں اور انتخابات میں ان کی مدد کرنے والے بن جائیں، جو دل سے فرقہ وارانہ ماحول کو بدلنا چاہتی ہوں اور اس ملک کے لئے مذہبی سیکولرازم نظام چاہتی ہوں جب ہجرت کرکے حبشہ کی عادل عیسائی حکومت کے زیر سایہ مسلمان رہ سکتے ہیں، تو یہاں مسلمان ایک سیکولر اور غیر جانبدار پارٹی کے طرفدار بن کر کیوں نہیں رہ سکتے ہیں۔ بلکہ روایت میں تو یہ بھی موجود ہے کہ حضور نے منصف بادشاہ نجاشی کے نام سفارشی خط بھی تحریر کیا تھا۔ یہ سفارشی خط اس بات کی بھی سفارش کرتا ہے کہ انصاف پسند لوگوں کی حمایت کرکے خود اپنے لئے انصاف کرنا چاہئے۔ اکثریتی طبقہ کی جارحیت سے بچنے کے لئے اور صاف ذہن ہندوؤں سے قریبی تعلقات رکھنے کے لئے دوسرے کے ساتھ مل کر ملک و وطن کی خدمت کے لئے سیکولر پارٹیوں کا ساتھ دینا ایسا ہی ہے جیسے قدیم زمانہ میں کسی قبیلہ کی پناہ میں آنا اور جوار حاصل کرنا۔ حقیقتاً یہ جوار نہیں، لیکن اس کے مقاصد سماجی تحفظ کے لئے ہجرت حبشہ سے یا قبائلی نظم میں جوار کے طریقے سے ملتے جلتے ہیں۔ مکی زندگی میں قبائل افراد کو اپنے جوار میں لیتے تھے اور ان سے جوار طلب بھی کی جاتی تھی۔ ہر قبیلہ کے ساتھ اس کا دفاعی معاہدہ ہوتا تھا۔ اب قبائلی نظام کی جگہ سیاسی پارٹیوں کا نظام ہے۔ کسی مخصوص پارٹی کی حمایت اور اس میں شمولیت ایک قسم کی

طلب جوار بھی ہے اور اپنا دفاع بھی ہے۔ اس لئے کہ سیکولر طاقتوں کو قوت نہیں پہنچائی گئی تو ہندو نازی ازم کا عفریت مسلمانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھائے گا۔ ان کے پرسنل لا کو ختم کرے گا، ان کے دینی تعلیمی اداروں پر پابندی عائد کرے گا۔ اب یہ معتبر قائدین کا کام ہوگا کہ وہ ان سیاسی پارٹیوں کی تعین کریں، جو مسلمانوں کے ووٹوں کی حقدار ہوسکتی ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرسکتی ہیں اور جن کے ساتھ مسلمان شریک ہوسکتے ہیں۔ مکہ میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ سب غیر مسلم رشتہ داروں اور غیر رشتہ داروں سے سماجی تعلقات رکھتے تھے۔ اس لئے عام غیر مسلموں سے سماجی تعلقات رکھنے اور سیکولر سیاسی تنظیموں میں رفاہ عام کے لئے اور ملک کی فلاح و بہبود کے لئے شرکت کرنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی قباحت نہیں، بلکہ یہ حالات کا تقاضہ ہے اور ضرورت اس کی متقاضی ہے، لیکن یہ شرکت غیر مشروط نہیں ہونی چاہئے، بلکہ داعیانہ کردار اور اخلاقی اقدار کے ساتھ ہونی چاہئے۔ عہد جدید کی سیاست اخلاقی اقدار سے روگرداں ہوچکی ہے، ملک میں گاندھی جی کے بعد سیاست میں حصہ لینا مسلمانوں کے لئے چیلنج بھی ہے اور آزمائش بھی۔ یہ سیاست میں شرکت کسی حال میں اسلامی تشخص کی قیمت پر نہیں ہونی چاہئے، مثال کے طور پر ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ سیاسی پارٹی میں شرکت کے بعد کوئی مسلم پرسنل لاء کی مخالفت شروع کردے یا دینی مدارس کے خلاف بیانات دینے لگے۔ اول تو ایسی کوئی سیاسی پارٹی صحیح معنوں میں سیکولر نہیں ہوسکتی، دوسرے یہ ایمانی کمزوری کی بات ہوگی اور مداہنت ہوگی اگر کسی سیاسی پارٹی میں شریک ہونے والا مسلمان شخص یا اسمبلی یا پارلیمنٹ کا مسلمان ممبر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بیان دینے لگے، حبشہ کی طرف جن مسلمانوں نے ہجرت کی تھی وہ ہمارے لئے نمونہ ہیں۔

انہوں نے کوئی مداہنت نہیں کی وہ اپنے پورے اسلامی تشخص کے ساتھ وہاں زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے نجاشی کے دربار میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں

ایک سوال کے موقع پر اسلام کا واضح عقیدہ پیش کیا اور عیسائی بادشاہ اور عیسائی اہل دربار کے ابن اللہ کے عقیدے کی ذرا بھی رعایت نہیں کی۔ اسی طرح ہندوستان میں نہ تو پرسنل لاء سے دست بردار ہونا ممکن ہے اور نہ ہی بابری مسجد سے۔ ان تمام مسائل میں برادران وطن کے ذہنوں کو صاف کرنے اور ان کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے ان سے قریبی رابطہ قائم کرنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کو نہ تو بارودوں کی طرح زود مشتعل ہونا چاہئے اور نہ دوسروں کو اشتعال دلانا چاہیے اور نہ ان قائدین پر اعتماد کرنا چاہئے جو اپنی تقریروں میں ہوش کے بجائے صرف جوش سے کام لیتے ہیں۔

ملک کی سیاست میں دیندار لوگوں کو حصہ لینا چاہئے:

حبشہ میں مسلمان عیسائی حکومت کے ماتحت تھے۔ سیرت ابن ہشام کی روایت کے مطابق صحابی حضرت زبیر اپنی کمسنی کے باوجود مسلمانان حبشہ کی طرف نجاشی کے انجام جنگ کا پتہ چلانے کی مہم پر روانہ ہوئے تھے اور پھر یہ خبر دی کہ ''**الا ابشروا فقد ظفر النجاشی واھلک اللہ عدوہ ومکن لہ فی البلاد**'' نجاشی کامیاب ہوا اللہ نے اس کے دشمن کو ہلاک کیا اور اس کو ملک میں اقتدار عطا کیا، حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ہم نجاشی کے دشمن پر فتح اور ملک پر اس کے اقتدار کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ حضور نے مسلمانوں کو فرمایا: ''**انتم فی رباط دائم**'' تم دشمنوں کی بری نیت کی وجہ سے مستقل طور پر سرحد کی نگرانی پر مامور ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے سیاسی اور انتظامی معاملات سے اور حالات کی تمام کروٹوں سے پورے طور پر واقف رہنا ہے کہ مسلمانوں کے بہتر پوزیشن کے لئے دعا اور ابتہال میں مشغول رہنا اور اس کی تدبیر بھی کرنا دین کا تقاضہ ہے۔ عالم بے خبری دین میں کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے اس سے یہ استدلال بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہوشمند قیادت اور وہ دردمند صحافت جو مسلمانوں کو صحیح سیاسی معلومات مہیا کرے اور صحیح

زاویہ عطا کرے وہ دین کی عین خدمت انجام دیتی ہے۔ ایسی قیادت اور ایسی صحافت کی ہمت افزائی ضروری ہے۔ جو لوگ ملی صحات سے نا آشنا رہتے ہیں اور باشعور مسلمانوں کی تحریر نہیں پڑھتے اور معلومات کے لئے صرف نیشنل میڈیا پر انحصار کرتے ہیں ان کی بصیرت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

حبشہ کے مہاجر مسلمان فریضہ تبلیغ سے بھی غافل نہ رہے۔ خود نجاشی نے اسلام قبول کیا اور حضور ﷺ نے اس کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھائی تھی۔ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں ان عیسائیوں کے نام موجود ہیں جنہوں نے حبشہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ بعض روایات میں ان کی تعداد چالیس آئی ہے۔ اس لئے سیاسی پارٹیوں سے مسلمانوں کی وابستگی کو اسلام سے تعارف کا ذریعہ بننا چاہئے۔ اس سے اسلام کے بارے میں برادران وطن کا ذہن صاف ہونا چاہئے اور شبہات کو دور ہونا چاہئے اور انہیں زندہ ضمیر اور غیرت کا حامل ہونا چاہئے ان سیاسی تدبیروں کا اختیار کرنا دور رس افادیت کا حامل ہوسکتا ہے۔ اس لئے بے دین قسم کے لوگوں کے مقابلے میں اہل دین کو سیاست میں حصہ لینا چاہے۔

اتحاد بین المسلمین اور امارت:

ایک بے حد اہم مسئلہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا مسئلہ ہے یہ اتحاد کیسے پیدا ہو۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک لڑنے والی قوم کو ایک مرکز پر جمع کر دیا ان کے درمیان الفت و موانست کا وہ رشتہ پیدا کر دیا تھا، جس کا قرآن مجید میں خاص طور پر تذکرہ موجود ہے "**فالف بین قلوبکم**" اس اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ایک امارت ہو، مکہ اور مدینہ میں آپ خود ملت اسلامیہ کے امیر تھے۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ مسلمان جہاں بھی رہیں وہاں وہ ایک امیر کے ماتحت ہوں اور ان کا ایک اجتماعی نظام ہو۔ امارت کے نظام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ امیر کارواں میں خوئے دلنوازی ہو وہ دلنوازی

جس کا سلیقہ بقول اقبال مسلمان کے لہو میں ہے وہ مروت جو مردان غازی کا حسن عالمگیر ہے۔ تاکہ نہ کسی کا دل ٹوٹے نہ کوئی قافلہ سے چھوٹے نہ اس کی امارت کے دارالافتاء سے کسی اسلامی مسلک کے خلاف کوئی فتویٰ صادر ہو۔ حضور اکرم کی خصوصیت قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ "**عزیز علیہ ماعنتم**" ان کو تمہاری تکلیف اور پریشانی کا احساس رہتا ہے۔ "**حریص علیکم**" وہ تمہارے لئے بے حد فکرمند رہتے ہیں۔ "**بالمؤمنین رؤف رحیم**" وہ مسلمانوں پر بے حد شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔ امیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اوصاف کا حامل ہو، امیر کے لئے ضروری ہے کہ ہر مسلک اور ہر مکتب فکر کو متحد رکھنے کی کوشش کرے اور مسلمانوں کا وہ دینی مزاج بنائے جس میں باہمی مودت و محبت اور ملاطفت ہو ان میں اختلاف نہ پیدا ہوں اور وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ وہ مسلمانوں کے خلاف زیادتی کا تدارک کرے اور ناانصافی اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔ وہ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے منصوبے تیار کرے اور ان منصوبوں کو روبعمل بنائے۔ صحابہ کرام میں بہت بڑی تعداد تجارت پیشہ اور دست کار لوگوں کی تھی، ان میں بہت سے مزدوری کرنے والے بھی تھے، رسول اللہ ﷺ نے محنت اور مزدوری کرنے اور تجارت کرنے پر لوگوں کو آمادہ کیا اور خود تجارت کر کے اس پیشہ کی عزت بڑھائی۔ اس روشنی میں مسلمانوں کی معاشی ترقی کی کوشش بھی ضروری ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ امیر کی اطاعت کریں اور اس کے فیصلے کو قبول کریں، خواہ وہ فیصلہ ان کے لئے پسندیدہ نہ ہو۔ حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ "**اوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعۃ وان تامر علیکم عبدا**" (میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی اور سمع وطاعت کی اگرچہ تم پر ایک غلام ہی کیوں نہ امیر بنایا گیا ہو) امیر کی اطاعت حضور کی وصیت ہے۔ اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان امیر کی اطاعت کریں اور سر پھرے اور آزاد بن کر نہ رہیں۔ اسی طرح سے مسلمانوں کے بعض معاملات کے لئے رہنماؤں کا کوئی مشترکہ پلیٹ فارم بن جائے تو اس کے اوقاف کی حفاظت بھی مسلمانوں کا

فریضہ ہے، کیونکہ یہ مسلمانوں کی اجتماعی قیادت اور امارت ہے۔ جو لوگ اس کے وقار کی دیوار کو غیر ذمہ دارانہ بیانات سے منہدم کرنے کی کوشش کریں، مسلمانوں کے سماج میں ان کی کوئی جگہ نہیں ہونی چاہئے جن لوگوں کی زبان پر تنقید زیادہ دراز ہوتی ہے وہ عام طور پر ناتربیت یافتہ لوگ ہوتے ہیں اور مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے اسے زیادہ بگاڑ دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے ناتربیت یافتہ اہل قلم اور چھوٹے موٹے لیڈروں کی ایک کھیپ پیدا ہوگئی ہے ان کے بیانات سے مسلمانوں کا اتحاد اور وقار مجروح ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے مسائل کا اصل حل جس کی سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے اور وہ شاہ کلید جس سے ہر قفل کھلتا ہے اور فتح یاب ہوتا ہے، سیرت طیبہ میں ملتا ہے، اس لئے سیرت کی کتابوں کے مطالعہ کا اہتمام بہت زیادہ کرنا چاہئے۔ اسی طرح سے مسلمانوں کے مستند اور معتبر علماء کرام کی تحریروں کو جن کو دین میں رسوخ حاصل ہے، اہتمام سے پڑھنا چاہئے اور ان کی بات ماننی چاہئے۔ اصل خرابی یہ ہے کہ دین سے بے خبری اور خود غرضی عام ہے، سزا اور جزا کا خیال دل سے رخصت ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ زبانیں بھی بے لگام ہو چکی ہیں۔ باہمی اعتماد اور محبت کے تیر نیم کش کا فقدان ہے بقول اقبال:

میر سپاہ نا سزا لشکر یاں شکستہ صف
آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

کردار دلبرانہ اور اشتعال انگیز رویہ سے اجتناب:

غیر مسلموں کے درمیان دعوت کا کام ہو یا خود مسلمانوں کے لئے ملک میں سماجی انصاف کا حصول ہو، ہندوستان میں ان دونوں کے لئے غیر فرقہ وارانہ اور خوشگوار فضا درکار ہے۔ اس کے لئے نہ صرف اشتعال انگیزی سے بچنا ضروری ہے، بلکہ دوسروں کے اشتعال دلانے پر مشتعل نہ ہونا بھی ضروری ہے، بلکہ دوسروں کے اشتعال دلانے پر مشتعل نہ ہونا

بھی ضروری ہے، مکی دور میں آپ کے جسم مبارک پر سجدہ کی حالت میں اوجھ ڈالی گئی، لیکن آپ مشتعل نہ ہوئے اور عبادت میں مشغول رہے تمام الزام تراشیوں کو برداشت کرتے رہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں اپنی تصویر بنانی ہوگی کہ وہ بلند ترین اخلاق سچی اور پاکیزہ روحانیت کے ساتھ ساتھ تعلیم، ذہانت طبعی، محنت اور کارکردگی اور فرض شناسی کے اوصاف سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی میں سلیقہ ہوتا ہے، وہ صاف ستھرے لباس میں ملبوس ہوتا ہے، وہ محنتی ہوتا ہے، وہ بہادر اور بے خوف بھی ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ پڑوسی کا ہمدرد، غریبوں کا مددگار اور منصف اور فیاض ہوتا ہے، وہ پاک دل اور پاک زبان ہوتا ہے، اسے اپنی فکر سے زیادہ دوسروں کی فکر ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیتا ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں میں دوسروں سے فائق ہوتا ہے، لوگ اسے کہیں وقت ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ جب تک دنیا میں رہتا ہے محبت سے کام کرتا ہے، ایمان داری سے اپنی روزی کماتا ہے، خدا کی عبادت کرتا ہے اور خدا کے بندوں کی خدمت کرتا ہے۔ وہ جہاں رہتا ہے اپنے بہتر اخلاق سے اور اپنی روحانیت سے روشنی پھیلاتا ہے اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوتا روشن اخلاقی اقدار کی یہ تعلیم ہمیں سیرت طیبہ اور آپ کے فرمودات سے ملتی ہے۔ جب مخالفت کا طوفان امنڈ پڑا ہو، جب نفرت کی آندھیاں اٹھ رہی ہوں، جب مسلمانوں کی دشمنی میں انسان درندے بن جائیں اور اس وقت صرف انصاف کی دہائی دینے سے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے سے، استغاثہ اور مرافعہ پیش کرنے اور ظالم کے خلاف تقریریں کرنے سے اور اخبارات میں تحریریں شائع کرنے سے کام نہیں چلتا۔ ایک اقلیت خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، جب کھلی ہوئی ناانصافی کا شکار ہو جائے، جب اکثریت ظلم اور ناانصافی پر تل جائے اور جارحیت کے لئے تیار ہو جائے تو پھر دستور، قانون، عدالت، سیاسی پارٹی کی بھی پشت پناہی ہو تو ''طوفان نوح'' صرف پانی کے سیلاب کی شکل میں نہیں آتا ہے یہ ظلم کے سیلاب کی شکل میں بھی آتا ہے اور اس وقت پہاڑی کی کوئی چوٹی بھی

تند و تیز موج بلا سے بچا نہیں سکتی ہے۔ اس سیلاب میں اگر کوئی سفینہ ہوتا ہے تو وہ خدا پر ایمان اور حسن عمل کا سفینہ ہوتا ہے جو اس سفینہ کا ربن جاتا ہے اور وہ ڈوبنے سے بچ جاتا ہے۔ خدائی نصرت اس کی پشت پناہ ہوتی ہے، دست غیب سے اس کی دست گیری ہوتی ہے۔ یہ وہ بنیادی صفات ہیں جن کی جانب رہنمائی سیرت طیبہ سے ملتی ہے اور جنہیں ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تمام مسائل کا یہی حل ہے، الجھی ہوئی ڈور کا یہی سرا ہے، آسمانی مدد کے حقدار بننے کا یہی طریقہ ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد مکہ کے کفار و مشرکین جب مدینہ منورہ آنے جانے لگے تو انہیں مسلمانوں کے اخلاق عالیہ کا اندازہ ہوا۔ انہیں معلوم ہوا کہ اسلام نے کیسی کایا پلٹ کر دی ہے، ہر مسلمان کی زندگی روشنی کا مینارہ بن گئی ہے۔ اس طرح اسلام کے بارے میں ان کے خیالات میں انقلابی تبدیلی آئی اور اسلام قبول کرنے والوں کی رفتار تیزی سے بڑھنے لگی۔

یقیں محکم عمل پیہم کے ذریعہ مسلمان صلابت میں اس چٹان کے مانند ہوں گے جس پر سمندر کی موجیں اپنا سر پٹکتی رہتی ہیں اور ''محبت فاتح عالم'' کے ذریعہ اس دلنشیں تیز نگاہ کے مانند ہوں گے جس سے دل مسخر ہو جاتے ہیں۔ گویا ایمان اور حسن عمل وہ کلید ہے جس سے ہر بند دروازہ کھل جاتا ہے۔

☆☆

بارگاہ رسالت میں التجا و التماس

تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں؟

● رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

ہر ہر عضو گرا ہوا تھا، چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے، قسم ہے اس خدائے زندہ و توانا کی جو مردوں سے زندوں کو اور زندوں کو مردوں سے نکالتا ہے کہ ایک سیکنڈ دو سیکنڈ کے لیے بھی بیٹھنے کی آرزو جس سیاہ بخت کے لیے مہینوں سے صرف آرزو بنی ہوئی تھی، بخت کی بیداری کے بعد دیکھا جا رہا تھا کہ اب وہ اٹھ رہا ہے، اٹھتا چلا جا رہا ہے، جس کی موت کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ وہ دوبارہ گویا زندوں میں پھر شریک کر دیا گیا۔ اسپتالوں والوں نے چند ہی دنوں بعد حکم دے دیا کہ اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی پھر آگے کیا قصے پیش آئے ان کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ شعور اور احساس میں ایک خیال کے سوا دوسرا خیال یا ایک جذبہ کے سوا دوسرا کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا۔ اس زمانے میں بہار میں تھا۔ بہار کی دیسی آبادی جو دیہاتوں میں ایک خاص قسم کی زبان بولتی ہے اس زبان میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن التجا و التماس کے لیے اس کا پیرایہ حد سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے، بے ساختہ اسی زبان میں کچھ مصرعے ابلنے لگے، سن کر تو اردو زبان کے سمجھنے والے بھی اس کو شاید سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اردو زبان کے املائے حدود میں مگدھی یا بہاری زبان مروجہ کے ان الفاظ کو لانا دشوار ہے۔ کتابی شکل میں صحیح وطور پر جیسا کہ چاہئے شاید وہ سمجھے بھی نہیں جا سکتے لیکن عرض چونکہ اسی زبان میں کیا گیا تھا بجنسہٖ ان ہی

الفاظ کو (نیچے) نقل کر دیتا ہوں۔ ''درشن'' کی آرزو اس عجیب وغریب اضطراری نظم کی روح تھی، بہار کے نائب امیر شریعت مولانا سجاد مرحوم اگرچہ بہ ظاہر فقیہ النفس والصورت تھے۔ مگر ذاتی تجربہ کے بعد یہ ماننا پڑتا تھا کہ باطن ان کا فقیہ سے زیادہ فقیر تھا۔ قرابت کے تعلقات کی وجہ سے گیلانی بھی کبھی تشریف لاتے تھے اسی زمانہ میں اتفاقاً ان کی تشریف آوری ہوئی، اس نظم کے سننے کا موقعہ ان کو بھی ملا، سنتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ اس بند پر تڑپ تڑپ گئے، ہچکیاں ان کی بندھ گئیں یعنی دوسرا بند:

تمری دواریا کیسے چھوڑوں　　تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں　　تم رے نگر میں دم بھی توڑ دوں
جی کا اب ارمان یہی ہے　　اٹھوں پھر اب دھیان یہی ہے

''تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں'' اس استفہامی مصرعہ کو بار بار دہراتے اور بے قرار ہو ہو کر بلبلاتے اور ہے بھی یہ سوال کچھ اس قسم کا، آج انسانیت زمین کے اس خاکی کرے پر تڑپ رہی ہے۔ زندگی کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال کو حل کرنا چاہتی ہے۔ ایک اس سوال کے جواب کی صحیح توقع کی جائے؟ اس تنہا واحد آستانے سے ٹوٹنے والا خود سوچے کہ کہاں جائے گا۔ کن کے پاس جائے گا۔ موسیٰ ہوں یا عیسیٰ، ابراہیم ہوں یا یعقوب علیہم السلام یا ان کے سوا کوئی اور اس راہ کے ان سب راہبروں نے اپنے اپنے وقتوں میں جو راہ پیش کی تھی جب وہ ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں، تاریخ جانتی ہے کہ ڈھونڈنے والوں کو ان بزرگوں کی بتائی ہوئی راہ نہیں مل سکتی، تو اب دنیا کہاں جائے اور اس کے سوا کہ: جلوۂ ات تعبیر خواب زندگی (اقبالؒ) کا فیصلہ کرتے ہوئے ''تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں'' کہتا ہوا سی چوکھٹ کے ساتھ چمٹ جائے، جس کے سوا غیب تک پہنچنے اور پہنچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہیں ہے۔

پیارے محمدؐ جگ کے سجن　　تم پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن　　کہیو کراہو تو درشن
جیا کنھڑے دلوا ترسے　　کرپا کے بدرا کہیا برسے
تمری دواریا کیسے چھوڑوں　　تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے　　اٹھوں پھر اب دھیان یہی ہے
صلی اللہ علیک نبیا　　تمرے دوارے آیا دکھیا
بھنیا اہکی پکڑھو راجا　　اپنے حسین و حسن کا صدقا
ڈھوا گھریں ناؤ کو اس کے　　اب نہیں ہم ہیں اپنے بس کے
سیس پہ اہکے پاواں دھر ہو　　پیت کی اگیا من میں بھر ہو
بھدر ہوا پہ تنی کرپا کر ہو　　سپنو میں ایسن کر گجر ہو
راجا تمری دیوڑی بڑی ہے　　رحمت تمرے نام پڑی ہے
اندھرا کے تم رہیا بتا ہو　　ہردے کا اِہکے جوت جگا ہو
ڈگری پہ اپنے اہکو چلا ہو　　بودھا کے تم بدھی بنا ہو
کھینچو اہکو پاپ نرکھ سے　　دھو دیہو کالیکھ منہ کا اہکے
تمرے پیا کی اونچی اٹریا　　ہمری نے ہی داں پہ گجریا
بتلا بتلا رہی نجریا　　پکھلئی ہے اک تمری دواریا
ان کھر پتوا تمرے سے چلی ہے　　کھوجوا بھی اُن کا تمرے سے ملی ہے
پی کی پیتا تم ہی لے لہو　　ان کھر بتیا تم ہی سنی لہو
ہمنی کے نندیا سے تم جگے لہو　　مرل تھلبئی تم سے جلے لہو
دھرمی بھے لوں تم ری دیا سے　　مکتی بھی ہوای ہی تمری دووا سے

☆☆

اسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

● حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ

اطلاق قرآنی کی رو سے امت کا یہ جمع وتالیف آیات کا طریقہ نہ صرف جائز ہی ہے بلکہ نبی کریم ﷺ کے اسے کرکے دکھلا دینے کے سبب مسنون اور اسوۂ نبوی بھی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے خود اپنے عمل سے چند مختلف قرآنی کلمات کو یکجا کرکے کلمۂ واحد بنایا اور یہ کہہ کر بنایا ہے کہ یہ کلمات قرآنی ہیں جنہیں یکجا جمع کیا جارہا ہے۔ ذیل کی حدیث اس حقیقت پر کھلی روشنی ڈال رہی ہے:

"وعن ابی الدرداء عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: ان الله اختار من الکلام أربعاً لیس من القرآن وهن من القرآن سبحان الله و الحمد لله ولا الٰه الا الله، والله اکبر. رواه الطبرانی و البزار" (مجمع الزوائد، صفحہ 88، جلد 10)۔

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ اللہ نے پسند فرمالیا ہے کلاموں میں سے چار کلمات کو جو (ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے) قرآن سے نہیں اور (بحیثیت انفرادی) قرآن سے ہیں: "**سبحان الله**" اور "**الحمد للهٔ**" اور "**لا الٰه الا الله**" اور "**الله اکبر**".

اس حدیث سے صاف واضح ہے کہ حضور ﷺ نے یہ چاروں کلمے خود تجویز نہیں فرمائے بلکہ قرآن سے لیے۔ اس لیے فرمایا: "**هن من القرآن**" (یہ چاروں کلمے قرآن سے ہیں) اور

نفی اگر فرمائی تو وہ ان کی ہیئت ترکیبی کے ساتھ قرآن سے ہونے کی فرمائی ہے۔ یعنی یہ مرکب مجموعہ آیت قرآنی نہیں، پس من القرآن کی نفی کا تعلق نہ اجزا کلام سے ہے اور نہ ہی ان اجزاء کے فعل جمع وترتیب سے ہے، جس سے واضح ہوا کہ چند متفرق کلمات قرآنی کو جوڑ کر کلام واحد بنالیا جانا اسوۂ نبوت ہے اور آپ ﷺ نے اسے کرکے دکھلا دیا ہے۔

پس یہ جمع وتالیف آیات کا فعل جہاں اطلاق قرآنی کی رو سے جائز تھا وہاں اسوۂ نبی سے ثابت ہوجانے کے بعد جائز ہی نہیں مسنون بھی نکلتا ہے اور جب کہ آپ ﷺ نے "**ان اللہ اختار**" کا لفظ استعمال فرمایا تو اس سے یہ صنعت مرضی الٰہی اور پسندیدہ خداوندی بھی نکلتی ہے۔

ظاہر ہے کہ کلمہ طیبہ کی صورت اس کلمہ تمجید سے کچھ بھی مختلف نہیں، بلکہ عین اس کے مطابق ہے، یہاں بھی متفرق کلمات قرآن کو قرآن کہہ کر جمع کیا گیا ہے اور کلمۂ طیبہ میں بھی دو آیتوں کو آیت کہہ کر یکجا کرلیا گیا ہے، اس لیے کلمۂ طیبہ کی ہیئت ترکیبی جہاں اطلاق قرآنی کی رو سے جائز ثابت ہوئی تھی وہاں اسوۂ نبوت مل جانے سے وہ مسنون بھی ثابت ہوگئی۔

بلکہ جن احادیث میں کلمۂ طیبہ کی یہ ہیئت ترکیبی وارد ہوئی ہے (جن کی تفصیل آگے آئے گی) وہاں بھی یہی اسوۂ نبی کارفرما ہے، جو یہاں ہے۔ یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے دونوں جملے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تجویز فرمودہ نہیں بلکہ قرآن سے لیے ہوئے ہیں جن کو یکجا کردیا ہے۔

پس حدیث بالا سے تو کلمہ کی ہیئت ترکیبی کا مسنون ہونا قیاس بالمثل کے طور پر ہی ثابت ہوا تھا اور ان احادیث سے کلمہ طیبہ کی جمع وتالیف اور اس کی ہیئت ترکیبی کا عین نص حدیث سے مسنون ہونا واضح ہوگیا، اس لیے کلمۂ طیبہ کے جواز کے لیے اعلیٰ ترین حجت تو اطلاق قرآنی ہے پھر حدیث بالا کی رو سے دوسری حجت قیاس بالمثل ہے اور پھر احادیث محولۂ سطور بالا کی رو سے تیسری حجت حضور ﷺ کی سنت فعلی اور اسوۂ نبوی ہے۔

بہرحال اطلاق قرآنی سے چند متفرق آیتوں کو یکجا کر کے کلمہ واحدہ بنالینا نہ صرف اصولاً ہی جائز قرار پاتا ہے، بلکہ اسی کے ساتھ فعل نبوت بھی ثابت ہوتا ہے اور آپ نے اس اصول پر عمل کر کے امت کے سامنے عملی اسوہ پیش فرمادیا ہے۔ اس اصول ہی کے ماتحت وہ تمام نظیریں عمل میں آئی ہیں جن کی مثالیں ابھی ہم پیش کر چکے ہیں۔ بہرحال جہاں کلمۂ طیبہ کا مادہ نصوص قرآن سے ثابت ہوا وہیں اس کی صورت عمومات اور اطلاقات قرآن سے ثابت ہوئی جس کی پشت پناہی اسوۂ نبوی سے ہورہی ہے۔

☆☆

رحمت للعالمینؐ مثالی رہنما

● ڈاکٹر محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

کتنا نادان ہوگا وہ مریض، جس کے اپنے گھر میں ماہر طبیب موجود ہو، مگر وہ اس طبیب ماہر کو چھوڑ کر ناتجربہ کار عطاروں کا چکر لگا رہا ہو، وہ ان کے الٹے سیدھے نسخے استعمال کر کے خود اپنی موت کو دعوت دے رہا ہو۔ جب کہ اس طبیب حاذق کی چند گولیاں اس کی صحت بحال کرنے کے لیے کافی تھیں!

کتنا بدقسمت ہوگا وہ مسافر، جس کے پاس ایک مخلص، دردمند اور واقف کار رہنما موجود ہو، مگر وہ اس رہنما سے مایوس ہوکر انسانوں کی اس بھیڑ کے پیچھے دوڑ رہا ہو، جسے خود اپنی منزل کا پتہ نہ ہو اور اس طرح وہ ہر لمحے اپنی منزل سے دور ہورہا ہو!

کتنا نادان ہوگا وہ انسان جس کے اپنے گھر میں آب حیات کا چشمہ رواں ہو اور وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے گندے نالوں کی طرف دوڑ رہا ہو!

بدقسمتی سے آج ہماری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے، پوری ملت بیماری وناتوانی کی کیسی تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہے اور اس کے پاس رحمۃ للعالمین کی صورت میں ایک طبیب حاذق موجود ہے، جو اس کی بیماریوں کی صحیح تشخیص کر کے اسے دوبارہ صحت وتوانائی سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ لیکن یہ امت اس طبیب حاذق کو چھوڑ کر در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہے، وہ اپنی بیماری وناتوانی کے علاج کے لیے ایسے لوگوں کے پاس جاتی ہے، جو اس کی بیماری کا علاج تو کیا اسے اور پیچیدہ بنا رہے ہیں۔ وہ اسے طاقت کیا پہنچاتے، اس کی

ناتوانیوں میں اور اضافہ کر رہے ہیں!

آج ہماری ملت کی مثال اس مسافر کی سی ہے، جو اپنی منزل کی طرف پشت کیے بہت تیز بھاگ رہا ہو!

یہ ملت اپنی منزل پر تو پہنچنا چاہتی ہے، لیکن دامن ایسے لوگوں کا پکڑے ہوئے ہے، جو اسے منزل سے ہر لمحہ دور کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ اگر چاہتی تو رحمۃ للعالمینؐ کی شکل میں ایک ایسا مخلص، دردمند اور واقف کار رہنما اس کے پاس موجود تھا جو اسے تمام غلط راستوں سے بچاتا ہوا سیدھے منزل مقصود سے ہم کنار کر سکتا تھا۔

آج ہماری ملت کی مثال اس بدنصیب پیاسے کی ہے، جس کے پڑوس میں آب شیریں کا چشمہ رواں ہے، مگر وہ اس آب شیریں سے سیراب ہونے کے بجائے گندے پانی سے اپنا پیٹ بھر رہا ہے! اس ملت کے صحن میں قرآن پاک کا چشمہ حیات بہہ رہا ہے مگر اس چشمۂ حیات سے سیراب ہونے کے بجائے وہ باطل نظریات اور باطل نظاموں کے گندے نالوں سے اپنے کوزے بھر رہی ہے!

رحمۃ للعالمینؐ کی سیرت کا سب سے ابھرا ہوا پہلو یہ تھا کہ آپ ﷺ بندگان خدا کی ہدایت کے لیے مضطرب رہتے، آپ ﷺ انہیں راہ راست پر لانے کے لیے ہر آن بے قرار رہتے۔

آپ ﷺ کی اس بے قراری کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ ﷺ نے مکے کے ایک ایک فرد کے دروازے پر پہنچ کر اسے قبول حق کی دعوت دی۔ قریش کے سرداروں کو بھی دعوت دی، مکے کے غریبوں اور غلاموں کو بھی دعوت دی، مشرکین کی طرف سے ہر طرح کی مخالفت ہوئی، ہر طرح سے حوصلہ شکنی اور دلآزاری ہوئی، روحانی اور جسمانی ہر طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں، مگر آپ ﷺ مایوس نہ ہوئے، مایوس ہونا تو درکنار، آپ کی درد مندی اور بے قراری بڑھتی ہی گئی۔

یہ آپ ﷺ کی حد سے بڑھی ہوئی بے قراری ہی تھی کہ جب مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ ﷺ کو دوسرے میدانوں کی جستجو ہوئی، اسی ضمن میں آپ ﷺ نے طائف کا تاریخی سفر کیا اور مکہ سے طائف تک جو ملا، اس کے سامنے اپنی دعوت رکھی۔ آپ ﷺ نے ایک ایک دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی، ایک ایک ضمیر کو دستک دی، ایک ایک کان کو اپنی باتیں سنائیں۔

اس سفر میں آپ ﷺ کو کیا کیا اذیتیں نہیں اٹھانی پڑیں، لونڈوں اور اوباشوں سے آپ ﷺ پر پتھراؤ کرایا گیا، آپ ﷺ کا جسم مبارک لہولہان کر دیا گیا مگر اس کے باوجود آپ ﷺ کا عزم جوان رہا آپ کی دل سوزی اور بے قراری بڑھتی ہی گئی۔ آپ ﷺ نے اس کام میں رات دیکھی نہ دن، صحت دیکھی نہ بیماری۔ ہر حال میں یہ کام جاری رکھا اور جس وقت بھی موقع ملا، اس سے فائدہ اٹھایا۔ ع

طائف میں مقدس خوں ٹپکا، مکہ میں کبھی پتھر کھائے
بس ایک تڑپ تھی، کیسی تڑپ؟ انسان ہدایت پا جائے

اور آج ہم مسلمانوں کی کیا کیفیت ہے؟ آج ہمیں اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، ہمارے اندر انسانیت کے لیے کوئی درد اور کوئی تڑپ نہیں رہی۔

آج سارا عالم تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ آج انسانوں کی بہت بھاری اکثریت بے تحاشہ جہنم کی طرف بھاگ رہی ہے، دنیا اپنی بداعمالیوں کی آگ میں جھلس رہی ہے لیکن اس ملت میں، جسے صحیح معنوں میں رحمۃ للعالمین کے درد وسوز کا امین ہونا چاہئے تھا، کوئی ایک آنکھ نہیں، جو ان کے غم میں آنسو بہائے، کوئی ایک دل نہیں، جو ان کی ہدایت کے لیے تڑپ اٹھے، کوئی ایک ہاتھ نہیں، جو انہیں کفر وشرک کی تاریکی سے نکال کر حق کی روشنی میں پہنچائے۔

آج ضرورت تھی کہ اس بھٹکتی ہوئی اور درد وکرب سے کراہتی ہوئی دنیا کو ہم یہ احساس دلاتے کہ تم نے اپنی کامیابی اور ترقی کے سارے نسخے آزما لیے۔ مگر وہ سارے نسخے ناکام

ثابت ہوئے۔اب تم اس شخصیت کی طرف لوٹو، جسے تمہارے خالق نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ جسے تمہارے پیدا کرنے والے نے صرف مسلمانوں کا نہیں، سارے انسانوں کا نبی تھا، اس کی تعلیمات کسی ایک نسل، کسی ایک ملک اور کسی ایک قوم کے لیے نہیں، بلکہ سارے انسانوں کی فلاح اور نجات کی ضامن تھیں اور ہیں اور قیامت تک رہیں گی۔

جس طرح سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ دنیا کے کسی ایک خطے کو روشنی اور حرارت نہیں عطا کرتا۔ وہ بلا امتیاز قوم وملت، بلا امتیاز رنگ ونسل اور بلا امتیاز مشرق ومغرب سب کو حرارت اور روشنی فراہم کرتا ہے۔

جس طرح آسمان پر بادلوں کے قافلے نمودار ہوتے ہیں اور پھر ہندو ہو یا مسلم، سکھ ہو یا عیسائی، یہودی ہو یا مجوسی، وہ سب کے کھیتوں کو سیراب کرتے سب کے باغوں کو شاداب کرتے اور سب کے خرمنوں کو پھلوں اور غلوں سے بھر دیتے۔

جس طرح ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے روح پرور اور حیات بخش جھونکے چلتے ہیں وہ صرف مسلمانوں کو نہیں، اس دھرتی پر بسنے والے سارے انسانوں کو تازگی، توانائی اور ایک نئی زندگی عطا کرتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وما ارسلنک الا رحمة للعالمین ۔''ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر سارے انسانوں کیلئے رحمت بنا کر۔'' (الانبیاء:107)

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

وما ارسلنک الا کافة بشیرا و نذیرا (سبا:28)

''ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر ایک ایک شخص کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر (جو ایمان لائے اسے جنت کی بشارت دو، جو ایمان نہ لائے اسے جہنم سے خبردار کردو)''

یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ اس دنیا میں آئے تو کسی ایک نسل اور ایک طبقے یا کسی

ایک ملک اور ایک قوم کے لوگوں کو نہیں، بلکہ سب کو مخاطب کیا۔ آپ ﷺ نے امیروں کو بھی مخاطب کیا۔ غریبوں کو بھی مخاطب کیا۔ حکمرانوں کو بھی مخاطب کیا، غلاموں کو بھی مخاطب کیا، عربوں کو بھی مخاطب کیا، عجم کو بھی مخاطب کیا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ پر ایمان لانے والے اور آپ کا ساتھ دینے والے، جس طرح عرب کے لوگ تھے اسی طرح روم کے صہیب رومیؓ، ایران کے سلمان فارسیؓ، حبشہ کے بلال حبشیؓ اور نہ جانے کن کن ملکوں اور کن کن نسلوں کے لوگ تھے۔

ضرورت تھی کہ مسلمان دنیا کے سامنے ان سارے پہلوؤں کو واضح کرتے، وہ انہیں بتاتے کہ محمد ﷺ جن کے بارے میں تم شدید غلط فہمی کا شکار ہو اور جنہیں تم خالص مسلمانوں کا نبی کہتے ہو، وہ رحمۃ للعالمین تھے۔ آپ سچ مچ ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ ﷺ جس طرح اہل ایمان پر مہربان تھے، اسی طرح دشمنوں کے بھی قدردان تھے اور ان کے غم میں گھلا کرتے۔ آپ ﷺ ان کی ہدایت اور نجات کے لیے رات ودن اس طرح تڑپتے کہ خود اللہ تعالیٰ کو آپ پر ترس آتا اور قرآن میں بار بار آپ ﷺ کو تسلی دی جاتی۔

آج مسلمانوں نے رحمۃ للعالمین کی دعوت اور تعلیمات کو اپنے اندر محدود کر رکھا ہے، جو انتہائی افسوسناک ہے، یقین مانو، اگر آج رحمۃ للعالمین اس دنیا میں دوبارہ آجائیں تو ملت اسلامیہ کے اس سرد مہری کو دیکھ کر تڑپ اٹھیں اور اگر دوبارہ آپ ﷺ کو اس زمین پر کام کرنے کا موقع مل جائے تو آپ ﷺ مکہ اور مدینہ میں بیٹھنے کے بجائے چین، جاپان، ہندوستان، امریکہ، یوروپ، روس، آسٹریلیا غرض اس عالم کے چپے چپے کو چھان ماریں اور زمین کے ایک ایک خطہ میں حق کی روشنی پھیلانے اور دنیا کو کفر وشرک کی تاریکی سے نکالنے کے لیے رات دن ایک کردیں۔

مگر ظاہر ہے کہ آپ دوبارہ اس دنیا میں آنے سے رہے۔ اب تو یہ کام مسلمانوں کو کرنا

تھا، جو وہ نہیں کر رہے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ یہ کام نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ اپنے غلط رویوں سے دنیا کو رحمۃ للعالمین ﷺ اور آپؐ کے مشن سے بدظن کر رہے ہیں!

آہ! رحمۃ للعالمینؐ نے اس دنیا سے جاتے جاتے انسانوں کو ہدایت و رہنمائی کی جو ذمہ داری ہمارے کاندھوں پر ڈالی تھی آج ہم اس ذمہ داری سے بالکل غافل ہو گئے۔

رحمۃ للعالمینؐ کی سیرت کا ایک دوسرا ابھرا ہوا پہلو یہ تھا کہ آپ ﷺ بہت ہی فراخ دل اور کشادہ ظرف تھے۔ آپ ﷺ کے سینے میں ہمیشہ محبت کا دریا موجزن ہوتا اور اس محبت سے دوست و دشمن سب سیراب ہوتے۔ بڑے سے بڑے دشمن کے لیے کبھی بھی آپ نے انتقام کا جذبہ نہیں رکھا، ہر ایک کے ساتھ ہمیشہ شفقت و دل سوزی کا معاملہ کیا۔

قریش نے رحمۃ للعالمین اور آپ کے ساتھیوں پر کس قدر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ ظلم و بربریت کی کون سی قسم ہے جو انہوں نے نہیں اٹھا رکھی؟ بے رحمی اور سنگ دلی کی کون سی روایت ہے جو انہوں نے نہیں دہرائی؟ وہ آپ ﷺ کی دشمنی میں شرافت اور انسانیت کی ساری حدیں پھاند گئے۔

انہوں نے مکہ میں آپ کا سماجی بائیکاٹ کیا، ماہ دو ماہ نہیں، سال دو سال نہیں، مکمل تین سال تک آپ اور آپ کے ساتھی شعب ابی طالب میں محصور رہے۔ اس وقت انہوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو دانے دانے کے لیے ترسا دیا۔ آپ نے اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے وہ زمانہ کس طور سے گزارا، یہ اللہ کے ہی علم میں ہے۔ درختوں کے پتے کھانے اور سوکھے چمڑے چبانے تک کی نوبت آ گئی۔

پھر ہجرت کے موقع پر انہوں نے ننگی تلواریں لے کر آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ وہ ساری رات گھر کو گھیرے رہے اس انتظار میں کہ آپ ﷺ گھر سے باہر نکلیں اور سب یکبارگی خوں آشام تلواروں کے ساتھ آپ ﷺ پر ٹوٹ پڑیں!

پھر وہ کتنی بار پورے لاؤ لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوئے اور ہر بار ان کی تمنا یہی

رہی کہ آپ ﷺ کے مبارک لہو سے اپنے سینے کی آگ بجھائیں۔

اس پوری تاریخ ظلم و ستم کو سامنے رکھو اور پھر رحمۃ للعالمین کی شان کریمی کا اندازہ لگاؤ۔ جب یہی خون کے پیاسے دشمن فتح مکہ کے موقع پر انتہائی بے بسی کے عالم میں آپ ﷺ کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو رحمۃ للعالمین ان کے ساتھ نہایت فراخ دلی اور کشادہ ظرفی کا معاملہ کرتے ہیں، وہ لوگ جو برسہا برس سے آپ ﷺ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے درپے رہے، آپ ﷺ ان سب کو اپنے دامن شفقت میں لے لیتے ہیں، ان سب کو جاں بخشی کا مژدہ سناتے ہیں، نہایت جاں نواز تبسم کے ساتھ فرماتے ہیں:

''جاؤ تم سب کو معاف کیا جاتا ہے۔'' **(اذھبوا فانتم الطلقاء)**

☆☆

سید المرسلینؐ کے پیغام کی افادیت

● عبدالاحد حقانی

سرور کائنات خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سید المرسلین بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔ آپؐ اللہ کے آخری نبی اور قیامت تک پوری انسانیت کے ہادی و رہبر ہیں۔ آپؐ کو دین کامل عطا کیا گیا۔ اور دین اسلام ہمیشہ کے لیے مکمل ہوگیا۔ یہ ایک کامل و مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ سرور کائناتﷺ کی پیغمبرانہ خصوصیات میں سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت آپؐ کا امام الانبیاء، سید المرسلین اور خاتم النبیین ہونا ہے، آپؐ کی دعوت، آپؐ کی شریعت، آپؐ کا پیغام اور دین اسلام آفاقی اور عالمگیر حیثیت کا حامل ہے۔ آپؐ بنی نوع آدم اور پورے عالم انس و جن کے لیے دائمی نمونۂ عمل بنا کر مبعوث فرمائے گئے۔ آپؐ پر دین مبین کی تکمیل کر دی گئی۔ پوری انسانیت آپؐ کی امت اور آپؐ قیامت تک پوری انسانی کے لیے ہادی اور رہبر اور بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمائے گئے۔ ارشاد ربانی ہے: ''اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (سورہ سبا)

رسول اکرمﷺ کی نبوت و رسالت کی آفاقیت اور عالمگیریت کے حوالے سے ارشاد ربانی ہے: ''کہہ دیجئے، اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔ (سورہ الاعراف) ایک اور مقام پر ارشاد ہوا: ''برکت والا ہے وہ (اللہ) جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندے (محمدؐ) پر نازل کی، تاکہ وہ دنیا جہاں کے

لیے ہوشیار و آگاہ کرنے والا ہو۔'' (سورہ الفرقان)

تکمیل دین کے حوالے سے یہی مضمون مختلف احادیث میں یوں بنیان فرمایا گیا ہے۔

''میں کالے اور گورے (مشرق و مغرب) تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ (مسند احمد بن حنبل)

رسول اللہﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''پہلے ہر نبی خاص اپنی قوموں کی طرف مبعوث کیے جاتے تھے، اور میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔'' (صحیح بخاری)

رسول اللہﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آخری نبی بنا کر پوری انسانیت کی ہدایت و رہبری کے لیے دنیا میں بھیجا۔ آپؐ کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا، نہ کوئی نیا دین آئے گا، نہ کوئی شریعت آئے گی، نہ وحی نازل ہوگی اور نہ اللہ کا پیغام نازل ہوگا۔

دوسری جانب قرآن کریم سے جب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ انبیاء کرامؑ کی بعثت کن حالات میں پیش آئی، اور وہ کیا تقاضے تھے، جن کے پیش نظر دنیا میں مختلف تاریخی ادوار اور اقوام میں انبیائے کرامؑ کو بھیجا گیا، تو واضح طور پر پتا چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں، جن میں انبیائے کرامؑ کو مبعوث فرمایا گیا۔

(۱) کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا ہو اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اس قوم تک نہ پہنچ سکا ہو۔

(۲) نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم کو قوم نے بھلا دیا ہو یا اس میں تحریف کر دی ہو اور اب اس کی پیروی کرنا ناممکن ہوگیا ہو۔

(۳) گزرے ہوئے نبی کے ذریعے مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تبلیغ دین اور شریعت کی تشریح و تعبیر کے لیے مزید کسی نبی کی ضرورت ہو یا نبی کا پیغام اور شریعت نامکمل ہو۔

(۴) ایک نبی کے ساتھ ایک ہی عہد میں ان کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ بھی نبی اکرم ﷺ کی بعثت، ختم نبوت اور تکمیل دین وشریعت کے بعد اب باقی نہیں ہے۔

''ختم نبوت'' اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، یہ شریعت محمدیؐ کی اساس اور بنیاد ہے، رسالت محمدیؐ کا امتیاز اور آپؐ کی نبوت کی اہم اور نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ قرآن و سنت، صحابہؓ وتابعین اور پوری امت کا اس امر پر اجماع ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو ''خاتم النبیین'' بنا کر مبعوث فرمایا گیا، آپؐ پر دین کی تکمیل کردی گئی۔ آپؐ اللہ کے آخری نبی، قرآن، ہدایت وراہ نمائی کا آخری اور ابدی سرچشمہ اور یہ امت آخری امت ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر سلسلۂ نبوت ورسالت کے اختتام کی ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ آپؐ قیامت تک پوری انسانیت کے لیے نجات دہندہ اور ہادی ورہبر بنا کر بھیجے گئے۔ اس حوالے سے ارشاد ربانی ہے: ''اے نبیؐ! ہم نے آپؐ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔'' (سورہ سبا)

دین اسلام کا بنیادی ماخذ، اللہ کی رضا کا سرچشمہ اور دوسرا بڑا ذریعہ ہمارے پاس فرامین نبویؐ اور احادیث مبارکہ ہیں، جن میں آپؐ نے واضح انداز میں عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت کو اجاگر فرما کر اسے دین کی اساس اور شریعت کی بنیاد قرار دیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''نبی اسرائیل کی قیادت وراہ نمائی ان کے انبیاء کیا کرتے تھے، جب کوئی نبی وفات پاجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا، مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔''

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری اور مجھ سے قبل گزرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین وجمیل بنائی، مگر اس کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی، لوگ اس عمارت کے گرد گھومتے،

اس کی خوب صورتی پر اظہار حیرت کرتے، اور کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ (آخری) اینٹ میں ہوں، اور میں خاتم النبیین ہوں (میری آمد اور بعث پر نبوت و رسالت کی عمارت مکمل ہوچکی ہے، اب کوئی جگہ باقی نہیں، جسے پُر کرنے کے لیے کوئی نبی آئے)۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے تحریر فرماتے ہیں ''اب نبوت ورسالت کا اختتام ہوگیا، باب نبوت ورسالت اب بند ہوچکا، دین کی تکمیل ہوچکی، دنیا میں اللہ کا آخری اور ابدی پیغام دعوت محمدیؐ کے ذریعے امت تک پہنچ چکا، معمار قدرت اپنی عمارت میں اس آخری پتھر کو اپنی جگہ رکھ کر اپنی تعمیر پوری کرچکا، درجہ بدرجہ ستاروں کے طلوع کے بعد وہ خورشید انور طلوع ہوا، جس کے لیے غروب نہیں، طرح طرح کی بہاروں کے آنے کے بعد باغ کائنات میں وہ سدا بہار موسم آگیا، جس کے بعد خزاں نہیں۔''

ان ارشادات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانیت کی ہدایت وراہ نمائی کے لیے حضرت آدمؑ سے جو سلسلۂ رشد شروع ہوا تھا وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر مکمل ہوا، آپؐ کے بعد نبوت ورسالت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا اور آپؐ پر دین کی تکمیل کردی گئی اس لئے آپؐ کی عطا کردہ شریعت رشد وہدایت کا ابدی سرچشمہ ہے۔ اسلام دین کامل اور ابدی ضابطۂ حیات ہے، اس کی اتباع ہی دین ودنیا میں کامیابی کی ضمانت اور آخرت میں نجات کی کلید ہے۔ رشد وہدایت کا سلسلہ اور ایمان سے وابستگی درحقیقت عقیدۂ ختم نبوت پر یقین سے وابستہ ہے۔

☆☆

جوہر نایاب

کامیابی کا راز خلق عظیم کی تلوار

● ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وانک لعلیٰ خلق عظیم۔ پھر کس کی مجال ہے جو رسول انور کے حسن اخلاق کو قلمبند کر سکے یہ غلط دعویٰ نہ کسی زبان سے نکلا اور نہ کسی قلم نے اسے صفحہ قرطاس پر رقم کیا۔ حسن اخلاق تو ایک ایسا جوہر ہے جو انسان کو مہذب و باشعور بناتا ہے نیز معاشرہ اور سوسائٹی میں اس سے آراستہ و پیراستہ شخص باعث عزو وقار ہوتا ہے۔ حسن اخلاق ہی بنیادی وجہ تھی کہ رسول کائناتؐ نے اغیار و اعداء کے قلوب پر حکمرانی کی اور بڑی بڑی ظالم و جابر حکومتوں کو سرنگوں کر دیا۔ محسن انسانیتؐ کے اخلاق و کردار لالہ و گل کی طرح رنگین، آبشاروں کی مانند مترنم اور کہکشاں کی طرح روشن و تابناک ہیں، درحقیقت رسولؐ کے ہاتھوں انسانی زندگی کی نشاۃ ثانیہ ہوئی، اور حضورؐ نے صبح درخشاں سے مطلع اخلاق و کردار کو منور کر کے بین الاقوامی تاریخ کا افتتاح فرمایا۔ اگر بچشم تاریخ ان حالات کا مشاہدہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جس دور میں رسول کائنات کا ظہور ہوا وہ ماحول انتہائی پرآشوب تھا، پوری انسانیت بداخلاقی و کرداری میں غوطہ زن تھی، شرک اور بت پرستی کی لعنتوں نے مدنیت کا ستیاناس کر رکھا تھا پورے عالم میں تہذیب اپنی شمعیں گل کر چکی تھی۔ بالادست طبقوں کی عیاشیوں اور نفس پرستیوں نے اخلاقی فضا کو مسموم و مکدر کر دیا تھا۔ انسان بداخلاقی کی ادنیٰ سطح پر گر کر درندوں اور چوپایوں کی مانند جی رہا تھا۔ مگر محسن انسانیتؐ نے ایسی خونخوار قوم کو ایسے زیور سے مزین

کیا جسے اخلاق کہا جاتا ہے اور پھر وہی قوم تہذیب و تمدن کی آئینہ دار بن گئی۔ انسانیت و بشر دوستی کا بول بالا کر دیا اور خاک کے ذروں کو ہم دوش ثریا کر دیا۔ اب آیئے اس ذات مجمع الصفات کے ایک تابندہ پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں جسے قرآن نے خلق عظیم فرمایا۔ اس کے اوصاف حمیدہ کا اندازہ ان واقعات سے بحسن خوبی کیا جا سکتا ہے کہ وہی مکہ جہاں اعداء اسلام تلوار لیے ہوئے آپؐ کے مقابلہ میں کھڑے تھے جب قحط کا زمانہ آتا ہے تو آپ غلہ کی رسد جاری کرتے ہیں اور اس شہر کے غرباء کے لیے پانچ سو اشرفیاں نقد بھجواتے ہیں۔ آپ کی محبت انسانی اور حسن اخلاق کی گواہی بدر کا وہ واقعہ پیش کرتا ہے کہ جب بدر کے قیدیوں کی کراہیں پردہ سماعت سے گزریں تو آنکھوں سے نیند اڑ گئی اور آپؐ اس وقت تک اطمینان سے نہ سوئے جب تک کہ انھیں آرام نہ پہنچا دیا۔ آپؐ کی شان غفور رحمت کا مظاہرہ فتح مکہ کے موقع پر دیکھئے کہ جب آپؐ مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے آپ کے خلاف بیس برس تک لڑنے والے دشمن آپؐ کے سامنے بے بس کھڑے ہوئے ہیں، کوئی دوسرا ہوتا تو ایک ایک واقعہ کا انتقام لیتا، قتل عام کا حکم جاری کرتا اور کشتوں کے پشتے لگائے بغیر نہ ٹلتا، وہ لوگ عرفاً قانوناً اخلاقاً ہر لحاظ سے مجرم تھے۔ مگر اس لمحہ حضورؐ کا بحر عفو و کرم جوش میں آتا ہے اور قریش کے مظالم کی ساری تاریخ پر خط عفو پھیر کر فرماتے ہیں۔ لاتثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء اور ان کی تالیف قلب کے لیے ان کو مال و دولت عطا کرتے ہیں۔ ذلیل و خوار کرنے کے بجائے ان کو ذمہ داریاں سونپتے اور گلے لگاتے ہیں۔ یہ ہیں ہمارے رسولؐ کے اخلاقی اوصاف اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ خدا کی رحمت سے تم ان سے بہ نرمی پیش آتے ہو اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے ہٹ جاتے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے تمہارے پاس تم میں سے خود ایک پیغمبر آیا اس پر تمہاری تکلیف شاق گزرتی ہے، وہ تمہاری بھلائی کا خواہاں رہتا ہے، اہل ایمان پر نہایت رحم دل اور مہربان ہے۔ انسان کے حالات کا واقف کار بیوی سے بڑھ کر دنیا میں کون ہو سکتا ہے

حضرت خدیجہؓ جو قبل از نبوت اور نبوت کے بعد پچیس برس تک آپؐ کی خدمت زوجیت میں رہی تھیں آپ کے اخلاق وعادات کے دفتر کے ایک ایک حرف سے واقف ہیں زمانہ آغاز وحی آپؐ کو ان الفاظ میں تسلی دیتی ہیں ہرگز نہیں خدا کی قسم خدا آپؐ کو کبھی غمگین نہ کریگا آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں غریبوں کی اعانت کرتے ہیں مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں۔ حق کی حمایت کرتے ہیں مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ حضرت انسؓ حضرت ہند بن ابی ہالہؓ وغیرہ جو مدتوں آپؐ کی خدمت میں رہے ان سب کا متفقہ بیان ہے کہ آپؐ نہایت نرم مزاج اور خوش اخلاق اور نیک سیرت تھے۔ آپ کا چہرہ ہنستا تھا۔ وقار ومتانت سے گفتگو فرماتے تھے کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک یہودی رہتا تھا جس سے میں قرض لیا کرتا تھا۔ ایک سال اتفاق سے کھجوریں نہیں پھلیں اور قرض ادا نہ ہوسکا اس پر پورا سال گزر گیا۔ بہار آئی تو یہودی نے تقاضا شروع کیا اب کی بھی پھل کم آئے۔ میں نے آئندہ فصل کی مہلت مانگی اس نے انکار کیا، میں نے آنحضرت ﷺ سے آکر تمام واقعات بیان کئے۔ آپؐ چند صحابہ کے ساتھ یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور سمجھایا کہ مہلت دیدو اس نے کہا کہ ابوالقاسم میں کبھی مہلت نہ دونگا۔ آپؐ نخلستان میں تشریف لے گئے اور چکر لگا کر پھر یہودی کے پاس آئے، اور اس سے گفتگو کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ بالاخر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ چبوترے پر (جو مسقّف تھا) بچھادو اس پر آرام فرمایا اور سو گئے۔ سوکر بیدار ہوئے تو پھر یہودی سے خواہش ظاہر کی کہ مہلت دیدے اس شخص نے اب بھی نہ مانا۔ آپؐ درختوں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہوگئے۔ اور جابر سے کہا کہ کھجوریں توڑنی شروع کرو۔ آنحضرت کی برکت سے اتنی کھجوریں نکلیں کہ یہودی کا قرض ادا کرنے کے بعد بھی بچ رہیں۔ ایک دفعہ ایک فرد نے باریابی کی اجازت چاہی آپؐ نے فرمایا اچھا آنے دو وہ اس قبیلے کا اچھا آدمی نہیں ہے۔ لیکن جب وہ خدمت مبارک میں حاضر ہوا تو نہایت خندہ

پیشانی اور نرمی کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی حضرت عائشہ کو اس پر تعجب ہوا۔ اور آپ سے دریافت کیا کہ آپ تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے پھر اس لطف ونرم خوئی کا کیا معنی؟ آپؐ نے فرمایا خدا کے نزدیک سب سے برا وہ شخص ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ آپؐ کے اخلاق کریمانہ اور محبت انسانی وہمدردی کا اندازہ ان اڑیل اور بے رحم دشمنوں کے ساتھ کئے گئے آپؐ کے حسن سلوک اور رواداری سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ البدایہ والنہایہ میں منقول ہے: عبداللہ بن ابی امیہ نے کہا اللہ کی قسم میں آپؐ پر ایمان نہیں لاؤں گا حتیٰ کہ آپ زمین سے آسمان تک ایک سیڑھی لگا کر آسمانوں میں چڑھ جائیں اور میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا رہوں پھر آپ آسمان سے ایک دستاویز اور چار فرشتوں کو ساتھ لے کر آئیں اور وہ فرشتے اس بات کی گواہی دیں کہ بے شک اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ پھر بھی آپؐ پر ایمان نہیں لاؤں گا۔ اتنا بڑا کریہ الخیالات ہٹ دھرم دشمن ہے مگر جب اس نے فتح مکہ کے موقع پر دوران سفر اسلام لانے کی خواہش ظاہر کی تو آپؐ نے پچھلی ساری باتوں کو بھلا دیا اور ان کی ہر غلطی معاف کردی۔ یہ ہیں ہمارے پیغمبرؐ کے اخلاق وکردار کے وہ نمونے جنہیں آج ہر مسلمان اپنالے تو مسلم معاشرہ ایسا پاکیزہ ہوجائے کہ غیروں کے لیے باعث رشک اور مسلمانوں کے لیے قابل صد افتخار بن جائے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ ایک یہودی عورت نے حضور اکرمؐ کی خدمت میں زہر آلود بکری کا گوشت پیش کیا اس عورت کے بارے میں حضورؐ سے عرض کیا گیا کہ اس عورت کو قتل کردیا جائے۔ آپ نے فرمایا قتل کرنا میری رحمت کے منافی ہے۔ اسد الغابہ میں ایک واقعہ لکھا ہے: عبداللہ بن شہاب نے پتھر مار کر آپؐ کے رخسار مبارک اور جبین نور کو زخمی کردیا تھا۔ لیکن جب وہ بعد میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو حضورؐ نے اس سے کوئی بدلہ نہیں لیا بلکہ اسے معاف کردیا۔ پھر اس نے اسلام قبول کرلیا اور حالت اسلام میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ ان تمام ثبوت وشواہد کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام کی سیرت کا ہر پہلو صاف وشفاف ہے کبھی بھی آپؐ

نے اپنا بدلہ لینے کی سعی نہ کی بلکہ ہر جرم اور خطا کو باران رحمت سے دھو دیا، جس قدر آپؐ نرم دل اور انسانیت کے لیے محسن وشفیق ہیں، وہ دنیا کی نظروں سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، دنیا کے تمام معاندین کے لیے یہ چیلنج ہے کہ انھوں نے تعصب کی وجہ سے رسول کریمؐ کے کریمانہ اخلاق کو داغدار کرنے کی ناکام سعی، کی کیا انھوں نے تاریخ کے ان بیّن ثبوتوں کو نہیں پڑھا جو اس بات پر دال ہیں کہ آپؐ کی تریسٹھ سالہ زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملے گا جو انسانیت نوازی کے مخالف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے سخت ترین دشمن بغض وعناد اور عداوت کے شعلے بھڑکنے کی حالت میں بھی آپؐ کی مجلس میں آئے تو ان کی کایا پلٹ جاتی اور عداوت کے بھڑکتے ہوئے شعلے محبت کے آنسوں سے ماند پڑ جاتے تھے۔ ایسا کردار رسول کریمؐ کو مرحمت فرمایا جو انسانی طبیعتوں کے لیے پرکشش ہے، اسی بناء پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ تمام انبیاء اکرام میں ان محاسن اخلاق کا ہونا از حد ضروری تھا کیونکہ ان کا کام تزکیہ نفس اور انسانیت کو معراج انسانیت سے ہمکنار کرنا تھا اگر خود انھی کے اندر یہ صفات اور خوبیاں نہ ہوتیں تو ان پڑھ اور جاہل قوموں کو کس طرح راہ راست پر لاتے۔ آج ہم ہر قدم پر ذلیل وخوار ہو رہے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اخلاق وکردار گھناؤنے ہیں۔ اخلاقی روح مسلم معاشرہ سے مفقود ہوگئی۔ ہمارا کردار اپنی سطح سے گرتا جا رہا ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تمام شعبہ ہائے زندگی میں رسول پاک کی سیرت وکردار سے رشتہ مضبوط کریں۔ اسی میں ہماری دنیا وآخرت کی فلاح وصلاح کا راز مضمر ہے۔ جب تک ہم اپنے افعال واعمال اور اخلاق وکردار کو پاکیزہ نہیں بنائیں گے۔ اس وقت ہم مایوس ونامراد پھرتے رہیں گے۔

☆☆

رسول پاک ﷺ اور شہری منصوبہ بندی

● ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

محمد رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں اسلام کی دعوت وتبلیغ شروع کی تو ان کو مشرکین مکہ کی طرف سے غیر معمولی مخالفت اور اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ مکہ کی سرزمین جب دعوت اسلام کے لئے تنگ ہوگئی تو آپ کے ساتھیوں نے پہلے حبشہ ہجرت کی پھر مدینہ ہجرت کی۔ مدینہ ہجرت کرنے سے پہلے آپ ﷺ نے دعا مانگی "رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا (بنی اسرائیل:) (اے میرے رب تو مجھے جہاں لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے)۔

دعا کرنے کے ساتھ آپ ﷺ نے ضروری تدبیریں بھی اختیار کیں، مثلاً حج کے موسم میں مدینہ کے جو قبائل مکہ آتے تھے آپ ان سے ملاقاتیں کرتے اور ان کو اپنی دعوت پہنچاتے۔ اس طرح کی ملاقاتیں مکہ کی گھاٹی عقبہ میں ہوئیں، ان دعوتی ملاقاتوں میں مدینہ کے مشہور قبائل اوس اور خزرج کے ممتاز لوگوں نے آپ سے بیعت کر لی۔ پہلی بیعت عقبہ میں ۱۲ اور دوسری بیعت عقبہ میں ۷۳ لوگوں نے حصہ لیا۔[۱] آپ نے ان کے ساتھ اپنے صحابی حضرت مصعب بن عمیر کو اپنا نمائندہ بنا کر مدینہ بھیجا جو ان کی تعلیم وتربیت کرتے اور دعوت اسلام کے لئے زمین ہموار کرتے[۲] اس طرح جب مدینہ کی فضا دین کی دعوت اور آپؐ کے ساتھیوں کے لئے ہموار ہوگئی تو آپؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور وہاں جا کر اسلام

کی دعوت کی توسیع اور اسلامی ریاست کی تشکیل فرمائی۔

ہجرت کے لئے مدینہ منورہ کا انتخاب رسول پاک نے ایک تو اس وجہ سے فرمایا کہ وہاں آپ کے ننہالی رشتہ دار قبیلہ بنونجار میں موجود تھے، آپؐ کو ان کی حمایت حاصل ہوسکتی تھی۔

دوسرے آپؐ کو خوش آمدید کہنے کے لئے بیعت عقبہ کے نتیجہ میں انصار موجود تھے۔

تیسرے مدینہ ایک ایسی جگہ واقع تھا جہاں سے مکہ کی تجارتی شاہراہ گزرتی تھی اور مکہ کے لوگوں کا انحصار اسی تجارت پر تھا، یہاں سے بسہولت ان کی آمد و رفت پر نظر رکھی جاسکتی تھی اور ان کی معاشی ناکہ بندی کی جاسکتی تھی۔

چوتھے یہ کہ مکہ میں قریش کی طرح کوئی ایسا سربرآوردہ مذہبی قبیلہ موجود نہیں تھا جو آپؐ کی مخالفت کو زندگی کا نصب العین بنا چکا ہو، اوس و خزرج کے زور آور قبائل باہم لڑتے ہوئے اس حد تک تھک چکے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت بآسانی قبول کرسکتے تھے۔

پانچویں یہ کہ مدینہ جغرافیائی لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل تھا کہ وہاں بہتر دفاعی حکمت عمل تیار کی جاسکتی تھی اور اسلام کو درپیش خطرات کا تدارک کیا جاسکتا تھا۔

مدینہ کو جنگی اور جغرافیائی نقطۂ نظر سے ایک مستحکم قلعہ کی حیثیت حاصل تھی۔

جزیرۃ العرب کا کوئی اور قریبی شہر اس معاملہ میں اس کا ہم سر نہ تھا، حرۃ الوبرہ مغربی جانب سے مدینہ کو اپنی حفاظت میں لئے ہوا تھا، حرۃ واقم مشرقی سمت سے اس کو گھیرے ہوئے تھا، مدینہ کا شمالی حصہ واحد راستہ تھا جو کسی پیش قدمی کے لئے کھلا تھا۔''[۳]

ہجرت سے پہلے مدینہ کا نام یثرب تھا، قرآن کی سورہ احزاب میں مدینہ کو اسی نام سے پکارا گیا ہے۔ ''**یا اهل یثرب لا مقام لکم فارجعوا.**''[۴] رسول پاک ﷺ نے یثرب کا نام مدینہ رکھا، جس کے معنی شہر کے ہیں اور بعد میں یہ مدینۃ الرسول یا مدینہ منورہ کہلایا، اسے طیبہ، طحا اور دارالہجرۃ جیسے متعدد ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔[۵] یہ کوئی دس

میل لمبے اور اتنے ہی چوڑے میدانی حصہ پر مشتمل تھا، بیچ بیچ میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی تھیں جن میں سلع کا پہاڑ مشہور ہے، اسی کے میدانی حصہ پر عرب اور یہودی قبائل کی منتشر بستیاں اور باغات قائم تھے۔[۶]

مدینہ کی غالب آبادی اوس و خزرج جیسے مشہور قبائل کے ساتھ یہودی قبائل جیسے بنی قریضہ، بنی نظیر اور بنی قینقاع وغیرہ پر مشتمل تھی۔ مدینہ کی آبادی کا ذریعہ معاش باغبانی، غلہ بانی، تجارت اور اسلحہ کی صنعت تھی، مدینہ کی اصل آبادی کا پیشہ تو کھجور، انار، انگور، غلوں، سبزیوں اور پھلوں کی کاشتکاری تھی، اس کے ساتھ اونٹ، گائے، بکری وغیرہ کو پالنا بھی ان کا وظیفہ زندگی تھا، جبکہ تجارت اور صنعت پر یہودی قبائل قابض تھے اور ان کے باغات بھی تھے۔

یہود تجارت ہی نہیں کرتے، بلکہ سودی کاروبار بھی کرتے تھے، اسی کے ساتھ اسلحہ کی صنعت اور سونے چاندی کے زیورات کی صنعت گری بھی ان کے پاس تھی، مدینہ کا مشہور بازار قینقاع جو کپڑوں اور سونے چاندی کی تجارت کے لئے مشہور تھا ان ہی کے محلّہ میں تھا، تجارت اور صنعت اور سودی کاروبار کی وجہ سے زراعت اور غلہ بانی کرنے والے قبائل پر ان کو معاشی سماجی اور سیاسی برتری اس طرح حاصل ہوگئی تھی جس طرح ہندوستان میں بنیوں، مارواڑیوں اور سندھیوں کو حاصل ہے، یہود ان کاشتکاروں کا استحصال کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم'' کی سورہ النساء'' میں یہود کی سودی اور استحصالی ذہنیت پر تنقید کی گئی ہے۔ ''**واخذهم الربوا وقد نهو عنه، وأكلهم أموال الناس بالباطل.**[۷] وہ منع کرنے کے باوجود سود لیتے تھے اور لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے۔

مدینہ میں ان قبائل کے مکانات شمال میں جبل ثور سے لے کر جنوب میں جبل عسیر تک فاصلہ سے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے اعلیٰ حصہ میں یہودی آباد تھے اور نشیبی حصہ میں یثرب کے باشندے آباد تھے۔[۸] یہ مکانات عمومی نوعیت کے تھے، البتہ یہودیوں کے مکانات نسبتاً

اعلیٰ قسم کے محلات، قلعوں اور گڑھیوں پر مشتمل تھے جن کو اطام اور آجام کہا جاتا ہے۔ مشہور سیرت نگار ''نورالدین سمہودی'' نے یہودیوں کے ۵۹ قلعوں کا تذکرہ کیا ہے[۹] ان قلعوں میں اسباب زندگی کے ساتھ کنواں، مدافعت کے سامان بھی ہوتے تھے، تجارتی قافلے بھی انہیں قلعوں کے باہر آ کر رکتے تھے اور وہیں کاروبار اور لین دین بھی ہوتا تھا۔

رسول اللہؐ کی ہجرت کے وقت مدینہ کی آبادی دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن میں مسلمان صرف پانچ سو تھے، مدینہ پہنچنے پر ان مسلمانوں نے رسول پاک ﷺ کا استقبال کیا تھا[۱۰] جو لوگ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ گئے تھے ان کو وہاں سے نکال باہر کرنے کے لئے قریش مکہ کی دھمکیاں مدینہ کے سربرآوردہ لوگوں کو برابر موصول ہو رہی تھیں، رسول اللہؐ مدینہ کو اسلام کا مرکز یا دارالسلطنت بنانا چاہتے تھے مگر، ان کے سامنے کئی مسائل کھڑے تھے جن کو رسول پاک ﷺ نے اپنی ہمت، حکمت، دوراندیشی اور منصوبہ بندی سے حل کیا اور دنیا کے سامنے دعوت اور ریاست کی تشکیل کی ایک قابل تقلید مثال قائم کر دی۔ رسول پاک ﷺ کے پیش نظر حسب ذیل چیزیں مدینہ کی شہری منصوبہ بندی کے لحاظ سے اہمیت کی حامل تھیں۔

(۱) مدینہ میں مہاجرین کے قدم جمانا

(۲) مدینہ میں مسلم آبادی کو قابل لحاظ بنا کر دارالاسلام بنانا۔

(۳) مدینہ کے باشندوں میں امن واعتماد پیدا کرنا اور آس پاس کی آبادی کو اس میں شامل کرنا۔

(۴) بیرونی حملہ آوروں سے مدینہ کا دفاع کرنا۔

(۵) مدینہ کو اسٹیٹ سٹی اور مثالی شہر بنانا۔

رسول پاک ﷺ نے مدینہ پہنچ کر اوس وخزرج دونوں متحارب قبائل کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے کر ان کو باہم متحد کیا اور جو مہاجرین مکہ سے گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے تھے ان کو

بسانے کا انتظام کیا، اگر آج کسی شہر میں بڑی تعداد میں پناہ گزین آ جائیں تو بہت سے سماجی اور معاشی مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور آج دنیا کے لئے مہاجرین کا مسئلہ دشوار مسائل میں شمار ہوتا ہے، مگر رسول پاک ﷺ کی منصوبہ بندی کے سبب یہ مسئلہ اس آسانی سے حل ہوا کہ وہ بجائے خود ایک نمونہ ہے۔ ہوا یہ کہ آپ نے ہر ایک مہاجر کو ایک انصار کا بھائی قرار دے کر اس کے خاندان کا ممبر بنا دیا، اس طرح نہ تو مہاجرین کے کیمپ بنانے پڑے اور نہ الگ سے مہاجر بستی آباد کرنی پڑی، بلکہ انصار کے درمیان ان کے گھروں اور افتادہ زمینوں میں آباد ہو گئے اور مہاجر وانصار خوشی خوشی ایک ساتھ رہ کر اسلامی معاشرہ کی تشکیل کا حصہ بن گئے۔ اس مواخاۃ میں ۹۰ انصار اور مہاجر شریک تھے[۱۱]

مسلمانوں کو باہم متحد اور مربوط کرنے کے ساتھ آپ نے مدینہ کے باشندوں کا ایک وفاق قائم کیا اور ایک میثاق تیار کیا جس میں مذہبی آزادی، مل جل کر رہنے، ایک دوسرے کی مدد کرنے اور بیرونی حملہ آوروں کا مل کر مقابلہ کرنے کو خاص اہمیت دی گئی تھی، یہ معاہدہ میثاق مدینہ کے نام سے معروف ہے جو تقریباً ۵۲ دفعات پر مشتمل ہے[۱۲] اس معاہدے میں مدینہ کے بیشتر قبائل شریک تھے۔ اس طرح آپ نے مدینہ شہر میں امن وامان اور داخلی استحکام کو یقینی بنا لیا اور ایک شہری مملکت City State کی بنیاد ڈالی، ڈاکٹر حمید اللہؒ کے بقول ''رسول کریم ﷺ نے خود ایک مملکت قائم کی اور اس ملک میں جہاں ہمیشہ سے نراج سا چلا آ رہا تھا ایک مرکزیت اور ایک تنظیم پیدا کی اور عربوں کو خانہ جنگیوں کے ذریعہ سے اپنی توانائیوں کو ضائع کرنے سے روک کر انہیں اپنے زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی فاتح اور نوآبادکار قوم بنا دیا اور ان کے ذہنوں سے احساس کمتری کو کلی طور پر دور کر کے ان میں وہ جوش اور جذبہ بھر دیا جسے احساس برتری یا احساس خودشناسی کہا جا سکتا ہے اور جو کسی ترقی پذیر قوم کے لئے اس قدر ضروری ہوتی ہے۔''[۱۳]

آپ نے شہر مدینہ کے حدود کا بھی تعین کیا مشرق اور مغرب میں لاوے کی پہاڑیاں

اورحرہ کا میدان شمال میں جبل ثور اور جنوب میں جبل عیر مدینہ کی حدود اربعہ قرار پائے۔۱۴ رسول پاک ﷺ نے مکہ کی طرح مدینہ کو بھی حرم قرار دیا۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ ''**المدینة حرم مابین عیر وثور**''۱۵ مدینہ عیر سے ثور تک حرم ہے۔ جبل ثور احد کے پیچھے ہے اور جبلِ عیر ذی الحلیفہ کی میقات کے پاس مکہ کی طرف ہے۔۱۶ آپ نے آس پاس کے قبائل کو اس وفاق میں شامل ہونے کی دعوت دی، تاکہ دشمن اگر اس شہر پر حملہ آور ہوں تو ان کے خلاف یہ قبائل دفاع اور اطلاع کے نقطہ نظر سے مددگار بن سکیں، اس مقصد کے لئے آپ نے ساحلی علاقوں، مثلاً ینبوع وغیرہ کا دورہ بھی کیا، اسی کے ساتھ آپ نے آس پاس کے قبائل کو اسلام کی دعوت دی اور تبلیغی وفود بھیجے۔

جن آبادیوں کے لوگ منتشر طور پر ایمان لاتے یا چھوٹی آبادی ہوتی تو ان کو مدینہ میں لاکر بسایا جاتا۔ ان کی تعلیم وتربیت اور معاشی ضرورت کا انتظام کیا جاتا۔ اس طرح مدینہ کی مسلم آبادی تیزی سے بڑھنے لگی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۲ھ میں جب رسول پاک ﷺ نے جنگی مہم کے لئے مسلمانوں کی مردم شماری کرائی تو ان کی تعداد کوئی ۱۵ سو تھی ۱۷ اس طرح ہر سال مدینہ میں مسلمانوں کا جماؤ بڑھتا رہا اور مدینہ فطری رفتار سے شہری مملکت کی شکل اختیار کرتا رہا، ابتدا میں ہجرت مدینہ ایمان کا لازمی حصہ قرار دی گئی ، چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا۔ ''**والذین آمنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شی حتی یھاجروا**. (الانفال:۷۲)

اسلام قبول کرنے والوں کو مدینہ میں لاکر بسانے سے رسول اللہؐ کے پیش نظر چار مقاصد تھے:

اول تو یہ کہ اسلام قبول کرنے والوں کے سامنے کوئی ایسا چیلنج نہ رہنے دیا جائے کہ وہاں کی غالب مشرک آبادی دھونس ودھاندلی سے یا ڈر وخوف پیدا کرکے یا لالچ دے کر ان کو اسلام سے مرتد کردے۔

دوسرے یہ کہ مدینہ میں لاکر نومسلموں کی تعلیم وتربیت کا مؤثر انتظام کیا جائے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی اعتقادی اور عملی تعلیم کے علاوہ رسول اللہ کی صحبت وقربت سے ان کا تزکیہ ہو۔

تیسرے یہ کہ دیہاتی زندگی میں مزاج کی سختی، اخلاق کی پستی، اجڈ پن اور بود وباش میں جو گنوار پن راہ پاجاتی ہے شہر میں لاکر ان کی اصلاح کی جائے اور ایک قومی، بلکہ بین الاقوامی شہریت کے لئے مزاج بنایا جائے۔ چنانچہ ایک موقع پر رسول پاک ﷺ نے قریش، انصاری، ثقفی اور روسی جیسے متمدن قبائل کے علاوہ دیہاتیوں کا ہدیہ قبول کرنے سے انکار فرمایا تھا۱۸ علامہ ابن کثیر نے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

یہ لوگ مکہ، مدینہ اور یمن جیسے شہروں کے رہنے والے تھے، اس لئے ان کے اخلاق بدوؤں کے مقابلے میں نرم تھے کیونکہ بدوؤں کی طبیعت میں سختی ہوتی ہے۱۹ خود رسول پاک ﷺ نے فرمایا: ''**من سکن البادیة جفا**''۲۰ جس نے بدوی رہائش اختیار کی اس نے زیادتی کی، ابوعبید القاسم بن سلام نے لکھا ہے کہ دیہاتیوں کو فئے کے مال سے اس طرح مقررہ وظائف نہیں ملیں گے جیسے ان شہری باشندوں کو ملیں گے جو مسلمانوں کے معاملات میں شریک رہتے اور اپنی جانوں اور مالوں سے دشمنان اسلام کے مقابلہ میں مدد کرتے یا خود اپنی رہائش سے اسلامی آبادی کو بڑھاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا علم رکھتے ہیں، حدود نافذ کرنے میں مددگار ہوتے ہیں، عیدین وجمعہ میں شریک ہوتے ہیں اور خیر کی تعلیم میں حصہ لیتے ہیں ان سب امور کی انجام دہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے شہری آبادی کو دیہاتی آبادی پر خصوصیت بخشی ہے۔۲۱

چوتھے یہ کہ مدینہ میں اس طرح آبادی کا تناسب قائم کردیا جائے کہ نسلی تصادم یا داخلی وخارجی ٹکراؤ کا امکان باقی نہ رہے۔ اور پانچویں یہ کہ مسلم آبادی کا ارتکاز مدینہ میں کرکے کفار مکہ کے ممکنہ حملوں کا سدباب ممکن ہوسکے، رسول پاک ﷺ کی یہ منصوبہ بندی پورے

طور پر کامیاب رہی اور آپ نے نہ صرف مدینہ کے اندر مہاجرین کو آباد کر دیا، بلکہ مدینہ کے مضافاتی علاقوں میں بھی نومسلم کالونیاں آباد کر دیں۔ اس طرح اندرونی اور بیرونی دونوں خطرات کا سدباب ممکن ہوسکا۔

سیرت نگار لکھتے ہیں کہ جب کسی قبیلہ کا وفد مدینہ آکر اسلام قبول کرنے کا اظہار کرتا تو آنحضرت ﷺ ان لوگوں کو مدینہ آنے کی ہدایت فرماتے۔ اسی طرح جب کبھی دورہ کرنے والے مبلغ بھیجے جاتے تو ان کو سمجھا دیا جاتا کہ نومسلموں سے کہہ دیں کہ وہ مدینہ جائیں جہاں ان کے لئے روزگار کا انتظام کیا جائے گا، یہ لوگ زیادہ تر قابل کاشت افتادہ زمینوں اور بعض صورتوں میں معدنیات کی کانوں میں کام کر کے اپنی گزر بسر کا انتظام کر لیتے تھے۔۲۲

حضرت بریدہ روایت کرتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ جب کسی علاقہ میں فوجی دستہ روانہ کرتے تو لشکر کے امیر کو خدا کا خوف اور ایفاء عہد اور انصاف وغیرہ کی نصیحت کرنے کے ساتھ یہ بھی حکم فرماتے کہ کفار کو پہلے اسلام کی دعوت دی جائے اگر وہ اسے قبول کر لیں تو جنگ نہ کی جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کر دارالہجرہ، یعنی مدینہ منتقل ہوجائیں، اگر وہ اس پر آمادہ ہوجائیں تو ان کو بتا دیا جائے کہ ان کے حقوق وفرائض مہاجرین کی طرح ہوں گے۔۲۳

مدینہ کی آب وہوا مہاجرین کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہ تھی، حضرت ابوبکر اور حضرت بلال جیسے بہت سے مہاجر صحابہ بخار اور دوسرے موسمی امراض میں مبتلا ہوئے۔۲۴ خطرہ تھا کہ مدینہ میں مسلم آبادکاری کا منصوبہ کہیں مشکل میں نہ پڑ جائے اور ایسا ہوا بھی کہ بہت سے دیہاتی جنہوں نے مدینہ آکر حضور ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا وہ بیماری وآزاری کا شکا ہوکر مرتد ہوگئے، چنانچہ ایک شخص نے جب رسول پاک ﷺ سے بیعت کر لی اور اس کے بعد بخار میں مبتلا ہوگیا تو اس نے حضور سے بیعت توڑنے کی درخواست کی جب حضور نے انہیں منع فرما دیا تو وہ مدینہ سے بھاگ گیا، آپ نے اس موقع پر فرمایا: ''أنما المدينه

كالكير تنفى خبثها وتنضع طيبها.'' ۲۵ مدینہ ایک بھٹی کی طرح ہے جو گندگی کو نکال دیتی ہے اور پاکیزگی کو صیقل کر دیتی ہے، اسی طرح اہل عکل اور عرینہ کے مدینہ میں بیمار ہونے اور مرتد ہونے کے واقعات سیرت کی کتابوں میں بہت مشہور ہیں ۲۶ اس خطرہ سے نمٹنے کے لئے جہاں رسول پاک ﷺ نے حفاظتی تدابیر اختیار کیں وہاں مسلمانوں کو صبر اور تحمل اور برداشت کی بھی خصوصی تعلیم دی، آپ نے فرمایا:

''من صبر على لاوائها وشدتها كنت له شهيدا او شفيعا يوم القيمة'' ۲۷

(جو شخص مدینہ کی حرارت اور شدت پر صبر کرے گا میں قیامت کے دن اس کے لئے نجات کی سفارش کروں گا)۔

نیز رسول پاک نے مدینہ میں وفات پانے اور وہاں دفن کئے جانے کو بھی باعث فضیلت قرار دیا، تاکہ لوگ مدینہ سے واپس جانے کا خیال ترک کر دیں۔ آپ نے فرمایا:

''من استطاع ان يموت بالمدينة فليمت بها فمن فات بالمدينة كنت له شفيعا يوم القيمة'' ۲۸

(جو مدینہ میں وفات پاسکتا ہو اسے مدینہ میں وفات پانا چاہئے اور جو شخص مدینہ میں وفات پائے گا قیامت کے دن میں اس کا سفارشی ہوں گا)۔

اسی کے ساتھ رسول پاک ﷺ نے مدینہ سے محبت کرنے اور اس میں برکت عطا کرنے کی خصوصی دعائیں اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگیں:

''اللهم حبب الينا المدينه كحبنا مكة أو أشد، اللهم بارك لنا فى صاعنا وفى مدنا وصححها لنا وانقل حما الى جحفة'' ۲۹

(اے اللہ ہمیں مکہ کی محبت کی طرح یا اس سے زیادہ مدینہ کی محبت عطا کر، اس کو سازگار بنا اس کے ناپ تول کے پیمانوں میں ہمیں صحت عطا کر اور اس کی بیماری کو جحفہ تک

دور کردے)۔

مزید یہ بھی کہ رسول پاک ﷺ نے مدینہ کی شہریت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے مدینہ میں جائیداد بنانے کی طرف بھی مسلمانوں کو متوجہ کیا، آپ نے فرمایا:

"من کان لہ بالمدینہ اصل فیتمسک بہ، ومن لم یکن بھا أصل فلیجعل لہ بھا أصلا، ولو قصیرۃ" ۳۰

(جس کے پاس مدینہ میں جائیداد ہو اسے اپنے پاس رکھے اور جس کے پاس نہ ہو وہ وہاں جائیداد بنائے اگرچہ کھجور کا چھوٹا پیڑ ہی کیوں نہ ہو)۔

ان روحانی اور سماجی تدابیر نے مدینہ میں مسلمانوں کے قدم جمادئے اور مدینہ کی شہریت مضبوط اور فزوں تر ہوگئی، لیکن اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات، مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور رسول اللہ ﷺ کی مقبول عام قیادت سے یہودی قبائل خوف اور حسد کی نفسیات میں مبتلا ہوگئے۔ انہوں نے اسلام کی مخالفت شروع کردی اور پیغمبر اسلام کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، یہاں تک کہ کفار قریش کے مقابلہ میں رسول کریم ﷺ کا ساتھ دینے کا جو معاہدہ کیا تھا اسے توڑ کر مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے لگے، کھلم کھلا غداری پر اتر آئے اور کفار کو دعوت دے کر مدینہ پر چڑھا لائے۔ ان کی اس غداری کی سزا یہ دی گئی کہ یکے بعد دیگرے ان کا محاصرہ کیا گیا اور ان کو حدود مدینہ سے باہر نکال دیا گیا اور اس علاقہ میں مسلمانوں کو آباد کیا گیا سب سے پہلے بنی قینقاع پھر بنی نضیر اور پھر بنی قریظہ سزایاب ہوئے۔ قرآن کی سورہ حشر میں بنی نضیر کے محاصرہ پر مفصل تبصرہ ہے۔ ۳۱

اب مدینہ پورے طور پر اسلامی مملکت بن گیا تھا اور اس کی غالب آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہوچکی تھی۔ لہٰذا رسول پاک ﷺ نے فتح مکہ کے بعد نومسلموں سے ہجرت کا مطالبہ ترک کرکے پورے عرب کو دارالاسلام بنادیا اور اعلان فرمادیا: **"لاھجرۃ بعد الفتح"** ۳۲ یعنی مسلمان جہاں کہیں رہیں وہ اسلامی مملکت کا حصہ قرار پائیں گے اور ان کو

وہی حقوق اور مراعات حاصل ہوں گے جو مدینہ کے باشندے کو حاصل ہیں۔ چنانچہ قبیلہ مزنیہ جو مدینہ سے ۲۰ میل کی دوری پر تھا اس قبیلہ کے کئی سو لوگ مسلمان ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو وہیں رہنے دیا اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام فرمایا اور مہاجرین کی طرح حقوق و مراعات کا اعلان فرمایا۔ ۳۳ اس نئی پالیسی کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ مسلم علاقوں کی اور اسلامی مملکت کی حدود کی توسیع کی جائے اور دوسرے یہ کہ مدینہ کی شہری آبادی کو غیر ضروری اور غیر فطری طور پر پھیلنے سے روکا جائے، یمن کے کچھ لوگ خدمت نبوی میں مدینہ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اللہ کے رسول! آپ کا نمائندہ ہمارے یہاں آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ جو مدینہ ہجرت نہیں کرے گا اس کا اسلام غیر معتبر سمجھا جائے گا، ہمارے ملک میں ہمارا کاروبار اور ذریعہ معاش ہے آپ کا حکم ہو تو سب کچھ چھوڑ کر مدینہ آنے کو تیار ہیں تو آپ نے فرمایا نہیں تم جہاں ہو وہیں رہو، تم کو مہاجرین ہی کی طرح حقوق و فرائض حاصل ہوں گے۔ ۳۴

سلمہ بن اکوع جب مدینہ آئے تو ان کو بریدہ بن الحصیب ملے اور بولے اے سلمہ! کیا تم اپنی ہجرت سے پلٹ گئے؟ انہوں نے کہا معاذ اللہ! مجھے مدینہ چھوڑنے کی اجازت خود حضور اکرم ﷺ سے ملی ہے۔ آپ کو یہ فرماتے ہوئے میں نے سنا ہے۔ "مضافاتی علاقوں اور گھاٹیوں میں جاکر بس جاؤ" اس پر لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس طرح ہمیں اندیشہ ہے کہ ہماری ہجرت میں نقصان نہ ہوجائے۔ آپ نے فرمایا تم جہاں کہیں رہو گے مہاجر تسلیم کئے جاؤ گے۔ ۳۵

حضرت ابوذر غفاریؓ سے رسول کریم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا جب مدینہ کی آبادی سلع تک پہنچ جائے تو تم مدینہ چھوڑ دینا اور شام چلے جانا۔ ۳۶

ان احکامات اور واقعات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسول پاک ﷺ مدینہ شہر کی آبادی اور اس کے وسائل میں تناسب قائم رکھنے کے لئے غیر ضروری طور پر بڑھنے سے روکنے کے حق میں تھے اور دوسرے شہر آباد کرنے کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔ یہ وہی

پالیسی تھی جس پر بعد میں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے عمل کرتے ہوئے کوفہ اور بصرہ جیسے نئے شہر آباد کئے اس پالیسی کو شہری منصوبہ بندی میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

علامہ اقبالؒ نے مسولینی سے ملاقات کے وقت جب رسول کریم ﷺ کی اس پالیسی کا تذکرہ کیا کہ شہر کی آبادی میں غیر ضروری اضافہ کے بجائے دوسرے شہر آباد کئے جائیں تو مسولینی مارے خوشی کے اچھل پڑا اور اسے شہری منصوبہ بندی کی شاہ کلید ہاتھ آ گئی۔[۳۷]

ہندوستان کے بڑے شہروں میں جھگی جھوپڑیوں کی تعداد جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اور گاؤں کی آبادی جس کثیر تعداد میں شہر کا رخ کر رہی ہے اس سے بہت سی ماحولیاتی، معاشی، سماجی پیچیدگی اور حفاظت کے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ رسول کریم ﷺ کی اس منصوبہ بندی سے روشنی حاصل کرتے ہوئے اگر گاؤں میں ضروری سہولیات، مثلاً سڑک، بجلی، ہسپتال اور تعلیم گاہ فراہم کر دی جائیں اور صنعت گاہوں کا رخ ادھر کر دیا جائے تو شہری مسائل کو سلجھانے میں مدد مل سکتی ہے۔ ایریا کے مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے اور غیر منصوبہ بند آبادی کے سیلاب کو روکا جا سکتا ہے۔

شہری منصوبہ بندی میں عدالت، ہسپتال، گیسٹ ہاؤس، سڑکیں، پارک، تعلیم گاہ، سکریٹریٹ اور عبادت گاہوں کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ رسول پاک ﷺ نے مدینہ کی منصوبہ بندی کرتے وقت ان تمام ضروریات و سہولیات کو ترجیحی حیثیت دی۔ آپ نے سب سے پہلے مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی، یہ مسجد ہمارے زمانہ کی عام مسجدوں کی طرح محض ایک عبادت گاہ نہیں تھی، بلکہ وہ City State کا سکریٹریٹ بھی تھی، عبادت گاہ بھی تھی، تعلیم گاہ بھی تھی اور حسب ضرورت وہاں خیمہ نصب کر کے اسپتال کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

مسجد نبوی جائے وقوع کے اعتبار سے مدینہ کے وسط میں واقع ہے۔ جب رسول پاک ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے تشریف لائے تو قباء، بنو سالم اور کئی محلوں کے لوگوں نے دست بستہ اپنے یہاں قیام کی پیشکش کی، مگر حضور اقدس ﷺ ان سب کو رد کرتے

ہوئے قبیلہ بنو نجار میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر فروکش ہوئے جو آج صحن مسجد کا حصہ ہے۔[۳۸]

اس جگہ کے انتخاب کی حکمت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب ہم مدینہ کی شاہراہوں کا مطالعہ کریں، آپ دیکھیں گے کہ مدینہ کی تمام سڑکوں کا سرا مسجد نبوی سے آ کر ملتا ہے۔ اس مرکزیت کا خیال صرف مسجد ہونے کی بنا پر نہیں رکھا گیا۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی زندگی مسجد نبوی کے علاوہ ۹/ مزید مساجد مختلف محلوں میں تعمیر ہو گئیں تھیں۔[۳۹] بلکہ اس وجہ سے بھی تھا کہ وہی ریاست کے سربراہ اعلیٰ کی رہائش گاہ بھی تھی، وہ سکریٹریٹ بھی تھی، جہاں منصوبہ بندی کی جاتی، جہاں سے فوج کشی کی جاتی، جہاں سے مبلغین اور معلمین بھیجے جاتے، جہاں حساب و کتاب رکھا جاتا اور جہاں سے مختلف گورنروں اور دیگر ممالک کے سربراہوں سے خط و کتابت کی جاتی تھی۔ وہیں ایک چبوترہ بنا کر تعلیم گاہ بھی بنا دی گئی جس کی حیثیت مرکزی اقامتی درسگاہ یا اعلیٰ تعلیم کے ادارہ کی تھی، جسے صفہ کہا جاتا ہے، کیونکہ مسلمانوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ ابتدائی تعلیم اپنے محلوں کی مسجدوں میں حاصل کریں۔ صفہ کی حیثیت تعلیم گاہ کے علاوہ نادار مسلمانوں کی پناہ گاہ کی بھی تھی۔

امام بخاریؒ نے "**باب الخیمه للمرضی فی المسجد**" قائم کر کے یہ واضح کیا ہے کہ رسول پاک ﷺ نے ہسپتال کے قیام کو بھی اپنی اوّلین توجہ کا مرکز بنایا اور اس کے لئے مسجد نبوی کے صحن میں خیمہ نصب کیا جاتا جہاں مریضوں کا علاج ہوتا۔[۴۰] ہمارے عہد کی طرح انسان نت نئی بیماریوں کا شکار نہ تھا، رسول پاک ﷺ کی تعلیم صحت و صفائی نے بیماری کو کم سے کم کر دیا تھا اس کے باوجود جو لوگ بیمار ہوتے تھے ان کو علاج کرانے پر زور دیا گیا اور ان کے لئے مسجد نبوی میں شفاخانہ کا انتظام کیا گیا۔

اس منصوبہ بندی میں مہمان خانہ یا گیسٹ ہاؤس کا بھی خیال رکھا گیا تھا، رسول پاک ﷺ سے ملنے اور دین اسلام کو سمجھنے کے لئے آئے دن نو مسلموں اور مہمانوں کی آمد ہوتی

تھی، ان مہمانوں کا قیام انصار کے گھروں میں کیا جاتا اور مسجد نبوی میں بھی کسی حد تک ان کو ٹھہرایا جاتا، خاص طور پر صفہ کا مدرسہ اس کے لئے موزوں تھا، بعد میں جب خوش حالی آئی اور مہاجرین کے مکانات تعمیر ہونے لگے تو باقاعدہ گیسٹ ہاؤس کا بھی انتظام کیا گیا، اس کی شکل یہ ہوئی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے جو ایک مشہور مہاجر تاجر تھے ایک بڑا سا گھر بنایا ان کے اس بڑے سے گھر کو گیسٹ ہاؤس بنا دیا گیا، نورالدین سمہودی کا بیان ہے کہ:

"کان عبدالرحمن ینزل فیها ضیفان رسول الله ﷺ فکانت أیضا تسمی دار الضیفان" ۴۱

(عبدالرحمٰن بن عوف اس میں رسول اللہ ﷺ کے مہمانوں کو ٹھہرایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس گھر کو گیسٹ ہاؤس بھی کہا جاتا تھا)۔

مدنی زندگی کے آخری دنوں میں بالخصوص ۹ ھ میں جب مفتوحہ ممالک کے Delegations کی آمد کثرت سے ہونے لگی جن کی تعداد بعض اوقات سو تک پہنچ جاتی تو بعض بڑی حویلیوں کو گیسٹ ہاؤس بنا کر ان کے قیام وطعام کا انتظام کیا جاتا۔۴۲ اس طرح رسول ﷺ نے ریاست کے مہمانوں کی مہمان نوازی کے لئے انصار کی روایتی مہمان نوازی کے جذبہ کا بھی فائدہ اٹھایا اور باقاعدہ مہمان خانے بھی قائم فرمائے۔

شہری منصوبہ بندی کا ایک اہم حصہ رسول پاک ﷺ کے نزدیک یہ تھا کہ ہر شہری کو علیحدہ مکان دستیاب ہو، آپ نے فرمایا: **"من سعادة المرء الدار الوسیع والمرکب الهنی."** ۴۳ (نسان کی خوشحالی کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں ان میں کشادہ مکان اور قابو کی سواری بھی ہے)، اسی نقطۂ نظر سے آپ نے مشترکہ خاندانی نظام، یعنی جوائنٹ فیملی سسٹم کو ناپسند فرمایا اور علیحدہ مکان کی فراہمی پر زور دیا، تاکہ انسان کو نجی زندگی کی سہولت، سرور اور لطف نصیب ہو اور وہ سکون سے اپنی عبادت انجام دے سکے۔

مہاجرین مکہ کو ابتدا میں انصار کے ساتھ ان کے گھروں میں ٹھہرایا گیا، بعد میں رسول

پاک نے ان کے لئے قطعۂ اراضی کی فراہمی اور مکانات کی تعمیر کا منصوبہ بنا کر ان کو اپنے گھروں میں آباد کیا، ابن سعد اور سمہودی جیسے سیرت نگاروں نے اپنی کتابوں میں اس منصوبہ بندی کی تفصیل بیان کی ہے، اس آبادکاری کے لئے آپ نے افتادہ زمین کو استعمال کیا اور انصار کی طرف سے ہبہ کردہ آباد جگہوں سے بھی استفادہ کیا گیا، اس آبادکاری میں حضرت حارثہ بن نعمان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ صحابہ میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس کام کے لئے رسول پاک کو اپنی زمین اور مکانات ہبہ کیں۔۴۴ اس طرح کے اور بھی اہل خیر اصحاب تھے جن کو آبادکاری کی سعادت حاصل ہوئی۔

آبادی بڑھنے کے ساتھ شہر کی زمین رہائش کے لئے کم اور نسبتاً مہنگی ہوتی چلی جاتی ہے، یہ دشواری عہد نبوی میں بھی پیش آنے لگی، اس مشکل کو حل کرنے کے لئے رسول پاک ﷺ نے کئی منزلہ عمارت بنانے کا مشورہ دیا۔ مدینہ میں محلوں اور قلعوں کے علاوہ اور مکانات بھی ایک سے زیادہ منزلوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ خود رسول پاک ﷺ ہجرت کے بعد سات ماہ تک حضرت ابوایوب انصاریؓ کے دو منزلہ میں قیام فرما ہوئے۔ پہلی منزل میں حضرت ابوایوب کی فیملی تھی اور اوپر کی منزل میں آپ نے قیام فرمایا۔۴۵ حضرت خالد بن ولید کی بہت اولادتھیں ان کے لئے ان کا مکان چھوٹا پڑتا تھا۔ انہوں نے رسول پاک ﷺ کے سامنے یہ مسئلہ رکھا تو آپ نے فرمایا:

"أرفع النباء فی السماء واسئل الله السعة. ۴۶

(اوپر کی منزل تعمیر کرو اور اللہ سے کشادگی کی دعا بھی کرو)۔

آبادی میں اضافہ ہونے کے ساتھ جب محلّہ گنجان ہونے لگا تو گلیاں اور راستے بھی تنگ ہونے لگے، رسول پاک ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ راستوں کو اتنا چوڑا رکھا جائے کہ دو لدے ہوئے اونٹ آسانی کے ساتھ گزر سکیں۔۴۷ شہری منصوبہ بندی کا اہم حصہ سڑکیں ہوتی ہیں، سڑکوں کے تنگ ہونے سے ٹریفک کے مسائل بڑھتے ہیں، گندگی بڑھتی ہے اور

سماجی پیچیدگیاں بڑھتی ہیں۔حضورﷺ کے زمانے میں بار برداری کی عام شکل اونٹ کی بار برداری تھی ہمارے عہد میں ٹریکٹر اور ٹرک وغیرہ بار برداری کی عمومی شکل ہے۔سنت رسول کو رہنما مان کر مسلم علاقوں کی گلیوں کو اتنا کشادہ تو کرنا چاہیے کہ دو ٹریکٹر آسانی سے گزر سکیں۔ ڈیولپمنٹ اتھارٹی اور کالونائزر دونوں کے لئے یہ نشان راہ ہے کہ وہ کالونی آباد کرتے وقت سڑکوں کی مناسب کشادگی کا اہتمام کریں۔

شہری منصوبہ بندی کا اہم مسئلہ صفائی اور صحت کا اہتمام بھی ہے۔سڑکوں، گلیوں اور محلوں میں غلاظت اس طرح جمع نہ ہوجائے کہ وہ صحت اور ماحول کے لئے خطرہ بن جائے۔ چنانچہ بلدیہ کی اوّلین ذمہ داری اس مسئلہ پر توجہ دینا ہے۔رسول پاکﷺ نے گھر، آنگن اور ماحول کو صاف رکھنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔۴۸ آج ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں اور خلاؤں کو بھی ہم نے مسخر کرلیا ہے۔زمین اور فضا انسان کی دسترس میں ہے، مگر ہندوستان میں آج بھی انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے انسانوں کی غلاظت کو اپنے سر پر ڈھوتا ہے۔اس سے زیادہ انسان کی تذلیل اور کیا ہوسکتی ہے۔ابھی تک ہم نے اس تکلیف دہ صورتِ حال کو ختم کرنے کی مکمل منصوبہ بندی نہیں کی۔

رسول پاکﷺ کے مدنی معاشرہ میں اس مشکل کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا یا تو لوگ قضائے حاجت کے لئے جنگلات کا رخ کرتے یا اپنے گھروں میں ''کنائس'' یعنی بیت الخلا کا انتظام کرتے۔ مدینہ میں رفع حاجت کے لئے بالعموم لوگ جنگلوں میں جاتے تھے ، یہاں تک کہ عورتیں بھی گھروں سے باہر جاتیں، مگر رسول پاک نے اس ضروری مسئلہ پر توجہ فرمائی۔اول تو آپ نے ادھر ادھر رفع حاجت کرنے ، نیز سڑکوں اور سایہ دار پیڑوں کے نیچے رفع حاجت کرنے سے منع فرمایا۔دوسرے یہ کہ آپ نے گھروں کے ساتھ بیت الخلا بنانے کا رجحان پیدا کیا، چنانچہ حضرت عائشہ واقعہ افک کا تذکرہ کرتے ہوئے ام مسطح کے ساتھ ایک شب باہر نکلنے کی بابت فرماتی ہیں۔

''وذالک قبل أن نتخذ الکذف قریبا من بیوتنا وامرنا امر العرب الأول فی التنزہ فی البریہ'' ۴۹

یہ اس وقت کی بات ہے جب ہمارے گھروں سے متصل بیت الخلا نہیں بنے تھے اور ہم اولین عربوں کی طرح باہر جا کر پاکی حاصل کرتے تھے۔

اس روایت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعد میں مدینہ میں گھروں میں بیت الخلا بن گئے اور خواتین کو باہر جانے کی زحمت سے نجات ملی۔

شہری منصوبہ بندی کا ایک ضروری حصہ مارکیٹ اور تجارتی مراکز کا قیام بھی ہے، مدینہ کی ریاست وجود میں آنے کے ساتھ ہی رسول پاکﷺ نے اس بنیادی ضرورت کو محسوس فرمایا، کیونکہ بڑی تعداد میں مسلمان ہجرت کر کے مدینہ میں آکر آباد ہوگئے تھے جن کے پاس زمین جائیداد نہیں تھی وہ تجارت پیشہ تھے اور ان کے معاشی استحکام کا ذریعہ تجارت ہی ہوسکتی تھی اور اس کے لئے بازار اور مارکیٹ کا فروغ شہری ریاست کی اہم ضرورت بن گئی تھی۔معاشی مسائل میں توسیع آبادی کی ہمیشہ ضرورت بن جاتی ہے۔

رسول پاکﷺ نے یہاں دو امور کی طرف توجہ فرمائی، ایک طرف تو آپ نے زراعت اور ملازمت کے مقابلے میں تجارت کی حوصلہ افزائی فرمائی اور اسے فروغ دینے کی ضرورت واضح فرمائی۔آپ نے ایماندار تاجر کو اجر کے لحاظ سے صدیقین، شہدا اور انبیاء کے ہم رتبہ قرار دیا۔۵۰ جو لوگ تجارت کرتے تھے آپ نے ان کے لئے برکت کی دعائیں کیں اور بھیک مانگنے والوں کی حوصلہ شکنی کی۔ نیز تجارت میں جھوٹ بولنے، دھوکہ دینے اور بدمعاملگی کرنے پر پابندی لگائی۔

دوسری طرف آپ نے وسط مدینہ میں ایک مرکزی مارکیٹ بنوائی جسے سوق المدینہ کہا جاتا ہے، اس وقت مدینہ کی مشہور اور بڑی مارکیٹ قینقاع تھی جو یہودیوں کے علاقہ میں تھی، وہاں وہ گاہکوں کا استحصال بھی کرتے اور ان کی عورتوں کے ساتھ چھیڑخانی اور

بدتمیزی بھی کرتے، اسی وجہ سے وہ جلاوطن بھی کئے گئے، رسول پاک ﷺ نے اس کے مقابلے میں مدینہ کی مرکزی جگہ پر مسجد نبوی اور بقیع کے نزدیک ''سوق المدینہ'' مدینہ مارکیٹ بنوائی، اس زمانہ میں قینقاع کی مارکیٹ کے علاوہ چھوٹی چھوٹی اور بھی کئی مارکیٹ تھیں، مثلاً زبالہ مارکیٹ، جسر مارکیٹ، صفاجت مارکیٹ وغیرہ۔ مگر رسول پاک ﷺ نے سوق المدینہ کو سوپر مارکیٹ کی حیثیت دی جہاں ضرورت اور تجارت کی ساری چیزیں مہیا ہوں۔ جس وقت رسول پاک اس سوپر مارکیٹ کی منصوبہ بندی کررہے تھے۔ اس وقت آپ نے قینقاع کے بازار کے ساتھ متعدد مقامات کا معائنہ فرمایا اور بالآخر مدینہ بازار کے محل وقوع کا تعین فرمایا۔

عطا بن یسار کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے مدینہ کے لئے مارکیٹ بنانے کا ارادہ فرمایا تو پہلے قینقاع کے بازار تشریف لے گئے پھر سوق المدینہ کی جگہ آئے اور آپ نے پاؤں سے اشارہ فرمایا کہ یہ تمہاری مارکیٹ ہوگی۔ ۵۱

عباس بن سہیل اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قبیلہ بنی ساعدہ تشریف لائے اور فرمایا میں تمہارے پاس ایک ضرورت سے رکا ہوں تم لوگ اپنے قبرستان کی جگہ مجھے دے دو تاکہ میں وہاں مارکیٹ بناؤں، بعض لوگوں نے اپنے حصہ کی زمین دے دی اور بعض نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ یہاں ہماری قبریں ہیں اور ہماری عورتوں کے نکلنے کی جگہ ہے، مگر بعد میں باہم گفت وشنید کرکے وہ جگہ حضور ﷺ کے حوالے کردی گئی اور آپ نے وہاں مارکیٹ بنادی۔ ۵۲

نبی ﷺ نے اس مارکیٹ کی مرکزیت، وسعت اور عوامیت کو برقرار رکھنے کے لئے فرمایا۔

''هذا سوقكم فلا ينقص منه ولا يضرب عليه الخراج''. ۵۳

یہ تمہارا بازار ہے نہ تو اس کو کم کرو اور نہ اس میں ٹیکس لگاؤ۔

اس حکم نامہ کی حکمت یہ تھی کہ اگر بازار کی جگہ تنگ ہوگی یا اس میں خرید وفروخت پر ٹیکس لگے گا تو بیوپاریوں کی کثرت نہ ہوگی۔ لہٰذا ان دونوں باتوں سے گریز کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مارکیٹ میں خرید وفروخت کرنے کی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی آپ نے فرمایا:

''الجالب سوقنا كالمجاهد في سبيل الله وان المحتكر في سوقنا كالملحد في كتاب الله'' ۵۴

(ہمارے بازار میں سامان لانے والا مجاہد فی سبیل اللہ کے مانند ہے اور بازار میں سامان روکنے والا اللہ کی کتاب میں سرکشی کرنے والے کی مانند ہے)۔

آپ نے مزید فرمایا: لايحتكر الاخاطي''. ۵۵ (سامان روکنے والا مجرم ہے)۔

اسی طرح رسول پاک نے بازار میں سامان پہنچنے سے پہلے راستہ میں روک کر خریدنے پر پابندی لگادی جسے حدیث کی اصطلاح میں ''تلقی بیوع'' کہا جاتا ہے۔ آپ نے مزید فرمایا: ''لا يبيع حاضر لباد''. ۵۶ راستہ میں کوئی شہری دیہاتی سے خرید وفروخت نہ کرے، ان ساری منصوبہ بندیوں سے نتیجہ نکلا کہ بہت جلد مدینہ تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کرگیا، دور دراز سے لوگ اس شہر میں تجارت کے لئے آنے لگے اور مدینہ کے لوگ باہر تجارتی سامان لانے کے لئے جانے لگے، تحفظ اور ترقی کا احساس اگر تاجروں کو ہوجائے تو تجارتی مرکز فروغ پاتا ہے اور یہ احساس رسول پاک نے اچھی طرح پیدا کردیا تھا۔

سوق المدینہ کی وسعت اور مرکزیت بعد میں بھی برقرار رہی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک لوہار نے اس مارکیٹ میں ایک بھٹی لگالی تو حضرت عمر نے اسے منہدم کردیا اور فرمایا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی مارکیٹ کا دائرہ تنگ کررہے ہو۔ ۵۷ حضور ﷺ کی منصوبہ بندی کو چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، مگر مدینہ مارکیٹ کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی ہے، بلکہ دن بہ دن اضافہ ہوا ہے اور اس وقت اس کی حیثیت انٹرنیشنل مارکیٹ کی ہے، دنیا کے

ہر خطے سے حاجی ہر سال لاکھوں کی تعداد میں وہاں پہنچتے ہیں اور مدینہ مارکیٹ میں خریداری کرنے کو سعادت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ اہمیت غالباً دنیا کی کسی مارکیٹ کو حاصل نہیں۔

شہری منصوبہ بندی میں پارک اور سیرگاہ کو آج غیر معمولی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ ضرورت عہد نبوی میں بھی نظر آتی ہے، رسول پاک ﷺ نے اس مقصد کے لئے مدینہ شہر کے باہر وادی عقیق کو منتخب فرمایا تھا، وہاں آپ نے ایک سیرگاہ ''حمی النقیع'' کے نام سے بنوائی، جو گھوڑوں کی چراگاہ بھی تھی، وہاں پیڑ پودے اس کثرت سے لگوائے گئے کہ وہ خوبصورت تفریح گاہ بن گئی، باغات، پانی اور شادابی کے سبب یہ جگہ سیرگاہ مدینہ کی کہلائی۔ رسول پاک وہاں آرام کے لئے تشریف لے جاتے آپ کو یہ جگہ بے حد پسند تھی۔۵۸

ایک مرتبہ رسول پاک ﷺ جب وادیٔ عقیق کی سیر سے لوٹے تو آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا میں وادیٔ عقیق سے آرہا ہوں کتنی موزوں جگہ ہے اور کتنا میٹھا اس کا پانی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا پھر کیوں نہ ہم لوگ وہاں منتقل ہوجائیں؟ تو حضور نے فرمایا اب یہ کیسے ممکن ہے، لوگوں نے مدینہ میں گھر بنالئے ہیں۔۵۹ صحابہ کرام میں جو اہل ثروت تھے وہ وہاں جاکر اپنے محلات تعمیر کرلیتے تھے یہ گویا ان کے لئے سمرہاؤس تھے، اہل مدینہ کے لئے رسول پاک کی طرف سے یہ ایک خوبصورت عطیہ تھا۔

رسول پاک ﷺ نے مدینہ شہر کی منصوبہ بندی کرتے وقت صرف اس کی آبادکاری اور سہولیات کی فراہمی کا ہی خیال نہیں رکھا، بلکہ شہر کی زینت و رونق اور خوبصورتی کو بھی پیش نظر رکھا، اسی وجہ سے یہاں کے قلعوں کو مسمار کرنے اور بلاضرورت درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا، چنانچہ محدث بیہقی فرماتے ہیں:

''أن النبی ﷺ انما أراد بقاء زینه المدینة وبهجتها لتتوطن کما منع منهدم أطام المدینة لذالک، قال ابو هریرةؓ: نهی رسول الله ﷺ من هدم أطام المدینة، وقال: انها زینة المدینة.۶۰

نبی ﷺ نے مدینہ کی زینت اور خوبصورتی کو پیش نظر رکھا، تاکہ یہ شہریوں کے لئے اچھی سکونت کی جگہ بنے، اسی لئے آپ نے مدینہ کے قلعوں اور گڑھیوں کو مسمار کرنے سے منع فرمایا۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مدینہ کے قلعوں کو مسمار کرنے سے یہ کہہ کر منع فرمایا کہ وہ مدینہ کی زینت ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ سیرت رسول ﷺ کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیجئے تو آپ کی شخصیت صرف ایک روحانی پیشوا، مذہبی رہنما اور معلم اخلاق ہی کی نظر نہیں آتی۔ بلکہ ایک مفکر منتظم اور منصوبہ ساز کی بھی نظر آتی ہے، آخری رسول ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کی تعمیر کی ان گنت صلاحیتیں آپ میں ودیعت کی تھیں اور پھر اپنے فیضان خاص سے بذریعہ وحی آپ کی رہنمائی کی تھی یہی وجہ تھی کہ بیک وقت دین و دنیا دونوں لحاظ سے آپ کامیاب رہنما اور حکمراں ثابت ہوئے تھے اور اس کی ایک مثال آبادکاری کے سلسلہ میں آپ کی وہ منصوبہ بندی ہے جس کی بعض جھلکیاں اوپر پیش کی گئی ہیں۔

☆☆

نسلی تفاخر اور اسوۂ رسول اکرم ﷺ

● مولانا خالد ندوی غازی پوری

معاشرتی اور سماجی برائیوں میں ''نسلی تفاخر'' ایک ایسی برائی ہے جس کی کوکھ سے بڑی برائیاں جنم لیتی ہیں، حسد، کینہ، توہین وتحقیر کے جذبات معاشرہ میں ناسور کی طرح بڑھتے چلے جاتے ہیں، دلوں میں دوری، باہمی عدم تعاون اور اخوت وانصاف کے تقاضے اس کی بدولت سوخت ہوجاتے ہیں، نسلی تفاخر سے عصبیت اور بے جا حمایت کے جذبہ کو فروغ ملتا ہے، رنگ ونسل اور زبان کو مقدس قرار دے کر بت کی طرح اس کی پرستش شروع ہوجاتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے نسلی تفاخر کے آہنی پنجوں میں انسانیت دم توڑ رہی تھی، قریش کو اپنی نسلی بڑائی کا اتنا غرور تھا کہ انہوں نے خانہ کعبہ کے طواف کے لئے آنے والوں کو یہ باور کرادیا تھا کہ جب تک ان کا لباس پہن کر وہ طواف نہیں کریں گے ان کی عبادت قبول نہیں ہوگی۔ لہٰذا وہ ان کا لباس کرائے پر لے کر پہنتے تھے اور طواف کرتے تھے، یا پھر اپنے لباس اتار کر برہنہ طواف کے لئے جاتے تھے، قریش اپنے آپ کو ''سدنۃ البیت'' (خانہ کعبہ کا خادم اور متولی) سمجھتے تھے۔ لہٰذا اپنے ہر عمل کو بارگاہ خداوندی میں مقبولیت کی علامت قرار دیتے تھے۔ الغرض تمام قبائل کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے، اس لئے حج کے ایام میں سارے حجاج عرفات میں پہنچ کر وقوف کرتے، لیکن قریش صرف مزدلفہ تک ہی جاتے تھے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ ہم حرم کے باشندہ ہیں، حدود حرم سے باہر نہیں جاسکتے، اپنے

آپ کو حمس مقدس تصور کرتے تھے۔

نسلی تفاخر کی وجہ سے دوسرے قبائل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان میں شادی بیاہ، لین دین کا معاملہ کرنا فروتر خیال کرتے تھے، لسانی تفاخر کا حال یہ تھا کہ اپنی زبان آوری کے آگے سارے جہاں کو عجم، یعنی گونگا باور کرتے تھے۔ نسلی تفاخر نے ان کے ذہن ودماغ کو اتنا اونچا کردیا تھا کہ بسا اوقات اس خیال سے کہ کبھی خسر کی صورت میں ان کی ''انا'' کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے اور جس قبیلہ میں بچی بیاہی جائے گی اس قبیلہ کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ اس لئے اپنی بچیوں کو زندہ درگور کردیتے تھے۔ ایسے وقت میں حضور ﷺ کی بعثت ہوئی جس کا بنیادی مقصد انسانی عظمت کو قائم کرنا اور خالق ومخلوق کے درمیان صدیوں سے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑنا تھا، جہالت کی تاریکی کو دور کرکے علم کی تنویر کو عام کرنا تھا۔

آپ کی بعثت مبارکہ سے جہالت کی کائی چھٹی، علم کا آفتاب طلوع ہوا، انسانیت کی کھیتی ہری ہوئی، مظلوموں کو سہارا ملا، انصاف کے تقاضے پورے ہوئے اور ہر انسان کو اولاد آدم ہونے کے ناطے برابری کا درجہ ملا، حضرت بلال حبشی ایک سیاہ فام غلام تھے وہ سردار بنائے گئے، حضرت سلمان فارسی جو عجمی نژاد تھے، بارگاہ رسالت میں باوقار ہوئے، عربوں کے مقابلے میں جنگی حکمت عملی میں ان کے مشورے قابل قبول ہوئے، بارگاہ رسالت سے یہ اعلان ہوا کہ ''(۱) **لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی، لاسود علی احمر ولااحمر علی الاسود الا بالتقویٰ**'' (بخاری ومسلم) (نہ تو کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور نہ کسی سیاہ فام کو سفید فام پر فضیلت وبرتری حاصل ہے، تم آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے افضل وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی وپارسا ہو)۔

حضور ﷺ نے نسلی غرور اور تفاخر کا قلع قمع کرنے کی غرض سے نسلی مساوات کا نمونہ پیش کرتے ہوئے اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی ایک ایسے غلام سے کرائی جسے آزاد کرکے

آپ ﷺ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا۔

جب مکہ فتح ہوا خانہ کعبہ کو بتوں سے صاف کیا گیا، نماز کا وقت ہوا تو اذان دینے کے لئے خانہ کعبہ کی چھت پر حضرت بلال کو چڑھ کر اذان دینے کو کہا گیا، یہ ایک اعزاز تھا، اس وقت ہاشمی، مطلبی، مخزومی، عدوی، کلبی اور قریش کی دیگر شاخوں کے افراد موجود تھے، لیکن اس مقدس سرزمین کی مقدس بارگاہ کی چھت پر آج اسے چڑھایا جارہا تھا، جو کل تک روندا کچلا جارہا تھا، جس کے سینہ پر پتھر رکھے جارہے تھے، تپتی ہوئی ریت پر ننگے بدن لٹا کر گھسیٹا جارہا تھا، آج اسے سب کی موجودگی میں خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھا کر یہ اعلان کیا جارہا تھا کہ خدا کی بارگاہ میں حسب ونسب کی کوئی حیثیت نہیں، قرب الٰہی کے لئے ایمان اور تقویٰ اصل سرمایہ ہے۔ حضور ﷺ کے صحابہ کرام آپ پر جان چھڑکتے تھے، حضرت ابوبکرؓ کا ایثار، حضرت عمرؓ کا خلوص، حضرت عثمانؓ کی اطاعت اور حضرت علیؓ کی محبت آپ ﷺ کے لئے، آپ کے مشن کے لئے، آپ کی دعوت وشریعت کے لئے مثال تھی، لیکن قرآن پاک میں کسی کا نام نہیں آیا، اگر آیا ہے تو صحابہ کرام میں صرف اس غلام کا آیا ہے جس کو حضور ﷺ نے غلامی سے آزادی عطا کی تھی اور اپنے گھرانہ کا ایک فرد بنایا تھا۔ قرآن نے حضرت زیدؓ کے نام کو ان کے کردار کو دوام عطام کیا اور اگر کسی قریش کا نام آیا تو ابولہب کا جس پر تباہی اور ہلاکت مسلط کی گئی۔ لہٰذا اسلام نسلی امتیاز کا قطعاً روادار نہیں، اس نے اس لعنت پر گہری ضرب لگائی ہے اور اس کی جڑیں زمین کے اندرونی تہوں سے کھود کر اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اس کا اعلان ہے:

"یایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی و جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا انا اکرمکم عنداللہ اتقاکم". (سورہ الحجرات): (اے انسانوں! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور بعد میں تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے، تاکہ اس سے تم ایک دوسرے کو پہچان سکو (جہاں تک عزت اور ذلت کی بات ہے)

زیادہ عزت دار وہ ہے، جو اللہ سے ڈرتا ہے)۔ (القرآن) ایک جگہ آپ ﷺ نے فرمایا تمام اولاد آدم کنگھی کے دندانوں کی طرح یکساں اور برابر ہیں (حدیث) لیکن افسوس ہے آج خود مسلمانوں میں برادریوں کے نام پر اونچ نیچ کا تصور برادران وطن کی وجہ سے پایا جاتا ہے، حالانکہ اونچ نیچ یا بیک ورڈ یا فارورڈ کا تصور جاہلانہ اور غیر اسلامی ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی تصور کرتا ہے۔ یہی اس کے ایمان کی شان ہے۔ برادریوں اور قبیلوں کا وجود غیر فطری نہیں کہا جاسکتا۔ یہ باہم تعارف کے لئے، تصادم کے لئے نہیں ہے، حضور اکرم ﷺ نے اس لئے مختلف قبیلوں میں شادیاں کیں، تاکہ باہم تعارف ومحبت پیدا ہو، آپ ﷺ نے آخری نکاح ایک پارچہ باف یمنی لڑکی حضرت قتیلہؓ سے فرمایا تھا۔ اس نکاح کا تذکرہ عام طور پر نہیں کیا جاتا ہے، اس نکاح کے بموجب حضرت قتیلہؓ جو اشعث بن قیس کندی (جو مشہور پارچہ باف تھے، کی بہن ہیں) امہات المومنین میں شامل ہیں۔ ان کا نکاح حضرت اشعث نے ولی بن کر مدینہ منورہ میں آپ ﷺ سے کیا تھا، لیکن رخصتی سے قبل ہی حضور ﷺ کی وفات ہوگئی۔ اس قتیلہ بنت قیس کے بھائی اشعث جو بنکر تھے کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی بہن حضرت ام فردہ کا نکاح کیا تھا۔

اسلام میں یقیناً نسل وامتیاز وتفاخر کی کوئی گنجائش نہیں، اسلام میں کوئی برادری نہیں وہ بجائے خود ایک عالمی برادری ہے جس میں سب کے حقوق یکساں ہیں اور سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے **"وکونوا عباد اللہ اخوانا"** (اللہ کے بندو تم آپس میں بھائی بن کر رہو)۔

☆☆

دعوت وتبلیغ دین اسوۂ نبویؐ کی روشنی میں

● پروفیسر ڈاکٹر خالد علوی

یہ دنیا جو دارالاسباب ہے، یہاں اسباب ووسائل کا معاملہ اولین اہمیت کا حامل ہے۔ اسباب ووسائل کے حصول اوران کی تنظیم وتربیت کے حوالے سے ہی سرگرمیاں ہوتی ہیں، نتائج ومنافع ہی اہداف ہوتے ہیں اوران ہی کی بناء جماعتیں اورگروہ تشکیل پاتے ہیں۔ جو افراد مادی اسباب کی بناء پر جمعیتیں تشکیل دیتے ہیں، وہ نہ صرف ان کی حفاظت کرتے ہیں، بلکہ ان کے اثر ورسوخ کو بڑھانے اور مزید فتوحات حاصل کرنے کی تگ ودو بھی کرتے ہیں۔ تاریخ انسانی شخصیتوں، قومیتوں اور مفادات کے ٹکراؤ کا منظر پیش کرتی ہے۔ ظلم وجبر اوراکراہ واستحصال کی مثالیں میدان حیات میں بکھری پڑی ہیں۔ طاقت ور گروہوں نے جس چیز کو اپنے لئے بہتر سمجھا، اس پر لوگوں کو مطمئن کرنے اوراسی نظام کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔ شخصی، قومی اور وطنی مفاد کے ساتھ ماوراء الطبیعی عنصر بھی شامل رہا، چونکہ اسے مادی مفادات کے ساتھ سازگاری کے لئے اختیار کیا گیا تھا، لہٰذا اس کی فوق الفطرت روح بھی مادی لبادہ اوڑھے رہی۔ چنانچہ انسانی مذاہب نے مفادات ہی کو محفوظ کرنے کے لئے کبھی شرک کی صورت اختیار کی، کبھی مذہبی گروہ کی اجارہ داری کا روپ دھارا اور کبھی ذات پات کے نظام کو سند جواز عطا کی۔ انسانی سوچ کی یہ گمراہی تھی جس کی اصلاح کے لئے انبیائے کرام دنیا میں آئے۔ ان کی دعوت شخصی، قومی اور وطنی مفاد کے تحفظ کے بجائے انسانی شخصیت کی روحانی تکمیل، فکری وجسمانی آزادی اور ظلم واستحصال کا خاتمہ

تھا۔ اس دعوت میں حریت، مساوات اوراخوت کا پیغام ہے، اس میں انسان کی تکریم ہے، اس دعوت سے انسان کی روح کو آزادی میسر آتی ہے اوراسے مشکلوں اورالجھنوں سے چھٹکارا ملتا ہے۔ قرآن مجید نے اسے موسیٰ وفرعون کے حوالے سے مومن آلِ فرعون کی زبان بڑے جامع انداز میں بیان کی ہے۔ ''اورائے قوم میرا کیا حال ہے کہ میں تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اورتم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو تم مجھے اس لئے بلاتے ہو، کہ میں خدا کے ساتھ کفر کروں اوراس چیز کو اس کا شریک مقرر کروں، جس کا مجھے کچھ بھی علم نہیں اور میں تم کو خدائے غالب اور بخشنے والے کی طرف بلاتا ہوں، سچ تو یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کو دنیا اورآخرت میں بلانے کا مقدور (جواز) نہیں اور ہم کو خدا کی طرف لوٹنا ہے اور حد سے نکل جانے والے دوزخی ہیں، جو بات میں تم سے کہتا ہوں، تم اسے یاد کرو گے اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں، بے شک، خدا بندوں کو دیکھنے والا ہے۔'' المؤمن ۴۰، ۴۱) آیت کے الفاظ۔

اس آیت میں دعوت الی اللہ کی برتری، امتیاز اور خصوصیت کو واضح کیا گیا ہے۔ دین کی دعوت دینے والے کو اگر شرح صدر حاصل ہو تو اسے اعتماد ہوگا کہ جو بات وہ کہہ رہا ہے، وہ ہی حق ہے اوراسے قبول کیا جانا چاہئے، کیونکہ اس کے مقابلے میں آنے والے فکر وعمل کے نظام میں وہ روحانی قوت اوراخلاقی برتری نہیں جو دعوت الی اللہ کے مقابلے میں ٹھہر سکے۔ چونکہ اسلامی دعوت کسی فرد، گروہ وطن یا مفاد کی طرف نہیں ہے، لہٰذا اس میں جاذبیت کا ہونا لازمی ہے۔ قرآن مجید نے بار بار دعوت الی اللہ کے مفہوم کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ وسائل واسباب کی قید سے آزاد ہوکر انسان مافوق الفطرت حقائق سے اپنا رشتہ استوار کرے۔ مثلاً قرآن حضور اکرم ﷺ کی زبان سے کہلواتا ہے:

(ترجمہ) ''آپ کہہ دیں کہ مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ میں اللہ ہی کی عبادت کروں اوراس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤں، میں اسی کی طرف بلاتا ہوں اوراسی کی طرف مجھے

لوٹنا ہے۔'' (سورۃ الرعد)

رسول اکرم ﷺ بہ حکمِ خداوندی دعوت الی اللہ کی جو حقیقت بیان کرتے ہیں، اسے قرآن نے یہوں نقل کیا ہے'' آپ کہہ دیں میرا راستہ تو یہ ہے، میں خدا کی طرف بلاتا ہوں اور میرے پیرو بھی اللہ پاک ہیں اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں'' (سورۃ یوسف) آیت کے الفاظ۔

دعوت الی اللہ کے نتیجے میں انسان کو جو صلاح وفلاح حاصل ہوتی ہے، اس کی اپنی لذت ہے، لہٰذا انبیاء جب دعوت الی اللہ کی بات کرتے ہیں تو ان نتائج کا بھی ذکر کرتے ہیں جو اسے قبول کرنے کی صورت میں انسان کو حاصل ہوتے ہیں، دعوت کے موضوع کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود داعی کی حیثیت سے پکارتا نظر آتا ہے۔ ''سورۃ البقرۃ'' میں جہاں مشرکین سے نکاح کرنے کی ممانعت کی گئی، مسلمانوں کو متنبہ کیا جارہا ہے کہ اس جسمانی تعلق میں کتنی کشش اور ظاہری حسن میں کتنی ہی جاذبیت کیوں نہ ہو، یہ مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہے یہ ایک قانونی ومعاشرتی قاعدہ ہے جسے عام اور سادہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، لیکن اس کے اختتامی کلمات حیران کن حد تک روحانی اور ماوراء الطبیعی ہیں، ارشاد ہوتا ہے۔ ''یہ لوگ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور اپنے حکم لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔'' آیت کے الفاظ۔ سورۃ یونس میں اس دعوت کا ذکر اور طریقے سے ہوتا ہے فرمایا گیا'' اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔'' آیت کے الفاظ۔

دعوت اسلامی ایک اصولی اور نظری دعوت ہے جس کا مرکزی محور اللہ کی ذات گرامی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے حوالے کو چھوڑ کر جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا وہ نتیجہ خیز نہیں ہوگا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز مکہ مکرمہ میں کیا تھا جو مشرک، جاہلی

معاشرے کا شہر تھا۔ آپ ﷺ کی ابتدائی گفتگو صرف ایک محور کے گرد گھومتی نظر آتی ہے اور وہ ہے اللہ کی توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال۔ جاہلی معاشرے کی اصلاح کی کوئی بات توحید کے ذکر سے خالی نہیں، مکہ کے مشرکانہ معاشرے کو بھی چھوڑئے آپ کو مدینہ کے یہودیوں اور نصرانی ودیگر عرب عیسائیوں سے واسطہ پڑتا ہے تو ان کے بگاڑ اور فساد پر تبصرہ ہوتا ہے۔ یہودیوں کے دنیا پرستی اور مفاہمت کی بات ہوتی ہے تو اس میں مرکزی نقطہ اللہ کی ذات ہے۔ عیسائیوں سے ڈائیلاگ کے ضمن میں مشہور آیت کے الفاظ اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہوتا ہے:''**قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواد بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیأ**'' (آ کہہ دیں اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں تسلیم کی گئی ہیں، اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے، اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔'' (آل عمران) آیت کے الفاظ۔

دین کی دعوت کا دوسرا اہم نقطہ آنحضور ﷺ کی ذات گرامی سے وفاداری اور اطاعت ہے۔ یہ بات اس وقت بھی اہم تھی جب حضور اکرم ﷺ خود کارِ دعوت میں مصروف تھے اور آج بھی۔ اطاعتِ رسول اور اتباع نبوی ﷺ کے بجائے کسی اور کی اطاعت واتباع کی دعوت، اسلامی دعوت نہیں کہلاسکتی، قرآن نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''تمہارے پروردگار کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہوسکتے جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ آپ کریں، اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی مان لیں۔''

ہر نبی اپنے دور میں دعوت الی اللہ کے کام کا خود معیار ہوتا تھا۔ لہٰذا دعوت الی اللہ کی صورت میں اس نبی کی قیادت وسیادت ازخود مسلم ہوتی تھی، اس کے بغیر دعوت کا کام مکمل

نہیں ہوتا تھا آنحضورﷺ چونکہ آخری نبی ہیں اور آپﷺ کے بعد کسی اور نبی کو نہیں آنا، اس لئے آپ ہی کی ذات قیامت تک کے انسانوں کے لئے معیار کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضور اکرمﷺ کی بعثت کے بعد سے قیامت تک کا دور دراصل محمدی دور ہے۔ اس عرصے میں آپ کے حوالے کے بغیر کوئی دعوت بہتر نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے خلق کو ''خلق عظیم'' اور آپﷺ کے اسوہ وسیرت کو ''اسوہ حسنہ'' کہا، ارشاد ربانی ہے: ''آیت کے الفاظ، **لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاذ**''. (درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسولﷺ میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے)۔ (سورۃ الاحزاب) اب دین کی دعوتِ توحید وسنت کی دعوت ہے، قرآن واسوۂ رسولﷺ کی دعوت ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسولِ اکرمﷺ کی اتباع کی دعوت ہے۔

جب تلک اک قوم میں جذبہ نہ ہو اصلاح کا
اس کی حالت کو بدلتا ہی نہیں ہرگز خدا

بار آور سخت کوشی سے ہے ملت کا شجر
فرد کو بھی سعی پیہم ہی کا ملتا ہے ثمر

محنت و تدبیر کو صورت گرِ تقدیر کر
عزم واستقلال سے دنیا نئی تعمیر کر

علامہ اقبالؒ

☆☆

دعوت وتبلیغ کا نبوی طریقہ

● مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی

کسی نظریہ کو قبول کرنا اپنی زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھالنا اور پھر دوسروں کو اس کی دعوت دینا، دنیا کا مشکل ترین کام ہے، پھر اگر اس نظریہ کا تعلق اسلام جیسے جامع ہمہ گیر اور سچے مذہب سے ہے تو اس کے راستے اور بھی پرخار اور سنگلاخ ہوجاتے ہیں، مصائب و مشکلات ابتلاء اور آزمائش کا طوفان بلاخیز ہوتا ہے، جو مسلسل اور متواتر آتا ہے اور داعی کے صبر وشکیب اور مستقل مزاجی کا امتحان لیتا رہتا ہے، پوری مکی زندگی اسی آزمائش کی کہانی ہے اور حضورﷺ کا اس راستہ میں آبلہ پائی اور دعوت کے کام کو مسلسل اور مربوط انداز میں بڑھاتے رہنا دعوت وتبلیغ کا نبوی طریقہ ہے، یہ کام تکمیل ذات کے بعد دوسرں کی خیرخواہی اور انسان سازی کے نصب العین کے طور پر اختیار کرنا ہوتا ہے اور زندگی کے دوسرے کام کی طرح یہ کام بھی اسوۂ نبوی کو سامنے رکھ کر کرنا ضروری ہے، اس طریقہ سے ہٹ کر جو دعوت کا کام ہوگا، اس کے بارآور اور مفید ہونے کی توقع رکھنا فضول ہے، ایسے موقع سے فطرح طور پر یہ سوال ہوتا ہے کہ آخر وہ نبوی طریقہ کیا ہے جسے ملحوظ رکھنا چاہئے؟ اس مختصر مضمون میں اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱- داعیانہ کردار:

سب سے پہلی چیز داعی کا کردار ہے، آقاﷺ کی پاک وصاف اور محبوبانہ زندگی کی طرح ہماری زندگی سو فیصد تو نہیں ہوسکتی، کیونکہ ہم انبیاء کی طرح معصوم نہیں ہیں، لیکن آقاء

ﷺ کے کردار کی طرف جس طرح دشمن بھی انگلی نہیں اٹھاتے تھے اور ساری مخالفت کے باوجود اپنی امانتیں آپ ﷺ کے پاس رکھتے تھے، آپ کو سچا جانتے تھے، اسی طرح ایک داعی کو اپنی زندگی کو بنانا چاہئے اور اسے نہ صرف اندر سے اچھا ہونا چاہئے، بلکہ اسے اچھا دکھنا بھی چاہئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی رائے اس کے بارے میں بری نہ ہو اور آپ جو کچھ اپنی زبان سے دوسروں کو بتا رہے ہیں آپ کا عمل اس کی گواہی دے کہ دین حق کو اپنا کر اور اسلام پر عمل کر کے آپ ﷺ کی شخصیت جیسا پاکیزہ انسان وجود میں آسکتا ہے اگر آپ کی ذات میں وہ خوبیاں نہیں ہیں، تو اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ آپ عملی طور پر خود اپنی دعوت کی تکذیب کر رہے ہیں، ایسی صورت میں دعوت وتبلیغ کا کام بے اثر ہو جائے گا اور لوگ آپ کی تبلیغ کی طرف دھیان نہیں دیں گے۔

آج کل یہ مرض لوگوں میں بری طرح پھیل گیا ہے کہ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں اور خود فریبی میں مبتلا ہو کر یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام کچھ تقاضے ان سے بھی کرتا ہے، یہ خود فریبی دعوت وتبلیغ کے حق میں نہایت مضر ہے، یہ تمام جادو بیانی اور تحریری کاوشوں کی روح نکال دیتی ہے، قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے ایسے لوگوں پر سخت تنقید کی ہے اور فرمایا:

" اَتَأمُرُونَ النَّاسَ بِالبِرِّ وَتَنسَوْنَ اَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتابَ اَفَلاَ تَعْقِلُونَ." (البقرۃ:۴۴) (کیا غضب ہے کہ) کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے ہو کتاب کی، تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے)۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

" يٰاَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُوْلُونَ مَالا تَفْعَلُون. كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُولُوا مَالا تَفْعَلُونَ". (الصف: ۲ ۳)

(اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضگی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں)۔

خلاصہ یہ ہے کہ داعی کی کتاب زندگی اور کتاب دعوت میں پوری ہم آہنگی ہونی چاہئے، ورنہ پھر نتیجہ برعکس ہوسکتا ہے۔

۲-اخلاص:

اخلاص سارے کاموں کی روح ہے، اس لئے داعی کا ہر کام مخلصانہ ہونا چاہئے، اخلاص سے محروم دعوت کا کام محض اداکاری ہے جس سے اصلاح کا سوال پیدا نہیں ہوتا، قرآن کریم میں اس پر خاصا زور دیا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ لاَ يَنْظُرُ اِلىٰ صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُم وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلىٰ قُلُوبِكُم وَاَعْمالِكُم" (مشکوٰۃ عن مسلم) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت "اِنَّمَا الاَعْمالُ بِالنِّيات" کا بھی حاصل یہی ہے، اگر دعوت کا کام نام ونمود طلب جاہ ومنصب اور مال ودولت کے لئے ہے تو ایسی دعوت سے انہیں چیزوں کا حصول ہوگا، انسان سازی کا کام دھرا رہ جائے گا۔

۳-مقام ومنصب کی رعایت:

داعی کو جوش وولولہ میں مدعو کے مقام ومنصب کو نہیں بھولنا چاہئے، بلکہ حفظ مراتب کا پورا خیال رکھنا چاہئے، چھوٹوں سے شفقت اور بڑوں سے تعظیم وتوقیر کا معاملہ کرنے اس میں کوتاہی کرنے پر آقاؐ کی بڑی سخت وعید ہے۔ ارشاد فرمایا: "مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّر كَبِيرَنا فَلَيسَ مِنَّا" جو ہمارے چھوٹوں پر مہربانی نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ مدعو خواہ کوئی بھی ہو، سو اسے حقیر نہ سمجھا جائے اور ہر ایک تک اللہ کے پیغام کو پہنچانے کی کوشش کی جائے، حضورؐ کا حال یہ تھا کہ: وَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لاَ يُحَقِّرُ أحَداً يُبَلِّغُهُ رِسَالاتِ اللّٰهِ (ابونعیم، دلائل النبوۃ)۔

۴-موقع سے بات کہی جائے:

دعوت کا کام ایک اہم کام ہے، اس لئے موقع کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ ہر مجلس

میں گفتگو نہ کی جائے انتظار کیا جائے، کہ لوگوں کا ذہن دین کی بات سننے کو تیار ہو جائے، اپنی بات منوانے کی ضد نہ کی جائے، حکمت کے ساتھ اللہ کے احکام سنائے جائیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مجلس دوسرے ادیان یا طلبہ کے لئے منعقد کی گئی ہے ان میں جا کر کوئی سنے یا نہ سنے دعوت کے جوش میں اپنی بات کرنا اسلام کی عظمت کو ہلکا کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح چمٹنے والے گداگروں کی طرح دعوت کے کام کرنے سے بھی حضورﷺ نے منع فرمایا ہے۔ ''میں تمہیں اس حال میں نہ دیکھوں کہ تم کسی جماعت کے پاس جاؤ اور لوگ اپنے کسی کام میں مشغول ہوں اور اسی حال میں تم ان کو اپنا وعظ سنانا شروع کر دو، بلکہ تمہیں چاہئے کہ تم خاموش رہو اور جب لوگ فرمائش کریں تو ان کو سناؤ اور وہ خوش دلی سے سنیں۔''

مسلسل اور ہر وقت ایک ہی موضوع پر گفتگو کرنے سے بھی لوگوں کی توجہات اور خواہش میں کمی آتی ہے۔ اگر وقفہ وقفہ سے بات کہی جائے، تو لوگوں پر بار نہیں ہوتا اور انبساط باقی رہتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ہر جمعرات کو وعظ کیا کرتے تھے، بعض لوگوں نے ہر دن اسی مجلس کے سجانے کی تجویز رکھی تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا مجھے خدشہ ہے کہ ہر دن کا وعظ تم پر بوجھ ہو جائے گا، خود حضورﷺ بھی ناغہ کر کے لوگوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ (متفق علیہ)

روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: ''كَانَ عبداللّٰهِ بنُ مَسْعُودٍ يَذكر النَّاسَ فِي كُلِّ خَمِيسٍ لَوَدِدتُ اَنَّكَ ذَكَّرَ تَنَافِي كُلِّ يَومٍ قَالَ اَمَّا انَّهُ يَمْنَعُنِي مِن ذَالِكَ اِنِّي اَكْرِه اَنْ اُمِلَّكُم وَاِنِّي اَتَخَوَّفُ لَكُمْ بِالمَوعِظَةِ كَمَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰه ﷺ يَتَخَوَّلُنَا بِهِ مَخَافَةَ السَّامَةِ عَلَيْنَا.'' (متفق علیہ) (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ لوگوں کو ہر جمعرات وعظ کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ کیا کریں۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسا ہی کرتا کہ کہیں تم پر بوجھ نہ بن جاؤں میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمہیں نصیحت کرتا ہوں، جیسا کہ آنحضرت

ﷺ کو ناغہ کر کے نصیحت کرتے تھے کہ ہم بیزار نہ ہو جائیں)۔

۶- دعوت کا جوش و ولولہ:

داعی کو جوش و ولولہ سے لبریز ہونا چاہیے، روایات میں آتا ہے کہ آپ جب وعظ و نصیحت کرتے تو آنکھیں سرخ، آواز بھاری اور جوش تیز ہو جاتا، لب و لہجہ ایسا ہوتا کہ جیسے دشمن کے حملہ آور ہونے کے خطرہ سے آگاہ کر رہے ہوں۔

''كَانَ رَسُولُ اللّٰه ﷺ اِذَا خَطَبَ اِحْمَرَّت عَيْنَاهُ وَعلىٰ صَوتُه وَاشْتَدَّ غَضَبُه، حَتّٰى كَاَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ''. (رسول اللہﷺ جب خطبہ دیتے تو آنکھیں سرخ ہو جاتی، جوش تیز ہو جاتا ایسا معلوم ہوتا کہ آپ دشمن کی کسی فوج کے آپڑنے کے خطرے سے آگاہ کر رہے ہیں)۔

۷- بات مختصر اور جامع کرے:

تقریر مختصر اور جامع ہو تو زیادہ مناسب ہے، حضور اکرمﷺ نے فرمایا کہ مختصر خطبہ سمجھ بوجھ کی علامت ہے، ارشاد ہے۔ ''آدمی کی نماز کا طویل ہونا اور خطبہ مختصر ہونا اس کی سمجھ بوجھ کی علامت ہے، لہٰذا نماز لمبی کرو اور خطبہ مختصر کرو۔

۸- ضرورت ہو تو بات دہرائی جائے:

اگر مخاطب اور سامع کند ذہن اور کم فہم ہو تو اہم باتوں کو بار بار دہرانا چاہئے، تاکہ سننے والا اچھی طرح سمجھ لے۔ حضورﷺ کا بھی یہی معمول تھا کہ جب آپ کوئی بات فرماتے تو تین بار دہراتے، تاکہ خوب سمجھ میں آجائے۔

''كَانَ النَّبِي ﷺ اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ''.

(آنحضرتﷺ جب کوئی بات فرماتے تو اسے تین بار دہراتے تاکہ خود سمجھ میں آجائے)۔

۹-دعائے خیر کرتا رہے:

اصلاح سے مایوس ہونے کے بعد بھی عوام کے حق میں داعی کو دعائے خیر ہی کرنی چاہئے۔طائف کی گلیوں میں جب حضورﷺ کے پائے مبارک خون سے تر بتر ہو گئے اور فرشتوں نے اس قوم کو دو پہاڑوں کے بیچ پیس کر ہلاک کرنے کی تجویز پیش کی تو بھی رحمت اللعالمینﷺ انتہائی تحمل و بردباری سے فرمایا کہ میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ ان کی اولاد میں ایسے لوگ ضرور پیدا کرے گا جو اللہ کی پرستش اور اس کی عبادت کریں گے۔

"اَرْجُوا اَن یُخْرِجَ اللّٰہِ من اَصلابِھِم مَن یَعْبُدَ اللّٰہ وَحْدَہ لَایُشرِکُ شَیئًا "(متفق علیہ)(مجھے امید ہے کہ ان کی صلب سے اللہ ایسے لوگوں کو پیدا کریں گے جو ایک اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے)۔ایک دوسرے موقع پر حضورﷺ نے فرمایا کہ اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے یہ لوگ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں"۔اَللّٰھُمَّ اِھْدی قَومِی فَاِنَّھُم لا یَعْلَمُون".

ایک اور موقع سے جب طفیل بن عمرو دوسی نے حضور اکرمﷺ سے قبیلہ دوس کے حق میں بد دعا کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا الٰہی قبیلہ دوس کو ہدایت عطا فرمانا۔

۱۰-ترغیب دی جائے:

اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ترہیب سے زیادہ ترغیب کی احادیث وآیات پیش کئے جائیں،تا کہ لوگ نفرت کے بجائے خوشی اور تنگی کے بجائے فراخی محسوس کریں اور ان کے قلوب اللہ کی پیدا کردہ آسانی اور اس کی اتھاہ رحمتوں سے فیض یاب ہوسکیں، ورنہ بہت ممکن ہے کہ لوگ اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جائیں جو یقیناً اچھی علامت نہیں ہے،اسی لئے حضورﷺ نے فرمایا:

"بَشِّرُوا ولَا تُنَفِّروا یَسِّرو ولا تُعَسِّروا". (بخاری بعث معاذ الی

الیمن ج ۲ ص :۶۳۲)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غلط سلط احادیث بیان کی جائے۔ایسے لوگ بے دھڑک احادیث بیان کرتے ہیں۔ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔"مَنْ کَذَّبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّداً فَلْیَتَبَوَّاُ مَقْعَدَہ مِنَ النَّارِ " (جو شخص جان بوجھ کر میری طرف سے غلط بیانی کرے گا اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے گا)۔

یہ تو اخروی نقصانات ہیں،دنیا میں بھی داعی کی اس کمزوری نے ماضی میں وضع حدیث کا فتنہ کھڑا کر دیا تھا،علامہ ابن جوزی نے وضع حدیث کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک گروہ نے ترغیب وترہیب کے لئے حدیثیں گڑھیں،تا کہ وہ لوگوں کو بھلائی کی طرف لاویں اور برائی سے روکیں، حالانکہ انہیں جاننا چاہئے کہ ان کے اس عمل کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ شریعت ناقص ہے اور وہ اس کی تکمیل کے لئے ایسا کر رہے ہیں۔

"قَومٌ وَضَعُو الْاَحادِیثَ فِی الترغیبِ والتَّرھِیبِ لِیَجِیئُوا النَّاسَ فِی زَعْمِھِمْ عَلیٰ الْخَیرِ وَیَرجُرُھُمْ عَنِ الشَّرِّ وَھَذا تَعاطٍ عَلَی الشَّرعِیَّةِ نَاقِصَةٌ، تَحْتَاجُ تَتِمَّةٍ فَقَدْ اَتَمَمْنَا". (ایک گروہ نے ترغیب وترہیب میں حدیثیں گھڑیں تا کہ اپنے گمان کے مطابق وہ لوگوں کو بھلائی کی طرف لائیں اور برائی سے روکیں۔مگر یہ شریعت پر زیادتی ہے،ان کے اس عمل کا مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے، وہ تکمیل کی محتاج ہے جسے پس ہم نے اس کو مکمل کیا ہے)۔(کتاب الموضوعات ج۔)

☆☆

مدینہ کی اسلامی ریاست اور جہاد

● ڈاکٹر محمود حسن

جہاد کا مادہ ''ج ہ د'' ہے جو باب فتح اور سمع دونوں سے آتا ہے، باب فتح سے اس کے معنی ہیں پوری کوشش کرنا۔ سعی بسیار کرنا، باب مفاعلۃ سے اسی کا مصدر بنتا ہے مجاہدہ اور جہاد۔ اس کے معنی بھی وہی ہوتے ہیں، لیکن اصطلاحی معنوں میں یہ لفظ دین کی حفاظت اور اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ افتعال کے وزن پر اسی مادہ سے اجتہاد کا لفظ ہے۔ اس کے معنی بھی کسی امر میں پوری کوشش کرنا ہے، لیکن یہ لفظ اب فقہ کی ایک الگ اصطلاح بن گیا ہے جس کا مطلب نصوص کی غیر موجودگی میں کسی مساوی یا ملتے ہوئے نصوص پر قیاس کرتے ہوئے کوئی حکم لگانا ہے۔

یوں تو انسان کی پوری زندگی ہی جہاد اور مجاہدہ سے عبارت ہے، لیکن اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمان کی پوری زندگی کو مقدس بنا دیا ہے۔ ''**جاهدوا في الله حق جهاده**'' (الحج ۷۸) (وراللہ تعالیٰ کی راہ میں کوشش کرتے رہو، جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے)۔ (جو ہماری رضا اور خوشنودی کی طلب میں سعی بسیار کرے گا، ہم اسے ہدایت کا راستہ دکھلائیں گے'' (العنکبوت: ۶۹) ''جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد کرے گا وہ اپنے ہی فائدے کے لئے کرے گا'' (العنکبوت: ۶) ''**يا يها الذين آمنوا اتقوا الله وابتغوا أليه الوسيلة**'' (المائدہ: ۳۵) (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے لئے وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں سعی بسیار کرتے رہو) لیکن جہاد کا لفظ قرآن کریم میں

بکثرت مقامات پر واضح طور سے قتل فی سبیل اللہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کے لئے کہیں جہاد فی سبیل اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور کہیں صرف جہاد ہی سے قتال فی سبیل اللہ مراد لیا گیا ہے۔ اول کی مثال: ''اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا، یہی لوگ رحمت الٰہی کے طلبگار ہیں'' (البقرہ: ۲۱۸) ل•''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ عالی مقام ہیں'' (التوبہ: ۲۰) دوم کی مثال: ''**امحسبتم أن تدخلوا الجنة ولما يعلم الله الذين جاهدوا منكم ولعلم الصابرين**'' (کیا تم گمان کر بیٹھے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ابھی تک جانا ہی نہیں ہے۔ (یہاں علم کا لفظ زمانے کے لئے استعمال ہوا ہے) ''کہ تم میں سے کس نے جہاد کیا ہے اور کس نے صبر سے کام لیا ہے)۔ (آل عمران: ۱۴۲) ''وہ لوگ جو بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ جہاد میں حصہ لیا یہ لوگ بھی تم ہی میں سے ہیں۔'' (الانفال: ۷۵)

اسلام کے قیام وبقا اور توسیع میں جہاد ہی کی کارفرمائی رہی ہے، لیکن یہ جہاد Crusade (مذہبی جنگوں) کے معنی میں نہیں ہے، جیسا کہ مخالفین اور معاندین اسلام نے باور کرا رکھا ہے اور اسلام پر طعن کرنے کے لئے بطور گالی اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔ جہاد ایک بے حد وسیع الاطراف لفظ ہے، جہاد بالسیف جس کا صرف ایک جزو ہے۔ دراصل مسلمان کی پوری زندگی جہاد ہی سے عبارت ہے اور اگر زندگی کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا تابع کر دیا جائے تو پوری زندگی جہاد کا ثواب مل سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فکر وعمل کو جہاد زندگانی سے تعبیر کیا ہے:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

رسول اکرمؐ نے نفس کے جہاد کو جہاد اکبر کا نام دیا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ

میں رسالت کے تیرہ سال گزارے، اس زمانہ میں یمن کے علاوہ جزیرۃ العرب میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی، لیکن خانۂ کعبہ کی مرکزیت کی وجہ سے مکہ میں مختلف خاندانوں نے عوامی ضروریات کے تحت ذمہ داریاں تقسیم کر رکھی تھیں، ان میں قصی کا مرتبہ سب سے اعلیٰ تھا، کیونکہ حجابہ، سقایہ، رفادہ، ندوہ اور لواء سب اسی سے متعلق تھے۔ (ابن ہشام، اردو، ۱/۱۵۱) یہ تمام خدمات بجائے خود ایسی عالی مرتبت تھیں کہ ابنائے قصی کو عملاً مکہ کی سرداری حاصل ہو چکی تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ کو نبوت حاصل ہونے کے بعد اہل ایمان کے سامنے اطاعت کا مسئلہ آ گیا جو کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص تھا، لیکن شوکت اور قوت سے محروم ہونے کے باعث مسلمان غربت اور بیچارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے ان کا سوشل بائیکاٹ بھی کیا گیا اور وہ شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہے۔ (الرحیق المختوم، علی گڑھ ۱۷۲) انہیں دوبارہ حبشہ بھی ہجرت کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔

ہجرت مدینہ تاریخ اسلامی کا اہم ترین سنگ میل ہے، کیونکہ یہیں سے اسلام کی شوکت کا آغاز ہوا ہے۔ یہ وہ مبارک سفر ہے، جس میں قوانین جہاد کی پہلی دفعہ مرتب ہوئی، جب سراقہ بن مالک بن جعشم کو تحریری امان نامہ دیا گیا۔ (الرحیق المختوم ۲۶۷، ابن ہشام ۱/۵۳۹ رحمۃ للعالمینؐ (اعتقاد، ۲۰۰۱ء) ۱/۸۲) اس سے قبل آپ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر یثرب (مدینہ) میں بارہ نقیب مقرر فرما چکے تھے جو دارالہجرت میں مستقبل کی اسلامی حکومت کے امین تھے۔ ان لوگوں کی کوششوں سے اوس اور خزرج کی باہمی دشمنی اور ایک دوسرے کے خون کی پیاس ختم ہو چکی تھی۔ مکہ سے آپؐ اور مسلمانوں کی ہجرت کفار کے عزائم پر ایک کاری ضرب تھی۔ اسے باعث ذلت سمجھا گیا، اس لئے انہوں نے قسمیں کھالیں کہ وہ ہادی اسلام ﷺ اور مسلمانوں کو فنا کے گھاٹ ہی اتار کر دم لیں گے۔ آنحضور ﷺ ان خونخوار وحشیوں کی غارت گرانہ عادت سے بخوبی واقف تھے۔ حزم و احتیاط کا

تقاضہ تھا کہ دشمن کی حرکات وسکنات کی خبر رکھی جائے۔ ان کی فوجی تیاریوں اور تدابیر جنگ کو نگاہ میں رکھا جائے اور ان کے تدارک کی بھرپور کوشش کی جائے۔ اس ذیل میں آپ ﷺ نے جو اہم کام کئے وہ سب دفاع ہی کے تحت آتے ہیں۔ ذیل میں ہم چند کاموں کا جائزہ لیں گے۔

(۱) مہاجرین کا مسئلہ ہر زمانے میں نہایت اہمیت کا موضوع رہا ہے۔ آج کل اس مقصد کے لئے الگ وزارتیں قائم ہوتی ہیں۔ اقوام متحدہ کا تو ایک باقاعدہ شعبہ ہی اسی مقصد کے لئے کام کرتا رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مہاجرین اور انصار میں مواخات کرائی۔ اب انصار کے دو قبائل اوس اور خزرج کے ساتھ مکہ کے مہاجرین مل کر ایک قبیلہ بن چکے تھے اور افرادی قوت کے ساتھ دفاعی قوت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

(۲) آپؐ نے اقامت صلوٰۃ کے لئے پہلی مسجد قبا تعمیر کی۔ پھر قبیلہ بنی نجار میں مرکزی مسجد تعمیر ہوئی جو مسجد نبوی کے نام سے دنیائے اسلام کی تین مقدس مساجد میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی تحقیق کے بموجب بلاذری نے لکھا ہے کہ مدینہ میں عہد نبوی میں نو مساجد تھیں۔ (ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بھاولپور، دہلی ۳۱۴/ بحوالہ بلاذری)

(۳) مذکورہ دونوں کام تعلیم وتربیت اور کفاف کی خاطر تھے۔ تیسرا کام جو آپؐ نے مدینہ تشریف لانے کے فوراً بعد کیا وہ سیاسی نوعیت کا تھا۔ آپؐ نے مدینہ اور اطراف کے قبائل کے ساتھ دفاعی معاہدات کئے۔ اس زمانہ میں شہر مدینہ میں یہود کے تین قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ خصوصیت سے آباد تھے۔ ان کے علاوہ ایک قبیلہ بن ثعلبہ کا بھی تھا۔ یہودی کی بستیاں اور قلعے شمال میں خیبر تک چلے گئے تھے۔ آپؐ نے ان تمام قبائل کو معاہدات میں شامل کر کے انہیں ایک دفاعی لڑی میں پرو دیا۔ ان معاہدات کے الفاظ احادیث اور سیر کی کتابوں میں بحمد اللہ محفوظ ہیں (ابن ہشام ۱/۷۶، الرحیق المختوم ۲۹۹،

رحمۃ للعالمین ۱/۹۵، ۹۶) آپؐ نے قبائل کو ہمنوا بنانے کے لئے شمال میں قبیلہ جہنیہ کی طرف اور اسی اطراف میں دیگر قبائل کا دورہ کیا اور الحمد للہ سبھوں سے دفاعی معاہدات کرنے میں کامیاب رہے۔

(۴) اسلامی ریاست پر اہل مکہ کی ترکتازیوں کے خلاف آپ ﷺ نے جاسوسی کا وسیع نظام قائم کیا، جس کے لئے ایک سے زیادہ ذرائع استعمال فرمائے۔ اس کی دلچسپ مثالیں ہمیں غزوہ بدر کی ابتدا میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بلاشبہ غزوات میں مسلمانوں کی کامیابیاں رسول اللہ ﷺ کی فراست جنگی کی مرہون منت تھیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ آپ ﷺ کے پاس ایک بدو لایا گیا۔ وہ قریش کی فوج کی تعداد نہیں بتا سکا، لیکن مزید استفسار پر اس نے بتلایا کہ ان کے کھانے کے لئے ایک دن میں نو اونٹ اور دوسرے دن دس اونٹ ذبح ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فوراً حساب لگا لیا کہ ان کی تعداد ساڑھے نو سو ہے۔ مزید برآں آپ ﷺ کو ابوسفیان کے تجارتی قافلہ اور ابوجہل کے لشکر کی خبر رہتی تھی۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھود کر مدینہ کو محفوظ کر لینا اسی جاسوسی کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا۔ ہمارے پاس اس سلسلہ میں بدر واحد، احزاب اور خیبر وغیرہ کی جنگوں کی پوری تفصیلات محفوظ ہیں۔ افسوس کہ آج کی دنیا میں یہ نظام یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس پہنچ گیا ہے اور مسلمان بالکل مفلس اور تہی دست ہو کر رہ گئے ہیں۔

(۵) اگرچہ آپ ﷺ خود مدینہ جیسی چھوٹی سی جگہ میں محصور تھے، لیکن آپ ﷺ کو قریش کی اس کمزوری کا علم تھا، کہ ان کی معیشت کا مدار تجارت پر ہے۔ چنانچہ گرمیوں میں ان کا سفر شام اور فلسطین کی طرف ہوا کرتا تھا اور سردیوں میں یمن کی طرف، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بتلایا ہے (تلخیص تفہیم القرآن) چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی معیشت پر ضرب لگانے کی خاطر تجارتی قافلوں کی ناکہ بندی کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جنگ بدر سے پہلے قافلہ قریش کی آپ ﷺ نے سات مرتبہ ناکہ بندی فرمائی تھی۔ (ڈاکٹر حمید اللہ-

خطبات ۲۶۶) جنگ بدر کے موقع پر ابوسفیان کا قافلہ بھی اپنی جاسوسی کی صلاحیت کی بنا پر بچ کر نکل گیا تھا۔ قرآن کہتا ہے: ''اور قافلہ تمہارے زیریں جانب تھا'' (الانفال ۴۲) معاشی ناکہ بندی کا عمل آج کے زمانہ میں بھی جاری ہے، لیکن اس ترقی یافتہ دنیا میں انسانی جان کی کوئی حرمت اور قیمت نہیں۔ افریقہ اور ایشیا کے مسلم ممالک پر معاشی تحدیدات عائد کر کے لاکھوں آدمیوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا اقوام مغرب کے لئے اقوام متحدہ کا ایک انعام ہے۔

(۶) جہاں دشمنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے جاسوسی نظام قائم تھا وہیں اپنی فوجوں کے بارے میں مکمل رازداری آپ ﷺ کی فوجی حکمت عملی تھی۔ چنانچہ مکہ کے وقت اہل شہر کو اس وقت تک اس کا علم نہیں ہو سکا جب تک اسلامی فوجوں نے اطراف کے ٹیلوں پر قبضہ نہیں کر لیا۔ ابوسفیان اس وقت مسلم فوجوں کی تحویل میں تھا۔ اس کی وجہ سے انسانی اتلاف جان نہیں کے برابر ہوا۔ ابوسفیان کو جانے کی اجازت اسی لئے نہیں دی گئی کہ اس کی واپسی زیادہ کشت وخون کا سبب بن سکتی تھی۔

(۷) آپ ﷺ کا کام کشت وخون برپا کرنا نہیں تھا، بلکہ لوگوں کو راہ حق دکھانا تھا۔ جیسے ہی آپ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا مکہ کی پوری آبادی اسلام لانے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ اگر مکہ جنگ کے ذریعہ فتح ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ اس سے انتقام کی پیاس قدر بجھ جاتی، لیکن دعوت دین کا کام نہ ہو پاتا۔

(۸) آپ ﷺ کی مشہور حدیث ہے ''**الحرب خدعة**'' (جنگ دھوکہ کا نام ہے) (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، ابن ہشام) اس کے تحت آپ ﷺ نے غزوہ خندق کے موقع پر یہود بنی قریظہ اور اہل مکہ کے درمیان بے اعتمادی پیدا کرنے کی اجازت دی، جس کی وجہ سے ان میں پھوٹ پڑ گئی اور بلآخر اہل مکہ کے واپس جانے کے بعد فوراً بنو قریظہ سے عہد شکنی کا انتقام لیا گیا اور ان کے تمام جنگی مرد قتل کئے گئے۔

(۹) جنگی تدابیر کے ذیل میں آپؐ چند باتوں کا لحاظ فرماتے تھے: (۱) بلندی کی جگہ، تاکہ دشمن فوج کی نقل وحرکت سامنے رہے اور اپنی فوجوں کو مناسب حرکت دی جاسکے۔ (۲) چشمۂ آب تک رسائی۔ جیسا کہ جنگ بدر کے موقع پر کیا گیا۔ (۳) محفوظ میدان۔ تاکہ فوجوں کو نقل وحرکت کی سہولت رہے۔ (۴) سورج کے مقابل رخ۔ تاکہ سورج کی کرنیں آنکھوں کو چکاچوند نہ کرسکیں اور دشمن اس فائدہ سے محروم اور اس پریشانی کا شکار رہے۔ (۵) جنگ کی ابتدا کرنے کے لئے صبح کا انتخاب، تاکہ فوجیں تروتازہ میدان میں اتریں۔ مزید یہ کہ صبح کے وقت مسلمان اللہ کو خصوصیت کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ (۶) کمزور جگہ کی ناکہ بندی۔ جیسا کہ احد میں جبل رماۃ پر تیراندازوں کا دستہ متعین کرکے کیا گیا (۷) فوج کے لئے محفوظ جگہ کا انتخاب جیسا کہ بدر اور احد دونوں جنگوں میں پہاڑی قوسوں کے درمیان اپنی فوجوں کو جمایا گیا۔ (۸) ہوا کے مناسب رخ پر قیام۔ (۹) تالیف قلب، شہادت حق کا ایک جز ہے۔ جنگ خندق میں عرب کے تمام قبائل پسپا ہوکر واپس گئے تھے۔ اس کے بعد عرب میں زبردست قحط پڑا تھا، یہاں تک کہ مکہ میں فاقہ کشی کی نوبت آگئی تھی۔ اس وقت سوائے نجد کے کہیں غلہ نہیں تھا، لیکن چونکہ وہاں کے رئیس ثمامہ بن اثال مسلمان ہوگئے تھے، انہوں نے مکہ والوں کو غلہ کی فراہمی روک دی تھی۔ ابوسفیان نے قرابتی حقوق کا واسطہ دے کر آپؐ سے درخواست کی کہ غلہ کی فراہمی بحال کردی جائے۔ نبی رحمتؐ نے اہل مکہ کی تالیف قلب کے لئے نہ صرف غلہ بھجوایا بلکہ پانچ سو اشرفیوں کی امداد بھی بھجوائی، تاکہ مکہ کے غریبوں میں تقسیم کردی جائے۔ (ڈاکٹر حمیداللہ، خطبات ۲۸۲) اس نیکی کا اثر ابوسفیان اور اہل مکہ پر یقیناً پڑا ہوگا۔

مدینہ میں قیام کے ابتدائی پانچ سالوں میں رسول اللہ ﷺ کو بار بار اعدائے اسلام کی فوج کشی کا سامنا کرنا پڑا کبھی کبھی اسلامی لشکر بھی احتیاطی تدابیر کے طور پر باہر نکلتا تھا۔ یہاں تک کہ غزوۂ احزاب (۵ ہجری) کے خاتمہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اب ہم ان

پر چڑھائی کریں گے۔ وہ ہم پر چڑھائی نہ کرسکیں گے، اب ہمارا لشکر ان کی طرف جائے گا۔'' (بخاری بحوالہ الرحیق المختوم ۴۴۷) ان جنگوں کو اور مابعد پیش آنے والی جنگوں کو جن میں حضور ﷺ نے خود شرکت فرمائی ہے۔ سیرت نگاروں نے غزوہ کا نام دیا ہے اور جن میں آپ ﷺ کی شرکت نہیں ہوئی، انہیں سریہ کہا گیا ہے۔ یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ ان بزرگوں نے ان لڑائیوں کو جہاد کا نام نہیں دیا۔ اگرچہ ان جنگوں کی اجازت اللہ تعالیٰ نے احکام جہاد ہی کے تحت دی تھی۔ اس لئے ان غزوات وسرایا کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کا تعین کرلیا جائے کہ اسلامی جنگ کے مقاصد کیا ہیں؟

قرآن اور سیرت کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام میں اقدامی جنگ کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ جہاں مسلمان نہ بستے ہوں وہاں اسلامی حکومت قائم ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ کیونکہ اسلامی احکام مسلمانوں کے اوپر نافذ ہوتے ہیں غیر مسلموں کے اوپر نہیں۔ اسلامی نظام دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ یہ استعمار یا سامراجیت نہیں ہے۔ روم اور ایران سے مسلمانوں کی جنگیں بھی اقدامی نوعیت کی نہیں تھیں۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ جنگ کی جتنی بھی صورتیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ مدینہ کے ماحول میں ان سب کو دفاعی جنگ سے موسوم کیا جائے گا۔ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جنہیں اقدام کے لئے مثبت دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

(۱) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کا مقصد وجود بتلایا گیا: ''**کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر و تومنون بالله**'' (آل عمران: ۱۱۰) (تم بہترین امت ہو جنہیں لوگوں سے الگ کیا گیا ہے کیونکہ تم معروفات کا حکم دیتے ہو اور منکرات سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔) نیکی کا حکم دینا تو بطور وعظ ونصیحت کے بھی ہوسکتا ہے، لیکن منکرات سے روکنے کے لئے قوت درکار ہے۔ آپؐ نے ایک حدیث میں حکم دیا ہے: ''**من رأی منکم منکرا فلیغیره**

بیدہ و ان لم یستطع فبلسانہ و ان لم یستطع فبقلبہ و ذٰلک اضعف الایمان" (تم میں سے جو شخص کوئی برا کام دیکھے تو اسے چاہیے کہ اسے بزور قوت روک دے، اگر یہ نہ کرے تو زبان سے منع کرے اور اس کی بھی قوت اسے حاصل نہ ہو تو چاہیے کہ اسے دل سے برا سمجھے، لیکن یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے) (مسلم) یہ حکم بہت تاکید کی ہے۔ قرآن کریم میں اس سلسلہ میں بنی اسرائیل کے تین گروہوں کی مثال دی گئی ہے، جن میں سے ایک سبت کے احکام کو توڑنے کا مجرم تھا، دوسرا فریضہ نہی عن المنکر ادا کرتا تھا اور تیسرا دوسرے گروہ کو اسی فریضہ کی ادائیگی سے روکتا تھا۔ پہلے گروہ کو دردناک عذاب (عذاب بئیس) نے آلیا تھا۔ دوسرے گروہ کو اللہ تعالیٰ نے بچالیا تھا اور تیسرے کے بارے میں اگرچہ قرآن خاموش ہے، لیکن مفسرین کا گمان ہے کہ شاید یہ گروہ بھی مبتلائے عذاب ہوا تھا۔ (الاعراف:۱۶۳-۱۶۵) ایک حدیث میں نہی عن المنکر سے غافل گروہ کو جہاز کے پیندے میں سوراخ کرنے والوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو بشمول خود پورے جہاز کی غرقابی کا سبب بنتا ہے۔ (بخاری)

(۲) دفع فتنہ- اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس طرح دیا ہے: "**فاقتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلمہ اللہ**" (البقرہ:۱۹۳) (اور انہیں قتل کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے")

لیکن یہ دونوں صورتیں بھی اقدامی جنگ کو ثابت نہیں کرتی ہیں۔ نہی عن المنکر دراصل اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ عامۃ المسلمین کے لئے مذکورہ حدیث مسلم ہی نے تین درجے مقرر کردئے ہیں۔ دفع فتنہ کی کوششیں منکرات تک محدود نہیں ہیں، بلکہ شورش اور ہنگامہ یا فساد فی الارض کو بھی محیط ہیں، جیسا کہ سورہ انفال میں بھی بیان ہے۔ قرآن کریم میں متعدد دوسری جگہوں پر کہیں وضوح اور کہیں اشارے ہیں، لیکن دراصل یہ بیان جنگ کے طریق کار کے وضوح کی خاطر ہے، یعنی جب جنگ شروع ہو جائے تو دشمن کو اچھی طرح کچل دو

اور ان کی گردنوں پر وار کرو اور جوڑ جوڑ مارو" (الانفال:۱۲) جب اہل کفر سے مڈبھیڑ ہو تو تمہارا کام گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب خوب خون بہالو تو اسیروں کو مضبوطی سے باندھو، پھر خواہ انہیں احسان کرتے ہوئے رہا کردو اور دفع فتنہ کی خاطر حکم دیا گیا ہے کہ ائمۃ الکفر کو ٹھکانے لگادو (کفر کے سرداروں کو قتل کردو) (التوبہ:۱۲) چنانچہ جنگ بدر میں اسی حکم پر عمل کرتے ہوئے تمام سرداران قریش کو میدان جنگ ہی میں قتل کردیا گیا تھا۔ بلکہ خاطر خواہ خونریزی کرلینے سے پہلے گرفتاریاں شروع کردینے پر اللہ تعالیٰ کا عتاب بھی آیا تھا۔ (الانفال:۶۸) رسول اللہ ﷺ نے جنگ کو اسی لئے تنور کی بھٹی سے تشبیہ دی ہے **حمی الوطیس** (بھٹی گرم ہوگئی، یعنی جنگ شباب پر آگئی) (الجہاد فی الاسلام باب سوم) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسی لئے ان دونوں صورتوں کو مصلحانہ جنگ میں شمار کیا ہے۔ (واضح رہے کہ 'الجہاد فی الاسلام' جو جہاد کے موضوع پر ایک مکمل اور سیر حاصل بحث پر مبنی کتاب ہے میں اقدامی جنگ کا کوئی باب نہیں) مدافعانہ جنگ کی جو صورتیں قرآن کریم کے نصوص سے ثابت ہوتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) ظلم وتعدی کا جواب:

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور ظلم وتعدی مت کرو۔ بے شک اللہ ظلم وتعدی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" (البقرہ:۱۹۰) اس آیت میں کفار کی جنگ کو تعدی سے تعبیر کیا گیا ہے "جن کے خلاف جنگ جاری ہے ان کو جنگ کی اجازت دے دی گئی، کیونکہ ان کے اوپر ظلم ڈھایا گیا ہے..... انہیں ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا ہے" (الحج:۳۹-۴۰) سورہ بقرہ کی آیت میں تعدی اور سورہ حج کی آیات میں ظلم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

(۲) راہ حق کی حفاظت:

اسلام ایک صالح طریق فکر اور اس پر گامزن ہونے کا نام ہے۔ یہی فکر و عمل بندۂ خدا کے لئے مومن بننے کی ضمانت ہے۔ اس لئے اسی طریق فکر کی حفاظت اور اشاعت ایک مومن کی ذمہ داری ہے۔ جب اس طریق فکر پر کہیں سے آنچ آئے تو اس کا دفاع مومن کا حق بھی ہے اور اس کی ذمہ داری بھی۔ اگر وہ اس کام سے پہلو تہی کرے گا تو اس کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ مکہ سے مسلمانوں کی ہجرت کا سبب (اور اصحاب کہف کا غار میں پناہ لینا) اسی حق کی پامالی تھی، لیکن قریش مکہ نے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ اسلام کا راستہ روکنے اور اسے مٹا ڈالنے کے لئے بار بار مدینہ کی اسلامی حکومت پر حملہ آور ہوتے رہے۔ اللہ نے اسی کا نقشہ کھینچا ہے: ''جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے، وہ اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لئے صرف کر رہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے، مگر آخر کار یہی کوششیں ان کے لئے پچھتاوے کا سبب بنیں گی، پھر وہ مغلوب ہوں گے۔ (الانفال:۶۳) اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے راہ حق کے روکنے والوں سے نہ صرف جنگ کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، بلکہ جنگ کا فیصلہ بھی سنا دیا ہے۔

(۳) دغابازی اور عہد شکنی کی سزا:

صلح حدیبیہ ۶ھ میں واقع ہوئی۔ اس شرائط میں ایک دفعہ یہ تھی کہ فریقین دس سال تک آپس میں نہ جنگ کریں گے اور دوسری دفعہ یہ تھی کہ قبائل اور دونوں فریقوں میں سے جس کے ساتھ عہد و پیمان میں شامل ہونا چاہیں شامل ہو سکتے ہیں۔ یہ پیمان صلح ان کے اوپر بھی نافذ ہوگا، لیکن قریش مکہ نے غدر کر کے اس معاہدہ کو توڑ ڈالا اور خزاعہ پر حملہ کرنے والے بنو بکر کی ہتھیاروں اور افراد سے مدد کی۔ اس کے نتیجہ میں رسول اللہ ﷺ نے بحکم الٰہی مکہ پر چڑھائی کی اور اسے بزور فتح کر لیا۔ اس کا ذکر قرآن میں ہے: ''ان میں سے وہ لوگ

جن کے ساتھ تو نے معاہدہ کیا پھر وہ اس کو ہر موقعہ پر توڑتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف نہیں کرتے۔ پس اگر یہ لوگ تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد دوسرے جو لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں، ان کے حواس باختہ ہو جائیں۔ توقع ہے کہ بدعہدوں کے اس انجام سے وہ سبق لیں گے'' (الانفال:۵۶-۵۷) اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ساتھ ہی ایک اصول بھی مقرر کر دیا کہ ''اور جب تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدہ کو اعلانیہ اس کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا'' (الانفال:۵۸) اس حکم پر عمل آوری کے لئے اللہ تعالیٰ نے چار مہینہ کا الٹی میٹم کا وقت مقرر کر دیا: ''اعلان برأت ہے اللہ اور رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔'' (التوبہ:۲۰۱)

(۴) دفاعی جنگ کی یہ تین صورتیں بیرونی دشمنوں کے لئے تھیں، لیکن چونکہ مسلمانوں کو اندرونی دشمنوں سے بھی سابقہ پڑتا رہتا ہے، اس لئے ان سے نپٹنے کی بھی اللہ نے گنجائش رکھی ہے۔ یہ بھی اسلامی حکومت کا حق دفاع ہے۔ ہم آگے چل کر مغربی قوموں کے کردار کا رسول اللہ ﷺ کے عملی کردار سے بھی موازانہ کریں گے کہ کس طرح یہ قومیں اس حق کا استعمال نہیں، بلکہ استحصال کر رہی ہیں۔ مدینہ میں مسلمانوں کے دشمن یہودی نہیں تھے، بلکہ منافقین بھی تھے۔ ان کی تاریخ تو اس زمانہ سے لے کر آج تک پھیلی ہوئی ہے۔ منافقین وہ لوگ تھے، جو' کافر نہ توانی شدنا چار مسلماں شو' کی لعنت میں گرفتار تھے۔ ان کا ایمان حقیقی نہیں، بلکہ ظاہر داری کا اور عمل اخلاص کی نیت سے نہیں، بلکہ ریاکاری پر مبنی تھا۔ اندر ہی اندر یہ مسلمانوں کی جڑ کھودنے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے واضح احکام دئے ہیں۔ اسے ہم ''اندرونی دشمنوں کا استیصال'' کا عنوان دے سکتے ہیں۔ دفاع کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ ان کو کفار کے مساوی قرار دیتا ہے۔ حکم ہوا ہے: ''اے

نبی! کفار اور منافقین کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ آخر کار ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے'' (التوبہ:۷۳)

(۵) حفاظت امن:

داخلی فتنوں میں لٹیرے، ڈاکو اور باغی شامل ہیں، جو امن کو غارت کر کے اسلامی حکومت کو فتنہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ قرآن پاک اس حرکت کو اللہ اور رسول ﷺ کے خلاف جنگ کے مترادف قرار دیتا ہے۔ تاریخ اسلام میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے بھی مقابلہ کرنے کا حکم دیتا ہے، تاکہ رعایا امن وسکون کے ساتھ رہے، لیکن بیرونی دشمنوں کے برخلاف انہیں توبہ کرنے کا موقع حاصل ہے، بشرطیکہ اسلامی لشکر کے ساتھ مڈبھیڑ ہونے سے پہلے انہیں عقل آجائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ ودو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں اور سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا جلاوطن کر دئے جائیں یہ ذلت ورسوائی ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر (اس سے مستثنیٰ وہ لوگ ہیں) ''جو توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔'' (المائدہ:۳۳-۳۴)

(۶) مظلوم مسلمانوں کی حفاظت:

اسلام پوری انسانیت کا دین ہے۔ یہ کسی پر بجبر نافذ نہیں کیا جاتا، دین میں کوئی زور و زبردستی نہیں۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔'' (البقرہ:۲۵۶) ایمان لانے کے

بعد دنیا کے تمام مسلمان ایک ہی رسی میں پروئے جاتے ہیں۔ یہ حبل اللہ کی رسی ہے اور اس رسی کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اللہ کا حکم ہے: آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال، جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی ومددگار پیدا کر دے'' (النساء:۷۵)

اللہ تعالیٰ اسلامی حکومت کو اختیار دیتا ہے کہ اگر مسلمان کسی ملک میں ذلت کی زندگی گزار رہے ہوں اور وہاں انہیں اپنے ایمان اور جان ومال اور آبرو کو خطرہ لاحق ہو تو ان کی مدد کے لئے پیش قدمی کی جاسکتی ہے اسے دفاع ہی گردانا جائے گا۔ (دفاع کی یہ چھ صورتیں ''الجہاد فی الاسلام'' کے باب دوم سے مستفاد ہیں)۔

صدر اسلام کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ایران کی جنگ کا سبب کسریٰ کا جبر واستبداد اور استحصال جس کی چکی میں ملک کے عوام کے علاوہ عراق کی عرب رعایا بھی پس رہی تھی اور ایران اپنی خانہ جنگی کے باوجود خود کو اتنا قوی محسوس کرتا تھا کہ اپنی رعایا کو حسب دلخواہ قابو میں رکھ سکے۔ روم کی سلطنت اسلامی حکومت کو خطرہ محسوس کرتی تھی، اسی لئے شام کی جنگوں میں ابتدا رومیوں ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس طرح یہ تمام ہی جنگیں دفاعی نوعیت کی تھیں۔

ہمارے زمانہ میں جنگ کی فتنہ سامانیاں، ہلاکت خیزیاں عروج پر ہیں۔ یہ تمدن وتہذیب کا زمانہ کہلاتا ہے اور غالب قوموں کا معیار امن وجنگ انسانیت کا پیمانہ بن چکا ہے، لیکن یہ قومیں جب اور جس کے خلاف چاہتی ہیں، جنگ چھیڑ دیتی ہیں۔ ان طاقتوں نے امن کے قیام کے لئے ایک بین الاقوامی ادارہ قائم کر رکھا ہے، جس کا نام 'اقوام متحدہ' ہے۔ پہلے اس کی جگہ ایک دوسرا ادارہ تھا جو 'مجلس اقوام' کہلاتا تھا جس کے بارے میں حکیم مشرق نے کہا تھا۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

(میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ کچھ کفن چوروں نے قبروں کی تقسیم کے لئے انجمن بنالی ہے)

موجودہ اقوام متحدہ بھی اسی کی جانشینی کررہی ہے۔اس کی ناک کے نیچے اتنی جنگیں ہوچکی ہیں اوراتنے افرادلقمۂ اجل بن چکے ہیں کہ جب سے دنیاوجود میں آئی ہے تب سے اب تک جنگوں میں اتنے افراد ہلاک نہ ہوئے ہوں گے۔اب امریکہ اور برطانیہ نے حفاظت خوداختیاری کے لئے اقدامی پیش بندی(Preimtive Strike) کی اصطلاح وضع کرلی ہے۔بیسویں صدی کی دوعظیم جنگوں اورافغانستان وعراق کی حالیہ جنگوں تک کم از کم ایک کروڑ وجانوں کی ہلاکت ان طاقتوں کی عدل گستری کی ممنون کرم ہیں۔اس تناظر میں جب رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی میں پیش آمد جنگوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے،تو حیرت انگیز مسرت ہوتی ہے،اتنے قلیل اتلاف جان کے ساتھ ایک معرکۃ الآرا تہذیب روئے زمین پرنمودار ہوگئی اورایک صدی کے اندرنصف دنیاپراس کا قبضہ وتسلط ہوگیا۔یہاں نہ کوئی استعماریت تھی، نہ کوئی استیصال تھا۔مقام تاسف ہے کہ ایسے پرامن انقلاب کو وہ لوگ خونیں انقلاب کا نام دیں،جن کے دامن سے اس وقت بھی لہوٹپک رہا ہے۔

آپ ﷺ کو مدینہ کتنی بارنکلنا پڑایا وہ خود نکلے ان سب کی مجموعی تعداد۸۲ ہوتی ہے۔ سیرت نگاروں نے اس کی پوری تفصیلات بھی مہیا کی ہیں۔یعنی مقابل فریق کا نام، دونوں فریقوں کی تعداد، مقابلہ یا کام کی نوعیت نتیجہ اورقتل واسارت وغیرہ کی تفصیلات (رحمۃ للعالمینؐ ۲/۲۰۰) اس سلسلہ میں قاضی سلیمان منصور پوریؒ نے پورے دور رسالت کے مسلمان شہداء کے نام تک تمام مصادر کو کھنگال کراوراکٹھا کردئے ہیں۔ (رحمۃ للعالمینؐ ۲/۲۱۴ تا ۲۳۲)

مخالفین کے اسیروں کی سب سے بڑی تعداد جنگ حنین سے تعلق رکھتی ہے، یہ جنگ فتح مکہ کے بعدلڑی گئی تھی اوردشمنوں کے چھ ہزارآدمی قید ہوئے تھے۔ان میں سے کچھ کوحق قرابت کی بناپراور کچھ کوفدیہ لے کررہا کردیا گیا تھا۔مجموعی طور سے مدینہ کے دس سالہ دور نبوت میں ۶۳۴۷ قیدیوں کوازراہ لطف وکرم بلاکسی شرط کے آزادکیا گیا تھا۔صرف دوقیدی ایسے تھے جواپنے سابقہ جرائم کی پاداش میں قتل کئے گئے۔دوسو پندرہ قیدیوں کی شرائط آزادی کی تحقیق ابھی تک نہیں ہوسکی ہے۔اس کا امکان ہے کہ وہ مسلمان ہوکراسلامی معاشرہ میں جذب ہوگئے ہوں۔مقتولین کی مذکورہ ۱۰۱۸ کی تعداد جومدنی دورنبوت کے دس سالوں پرمحیط ہے۔گزشتہ صدی کی دوعظیم جنگوں اورامریکہ وبرطانیہ نے شہریوں کی ایک زمین دوز پناہ گاہ (Bunker) کے اوپر جان بوجھ کرایک میزائل داغ کراس سے زیادہ آدمیوں کوبھون ڈالا تھا، جتنے آدمی پورے دوررسالت میں مقتول نہیں ہوئے تھے۔

واضح رہے کہ مسلمان مقتولین کی ایک بڑی تعداد جنگ احد میں شہید ہوئی تھی۔ مسلمان شہداء کی تعداداس جنگ میں ستراورزخمیوں کی تعداد چالیس تھی۔اس کے برخلاف کفارمکہ کے مقتولین کی تعدادصرف تین تھی۔مسلمانوں کا دوسراسب سے بڑا جانی نقصان سریہ بئرمعونہ میں ہوا تھا۔جب ۶۹ علماءاورحفاظ مظلومانہ شہید کردئے گئے تھے۔دراصل یہ جنگ تھی ہی نہیں، بلکہ عامربن مالک کی فرمائش پر۷۰ مسلمانوں کا ایک وفدتبلیغ وتعلیم کی غرض سے اس کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔عامرغداری کرکے قبائل رعل وذکوان اور بنوسلمہ کو چڑھایااور ایک کے سوا سب شہید کردئے گئے۔واقعہ رجیع میں بھی دس واعظین کوشہید کیا گیا، یہ بھی جنگ نہیں تھی۔

مذکورہ ۸۲ کی تعداد میں اصل جنگیں تو چندہی ہیں،لیکن مدینہ سے باہر نکلنے کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض سرایامحض سفراوردشمنوں کی نقل وحرکت پرنظر رکھنے کے لئے تھے، جیسے سیف البحر، رابع ،ضرار اورنخلہ وغیرہ۔بعض تبلیغ کے لئے تھے جیسے

دوان، بواط اور ذوالعشیرہ اسی ذیل میں رجیع اور بئر معونہ کو بھی شمار کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کے بعض اسفار غداروں یا ڈاکوؤں کی بیخ کنی کے لئے تھے، جیسے غزوہ سفوان اور غزوہ کرز بن جابر فہری، ذی قردہ، سریہ حسمی، سریہ ام قرفہ وغیرہ۔ بعض قتل غلط فہمی کی بنا پر ہوئے تھے۔ بعض اسفار دشمن کو مرعوب کرنے کے لئے تھے۔ ان کی تعداد ۳۳ ہے۔ بعض جنگیں معاہدہ توڑنے کی وجہ سے ہوئیں، جیسے بنوقینقاع، بنونضیر، بنوقریظہ، بنومصطلق، سریہ ذوالقصہ، سریہ بنوطے وغیرہ۔ فتح مکہ کو بھی اسی ذیل میں شمار کرنا چاہیے۔

مذکورہ جنگی نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگیں درج ذیل قبائل کے درمیان ہوئی ہیں:

(۱) قریش مکہ (۲) بنوغطفان وانمار (۳) بنوسلیم (۴) بنوفزارہ وعذرہ (۵) بنو کلاب ومرہ (۶) بنوعضل وقارہ (۷) بنواسد وبنوقضاعہ (۸) بنوذکوان (۹) بنولحیان (۱۰) بنوسعد بن بکر (۱۱) بنوہوازن (۱۲) بنونعیم (۱۳) بنوثقیف (۱۴) یہود (۱۵) نصاریٰ۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مدینہ کی اسلامی سلطنت کو خطرات تو چاروں طرف سے لاحق تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی جنگی فراست نے بہت سے مواقع کو ٹال دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نبی رحمت تھے، نبی زحمت نہیں تھے۔

آج کل بعض ملکوں خصوصاً امریکہ اور برطانیہ نے حق دفاع (Right of Defance) کو پوری دنیا تک پھیلا دیا ہے۔ بلکہ امریکہ نے تو خلاف میں بھی اپنے دفاع کے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں اور بلا کسی ادنیٰ ثبوت کے اپنی جاسوسی رپورٹوں کے بہانے جس ملک پر چاہتا ہے چڑھ دوڑتا ہے۔ ان سب ترکتازیوں کا اصل ہدف مسلمان ممالک ہیں جنہیں یہ ملک ایک ایک کرکے زیر کرتے چلے جارہے ہیں۔ تاکہ مسیحیت اور صہیونیت کا غلبہ ہوسکے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی بازدید سے وہ شادکام ہوسکیں، ستم یہ کہ وہ اسلام پر دہشت گردی کا الزام لگاتے ہیں اور اسلامی ممالک کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کے

ساتھ ساتھ قرآن سے جہاد کی آیتوں کے اخراج کی کوشش بھی کررہے ہیں۔ اسلام جہاد کو خیرالعمل قرار دیتا ہے، لیکن کشت وخون کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''حمی الوطیس'' (تنور گرم ہوگیا) (مسلم، مسند احمد) ''دشمن سے مقابلہ کی تمنا مت کرو، بلکہ اللہ سے امن وعافیت کی دعا کیا کرو، مگر جب دشمن سے مقابلہ ہوجائے، تو پھر جم کر لڑو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے'' (بحوالہ الجہاد فی الاسلام ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۶) یہ احادیث صحاح ستہ کی تمام کتب میں ہیں) ''خانقاہ نشیں زاہدوں کو قتل مت کرو'' (بحوالہ الجہاد فی الاسلام ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۶- یہ احادیث صحاح ستہ کی تمام کتب میں ہیں) ''آگ کا عذاب سوائے آگ پیدا کرنے والے کے کسی کو سزاوار نہیں'' (بحوالہ الجہاد فی الاسلام ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۶ یہ احادیث صحاح ستہ کی تمام کتب میں ہیں) ''آپ ﷺ نے باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔'' (بحوالہ الجہاد فی الاسلام ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۶ یہ احادیث صحاح ستہ کی تمام کتب میں ہیں۔)

آج کل کی جنگوں میں پوری کی پوری بستیاں اور شہر جلا کر خاک کردئے جاتے ہیں، یہ بات بالکل ہی توریت کے احکام پر عمل ہے۔ مقابلہ کے محدود صفحات زیادہ تفصیل کے متحمل نہیں ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے ہم بائبل کے صرف احکام اور اس پر عمل درآمد سے متعلق چند حوالے نقل کرتے ہیں۔ تاکہ صاحبان تقدیس کے لئے سرچشمہ عبرت بن سکیں۔ تفصیل کے لئے قارئین اصل بائبل سے مراجعت کرسکتے ہیں۔ بنابریں جب خداوند تیرا خدا ان کو تیرے آگے شکست دلائے تو ان کو بالکل نابود کرڈالنا..... ان کے مذبحوں کو ڈھا دینا..... وغیرہ (بائبل کتاب استثنا ۷:۱ تا ۵) عمالیق کو مکمل طور سے نیست ونابود کردینے کی ہدایت (استثنا ۲۵:۱۹) آگ لگانے کی ہدایت اور اس پر عمل (یشوع ۸:۸، ۱۹ تا ۲۹) بزق میں دس ہزار مردوں کا قتل (قضاۃ ۱:۵) موآب میں دس ہزار مردوں کا قتل (قضاۃ ۳، ۲۹) بیس یلعاد کے تمام باشندوں کو عورتوں اور بچوں سمیت قتل کردینے کا حکم (قضاۃ ۱۲:۱۰) بنی

اسرائیل نے ایک دن میں آرامیوں کے ایک ہزار پیادے قتل کردئے۔(اسلاطین۲:۲۴) خدا کے فرشتے نے اسور کی لشکر گاہ میں ایک لاکھ پچاسی ہزار آدمی مارڈالے۔ (۲سلاطین:۲۰:۳۵)

اس ہوشربا تعداد کا مقابلہ مدینہ کی اسلامی سلطنت میں مقتولین کفار کی تعداد سے کیجئے اورصہیونیوں اورصہیونی مسیحیوں کی دیدہ دلیری کی داد دیجئے۔ع- چہ دلاور است دزدے بکف چراغ دارد۔یاد کرلیجئے کہ ہجرت سے لے کرآنحضورﷺ کی وفات تک دشمنوں کے مقتولین کی تعداد صرف سات سوپچپن ہے(بحوالہ الجہاد فی الاسلام۲۲۳) آپﷺ کا یہ ارشادگرامی سامنے رہے:''نبیﷺ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے''(رحمۃ للعالمین۲/۲۱۱) نیز یہ حکم بھی ہے:''نہ کسی بوڑھے ضعیف کوقتل کرو نہ چھوٹے بچے کو نہ عورت کو۔اموال غنیمت میں چوری نہ کرو جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے سب ایک جگہ جمع کرو، نیکی واحسان کرو، کیونکہ اللہ نیکوں کو پسند کرتا ہے۔''(بحوالہ الجہاد فی الاسلام۲۲۲،۲۲۳،۲۲۶ یہ احادیث صحاح ستہ کی تمام کتب میں ہیں)۔

واضح رہے کہ بعد کے ادوار میں فقہائے اسلام نے دارالسلام کے مقبوضہ علاقوں کے حصول کے لئے جہاد کوفرض قرار دیا ہے،لیکن اس تفریض کی شرائط بھی مقرر کردی ہیں۔یہ تمام چیزیں قرآن وسنت سے ہی ماخوذ ہیں۔ان پر گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔اس درازنفسی کا خلاصہ یہ ہے کہ:(۱)رسول اللہ کی ساری جنگیں دفاعی تھیں۔(۲) آپ کا مقصد قتل وخون ریزی نہیں، بلکہ رافت ورحمت تھا۔(۳) کم سے کم جانی نقصان کی کوششیں کی گئیں۔کیونکہ آپﷺ کوعلم تھا کہ یہ قوم مسلمان ہونے اور سربلند ہونے والی ہے۔(۴) آپ نے جنگ وصلح کے قواعد مقرر فرمائے اوران پر عمل فرمایا(۵) رائج الوقت معمولات کے علاوہ توریت کے قوانین ظالمانہ نہیں تھے کیونکہ وہ تو اللہ کے ہی نازل کردہ تھے،اگرتوریت میں کوئی قانون ظالمانہ ہیں تو وہ یہودیوں کے اضافے ہیں، جیسے یہودیوں کی بدنیتی اور

کارستانی کا شاخسانہ کہا جاسکتا ہے،اور یہ سب محرف توریت میں ہے،اہل توریت میں نہیں ہے(مرتب)، توریت کے ظالمانہ قوانین جنگ کی اصلاح فرمائی۔(۶) تہذیبی، سیاسی، یا مالی کسی بھی قسم کے استحصال اوراستعمار کے لئے اسلام نے جنگ کو جائز نہیں رکھا، جیسا کہ آج کے جنگ بازوں کا وطیرہ ہے۔یہی وہ اسباب تھے جن کی بناء پر دس سال میں مدینہ کی اسلامی حکومت کا رقبہ تئیس مربع کلومیٹر سے بڑھ کرتیس لاکھ کیلومیٹر مربع ہوگیا۔(خطبات بھاولپور۲۴۳) اور دنیا میں اس مرکز سے تعلق رکھنے والوں کی اصل تعداد کسی بھی دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے الحمدللہ زیادہ ہے۔

☆☆

مجالس نبویؐ کی خصوصیات

● مولانا انیس الرحمٰن قاسمی

نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰؐ کا فیضان اگرچہ سفر، حضرت، خلوت، ہر جگہ جاری رہتا تھا، مگر آپ نے خاص طور پر تعلیم وتلقین کے لئے کچھ اوقات معین کردئے تھے، جس کی اطلاع ایمان والوں کو رہتی تھی اور وہ ان مجالس میں آکر استفادہ کیا کرتے تھے، ان مجالس کی کیفیت اور پیغمبر خاتم کی جلوہ فرمائی اور عقیدت کیش صحابہ کرام کی حاضری کے ساتھ یہود ومشرکین، منافقین اور نومسلمانوں کی آمد اور سخت ودرشت باتوں وطریقوں پر رسولؐ کا برتاؤ، خلق نبوی کا ایسا حیرت انگیز منظر پیش کرتا ہے جس کی مثال دوسری جگہ نہیں مل سکتی، یہ مجلسیں گھریلو بھی ہوتی تھیں، جن میں رسول اللہؐ ازواج مطہرات کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے اور ان کے ذریعہ عام مسلمان عورتوں کے جو مسائل ومعاملات پیش ہوتے اس پر ان کی رہنمائی فرماتے تھے، چنانچہ آپ کا معمول تھا کہ ہر روز عصر کے بعد ازواج مطہرات کے گھروں میں جو پاس پاس تھے تشریف لے جاتے ایک ایک کے پاس تھوڑی دیر ٹھہرتے اور جب ان کا گھر آتا جن کی باری ہوتی تو شب کو وہیں ٹھہر جاتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جس بیوی کی باری ہوتی اس کے گھر آپؐ تشریف لے جاتے اور دیگر بیویاں بھی وہیں آجاتیں، اس مجلس میں گھریلو باتیں ہوتیں، مسائل پوچھے جاتے اور آخرت سے متعلق امور پر آپؐ گفتگو فرماتے۔

مجالس ارشاد:

مجالس خانہ کے علاوہ عمومی تعلیم وتلقین اور تبلیغ وارشاد کے لئے جو مجالس روزانہ منعقد

ہوتی تھیں ان کی جگہ مسجد تھی، مسجد نبوی میں ایک چھوٹا سا صحن تھا، جس میں آپ نشست فرماتے، ابتدا میں نشست کی جگہ کوئی ممتاز نہ تھی، اس لئے باہر سے جو اجنبی ومسافر آتے انہیں آپ کو پہچاننے میں دقت ہوتی، صحابہ کرام نے اس کو محسوس کیا اور اس صحن میں ایک چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنادیا، آپ ﷺ اس پر تشریف رکھتے اور صحابہ حلقہ بنا کر بیٹھتے (ابوداؤد)

مجالس خواتین:

مجالس نبوی کا فیض زیادہ تر مردوں تک محدود تھا اور عورتوں کو موقع کم ملتا تھا، اس لئے عورتوں کی درخواست پر ان کے وعظ وارشاد کے لئے ایک خاص دن مقرر کردیا، جس میں خواتین مسائل شرعیہ دریافت کرتی تھیں، بالخصوص ایسے مسائل کا حکم معلوم کیا کرتی تھیں، جو خاص پردہ نشینوں سے تعلق رکھتے تھے، تاہم کوئی پردہ کا واقعہ مجلس عام میں پیش کیا جاتا تو حیا کی وجہ سے آپ کو ناگوار ہوتا۔

اوقات مجلس:

مسجد نبوی میں عمومی وعظ وارشاد کے لئے منعقد مجلسوں کے جو اوقات مقرر تھے وہ نمازوں کے بعد کے اوقات تھے، بالخصوص نماز فجر کے بعد کا وقت اس کے واسطے مقرر تھا، نماز فجر کے بعد آپ ﷺ بیٹھ جاتے اور فیوض کا چشمہ جاری ہوتا، اس میں وعظ ونصیحت اور افادۂ عام کی باتیں فرماتے، ان مجالس میں صحابہ کرام کے بیٹھنے کو آپ ﷺ پسند فرماتے اور چاہتے کہ کوئی شخص فیض سے محروم نہ رہنے پائے، اگر کوئی شخص آکر واپس چلا جاتا تو آپ ﷺ ناراض ہوتے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تین افراد آئے، ایک صاحب مجلس میں تھوڑی سی جگہ خالی پائی وہاں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب کو اندر موقع نہ ملا، اس لئے سب کے پیچھے بیٹھے، لیکن تیسرے صاحب چلے گئے آپ جب گفتگو سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ:

''ان میں سے ایک نے خدا کی پناہ لی خدا نے اس کو پناہ دی، ایک نے حیا کی خدا بھی اس سے شرمایا، ایک نے خدا سے منہ پھیرا خدا نے بھی اس سے منہ پھیر لیا۔ (بخاری ومسلم)

نماز فجر کے بعد اس وقت تک آپؐ بیٹھتے جب تک آفتاب اچھی طرح نکل نہ آتا، جب دن کچھ چڑھ جاتا تو چاشت کی کبھی چار کبھی آٹھ رکعت نماز ادا کرتے، پھر گھر تشریف لے جاتے اور خانہ داری کے امور میں مشغول ہوتے، صبح کی مجلس میں آپ ﷺ کا معمول تھا کہ ہر قسم کی باتیں فرماتے، کبھی صحابہ جاہلیت کے واقعات بیان کرتے یا شعر پڑھتے، ہنسی خوشی کی بات کرتے، اکثر اسی وقت مال غنیمت اور وظائف وخراج وغیرہ تقسیم فرماتے۔

آداب مجلس:

گرچہ رسول اللہ کی مجلس کے لئے کوئی دربان یا نقیب وچاؤش مقرر نہ تھا اور آنے والوں کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی، آنے والوں میں اکابر صحابہ بھی ہوتے اور وحشی نما بدو، بھی تاہم آپؐ ان کے رتبہ کے موافق برتاؤ کرتے اور فرماتے: ''اکرموا کریم کل قوم'' ہر قوم کے معزز شخص کا اکرام کرو۔

نشست میں بھی اس کا لحاظ رکھتے اور قبیلہ کے معزز فرد یا بزرگ صحابی کو اپنے قریب بٹھاتے، کبھی کبھی کسی کے اعزاز میں نشست سے آپ کھڑے بھی ہو جاتے، جیسا کہ حضرت فاطمہ زہراؓ گھر میں کبھی آتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے فرط محبت سے کیونکہ اس طرح بیٹھنا ان لوگوں کا طریقہ ہے جو متکبر و نافرمان ہوتے ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر چڑھا کر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرام اسی طرح پرسکون وخاموش مؤدب بیٹھتے کہ معلوم ہوتا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، یعنی کوئی شخص نہ جنبش کرتا، نہ سرگوشی ہوتی۔

رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں جو جہاں بیٹھا ہوتا اگر کسی ضرورت سے وہ وہاں سے اٹھ جاتا، پھر لوٹ کر آتا تو اسی سابقہ جگہ پر اپنی نشست لیتا، اس بارے میں آپ ﷺ تاکید بھی فرمایا کرتے تھے۔ ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص مجلس سے اٹھے اور پھر لوٹ کر اس جگہ جائے تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔'' (مسلم)

اسی طرح حضرت وہب ابن حذیفہ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''ہر شخص اپنی جگہ نشست کا زیادہ مستحق ہے، اگر وہ اپنی کسی ضرورت سے نکلا اور پھر واپس آیا تو وہ اپنی پہلی جگہ کا زیادہ حق دار ہے۔'' (ترمذی)

رسول اللہؐ کا طریقہ تھا کہ مجلس میں آپ سب سے پہلے اہل حاجت کی طرف متوجہ ہوتے اور ان کی معروضات سن کر ان کی حاجت برآئی فرماتے، آپ ﷺ کی مجلس میں حاضرین ادب سے سر جھکائے رہتے خود بھی آپ ﷺ مؤدب ہو کر بیٹھتے اور صحابہ کرامؓ بھی کوئی شخص بولتا تو جب تک وہ چپ نہ ہو جاتا دوسرا شخص بول نہیں سکتا، حاجت مند اپنی ضرورت پیش کرنے میں ادب کی حد سے اگر بڑھ جاتا تو آپ ﷺ کمال حلم کے ساتھ برداشت فرماتے تھے، کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ کرتے، جو بات ناپسند ہوتی اس سے تغافل فرماتے۔

مجلس میں امتحان کے طور پر صحابہؓ سے سوال بھی کرتے، گفتگو میں سوال کر کے صحابہؓ سے جواب پوچھتے اور ان کی اصابت رائے کا اندازہ فرماتے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا بیان ہے: ایک دفعہ آپ ﷺ نے پوچھا وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے، لوگوں کا خیال جنگلی درختوں کی طرف گیا، میرے ذہن میں آیا کہ کھجور کا درخت ہوگا، لیکن میں کمسن تھا، اس لئے جرأت نہ کر سکا بالآخر لوگوں نے عرض کیا کہ حضور بتائیں ارشاد فرمایا: کھجور۔ عبداللہ بن عمرؓ کو تمام عمر حسرت رہی کہ کاش میں نے جرأت کر کے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہوتا، (سنن ابن ماجہ) ان کی پیشانی چومتے، اسی

طرح آپ کو دودھ پلانے والی خاتون ماں حضرت حلیمہ سعدیہ جب آئی تو آپ ﷺ نے اٹھ کر چادر بچھائی، اسی طرح آپؐ کے رضاعی بھائی آئے تو ان کے لئے بھی محبت سے کھڑے ہوگئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھایا۔ اسی طرح قبیلہ عبدالقیس کا وفد آیا تو آپ ﷺ نے اس کے قائدے کے ساتھ اعزاز کا برتاؤ کیا، شہاب ابن عبادہ وفد عبدالقیس سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ: ''جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو لوگوں کو بہت خوشی ہوئی اور جب ہم ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے ہم کو جگہ دی، چنانچہ ہم بیٹھ گئے ،اس کے بعد رسولؐ نے ہمارا خیر مقدم کیا اور بلایا اور ہماری طرف دیکھ کر فرمایا'' ''تمہارا سردار اور قائد کون ہے؟'' اس پر ہم سب نے منذر بن عائذ کی طرف اشارہ کیا اور جب منذر ان کے قریب ہوئے تو لوگوں نے جگہ دی، یہاں تک کہ نبی کریمؐ کے پاس پہنچ گئے اور آپ کے داہنے جانب بیٹھ گئے، پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کا خیر مقدم کیا، نرمی سے پیش آئے اور ان کے علاقہ کے حالات دریافت کئے۔'' (مسند احمد)۔

مواجہت:

رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں لوگ مواجہت میں دائرہ بنا کر بیٹھے تھے، حلقہ کے درمیان بیٹھنے سے آپ ﷺ منع فرماتے تھے۔ حضرت حذیفہ نقل کرتے ہیں کہ:

''رسول اللہ ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے جو حلقہ کے وسط میں بیٹھتا ہے۔'' (ابوداؤد)

نشست کی ہیئت:

رسول اللہ مجلس میں متواضع و پرسکون انداز میں تشریف فرماتے تھے، کبھی آپؐ دوزانوں بیٹھتے اور اکثر چہار زانوں بیٹھا کرتے تھے۔ (ردمختار) مگر متکبروں کے انداز میں نہ بیٹھے، نہ ہی خلاف تہذیب طریقہ اختیار کرتے، بلکہ اس طرح اگر کوئی بیٹھتا تو آپ منع

فرماتے، حضرت شرید بن سوید کہتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ میرے قریب سے گزرے اور میں اپنے بائیں ہاتھ کو پشت کی طرف ٹیک کر بیٹھا ہوا تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مغضوب مت بیٹھو۔'' (ابوداؤد)

رسول اللہؐ کی مجالس میں اس کے باوجود کہ ہدایت وارشاد، اخلاق واحکام اور تزکیہ نفوس کی باتیں ہوتیں، تاہم یہ مجلس شگفتہ مزاجی سے خالی نہ تھی۔ ایک دن آپؐ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ جنت میں خدا سے ایک شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی، خدا نے کہا کیا تمہاری خواہش پوری نہیں ہوتی۔ اس نے کہا ہاں! لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی تیار ہوجائے۔ چنانچہ اس نے بیج ڈالے فوراً دانہ اگا، بڑھا اور کاٹنے کے قابل ہوگیا۔

ایک اعرابی بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا یہ سعادت صرف قریشی انصاری کو نصیب ہوگی جو زراعت پیشہ ہیں، لیکن ہم لوگ تو کاشتکار نہیں، آپؐ مسکرا اٹھے۔

رسول اللہ ﷺ کی مجالس تاثیر کے لحاظ سے اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ صحابہ کرامؓ جب خدمت اقدس میں حاضر رہتے تو ان کے دلوں کا رنگ کچھ اور رہتا، لیکن جب گھر میں بال بچوں میں ہوتے تو دوسری حالت ہوتی۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ جب ہم خدمت اقدس میں حاضر رہتے ہیں تو دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے، لیکن جب گھر میں بال بچوں میں بیٹھتے ہیں تو حالت بدل جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا! کہ اگر یکساں حال رہتا تو فرشتے تمہاری زیارت کو آتے! غرض رسول اللہ ﷺ کی مجالس تہذیب واخلاق اور قوت تاثیر کے لحاظ سے ایسی تھی کہ ایسی مجالس نہ کسی دوسرے انسان کی ہوئی ہیں اور نہ آئندہ ہوگی، البتہ آپ کی ذات اسوہ ہے تمام ایمان والوں کے لئے، بلکہ تمام انسانوں کے لئے اس لئے آپؐ کی مجالس کے طریقوں کی اتباع بھی ہونی چاہئے۔

☆☆

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

● مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ایک شخص سرزمین عرب میں عدنان نامی گزرا ہے، جس کی اولاد عدنان کہلاتی ہے، عدنان کے دولڑکے تھے عبک اور معد آئندہ نسل صرف معد کے لڑکے نزار سے پھیلی، معد بن عدنان کے سلسلے میں آپ ﷺ نے فرمایا: یہاں تک میرا شجرۂ نسب بالکل درست ہے، اس کے علاوہ جو کچھ لوگ کہتے ہیں وہ ناقابل اعتبار ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آپ ﷺ سے پوچھا کہ: یارسول اللہ جب نہ یہ آسمان تھا، نہ زمین تھی، نہ لوح وقلم تھا، نہ تخت وعرش اس وقت اللہ تعالیٰ نے کس چیز کو سب سے پہلے پیدا کیا، تو اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اللّٰهَ تعالیٰ خَلَقَ نُور نبیکَ بِنُورہ قبل خلق الاشیاء'' (تمام چیزوں کے پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے تمہارے نبی کے نور کو پیدا کیا)۔

یہ نور نسلاً بعد نسلٍ امانت الٰہی کے طور پر معد بن عدنان تک منتقل ہوا، ان کے زمانے میں بابل اور نینوا کے علاقے میں جس بادشاہ کی حکمرانی تھی وہ نہایت ظالم وجابر تھا، جسے بخت نصر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے شام پر حملہ آور ہوکر اس کے سلطنت کو تاخت وتاراج کیا، ۵۸۷ ق م میں یہودیہ کے تمام شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ ان کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ

کھڑی نہ رہی، ملک گیری کی ہوس بڑھتی رہی، یہاں تک کہ عرب پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا، اس زمانے میں معد بن عدنان عرب کے سردار تھے، بخت نصر کے حملہ آور ہونے سے پہلے اللہ رب العزت نے حضرت حزقیل اور برخیا علیہما السلام کو باقاعدہ معد بن عدنان کی حفاظت کے لئے بھیجا، چونکہ ان کی جبین میں نور محمدی جلوہ گر تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی آمد مبارکہ کا ذکر صدیوں قبل سے جاری تھا، اس کا باضابطہ ظہور اس وقت ہوا جب سرزمین مکہ پر بسنے والی قوم انسانیت سے عاری ہورہی تھی، مظالم سوزی ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا، معصوم بچیوں کو زندہ درگور کرنا، عورتوں کو 'ستی' پر مجبور کرنا، باتوں بات پہ برسرپیکار ہوجانا، دوسروں کے اموال کو غصب کرنا، ان کے لئے عام بات تھی، ان اخلاقی ومعاشرتی مفاسد کے سدباب کے لئے اور انسانیت کا صحیح درس دینے کے لئے حق جل مجدہ نے آقا ﷺ کو مبعوث فرمایا: ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عليهم اٰيتهِ وَيزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الكتَابَ وَالْحِكْمَةَ''. (آل عمران:۱۶۴)

خود نبی امی ﷺ کا فرمان ہے: ''انما بعثت معلما'' (ابن ماجہ) دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ''بعثت لاتمم حسن الاخلاق'' (موطا: باب حسن الخلق)

آپ نے اخلاقیات ومعاشرت کی ایسی تعلیم دی کہ ایک صحرانشیں بدوی کو شہنشاہیت کے مقام پر پہنچادیا، بھیڑیوں، بکریوں کے چرانے والے جس کی کوئی اہمیت نہیں تھی، انہیں اللہ نے دنیا بھر کے لوگوں کے لئے قابل ذکر نمونہ بنادیا۔ ''ذالک فضل الله یوتیه من یشاء''. بقول شاعر:

ایک عرب نے دین حق کا بول و بالا کردیا
خاک کے ذروں کو ہم دوش ثریا کردیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا

دعوت اسلام کا مکی دور:

غار حرا میں تحنث کے بعد جب آپ وحی الٰہی: ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ. اَلَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ.'' (العلق:۱-۵) سے شرف یاب ہوئے تو سب سے پہلے ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو دعوت دی اور یہی سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں پہلی ہستی قرار پائیں، یہ دعوت خفیہ، دھیمی دھیمی رفتار سے چلتی رہی، پھر آپ ﷺ کے بچپن کے ساتھی سیدنا حضرت ابوبکر صدیق بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہما نے ایمان قبول کیا، آپ پر قریب ترین لوگوں کا ایمان لانا ہی آپ کے اخلاص اور آپ کی صداقت کا بجا ثبوت ہے، آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت میں کار دعوت کو آگے بڑھاتے رہے، حتیٰ کہ ایک معتد بہ تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوگئی، تو آپ ﷺ ساری ہمت وعزیمت سمیٹ کر نئے مرحلہ اور متوقع حالات کے لئے خود کو تیار کر کے ''وانذر عشیرتک الأقربین'' (الشعر:۱۲۴،۱) کے نفاذ کے لئے کوہ صفا پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور قریش عرب کو ''انالنذیر العریان'' کے ذریعہ مخاطب فرما کر یہ کہتے ہیں:

''اللہ پر ایمان لاؤ، ورنہ تم پر سخت عذاب آئے گا'' جیسا کہ علامہ حالی نے کہا:

اتر کر حراء سے سوئے قوم آیا
اور ایک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

ان مختصر الفاظ کے ساتھ آپ نے برسر عام دعوت اسلام کا آغاز فرمایا، جسے سن کر آپ کے چچا ابولہب نے کہا: ''تبالک'' تیرا غارت ہو، کیا یہی بات تھی، جس کے لئے تو نے ہم سبھوں کو یہاں جمع کیا، ان کے ساتھ دیگر سامعین بھی خفا ہو کر چلے آئے، پھر دوسری مرتبہ آپ ﷺ نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ تمام خاندان عبدالمطلب کو دعوت طعام دی،

جس میں حضرت حمزہؓ، ابوطالب اور حضرت عباسؓ جیسی سرکردہ ہستیوں کو کھانے سے فراغت کے بعد اپنی مختصر تقریر میں فرمایا: ''میں جس پیغام کو لے کر آیا ہوں وہ دین اور دنیا دونوں کا کفیل ہے، کون اس میں میرا ساتھ دے گا؟'' تھوڑی دیر مجلس پہ سکوت طاری رہا، پھر حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے آپ کی مساعدت کے لئے اعلان فرمایا، جو آگے چل کر اساطین دعوت میں شمار ہوئے۔

اس کے بعد مخالفتوں کا نہ تھمنے والا سیلاب امنڈ آیا، معاندین اسلام کی طرف سے دعوت دین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جانے لگیں، بھونڈے بھونڈے پروپیگنڈے رچے جانے لگے اور آپ کو ساحر، مجنون، کاہن اور نہ جانے کس کس قسم کے خطاب ملے، لیکن قدرت نے ہر ایک کا جواب دیا:

''وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ط قَلِيْلاً مَّا تُؤْمِنُونَ. وَلاَ بِقَوْلِ كَاهِنٍ ط قَلِيْلاً مَّا تَذَكَّرُوْنَ''. (الحاقہ: ۴۲-۴۱)

ہجرت حبشہ:

جب مکہ میں کفار کے ظلم وستم حد برداشت سے گزر گئے تو آپ ﷺ نے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی قیادت میں ۸۰/افراد پر مشتمل جماعت کو حبشہ ہجرت کی اجازت دے دی، جب یہ لوگ نجاشی کے دربار میں پناہ گزیں ہوئے تو کفار نے ان کا تعاقب کیا اور ان کی واپسی کا مطالبہ کیا، نجاشی نے وفد کے قائد حضر جعفر بن ابی طالبؓ سے مکالمہ کیا اور بعد میں دریافت کیا کہ جو شخص پیغام وحی لایا ہے اس کا کوئی حصہ سناؤ، حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے سورہ مریم کی ابتدائی آیتیں پڑھیں، جسے سن کر شاہ حبشہ نجاشی رو پڑے اور کہا کہ یہ کلام اور کلام موسیٰ علیہ السلام دونوں ایک ہی چشمہ نور سے نکلے ہیں، اس واقعہ کے بعد کفار مکہ نے سازش رچ کر خود حبشہ میں دوسرا گروہ نجاشی کے مخالفین کا تیار کرلیا، جس نے مہاجرین

صحابہ کی موجودگی میں نجاشی پر حملہ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے نجاشی کو فتح عطا کی۔

حضرت عمر بن الخطابؓ کا قبول اسلام:

تاریخ اسلام کا وہ واقعہ بہت ہی یادگار ہے جو سیدنا عمرؓ کے اسلام لانے سے متعلق ہے، سیدنا عمرؓ ۲۷ رسال کے تھے جب کہ گلشن محمدی ﷺ کا علم بلند ہوا تھا، فاروق اعظم کے بہنوئی سعید رضی اللہ عنہ ابتدا ہی میں اسلام لے آئے تھے، ان کی دعوت سے عمرؓ کی بہن حضرت فاطمہؓ نہا بھی ایمان لے آئیں۔ خاندان کی ایک اور با اثر شخصیت نعیم بن عبداللہؓ نے بھی دعوت حق پر لبیک کہی، جب حضرت عمرؓ کو ان کے اسلام لانے کی خبر ملی تو بہت برہم ہوئے حتیٰ کہ اسلام لانے والوں کے جان لینے کے درپے ہو گئے، بالآخر ایک دن تہیہ کر لیا کہ کیوں نہ اصل داعی کو ہی راستے سے ہٹا دیا جائے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ ننگی تلوار لے کر چل پڑے، راستے میں نعیم بن عبداللہؓ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ عمر کیا ارادہ ہے، عمر بولے! (العیاذ باللہ) محمد ﷺ کا قصہ ہمیشہ کے لئے پاک کر دینا چاہتا ہوں۔ نعیم بن عبداللہؓ بول پڑے پہلے اپنے گھر کی خبر لو اور اپنے بہن بہنوئی سے نمٹ لو، پھر کسی اور طرف جانا، فوراً پلٹے اور بہن کے گھر پہنچتے ہیں دستک دی، وہ قرآن سیکھ رہے تھے، آہٹ ہوئی تو خاموش ہو گئے اور قرآن کے اوراق چھپا لئے، حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا پڑھا جا رہا تھا، بہن نے ٹالا، کہنے لگے مجھے خبر مل چکی ہے کہ تم دونوں آبائی مذہب سے پھر چکے ہو، یہ کہہ کر بہنوئی پر ٹوٹ پڑے، بہن بیچ بچاؤ کے لئے آئی تو ان کو بھی مارا، ان کا جسم لہولہان کر دیا، لیکن آخر بہن بھی تو تھی فاروق اعظم کی ڈبڈاتی آنکھو ں سے صبر و استقلال اور عزیمت مندانہ لہجہ میں بولیں ''عمر! جو کچھ تو کر سکتے ہو کر لو، اب دل سے اسلام نہیں نکال سکتے ہو۔''

حضرت عمرؓ نے فرمایا: جو تم پڑھ رہی تھی مجھے بھی لا کر دکھاؤ یہ سنتے ہی حضرت خبابؓ جو

مکان کے کسی گوشے میں چھپے ہوئے تھے، فوراً باہر نکل آئے، بہن نے کہا: ''**انک رجس لا یمسہ الا المتطھرون فقم فتوضا**'' تو ناپاک ہے، قرآن مجید کو پاک ہی لوگ چھو سکتے ہیں، جاؤ غسل کر کے آؤ، عمرؓ اٹھے اور غسل کیا اور صحیفۂ مطہرہ کو ہاتھ میں لیا جس میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ اس آیت پر پہنچے ''اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِی وَاَقِمِ الصلوٰۃَ لِذِکْرِیْ.'' (طٰہٰ:۱۴) میں ہی معبود برحق ہوں میرے سواء کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔ بے ساختہ بول اٹھے۔ ''**ما احسن ھذا الکلام اکرمہ**'' کیا ہی اچھا اور بزرگ کلام ہے۔ حضرت خباب نے یہ سن کر کہا اے عمر! تم کو بشارت ہو میں امید کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا تمہارے حق میں قبول ہوگئی۔ عمر نے کہا اے خباب مجھے محمد ﷺ کے پاس لے چلو، حضرت خباب عمر کو ساتھ لے کر دار ارقم کی طرف چل پڑے جہاں رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کے ساتھ فروکش تھے، دروازہ بند تھا دستک دی اور اندر آنے کی اجازت چاہی یہ معلوم کر کے کہ عمر اندر آنا چاہتے ہیں کوئی شخص دروازہ کھولنے کی جرأت نہ کر سکا، سید الشہداء امیر حمزہؓ نے فرمایا اگر خیر کے ارادے سے آرہا ہے تو ہم بھی اس کے ساتھ خیر کا معاملہ کریں گے اور اگر شر کے ساتھ آرہا ہے تو اسی کی تلوار سے اس کی گردن اڑا دیں گے۔

نبی الامی ﷺ نے بھی دروازہ کھولنے کی اجازت دے دی۔ دروازہ کھول دیا گیا اور دو شخصوں نے میرے دونوں بازو پکڑے اور آپ کے سامنے لا کر مجھ کو کھڑا کیا۔ آقا ﷺ نے ان سے فرمایا چھوڑ دو اور میرا کرتا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ اے خطاب کے بیٹے! ایمان لاؤ اور یہ دعا فرمائی۔ ''**اللھم اھد، اللھم ھذا عمر بن الخطاب، اللھم اعز الدین بعمر بن الخطاب**'' اے اللہ اس کو ہدایت دے، اے اللہ یہ عمر بن الخطاب حاضر ہے، اے اللہ اس سے اپنے دین کو عزت دے، تو سیدنا عمرؓ بے اختیار پکار اٹھے ''**اشھد أن لا الہ الا اللہ وأشھد أن محمدا عبدہ ورسولہ**'' اور اللہ کے

رسول ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی، اس واقعہ پر مسلمانوں نے مارے خوشی کے ایسا نعرہ تکبیر بلند کیا کہ مکہ کا سارا ماحول گونج اٹھا اور دار ارقم کی دیواروں کی چول ہل گئی، ان کی قوت بڑھ گئی۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لاتے ہی کعبۃ اللہ میں پہلی مرتبہ اعلانیہ نماز باجماعت کی ادائیگی کا سلسلہ شروع ہوا۔

ظالموں کی چیرہ دستی اور آپؐ کی صلح پسندی:

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دعوت دین کی راہ میں جس قدر آپ کو اذیتیں دی گئیں، سب وشتم کیا گیا، رکاوٹیں ڈالی گئیں، مطعون ومعذوب کیا گیا، اتنا کسی نبی اور ہادی کو نہیں ستایا گیا، خود آپ کا فرمان ہے: "**لقد أوذيت في سبيل الله مالم يوذ احد.**" (ترمذی: کتاب القیامہ)

ظالموں نے ظلم وستم کے پہاڑ اپنے سر پر اٹھا لیے، لیکن آقاء نامدار ﷺ نے انہیں اف تک نہ کہا، حضور ﷺ اپنے متبنی زید ابن حارثہؓ کو ساتھ لے کر طائف پہنچتے ہیں، وہاں عمر وبن عمیر کے تین بیٹے عبد یالیل، مسعود اور حبیب سب بااثر تھے، آپ نے ان سبھوں کو اسلام کی دعوت دی اور جوار بھی طلب کیا، نہایت غیر متوقع طور پر انہوں نے آپ کا ساتھ دینے اور قریش کے بالمقابل کھڑا ہونے سے انکار کر دیا اور آپ کی تعلیم کا مذاق بھی اڑایا، اس معاملے میں تینوں بھائیوں کی رائے ایک تھی۔ لہٰذا نبی ﷺ نے وہاں مزید قیام ناپسند فرمایا اور واپسی کی راہ لی، ان ظالموں نے اپنے غلاموں اور لڑکوں کو ہدایت دی کہ اس شخص کا پیچھا کریں اور اس کو زک پہنائیں۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ حضور کو اور زید بن حارثہؓ کو پتھروں سے لہولہان کر دیا نعلین خون سے بھر گئے۔ راستہ میں انگوروں کا باغ نظر آیا تو حضور ستانے کے لئے اس میں داخل ہو گئے اور بیلوں کی چھاؤں میں آرام فرمانے لگے۔ یہ باغ مکہ کے سردار عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ اتفاق سے وہ دونوں اس میں موجود تھے، ان کی نظر

آپ پر پڑی تو خاندانی نسبت کا لحاظ کرتے ہوئے انہوں نے ایک طشتری میں آپ کو انگور بھجوائے ان کا نصرانی غلام عداس یہ تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کیا آپ نے ..... بسم اللہ، پڑھ کر انگور کھانا شروع کیا تو غلام چونکا کہنے لگا کہ اس دیار کے لوگ تو کھاتے وقت یہ کلمات ادا نہیں کرتے۔ حضور کو عداس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کا تعارف چاہا اس نے بتایا کہ میں نینوا کا نصرانی ہوں، آپ نے فرمایا تمہارا علاقہ تو ایک صالح شخص یونس بن متی علیہ السلام کا ہے وہ نبی تھے، میں بھی نبی ہوں، لہٰذا وہ میرا بھائی ہے یہ سن کر عدنے حضور کے ہاتھوں اور سر کو بوسہ دیا۔ (حیات رسول امی: ۲۲۴)

دشمنوں نے بارہا ایسی حرکتیں کیں جو نہایت دل آزار، بڑی توہین آمیز اور اشتعال انگیز تھیں، مگر ان موقعوں پر تحمل وبرداشت، عالی ظرف اور کوہ ثباتی کا وہ بلند وبالا ثبوت دیا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر لرزہ براندام کافروں کے خوف اور اعتراض تقصیرات کے جواب میں "**لاتثريب عليكم اليوم انتم الطلقاء**" (اپنی مثال آپ ہے اور یہ سب اسی لئے کہ آپ معلم اخلاق تھے)۔ اسی کو الطاف حسین حالی نے کیا اچھے انداز میں بیان کیا ہے:

خطا کار سے در گزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

لیکن تاریخ کی ستم ظریفی کہیے یا اعداء اسلام کی سازشوں کی کامیابی کہ آج ایسے شخص کی سیرت وتعلیمات کو دہشت گردی اور ظلم وزیادتی پر مبنی ٹھہرایا جا رہا ہے اور آپ کے ماننے والوں کو خوں خوار اور بے رحم انسان دکھلانے کی ہمہ گیر کوششیں ہر سطح پر جاری ہیں، حالانکہ اگر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو یہ آشکار ہو جائے گا کہ حضور ﷺ کی تعلیمات سراپا رحمت ہیں جن میں ہر ایک کو ان کا جائز حق وصول ہوتا ہے اور یہی مساوات اسلامی کی امتیازی شان ہے۔

حضور کریم کی یثرب روانگی:

دعوتِ حق کا پودا مکہ کی سرزمین میں اگا لیکن اس کے پھلوں سے دامن بھرنا مکہ والوں کے نصیب میں نہ تھا پھل مدینہ والوں کے حصے میں آیا، اہل مکہ کی چیرہ دستی سے پریشان ہوکر آپ نے ہجرت مدینہ کا فیصلہ لیا پہلے آپ قبا پہنچے ''قبا'' یثرب سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک آبادی تھی وہاں انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔آپ کا قیام کلثوم بن ہدم کے یہاں تھا جو وہاں کے ممتاز خاندان عمرو بن عوف کا سردار تھا، قبا میں آمد کے بعد سب سے پہلا کام جو آپ نے انجام دیا وہ مسجد قبا کی تعمیر تھی۔تاریخ اسلام میں سے پہلے یہی مسجد تعمیر ہوئی جو ۸ تا ۱۱ ربیع الاول ۱ھ ۲۳/۲۰ دسمبر ۶۲۲ء کے درمیان ہوئی سورہ توبہ کی آیت: ۱۰۸ میں اس کا ذکر ہے۔لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوىٰ مِنْ اَوَّلِ يَومٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمُ فِيهِ ط رِجَالٌ يُّحِبُّونَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِرِيْنَ.
(اسلامی انسائیکلوپیڈیا ص: ۱۳۲۴-۲۲)

چودہ دن بعد آپ القصوا پر سوار ہوکر شہر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے لوگوں کو جب آپ کی تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف سے لوگ جوشِ مسرت سے پیش قدمی کے لئے دوڑ پڑے، قبا سے مدینہ تک دورویہ جاں نثاروں کی صفیں تھیں، راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے، ہر قبیلہ سامنے آکر یہ عرض کرتا حضور یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے آپ منت کا اظہار فرماتے اور دعاء خیر دیتے۔شہر قریب آ گیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ لڑکیاں چھتوں پر نکل آئیں اور آپ ﷺ کی آمد پر یہ اشعار پڑھنے لگیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيّاتِ الْوِدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَى لِلّٰهِ دَاعِ

معصوم لڑکیاں دف بجا کر گا رہی تھیں

نحن جوار من بني النجار
يا حبذا محمدا من جار

ہم بنی نجار کے پڑوسی ہیں، اے کاش محمد ہمارے پڑوسی ہوجاتے

جہاں اب مسجد نبوی ہے اس سے متصل حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا گھر تھا جب آپ یہاں پہنچے تو سخت کش مکش تھی کہ آپ کی میزبانی کا شرف کس کو حاصل ہو بالآخر یہ شرف حضرت ابوایوب انصاریؓ کو حاصل ہوا اور آپ کی سواری القصویٰ ایسی جگہ بیٹھی جو دو یتیموں سہل وسعدؓ کی ملکیت تھی۔آپ نے اس زمین کو قیمتاً خریدا اور مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ ہی حجرۂ ازواج مطہرات بھی تعمیر ہوئے تعمیر کی سرگرمی میں سبھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہر ایک آواز ملا کر پڑھتے تھے۔

اللهم لا خير إلا خير الاخرة
فاغفر الانصار والمهاجره

یہ مسجد ہر تکلفات سے بری اسلام کی سادگی کی تصویر تھی، یعنی کچھ اینٹوں کی دیواریں، کھجور کی پتی کا چھپر اور کھجور کے ستون تھے، مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقّف چبوترہ آپ نے ''صفہ'' کے نام بنوایا یہ ان لوگوں کے لئے تھا جو اسلام لائے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے ان کے لئے مستقل یہ جائے پناہ ہوتی آپ یہاں درس دیتے اور تمام حاضرین بغور سماعت فرماتے۔مروجہ مدارس کا سلسلۃ الذہب اسی دارالعلوم سے جا کر ملتا ہے۔

ہجرت مدینہ:

جب نبوت کا تیرہواں سال شروع ہوا تو ارشاد ربانی کے مطابق آپ نے مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کا حکم فرمایا، جب قریش نے دیکھا کہ مسلمان مدینہ جا کر طاقت پکڑتے جا رہے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جا رہا ہے۔انہیں بڑی تشویش ہوئی تو دارلندوۃ میں مشورہ کیا جس

میں ہر قبیلہ کے رؤسا شریک تھے۔ قسم قسم کے مشورے سامنے آئے بالآخر ابوجہل کے مشورے کو قبول کیا گیا جس نے یہ مشورہ دیا کہ ہر قبیلہ سے ایک شخص کا انتخاب ہو اور پورا مجمع مل کر ایک ساتھ تلواروں سے العیاذ باللہ محمد ﷺ کا خاتمہ کردیں۔ اس صورت میں ان کا خون تمام قبیلہ میں بٹ جائے گا اور آل ہاشم کے لئے تمام قبائل سے نبرد آزما ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگا، پھر کیا ہوا فوراً آستانۂ رسول کا محاصرہ کرلیا گیا، اہل عرب زنانہ مکان میں گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لئے حضور کے نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

آپ کو قریب کے اس ناپاک ارادے کی اطلاع بذریعہ وحی مل گئی تھی، آپ نے حضرت علی کو بلا کر فرمایا مجھ کو ہجرت کا حکم مل چکا ہے، میں آج یثرب روانہ ہوجاؤں گا۔ میرے ذمہ لوگوں کی جو بھی امانتیں ہیں واپس کردینا یہ کہہ کر آپ حضرت ابوبکر صدیق کی معیت میں جانب یثرب چل پڑے، اس وقت آپ کی زبان مبارک سے یہ کلمات جاری ہوتے ہیں: ''اے مکہ! تو کتنا پاکیزہ اور کتنا مجھے محبوب ہے اگر میری قوم نے مجھے یہاں سے نہ نکال دیا ہوتا تو میں تیرے سوا کسی دوسری جگہ سکونت اختیار نہ کرتا۔''

مذکورہ کلمات کہتے ہوئے یثرب کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں، دشمن کا تعاقب ہوتا ہے خبر پاکر آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ غار ثور میں چھپ جاتے ہیں، ڈھونڈتے ڈھونڈتے بالآخر غار تک ان کی رسائی ہوجاتی ہے، آہٹ پاکر حضرت ابوبکر صدیقؓ گھبرا جاتے ہیں، آپ فرماتے ہیں: ''لا تحزن إن اللّٰه معنا''.

مشہور ہے کہ جب غار ثور کے قریب آپہنچے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے دفعتہً ببول کا درخت اگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر غار کو ڈھانپ لیا، ساتھ ہی دو کبوتری آئی او رانڈے سینے لگی، مکری نے جالا تان دیا، سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے غلام عامر بن فہیرہ تمام دن کفار کے ساتھ رہتے، شام کے وقت بکریاں چرانے کے لئے وہاں لے آتے اور کفار کی تلاش ومشورہ کی خبر رسانی کرتے رہتے، چوتھے دن آپ غار سے نکلے اور عبداللہ بن اریقط

اللیثی جو کافر تھا، لیکن راستوں سے خوب واقف تھا، اجرت پر مقرر کرلیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک دن ورات برابر گزر گئے، دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ کی شدت عروج کو پہنچ گئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آرام کی خواہش ظاہر کی، چہار سو نظر ڈالنے پر ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی پھر اپنی چادر بچھادی، جس پر آپ ﷺ آرام فرمانے لگے، پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو حاضر خدمت کروں، پاس ہی میں ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، اس سے آپ نے کہا کہ ایک بکری کا تھن گرد وغبار سے صاف کردو، پھر اس کا دودھ دوہا اور لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے دودھ نوش فرمایا، آفتاب اب ڈھل چکا تھا، آپ وہاں سے روانہ ہوگئے۔

قریش نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص محمد ﷺ یا ان کے رفیق غار ابوبکر صدیقؓ کو گرفتار کر کے لائے گا اسے سو اونٹ بقول بعض ستر اونٹ انعام میں دیا جائے گا۔ سراقہ بن جعشم انعام پانے کے لئے تعاقب میں نکلا، اس نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آگیا تو آپ نے دعا کی اور اس کے گھوڑے کا اگلا پاؤں زمین میں دھنس گیا اور وہ اپنے ناپاک عزم کی تکمیل سے قاصر رہا۔

آپ یثرب پہنچ کر باضابطہ اشاعت اسلام کا سلسلہ سرگرمی سے جاری فرماتے ہیں، انصار مدینہ کو مہاجرین سے الفت ومحبت کے لئے مواخات پر ابھارتے ہیں، تاکہ ان مہاجرین کو جنہوں نے بے سروسامانی کے عالم میں آپ کی آواز پر لبیک کہہ کر یثرب کا رخ کیا ہے، انہیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو، پھر رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قدموں کو مضبوطی عطا کی اور آپ اس قابل ہوگئے کہ اشاعت اسلام کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں سے نمٹ سکیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اجازت دی کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کریں۔

"اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوا ط وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْر.
(الحج: ۳۹)

غزوۂ بدر:

اسلام اور کفر کے درمیان جو پہلی جنگ ہوئی وہ جنگ بدر کے نام سے مشہور ہے، ہجرت مدینہ کے بعد بھی جب کفار نے آنحضورﷺ کو سکون سے بیٹھنے نہ دیا تو مسلمان کفار سے قتال پر مجبور ہوئے۔ اس جنگ کی تیاری میں آپ نے کبار صحابہ سے مشورہ کیا، سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدقؓ وعمر فاروق نے تقاریر کیں، بعد میں انصار کی طرف سے سعد بن عبادہؓ نے کہا کہ: اللہ کی قسم آپﷺ سمندر میں کودنے کا حکم دیں تو ہم کود پڑیں، ساتھیوں سے مشورہ کے بعد آپ تین سو سے کچھ زائد جاں نثاروں کے ساتھ مدینہ سے نکل پڑے، ۱۶/رمضان ۲ھ کو دونوں لشکر میدان بدر میں داخل ہوئے۔

ایک طرف شیطانی ہجوم ہتھیاروں سے مسلح تھا اور دوسری طرف اللہ کے ۳۱۳ فرمانبردار بندے اور توحید کے متوالے تھے، اسی غزوہ میں آپﷺ نے رقت آمیز دعاء کی اے اللہ! اپنا وعدہ پورا کر کیا تو چاہتا ہے کہ آج کے بعد تیرا نام نہ لیا جائے؟ اسی کے بعد آیت نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے مدد کا وعدہ فرمایا:

" وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ فَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ o اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰئِکَۃِ مُنْزَلِیْنَ o بَلٰی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْکُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰئِکَۃِ مُسَوِّمِیْنَo". (آل عمران: ۱۲۳-۱۲۵)

اس غزوہ میں ستر مشرکین مارے گئے اور اسی گرفتار کر لئے گئے اور مال غنیمت میں بہت سے اونٹ اور تقریباً تیس گھوڑے ہاتھ آئے۔

میدان جنگ میں اصولی ہدایات:

سرکار دو عالم جناب محمد رسول اللہﷺ نے میدان جنگ میں جو ہدایت فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ عقلاً وعرفاً اور عملاً جنگ میں حصہ نہیں لیتے مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، معذور، خانقاہ نشیں، معبدوں کے مجاور وغیرہ انہیں تعرض کرنے سے بچنا از حد ضروری ہے، آنحضرتﷺ کا ارشاد ہے: "نہ کسی بوڑھے ضعیف کو قتل کرو نہ چھوٹے بچے کو اور نہ عورت کو" (ابوداؤد: کتاب الجہاد)

اسی طرح اکثر جنگوں میں فریقین غصے اور شدت انتقام سے بے قابو ہو کر اپنے دشمنوں کو زندہ جلا دیتے ہیں، آنحضورﷺ کا ارشاد ہے: "آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے کسی کو سزاوار نہیں۔" (ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب حق العدو بالنار)

ایسے ہی باندھ کر مارنے، فصلوں کو خراب کرنے، بستیوں کے اجاڑنے، مثلہ کرنے اور نعش کی بے حرمتی کرنے سے منع فرمایا۔" (ابوداؤد: باب النہی عن المثلۃ)

درحقیقت اسلام نے جنگی اصول بیان کر کے جنگ کو ان تمام وحشیانہ افعال سے پاک کر دیا، جو اس عہد کے جنگ کا جزو بنے ہوئے ہیں اور آج بھی بعض اسلام دشمن ممالک اپنائے ہوئے ہیں، اکیلے امریکہ نے صرف عراق کے تعلق سے انسانیت کشی کو جو گھناؤنی مثال قائم کی ہے کوئی ادنیٰ مثال بھی اس طرح کی پوری اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس سفاکیت اور درندگی کے بعد بھی انسانیت کے ان دشمنوں کو اسلام پر دہشت گردی کا لیبل چسپاں کرتے شرم نہیں آتی۔ **اذا فاتک الحیاء فاصنع ماشئت.**

غزوۂ احد:

شوال ۳ھ میں مدینہ کے قریب واقع پہاڑ "احد" کے دامن میں ہونے والا مشہور اسلامی غزوہ ہے، جس میں آپﷺ نے اپنے جاں نثاروں کے ساتھ لشکر کفار کا مقابلہ کیا۔

اس غزوہ کی بنیادی وجہ سابقہ غزوۂ بدر میں مشرکین مکہ کو ہونے والی شکست تھی، قریش مکہ نے اس ناکامی کا انتقام لینے کی غرض سے ڈھائی لاکھ درہم جمع کر کے جنگ کی تیاری شروع کی، قریش مکہ نے بقول ابن ہشام ایک سال کے عرصے میں تین ہزار کا لشکر جرار تیار کیا، جس میں سات سو زرہ پوش اور دو سو گھڑ سوار شامل تھے، ادھر آپ ﷺ ایک ہزار مجاہدین جن میں ایک سو مجاہدین کے پاس زرہیں تھیں اور گھوڑوں کی تعداد دو یا تین تھیں، کے ساتھ ''جبل احد'' پہنچے، یہاں آپ نے بنی عمرو بن عوف کے سردار عبداللہ ابن عمیر کو جھنڈا دیا اور تیر اندازوں کو یہ حکم دیا کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔

جانبین سے گھمسان کی جنگ ہوئی حضرت زبیر ابن العوام نے خالد بن الولید کے دستے پر تیروں کی بوچھار شروع کر دی، خالد بن الولید کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر عکرمہ کے دستوں میں ہراس پھیل گیا وہ مسلمانوں کے آگے جم نہ سکے، عکرمہ شکست کھا کر پسپا ہوا تو مسلمانوں نے دھاوا بول دیا یہ فتح کی طرف پہلا قدم تھا، چنانچہ کچھ مسلمانوں نے غنیمت سمیٹنا شروع کر دیا، بلندی پر موجود مسلمان تیز اندازوں کو دشمن کو فرار ہوتے اور مسلمانوں کو غنیمت سمیٹتے دیکھ کر غلط فہمی ہوئی کہ فتح عام ہو چکی ہے، اپنا مورچہ چھوڑ کر نیچے کی طرف آنے لگے، انہیں حضورؐ کی ہدایت ذہن نشین نہ رہ سکی تھی کہ ''بہر حال مورچہ پر ڈٹے رہنا ہے'' نتیجہ خالد بن الولید موقع پاتے ہی مسلمانوں پر عقب کی جانب سے حملہ آور ہوئے۔ دوسری طرف بھاگتے ہوئے کفار کی صورت حال بدلتی ہوئی دیکھ کر پورے جوش سے پلٹے اور مسلمانوں کا چہار جانب سے محاصرہ کر لیا۔

اسی جنگ میں آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور صحیح بخاری کے مطابق ۷۰ مسلمان شہید ہوئے۔ ہر چند کہ میدان احد میں مسلمانوں کو سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا، مگر اسے کسی بھی طرح مسلمانوں کی شکست نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ فتح و شکست جنگ کے آخری نتائج کا نام ہے اور نتائج کے اعتبار سے مسلمان فاتح رہے، بلکہ یوں کہئے کہ یہ مسلمانوں کی

ظاہری شکست تھی، انجام کار اور معنوی لحاظ سے تو یقیناً مسلمانوں ہی کی فتح تھی۔

غزوۂ خندق:

غزوہ احد میں قریش یہ دعویٰ کر گئے تھے کہ شوال ۴ھ میں پھر لڑنے آئیں گے، مگر نہیں آئے۔ محرم ۵ھ ہیں، بنو نضیر مدینہ سے نکالے گئے تو ان کا بڑا حصہ خیبر میں پناہ گزیں ہوا، سردار بنو نضیر حی ابن اخطب قبائل بنو غطفان سے معاہدہ کر کے دس ہزار چوبیں اونٹ سوار اور تین سو گھوڑ سوار کے ساتھ روانہ ہوئے۔

آنحضرت ﷺ کو جب اس لشکر کے کوچ کی خبر ملی تو آپ نے مجلس مشاورت منعقد کی مجلس میں طے پایا کہ مدینہ طیبہ میں رہ کر مدافعت کی جائے، حضرت سلمان فارسی نے مشورہ دیا کہ حملہ آور فوج سے محفوظ رہنے کے لئے خندق کھودی جائے، آپ ﷺ نے اس تجویز کو پسند فرمایا۔ خندق کی کھدائی شروع ہوگئی خندق کی کھدائی میں آپ ﷺ کے معجزہ کا بھی ظہور ہوا، کھدائی کے دوران ایک جگہ بڑا سخت پتھر آ گیا، سب زور آزمائی کر کے ہار گئے بالآخر آپ نے بذات خود اس پر ضرب لگائی تو پتھر میں شگاف پڑ گیا ساتھ ہی روشنی نکلی۔ آپ نے اللہ اکبر کہہ کر فرمایا محمد کو ملک شام کی کنجیاں دی گئیں، تیسری ضرب پر روشنی نکلنے پر آپ نے فرمایا مجھے یمن کی کنجیاں دے دی گئیں، تیسری ضرب سے پتھر ریزہ ریزہ ہو گیا، آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اطلاع دی کہ مجھے جبریل علیہ السلام نے خبر دی ہے کہ مذکورہ ممالک آپ کے قبضے میں آ جائیں گے۔

مشرکین مکہ کو خندق عبور کرنے میں غیر معمولی دشواریوں کا سامنا ہوا بالآخر وہ ناکام و نامراد ہو کر چند دنوں تک خندق کے باہر ہی سے تیر پتھر برساتے رہے، محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک رہا آخری دنوں میں ایک تند و تیز آندھی چلی جس سے خیموں کی میخیں اکھڑ گئیں اور چولہے سے دیگچیاں گر گئیں، برف باری ہونے لگی، کفار مایوسی کے عالم میں

محاصرے کو ختم کر کے واپس چلے گئے، کفار کے فرار کی خبر آپ کو اللہ جل مجدہ کی طرف سے دی گئی، مسلم لشکر کی خبر رسانی کرنے والے حضرت حذیفہ بن یمان نے اطلاع دی کہ کفار بھاگ گئے ہیں اور ان کی لشکر گاہ خالی پڑی ہے، آپ نے فرمایا اب کفار کبھی بھی ہم پر حملہ آور نہ ہوسکیں گے۔

غزوۂ حنین:

صلح حدیبیہ، جس کو قرآن کریم نے فتح مبین قرار دیا: ”اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا“ (الفتح:۱) کے بعد ہوازن اور ثقیف دو قبیلے بجائے قبول اسلام کے مکہ پر حملہ کی تیاریاں کرنے لگے، جب حضورﷺ کو ان کی تیاریوں کا علم ہوا تو آپ نے بھی جنگ کی تیاریاں شروع کردیں ۶؍شوال ۸ھ آپﷺ ۱۲؍ہزار لشکر جرار کے ساتھ مقابلہ کے لئے وادیٔ حنین پہنچ گئے، یہاں کفار نے اپنی کمین گاہوں سے، اسلامی لشکر پر حملہ کردیا جس سے مسلم لشکر منتشر ہوگئے، اس موقع پر آپ خود بھی تلوار لئے رجز پڑھ رہے تھے۔

انا النبی لا کذب انا بن عبدالمطلب

اس غزوہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے آسمانی فوجیں اتاریں ”وَاَنۡزَلَ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا وَعَذَّبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا“. (التوبہ:۲۶) اور مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار کیا، چھ ہزار عورتیں اور بچے قیدی بنالئے گئے، بے شمار اونٹ، بھیڑ، بکریاں تقریباً چالیس ہزار اوقیہ چاندی اور دیگر آلات حرب مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

غزوہ تبوک:

فتح مکہ سے قبل آنحضرتﷺ نے جمادی الاولیٰ ۸ھ میں روم کی افواج قاہرہ کے مقابلے کے لئے تین ہزار کا لشکر شام کی طرف روانہ فرمایا جو ”موتہ“ کے مقام پر دشمن سے متصادم ہوا دشمن کی تعداد ۲؍لاکھ تھی، مگر لشکر اسلام نے بے جگری سے مقابلہ کیا، تین سپہ سالار

اور نو مجاہد شہید ہوئے، مؤرخین نے دشمن کے ہلاک شدگان کی تعداد نہیں بتائی ہے، اعداء کی کثرت کی وجہ سے فیصلہ کن جنگ نہ ہوئی۔

آنحضرتﷺ ”تبوک“ میں بیس روز قیام کے بعد اوائل رمضان ۹ھ میں مدینہ تشریف لائے، یہ آخری جنگ تھی جس میں حضورﷺ نے بنفس نفیس شرکت فرمائی، لیکن وہ حالت جنگ جو رمضان ۱ھ میں شروع ہوچکی تھی۔ اس کے بعد جاری رہی، وصال نبویﷺ تک مسلمانوں کی فوجیں مختلف اطراف میں مشرکین کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوتی رہیں اور پھر وفات سے چند روز پہلے آپ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک لشکر رومیوں کی سرکوبی کے لئے تیار کیا، جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں روانہ ہوا۔

حجۃ الوداع:

نبی امیﷺ نے اپنی زندگی کے آخری سال ۱۰ھ میں حج کا ارادہ فرمایا، تاکہ لوگ حج کے احکام سیکھ لیں، چونکہ سورۃ النصر کے ذریعہ آپ کے وصال کی اطلاع مل گئی تھی، چنانچہ آپ چاہتے تھے کہ حج کے احکام بیان کر کے شریعت کی تکمیل کردی جائے۔ اسی لئے اس حج کا نام حجۃ الوداع رکھا گیا، چنانچہ ذوالقعدہ کے آخری ایام میں ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابۂ کرام کے ساتھ حج کی غرض سے مکۃ المکرّمہ روانہ ہوئے۔ ذوالحجہ کی چوتھی تاریخ کو صبح کے وقت مکہ مکرمہ آپ کے قدم مبارک سے مشرف ہوا اور نویں تاریخ کو بروز جمعہ عرفات کا میدان اسلام کی شان وعظمت کا بہترین نمونہ بن گیا۔ عرفات میں یہ آیت نازل ہوئی:

”اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا“ دوپہر کے بعد نبی کریمﷺ نے ایک طویل اور پرتاثیر خطبہ دیا جس میں لوگوں کو جامع طور پر دینی اور دنیوی امور کے متعلق شرعی احکامات سنائے خطبے کے بعد فرمایا:

لوگو! بروز قیامت تم سے پوچھا جائے گا کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا اور تم میں کیوں کر زندگی بسر کی تو تم اس کا کیا جواب دو گے؟ اس پر چہار جانب سے جواب ملا یا رسول اللہ! آپ نے حق جل مجدہ کے سبھی احکام ہمیں پہنچا دئے اور رسالت کا پورا حق ادا کر دیا، یہ سن کر آپ ﷺ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا۔ الٰہی تو گواہ ہے، الٰہی تو گواہ ہے، الٰہی تو گواہ ہے، میں نے رسالت کا حق ادا کر دیا۔ علامہ حالی نے کیا خوب تصویر کشی کی ہے:

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت وجبل نام حق سے

آپ کے انقلابی پیغام کو عام کرنے والے جانشیں:

آپ ﷺ مدنی دور میں کفار ومشرکین کے ساتھ غزوات کے ذریعہ اپنے اصحاب کو انقلابی ذہن عطا کیا اور ان کی مکمل تربیت ورہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کے عظیم دعوتی منصوبوں کو وسعت دینے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زریں خدمات انجام دیں اور جس شان سے حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ اور دیگر قائدین صحابہ کرام نے اپنا بھرپور تعاون حضور ﷺ کے جانشیں کو بہم پہنچایا اس کی مثالیں تاریخ میں نایاب ہیں۔ محسن انسانیت کے تیار کردہ افراد نے اپنی جفاکشی سے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ بہترین نمونۂ انسانیت ہیں، وہ بے لوث کردار سے مزین ہیں، ذہانت و فطانت میں اپنی مثال آپ ہیں، سخت ترین حالات میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہونے والے نہیں ہیں۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ آقا ﷺ کی تربیت یافتہ جماعت اور اس کی قیادت نے چند ہی برسوں میں اسلام کی شعاؤں کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچا دیا اور اسلامی نظام عدل کا سایۂ رحمت جس رفتار سے آپ ﷺ نے اس کرۂ ارضی پر پھیلایا تھا اس

میں قطعاً کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ہمارا اور پوری دنیا میں ملت اسلامیہ کا وجود انہیں کی جانفشانیوں کا ثمر ہے۔ آج اگر سچائی اور نیکی کی کچھ رمق موجود ہے تو انہیں کا مرہون منت ہے، اخلاق کی لازوال قدریں اور زندگی کی کامیابی وکامرانی کے اٹل اصول ہاتھ آسکتے ہیں تو حضرت محمد ﷺ کی بارگاہی سے ہاتھ آسکتے ہیں۔

سیرت طیبہ آج بھی کامیابی کی ضامن:

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جب تک نبی کریم ﷺ کے ارشادات وفرمودات کو عملاً اپنایا اس وقت تک وہ دنیا کے امام ورہبر رہے اور اس شان وشوکت سے ان کی قیادت کیکہ تاریخ اسے بھلا نہیں سکتی، آج اگر وہ ان عظمتوں اور رفعتوں سے محروم ہیں تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ انہوں نے اسوۂ نبوی ﷺ سے منہ موڑ لیا ہے اور اپنے آپ کو بربادی کے دہانے پر ڈال دیا ہے۔ آج ان کا دعوی محبت رسول صرف قرطاس وقلم میں سمٹ کر رہ گیا ہے، ان کی مجلسیں اور ان کی تحریریں ذکر رسول ﷺ سے آباد ہیں، لیکن ان کا دل سیرت طیبہ کو عملاً اپنانے سے بے زار و ویران ہے، پھر کیسے انہیں کامیابی مل سکتی ہے؟۔ صالح معاشرہ کی تشکیل میں آنحضرت ﷺ کا کردار وہ مثالی کردار رہا ہے جسے غیروں نے بھی مانا ہے اور یہی آپ کا امتیاز ہے، آپ نے صدق ووفا جود وسخا کی وہ فضا قائم کی جس سے سبھی اقوام متاثر ہوئے، آج ہم رسول کریمؐ کی اخلاقی ومعاشرتی تعلیمات سے کوسوں دور ہو چکے ہیں، ہمارے دلوں میں ایمان وایقان کی وہ چنگاری باقی نہ رہی جو شعلۂ جوالہ بن کر ایوان باطل کو خاکستر کر سکے، ہم ان اوصاف سے متصف نہیں جن سے صحابہ کرام متصف تھے، نتیجۃً آج ہم چہار جانب سے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں، سازشوں کا جال وسیع پیمانے پر پھیلا جا رہا ہے اور انتھک کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کے قلوب سے تخم ایمان کو نکال دیا جائے، لیکن ہم مسلمان آج دنیا کی رنگینیوں اور ظاہری چمک دمک سے اس

طرح مسحور ہو گئے ہیں کہ فرمان نبی "الدنیا خضر حلو" ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے، ہر سو دشمنوں کی یلغار ہے اور ہم میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں، بزدلی و جبن ہمارے دلوں میں گھر کر گیا ہے، لیکن یقین مانئے قوموں کی تاریخ ہی عروج و زوال سے مرکب ہے، مصائب کا آنا کوئی نئی بات نہیں ان سے نبرد آزما ہونا اور اسلامی شناخت کو باقی رکھنا اصل سرمایۂ حیات ہے، اگر آج بھی ہم خود کو اسوۂ نبویؐ کا پابند بنالیں تو انشاء اللہ ضرور عظمت رفتہ کی بازیابی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ "وَأَنْتُمُ الاعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْن" علامہ طارق بن ثاقب کی اس آواز پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

پھر ہو فاران کی چوٹی سے صدا کوئی بلند
پھر سے آوازِ محمدؐ کو ابھارا دے دے

☆☆

اسوۂ رسول ﷺ کے روشن ابواب

● محمد اسجد قاسمی ندوی

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے ایک بار رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ کا طریقۂ زندگی اور آپ کی سنت حسنہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے تفصیل سے جواب دیتے ہوئے فرمایا: (**المعرفة راس مالی، والعقل أصل دینی والحب اساسی، والحزن رفیقی، والعلم سلاحی، الصبر ردائی، والرضاء غنیمتی، والعجز فخری، والزهد حرفتی، الیقین قوتی، والصدق شفیعی، والطاعة حسبی، والجهاد خلقی، وقرة عینی فی الصلاة**) ''معرفت میرا سرمایہ زندگی ہے، عقل میرے دن کی اصل ہے، محبت میری زندگی کی بنیاد ہے، شوق میرا راہوار ہے، ذکر اللہ میرا مونس ہے، اعتماد میرا خزانہ ہے، غم میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میری پوشاک ہے، رضا میرا مال غنیمت ہے، تواضع وانکساری میرا فخر ہے، زہد میرا پیشہ ہے، یقین میری توانائی ہے، صدق میرا حامی اور سفارشی ہے، طاعت الٰہی میرے لئے بس ہے، جہاد میرا خلق ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔'' (کتاب الشفاء قاضی عیاضؒ)

رسول اللہ ﷺ نے سترہ نکات کا ذکر فرمایا، ان میں ہر نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، کتاب زندگی کے یہ سترہ باب ہیں جن پر عمل کر کے انسان اپنی زندگی قابل صد فخر و رشک بنا سکتا ہے اور اپنے کو اسوۂ رسول کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کر سکتا ہے، ذیل میں ہم ان سترہ نکات کو اختصار کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔

معرفت (المعرفۃ رأس مالی):

معرفت کے معنی پہچاننے کے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو اپنے نفس کی معرفت ہے، دوسرے خدا کی معرفت، نفس کی معروف کو عرفان خودی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، انسان اگر بالکل غیر جانبدار ہو کر عرفان خودی میں مشغول ہو تو وہ اپنے آپ معرفت خدا تک پہنچ جاتا ہے "**من عرف نفسه فقد عرف ربه**" جس کو خود کا عرفان حاصل ہو گیا اسے خدا کا عرفان حاصل ہو گیا، انسان عالم اصغر ہے، کائنات کی ہر چیز کا نمونہ اس کی اپنی ذات میں موجود ہے، اگر وہ اپنی ذات میں تفکر کرے تو اسے اپنی عبدیت اور اللہ کی الوہیت ومعبودیت کا ناقابل شکست یقین حاصل ہوتا ہے، قرآن میں مختلف موقعوں پر مغفرت خدا اور قبول قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ تک رسائی کی کوشش کی طرف بلایا گیا ہے۔ فرمایا گیا "**وفی الارض آیات للمؤقنین، وفی انفسکم افلا تبصرون**" (الذاریات: ۲۰، ۲۱) (زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خود تمہارے اپنے وجود میں بہت سی نشایاں ہیں، کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟)۔

بے نظیر ساخت کا جسم، حیرت انگیز قوتیں، دل ودماغ، عقل وفکر، تخیل وشعور، ارادہ وحافظہ، احساسات وجذبات، خواہشات ومیلانات، سماعت وبصارت، قوت شامہ وذائقہ، زبان وگویائی اور نہ جانے کتنی نعمتیں اس انسان کو دی گئی ہیں جو قدرت الٰہی کی جیتی جاگتی نشانیاں ہیں، پھر ان قوتوں اور اختیارات کے ساتھ ہی کائنات کی ہر چیز انسان کی خادم وتابع بنائی گئی ہے، چاند سورج، لیل ونہار، صبح وشام، بحر وبر، بلکہ زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں انسان کے لئے مسخر ہیں۔

اگر انسان خودی کے عرفان کی کوشش کرے گا تو ان تمام حقیقتوں تک اس کی رسائی ہوگی، خدا کی وہ نعمتیں جو اس کے وجود پر ہر آن برس رہی ہیں اس کے دل میں شکر وعمل کے

جذبات بیدار اور اس کی ذات میں مخفی صلاحیتوں کو قوت سے فعل میں لانے کی روح (Spirit) پیدا کریں گی اور عرفان خودی کی بدولت اسے عرفان خدا کی دولت بے بہا میسر آئے گی اور فکر وعمل کی تمام پر پیچ راہوں میں حق کی سیدھی شاہراہ پر اس کے پاؤں جمے رہیں گے اور وہ ناشکری، بے عملی اور بدعملی کی بدترین لعنتوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ ہو جائے گا۔ اقبال نے اسی کو واضح کیا ہے۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی
کہ خودی کہ عارفوں کا ہے مقام بادشاہی
تری زندگی، اسی سے تیری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش ولذت نمود میں ہے

خودی اور خدا کی معرفت افراد واقوام کی زندگی کا حقیقی سرمایہ اور حاصل ہے، معرفت الٰہی جس دل کو حاصل ہو جاتی ہے وہ توحید کا سچا علم بردار بن جاتا ہے، وہ شرک کی تمام جلی وخفی، عیاں ونہاں صورتوں سے آخری حد تک گریزاں اور نفور ہو جاتا ہے، پھر وہ اللہ کے اخلاق واوصاف کو اپنانا اور ان کا پرتو بننا چاہتا ہے، وہ اپنی حیات مستعار کا ہر لمحہ اللہ کے رنگ میں رنگ لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ "(**ومن أحسن من الله صبغة**" (اللہ کے رنگ سے اچھا رنگ کس کا رنگ ہوگا؟)۔

(۲) عقل میرے دین کا اصل ہے (العقل أصل دینی):

عقیل سلیم دین کی جڑ ہے، وہ کلیدی اہمیت کی حامل ہے، بے عقل افراد واقوام بے مقصد زندگی گزارتے ہیں، دین کی بقاء اور ارتقاء کا دارومدار عقل سلیم ہے، جا بجا اللہ نے

قرآن میں اپنی نعمتوں میں، اپنی قدرت کے کمالات میں، آفاق وانفس میں، تاریخ عالم اور تاریخ اقوام وملل میں، امتوں کے اسباب عروج وزوال میں تدبر وتفکر اور عقل کے استعمال کی اسی لئے دعوت وتاکید فرمائی ہے کہ اس کی مدد سے انسان حقیقت تک رسائی حاصل کر سکے گا اور اپنے عمل کے لئے راہیں متعین کرے گا، عبرتیں حاصل کرے گا اور اپنے عمل کے لئے راہیں متعین کرے گا، عبرتیں حاصل کرے گا، سبق لے گا، وہ عقل کا استعمال کرے گا، تو دل ناجائز خواہشات کے ہاتھوں میں اپنی لگام اور باگ نہیں دے گا، اس کے نفس کا سرکش گھوڑا اس کے عقل سلیم کے قبضہ میں ہوگا، نفس امارہ کی پیروی سے وہ دور رہے گا، اللہ نے بے عقلوں کے بارے میں فرمایا: ''وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَايَعْقِلُوْنَ'' (جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اللہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے) (یونس:۱۰۰) واضح فرمایا گیا کہ جو طالب حق نہ ہو اور اپنی عقل کو تعصّبات کی تاریکیوں میں چھپائے ہوئے ہو یا جستجو حقیقت میں بالکل عقل کا استعمال ہی نہ کرے تو اس کے لئے اللہ کے ہاں ضلالت وجہالت اور محرومی وغلط کاری کی غلاظت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے وہ اپنے کو اسی نجاست کا اہل بناتا ہے اور یہی اس کی قسمت میں لکھی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے خاص بندوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ان اوصاف میں سے ایک وصف یہ ہے۔ (وَالَّذِيْنَ اِذا ذُكِروا بِآياتِ'' رَبِّهِم لَم يخروا عَليها صُماً وَّعُمْيانـاً'' (اگر ان کے رب کی آیات سنا کر انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں گرتے) (الفرقان) اس کا مطلب یہ ہے کہ ''قرآن کے معارف وحقائق کی طرف سے اندھے بہرے نہیں ہو جاتے، بلکہ عقل وفہم کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے اور تعمیل حکم میں لگ جاتے ہیں، انہیں بہ گوش قبول سنتے اور بہ چشم عبرت دیکھتے ہیں'' (تفسیر ماجدی:۳/۳۲۵)

اہل ایمان اللہ کی آیات اور احکام کی طرف اندھوں اور بہروں کی طرح نہیں، بلکہ دانا

اور بینا وشنوا انسان کی طرح متوجہ ہوتے، غور کرتے اور عمل کرتے ہیں، اللہ نے عقل کو علم کا اہم ترین ذریعہ بنایا ہے۔ حواس خمسہ کی پرواز جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے عقل کا دائرہ کار شروع ہوتا ہے، لیکن اللہ نے عقل کا دائرہ غیر محدود نہیں، بلکہ محدود رکھا ہے، اس کا دائرہ متعین ہے، دائرہ سے باہر عقل صحیح رہنما نہیں کرتی، بلکہ گمراہی میں لے جاتی ہے، عقل کی پرواز جہاں ختم ہوتی ہے، وہاں وحی الٰہی کا دائرہ شروع ہوتا ہے، دائرہ میں عقل کا استعمال شرع کا مطلوب ہے، عقل کا بالکل استعمال نہ کرنا یا دائرہ سے باہر استعمال کرنا افراط وتفریط میں داخل ہے، جو قابل مذمت امر ہے، عقل کو سلیم اسی وقت قرار دیا جائے گا جب وہ اعتدال سے آراستہ اور افراط وتفریط سے دور ہو، شریعت میں یہی محبت عقل مطلوب ومحمود اور اصل وبنیاد قرار دی گئی ہے۔

(۳) محبت میری زندگی کی بنیاد ہے (الحب أساسی):

اللہ کی محبت اور اللہ کی خاطر اور اس کی رضا جوئی کے لئے بندوں سے محبت ایمان کا اہم ترین حصہ ہے، نوع انسانی سے مواسات وہمدردی کا معاملہ، عدل واحسان اور اس کی خاطر ایثار وقربانی اور اپنوں وبیگانوں سب کے ساتھ رحمت کا معاملہ ایمان کا اہم مطالبہ ہے، حضور اکرمؐ کو رحمۃ للعالمین قرار دیا گیا ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ کی ذات والا صفات اس کی پوری کائنات کے لئے سراسر رحمت تھی۔

تقویٰ اور خوف خدا فی الواقع محبت کا نتیجہ ہوتا ہے، اللہ سے محبتِ خاطر اور اس کی خوشنودی کے حصول کی غرض سے انسان راہ تقویٰ پر گامزن ہوتا ہے، دوسری طرف اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال اور خلق خدا سے سچی محبت کی بنیاد پر انسان خود بھی عذاب جہنم سے بچنا اور دوسروں کو بچانا چاہتا ہے، اسی لئے وہ خود تقویٰ اختیار کرتا ہے اور دوسروں کو تلقین کرتا ہے اور قرآن کی اس آیت پر عمل کرتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے: '' يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا

قُوا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَاراً وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے)۔ (التحریم:٦) مختلف احادیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ ایمان کی حلاوت ولذت اور چاشنی وشیرینی اسی صورت میں میسر آئے گی جب اللہ ورسول کی محبت ہر ماسوا سے کہیں زیادہ دلوں میں جاگزیں ہوگی، ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "ولا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین" (تم میں سے کوئی مومن ہی نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی نگاہ میں اس کے والدین، اولاد، اعزہ واقارب اور پوری کائنات سے زیادہ محبوب وعزیز نہ ہوجاؤں)۔ (صحیح بخاری) قرآن کریم میں ان لوگوں کو سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں جو اللہ ورسول کی محبت پر دوسروں کی محبتوں کو ترجیح دیتے ہوں گے، فرمایا گیا: "قُلْ اِنْ كَانَ آبَآؤُكُمْ وَاَبْنَـآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يأتى اللّٰهُ بِأمْرِهٖ" (اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور بیویاں اور عزیز وقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے پسندیدہ گھر تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے لے آئے)۔ (التوبہ:٢٤)

مولانا آزادؒ اس آیت کے ذیل میں رقم طراز ہیں۔ "یہ آیت مہمات مواعظ میں سے ہے اور باب میں قطعی ہے کہ اگر حب ایمانی وغیر ایمانی میں مقابلہ ہوجائے تو مومن وہ ہے جس کی حب ایمانی پر دنیا کی کوئی اور محبت اور علاقہ بھی غالب نہ آسکے...... محبت ایمانی کی اس آزمائش میں صحابہ کرام جس طرح پورے اترے اس کی شہادت تاریخ نے محفوظ کرلی ہے اور

محتاج بیان نہیں، بلاشائبہ مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے کسی انسان کے ساتھ اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح سے ایسا عشق نہیں کیا ہوگا، جیسا صحابہؓ نے اللہ کے رسول سے راہ حق میں کیا۔ انہوں نے اس محبت کی راہ میں سب کچھ قربان کردیا جو انسان کرسکتا ہے اور پھر اسی کی راہ سے سب کچھ پایا جو انسانوں کی کوئی جماعت پاسکتی ہے، لیکن آج ہمارا حال کیا ہے؟ کیا ہم میں سے کسی کو جرأت ہوسکتی ہے کہ یہ آیت اپنے سامنے رکھ کر اپنے ایمان کا احتساب کرے؟" (ترجمان القرآن:٣/٢٥٣، ٢٥٤ ملخصا)

اللہ اور رسول کی محبت کے سوا خلق خدا کی محبت بھی ایک مومن کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے، باقی محبت کرنے والے بندوں سے اللہ بھی محبت کرتا ہے اور انہیں قیامت کے روز عرش الٰہی کے سائے میں نور پر جگہ ملے گی، باہمی محبت کو پروان چڑھانے کا اہم نسخہ آپ ﷺ نے " سلام کی ترویج واشاعت بتایا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا "والذین نفسی بیده، لن تدخلوا الجنة حتی تؤمنوا ولن تؤمنو حتی تحابوا، ألاأدلكم على شئى اذا فعلتموه تحاببتم افشوا بالسلام" (اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم جنت میں بلا ایمان داخل نہ ہوسکو گے اور بغیر باہمی محبت کے تم مومن نہ ہوسکو گے، کیا میں تم کو وہ عمل نہ بتادوں جس کی بنیاد پر تم میں باہمی محبت پیدا ہوجائے۔ تم آپس میں سلام کو رواج دو)۔ (صحیح مسلم)

ایک دوسری حدیث میں اللہ ہی کے لئے محبت کرنے اور محبت ونفرت کے تمام جذبات مرضی مولیٰ کے تابع کردینے کو کمال ایمان کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔

مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اس کے ساتھ محبت اور حسن سلوک کا معاملہ اللہ کی توجہ اور رحمت ومحبت کے انجذاب کا اہم ترین باعث ہوتا ہے۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر

(۴) شوق میری سواری ہے:

سوز دروں، جذب اندروں، طلب وآرزو وہ عناصر ہیں جو کسی بھی مشن کی ترقی اور اشاعت کے لئے اساسی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، حضور اکرم ﷺ کو اپنے مشن سے بے پناہ عشق تھا آپ کا مشن قرآن کی زبان میں الفاظ ومعانی قرآن اور سنت کی تعلیم اور لوگوں کا تزکیہ تھا، اپنے اس مشن کی تکمیل کے لئے آپ کی دلسوزی اور شوق وعشق کا ذکر قرآن نے یوں کیا ہے کہ ''فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا'' (شاید آپ ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھودیں گے اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہیں لائے) (الکہف:۶) مولانا آزاد کی زبان میں ''انبیاء کرام ہدایت واصلاح کے صرف طالب ہی نہیں ہوتے، عاشق ہوتے ہیں، انسان کی گمراہی ان کے دلوں کا ناسور ہوتی ہے اور انسان کی ہدایت کا جوش ان کے دل کے ایک ایک ریشے کا عشق، اس سے بڑھ کر ان کے لئے کوئی غمگینی نہیں ہوسکتی کہ ایک انسان سچائی سے منہ موڑ لے، اس سے بڑھ کر ان کے لئے کوئی شادمانی نہیں ہوسکتی کہ ایک گمراہ راہ راست پر آجائے۔'' (ترجمان القرآن:۳۴۸/۲)

دعوت وتبلیغ دین کے ہر کارکن کی ذمہ داری یہی ہے کہ اسی شوق فراواں، سوز وعشق اور تڑپ ولگن سے اپنے مشن کی اشاعت میں منہمک رہے اور یہ وصف اگر میسر نہ آسکا تو پھر حیات انسانی جمود وتعطل وانحطاط وزوال وضعف واضمحلال کی شکار ہوجاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت یہی ہے کہ یہ شوق وعشق ودعوت دین کی مقبولیت اور اثر آفرینی کے لئے بنیادی عنصر کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے اسے اختیار کیا جائے۔

(۵) ذکر اللہ میرا مونس ہے:

واقعہ یہ ہے کہ ذکر الٰہی عبد ومعبودیت کے رشتہ کے استحکام ودوام کا سب سے قوی ذریعہ ہے، ذکر کے مفہوم میں ہر وہ چیز شامل ہے، جس سے اللہ کا استحضار ہو اور اس میں ہر وہ کام داخل ہے جو غفلت سے آزاد ہوکر کیا جائے۔

حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کا ہر گوشہ آپ ﷺ کی نبوت کی واضح دلیل ہے، لیکن آپ ﷺ کی زندگی میں اور ہر عمل میں اللہ کی رحمت وجلال کا ہر آن استحضار اور ذکر کرنے کے ذریعہ ہر دم اللہ سے ربط وتعلق بہت ہی روشن پہلو ہے، اسی لئے آپ نے ذکر الٰہی کو اپنا انیس اور بے پایاں مرغوب ومحبوب عمل قرار دیا ہے، جو آپ کے لئے باعث اطمینان قلب عمل تھا، اہل ایمان کا ایک بنیادی وصف یہ بھی ہے کہ ان کے دل ذکر الٰہی سے اطمینان وسکینت حاصل کرتے ہیں: ارشد فرمایا گیا ''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب'' (سنو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے) (الرعد:۲۸) اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ذکر اللہ قرب خاص کا اہم ترین وسیلہ ہے اور امت کے جن بے شمار بندوں کو قرب خداوندی کی دولت بیش بہا میسر آئی ہے، ان کی زندگی میں ذکر الٰہی کا پہلو بے حد نمایاں رہا ہے۔

قرآن کریم کی مختلف آیات میں مومنوں کو بڑی تاکید کے ساتھ ذکر کا حکم فرمایا گیا ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا'' (اے ایمان والو! اللہ کا کثرت سے ذکر کیا کرو اور صبح وشام اس کی پاکی بیان کرو)۔ (احزاب:۴۱،۴۲) واضح کیا گیا کہ فلاح وکامیابی کثرت ذکر سے وابستہ ہے ''وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا'' (کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے بندوں اور بندیوں کے لئے اللہ نے مغفرت اور عظیم

اجر تیار کر رکھا ہے)(احزاب:۳۵)

قرآن وحدیث کے نصوص یہ واضح کرتے ہیں کہ ذکر اللہ تمام اعمال صالحہ کی روح ہے، دلوں کی دنیا سے آباد رہتی ہے، قلبی بیماریوں کے لئے وہی دوا اور شفا ہے، وہی عبد ومعبود کے مابین وسیلۂ ربط ہے، ذکر میں مشغول افراد کو ملائکہ رحمت گھیر لیتے ہیں، ان پر رحمت خداوندی چھا جاتی ہے، ان پر سکینت نازل ہوتی ہے، اللہ اپنے مقرب فرشتوں میں ان کا تذکرہ کرتا ہے، انہیں اللہ کی معیت وقبولیت کی نعمت ملتی ہے، ذکر الٰہی دلوں کو صیقل کرتا ہے وہ عذاب الٰہی سے نجات کا بہت مؤثر ذریعہ ہے، جب کہ ذکر سے محرومی کا انجام حسرت وحرماں نصیبی اور دلوں کی قساوت وشقاوت ہے۔

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ذکر الٰہی کو اپنی بے انتہا محبوب چیز قرار دیا ہے۔ ''رسول اللہ ﷺ نے ذکر کی جو تاکید فرمائی ہے، اس کے جو فضائل ومنافع بیان فرمائے، اس کے جن اسرار وحکم کی نقاب کشائی فرمائی، اس کے بعد ذکر محض ایک فریضہ اور ضابطہ نہیں رہ جاتا، بلکہ وہ زندگی کی ایک بنیادی ضرورت، فطرت انسانی کا ایک خاصہ روح کی غذا اور دل کی دوا بن جاتا ہے۔ پھر اس کے لئے الہام خداوندی سے جو اوقات ومواقع، جو اسباب ومحرکات تجویز فرمائے اور ان کے لئے جو صیغے اور الفاظ تعلیم فرمائے، وہ توحید کی تکمیل کرنے والے، عبدیت کے قالب میں روح ڈالنے والے، قلب کو نور سے، زندگی کو سکینت وسرور سے اور فضا کو برکت ونورانیت سے بھرپور کرنے والے ہیں، پھر وہ اسی قدر عمومی، پوری زندگی کی وسعت وتنوعات اور شب وروز کے اوقات پر محیط ہیں کہ اگر ان کا ذرا بھی اہتمام کیا جائے تو پوری زندگی ایک مسلسل ومکمل ذکر میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور مشکل سے کوئی وقت، کوئی کام، کوئی نقل وحرکت اور کوئی پیش آنے والی حالت وتبدیلی اس کی رفاقت وشمولیت سے محروم رہتی ہے۔'' (ماخوذ از مقدمہ معارف الحدیث جلد پنجم، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ص ۶/۷)

(۶) اعتماد میرا خزانہ ہے:

اعتماد کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں (۱) خداوند قدوس پر اعتماد (۲) اپنی ذات پر اعتماد (۳) اپنے مصاحبین پر اعتماد۔ رسول اللہ ﷺ ان تینوں قسموں سے مالا مال تھے اور یہی وصف ہر مسلمان میں مطلوب ہے۔

اللہ پر اعتماد کو اصطلاح میں ''توکل'' کہا جاتا ہے، قرآن میں توکل کا حکم بھی ہے اور اس کے فوائد ونتائج کا بیان بھی ہے، آپ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا ''**لا الٰہ الا ھو فاتخذہ وکیلا**'' (اللہ کے سوا کوئی بندگی کے قابل نہیں ہے تو آپ اسی کو اپنا وکیل بنا لیجئے)(المزمل:۹) جگہ جگہ اللہ کو ''**نعم الوکیل**'' (بہترین کارساز) کہا گیا ہے، فرمایا گیا ''**ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ**'' (اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لئے اللہ کافی ہے)(الطلاق:۳) قرآن اپنے پیروؤں کو زیور توکل سے آراستہ ہونے کی جا بجا تلقین کرتا اور دہراتا ہے کہ ''**وعلی اللہ بلیتوکل المؤمنون**'' (اہل ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے)(آل عمران:۱۶۰، تغابن:۱۳) ایک جگہ ارشاد ہے ''**وتوکل علی الحی لا یموت**'' (تم اس اللہ پر بھروسہ کرو جو زندۂ جاوید اور فنا ناآشنا ہے)(الفرقان:۵۸)

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ توکل کا مطلب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا اور اختیاری اسباب ووسائل کو استعمال میں نہ لانا نہیں ہے، بلکہ تمام ممکنہ ظاہری اسباب وتدابیر کو اختیار کر کے نتائج اللہ کے سپرد کرنا اور بے فکر ہو جانا توکل ہے، مگر دل کا اعتماد اللہ کی ذات پر ہو، یہ یقین ہو کہ قدرت خداوندی ان اسباب کی پابند نہیں ہے، اللہ چاہے تو ان اسباب کے بغیر بھی سب کچھ کر سکتا ہے اور ظاہری اسباب کی حیثیت بس صرف اتنی ہی ہے کہ وہ اللہ کے مقرر کردہ ذرائع اور راستے ہیں جن سے ہم تک اشیاء کی رسائی ہوتی ہے۔ احادیث میں وارد ہوا

ہے کہ اللہ پر توکل کرنے والے بندے بلاحساب جنت میں داخل ہوں گے، دنیا میں انہیں سہولت سے روزی ملے گی، زیادہ کدوکاوش نہ کرنی پڑے گی، اللہ ان کی تمام ضرورتوں کے لئے کفایت کرے گا اور سکون قلبی کی دولت سے نوازے گا اور ان کی محنتوں کو ضائع نہیں کرے گا، اللہ کی ذات وصفات پر کامل ایمان قدرت کے مکافات عمل کے منصفانہ قانون پر یقین اور رجائیت پسندی اور ناامیدی سے دوری توکل کے اہم عناصر ہیں۔

اپنی ذات پر اعتماد (خود اعتمادی) کامیابی وکامرانی کی ضمانت ہے، رسول اللہ ﷺ نے تئیس سال کی مختصر ترین مدت میں جزیرہ العرب میں جو علمی، فکری، ونظری، اخلاقی واصطلاحی مدت میں جزیرہ العرب میں جو علمی، فکری، ونظری، اخلاقی واصلاحی انقلاب برپا فرمایا اس کی کامیابی میں خود اعتمادی کا بے پناہ دخل تھا، بادمخالف، طوفان مصائب، حوادث زمانہ، مشکلات وخطرات سے مقابلہ اور قربانیاں پیش کرنے کا حوصلہ خود اعتمادی کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا، عظمت اور رفعت کے حصول میں خود اعتمادی کا بڑا کلیدی کردار ہوتا ہے، ہر دور میں اہل ایمان کی کامیابیوں، بلندیوں اور عظمتوں میں توکل اور خود اعتمادی دونوں کا اہم رول رہا ہے۔

مصاحبین پر اعتماد کسی بھی مشن اور دعوت کی کامیابی کے لئے شرط اولین ہے، اصلاحی، سیاسی، معاشرتی، عسکرتی ہر میدان میں رفقائے کار پر مکمل اعتماد ضروری ہے، رفقاء میں خود اعتمادی پیدا کرنا، ان کو قابل اعتماد بنانا اور ان کے دلوں میں اپنا اعتماد راسخ کرنا بہت اہم ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے معتمد تھے، ان کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ پر مکمل اعتماد واعتقاد تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے ان میں خود اعتمادی کا جوہر پیدا فرمادیا تھا اور پھر ان کے والہانہ انداز اور سرفروشانہ جذبوں نے آپ ﷺ کی نگاہ میں ان کو بے حد قابل اعتماد بنادیا تھا اور انہیں کے ذریعہ سے آپ ﷺ نے پورے جزیرۃ العرب کی کایا پلٹ دی تھی، نئی روح پھونک دی تھی، ہدایت کی شمعیں ہر جگہ فروزاں کردی تھیں۔

توکل خود اعتمادی اور رفقاء پر کام میں اعتماد رسول اللہ ﷺ کی زبان میں ان کا خزانہ تھا، یہی خزانہ ہر مومن کے پاس ہونا چاہیے۔

(۷) غم میرا رفیق ہے (والحزن رفیقی):

رسول خدا ﷺ کو اپنی ذات کا نہیں بلکہ انسانیت کا غم تا، آپ جو مشن لے کر اس دنیا میں تشریف لائے تھے اور ہدایت واصلاح خلق کی جو ذمہ داری آپ پر اللہ کی طرف سے ڈالی گئی تھی اس کی تکمیل کی فکر میں آپ کے شب وروز کا ہر لمحہ اضطراب کے عالم میں گزرتا تھا، آپ کو پوری کائنات کے لئے رحمت عالم اور مبشر نذیر اور داعی ومصلح بنا کر بھیجا گیا تھا، آپ اپنے اس فرض کی انجام دہی کے لئے ہمہ وقت کوشاں اور بے قرار رہا کرتے تھے اور کسی بھی نوع کی غفلت سے ہر آن لرزاں وترساں رہتے تھے۔

قرآن کریم آپ کے اسی غم انسانیت اور اضطراب دائمی کا تذکرہ کرتا ہے "لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ" (اے نبی! شاید آپ اس غم میں اپنی جان کھودیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے) (الشعراء:۳)

دعوت واصلاح کی پر خطر راہ پر چلنے والے ہر فرد میں شریعت کی مطلوبہ کیفیت یہی ہے کہ وہ اپنے مدعوں کی اصلاح کے لئے تڑپتا رہے اور اس کی بے قراری کو تبھی قرار آئے جب اس کا مشن تکمیل کا مرحلہ طے کرلے۔

(۸) علم میرا ہتھیار ہے (والعلم سلاحی):

اسلام میں علم کو اولین اہمیت دی گئی ہے، ابتدائی وحی میں علم ہی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا "اِقْرأ بِاسمِ رَبِّکَ الَّذِی خلق خَلَقَ الاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقرأ وَرَبُّکَ أکرَمُ الَّذی عَلَّمَ بِالْقَلم عَلَّمَ الاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَم" (اپنے اس پروردگار کے نام پڑھیے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کو لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھیے، آپ کا رب

بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جس سے کہ وہ ناآشنا تھا) (العلق:۱-۵)

واقعہ یہ ہے کہ علم کی طاقت سے ہر معرکہ سر ہوسکتا ہے، اسی لئے اس کو ہتھیار قرار دیا گیا ہے، اس کے ذریعہ ہر دشمن کو زیر کیا جاسکتا ہے، قرآن کے بیان کے مطابق قارون کی بے پناہ دولت وثروت، شان وشوکت، تعیش وطمطراق اور ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر ظاہر بیں سطحی لوگ رشک کرنے لگے اور کہنے لگے ﴿یا لیت لنا مثل ما اوتی قارون، انه لذو حظ عظیم﴾ ''کاش ہمیں بھی وہی ملتا جو قارون کو ملا ہے، وہ تو بڑا نصیبے والا ہے'' مگر ثروت وتعیش کو اگر کسی نے پرکاہ اور ذرہ بے مقدار کے برابر بھی قابل اعتناء نہ سمجھا تو علم کی دولت سے بہرہ مند افراد نے، انہوں نے علم کی دولت وطاقت کے ذریعہ مادیت پرستی اور دنیوی ہنگامہ آرائیوں کی طاقت کو توڑ دیا اور کہا ''ثَوابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صالِحًا، وَلاَ يُلَقّٰهَا اِلا الصَّابِرونَ'' (اللہ کا ثواب اس شخص کے لئے بدرجہا بہتر ہے، جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت صبر کرنے والوں ہی کو ملتی ہے) (القصص:۷۹-۸۰)

خوف خدا اور خشیت ربانی جو انسان کی زندگی کے ہر موڑ پر ضروری چیز ہے اور جس کے بغیر انسان نہ منزل کا صحیح ادراک وتعین کرسکتا ہے اور نہ اپنا لائحہ عمل طے کرسکتا ہے، یہ دولت بھی اہل عمل ہی کے حصہ میں آتی ہے، قرآن کہتا ہے ''اِنمَا يَخشىٰ اللّٰهَ مِنْ عِبادِهِ العُلَمَاءُ'' (حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے اس کے صرف وہی بندے ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا علم رکھتے ہیں) (الفاطر:۲۸)

قرآن ہی کی شہادت کے مطابق اللہ کی وحدانیت کا راز بھی صرف اصحاب علم پر آشکارا ہوتا ہے، ارشاد ہے ''شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّه لاَ اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَاُولُوا العِلْمِ قَائِماً بِالْقِسْطِ'' (اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور وہ عدل وانصاف کرنے والا ہے اور یہی شہادت ملائکہ اور اہل علم نے بھی دی

ہے)۔ (آل عمران:۱۸)

اہل علم کے ذکر میں قرآن ایک جگہ کہتا ہے ''يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أوتوا العِلْمَ دَرَجَاتٍ'' (تم میں جو ایمان والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے اللہ ان کو بلند درجہ عطا فرمائے گا) (المجادلہ:۱۱)

قرآن دوسری جگہ کہتا ہے ''قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لاَ يَعْلَمُوْنَ'' (آپ کہہ دیجئے کہ کیا علم والے اور جاہل دونوں کبھی یکساں ہوسکتے ہیں)۔ (الزمر:۹) اسی لئے اللہ نے اپنے پیغمبر کو تلقین فرمائی کہ وہ اپنے رب سے اضافہ علم کے لئے دعا کرتے رہیں ''وقل رب زدنی علما'' (اور دعا کیجئے اے پروردگار مجھے مزید علم عطا فرما)۔ (طٰہٰ:۱۱۴)

حضور اکرم ﷺ کے بقول ''العلم ثلاثة: آية محكمة، أو سنة قائمة، أو فريضة عادلة وما سوىٰ ذلك فهو فضل'' (علوم صرف تین ہیں، قرآن، حدیث اور وہ مسائل جنہیں قرآن وحدیث کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے، اسی کے سوا جو کچھ ہے وہ زائد ہے) (سنن ابوداؤد) حدیث میں علم دین کے حصول کو ہر مسلمان کا لازمی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔

احادیث کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم وحکمت کی دولت قابل رشک دولت ہے، جس کے حصول کی تمنا ہر دل میں ہونی چاہئے اور انسان کی موت کے بعد بھی اسے اپنے اس علم کی بدولت مسلسل ثواب ملتا رہتا ہے، جس کا فائدہ لوگوں تک پہنچتا رہے، اللہ کے رسول ﷺ نے علم نافع کی دعا اور علم غیر نافع سے پناہ خود بھی مانگی اور دوسروں کو بھی اس کا حکم بھی فرمایا ہے اور اسے انبیاء کی میراث قرار دیا ہے اور یہ واضح کردیا ہے کہ حصول علم میں مشغول افراد کے لئے آسمان کے فرشوں سے لے کر سمندر کی مچھلیوں اور زمین کی چیونٹیوں تک تمام مخلوقات دعائے خیر واظہار محبت کرتی ہیں۔ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ علم دین سے ناواقف

واقف کاروں سے سیکھیں اور واقف کار انہیں سکھائیں، رسول اللہ ﷺ نے دعا اور مناجات میں مشغولیت سے زیادہ افضل تعلیم دین و تعلم دین کو قرار دیا ہے، لیکن دوسری طرف دنیوی اغراض کے لئے ریا وسمع کے لئے علم حاصل کرنے والے کا ٹھکانہ جہنم بتایا گیا ہے اور اسے جنت کی خوشبو سے محروم قرار دیا گیا ہے، بے عمل عالم کی مثال حدیث میں اس چراغ کی سی بتائی گئی ہے جو دوسروں کو تو روشنی فراہم کرتا ہے لیکن اپنی ہستی کو بس جلاتا رہتا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ دین کا خالص علم مومن کے لئے تمام معرکوں میں سب سے کارآمد ہتھیار رہتا ہے، بشرطیکہ وہ خلوص وعمل کے زیور سے آراستہ ہو۔

(۹) صبر میری پوشاک ہے (الصبر ردائی):

پوشاک کی خصوصیت اور مقصد برہنگی اور عریانیت سے بچاؤ، پردہ پوشی، موسم کی سختیوں سے حفاظت اور تزئین وآراستگی ہوتا ہے، صبر وتحمل بھی انسانی عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔

صبر کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے عام طور پر اس کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) مصائب پر صبر (۲) معاصی سے صبر (پرہیز) (۳) طاعات پر صبر (جماؤ) مختصر لفظوں میں صبر کا مفہوم اللہ کے حکم کی تعمیل میں خواہش نفس کا دبانا اور کچلنا اور اس کی راہ کی تلخیوں اور مصیبتوں کو برداشت کرتے رہنا ہے۔ قرآنی بیان کے مطابق صبر انسان کی فلاح اور کامیابی کی ضمانت ہے، صبر کرنے اور صبر کی تلقین کرنے والوں کو خسارہ اور گھاٹے سے محفوظ بتایا گیا ہے، ارشاد ہے: ''وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِی خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ '' (زمانے کی قسم! انسان درحقیقت خسارہ میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے)۔

یہ دنیا چونکہ راحت ومصیبت وغم کا آمیزہ ہے، یہاں خوشی ہے تو رنج ودکھ بھی ہے، تلخی

بھی ہے اور شیرینی بھی اور یہ سب منجاب اللہ ہے، اس لئے اہل ایمان کو یہ حکم ہے کہ وہ مصائب کے عالم میں صبر وتحمل کے پیغمبرانہ اسوہ کی پیروی کریں، قرآن کریم میں ستر سے زائد جگہوں پر صبر کا بیان ہے اور بیشتر نیکیوں کو صبر ہی کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور انہیں صبر کا نتیجہ اور ثمرہ بتایا گیا ہے، احادیث میں بھی یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ صبر کے نتیجہ میں انسان بہرصورت اپنے رب سے مربوط اور وابستہ رہتا ہے اور مصائب وناکامیوں اور رنج وغم کے ہجوم میں بھی وہ دل شکستہ، پژمردہ اور مایوس نہیں ہوتا بلکہ اس کی عملی توانائیاں بڑھ جاتی ہیں۔

قرآن کا بیان ہے کہ اللہ کی معیت اور نصرت صبر کرنے والوں کے شامل حال رہتی ہے، حضور اکرم ﷺ کی زندگی کے ہر موڑ پر صبر وتحمل کا نمونہ ملتا ہے، بارہا مصائب کا طوفان آیا مگر آپ ﷺ صبر وتحمل اور استقامت میں پہاڑ سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی مدد اور نصرت ہر موقع پر آپ کے ساتھ رہی۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر نیکی کا ثواب متعین ومقدر ہے، مگر صبر کا اجر بے حساب ہے، ارشاد ہے: ''اِنَّمَا یوفیّٰ الصابرون أجْرَهُمْ بغیر حِسَاب '' (صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا)۔ (الزمر:۱۰) حدیث میں روزوں کے بارے میں بے حساب اجر کا ذکر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ بھی صبر ہی کی قسم ہے، حضرت یونسؓ نے آپ ﷺ سے روایت کی ہے کہ قیامت کے دن میزان عدل قائم کی جائے گی، اہل صدقہ آئیں گے، تو ان کے صدقات کو تول کر ان کے حساب سے پورا پورا اجر دے دیا جائے گا۔ اسی طرح نماز اور حج کی عبادات والوں کو تول کر حساب سے ان کا اجر پورا کر دیا جائے گا۔ پھر جب بلا اور مصیبت میں صبر کرنے والے آئیں گے تو ان کے لئے کوئی کیل اور وزن نہیں ہوگا، بلکہ بغیر حساب واندازہ کے ان کی طرف اجر وثواب بہا دیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کی دنیاوی زندگی عافیت میں گزری تمنا کرنے لگیں گے کہ کاش ان کے بدن بھی دنیا میں قینچیوں کے

ذریعہ کاٹے گئے ہوتے تو ہمیں بھی صبر کا ایسا ہی صلہ ملتا'' (معارف القرآن: ۷/۵۴۳)

قرآن کی صراحت کے مطابق اہل صبر پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات اور نوازشیں ہوں گی، رحمت الٰہی ان پر سایہ فگن ہوگی اور وہ ہر موڑ پر راست رو رہیں گے۔ احادیث نبویہ میں کہیں صبر کو سراسر خیر اور موجب برکت بتایا گیا ہے اور کہیں جنت میں داخلہ کی ضمانت قرار دیا گیا ہے، صبر کو ذریعۂ مغفرت اور باعث نجات بتایا گیا ہے، صبر کے بارے میں یہ بھی آیا ہے ''**وَما أعطي احد عطاء خيرا اوسع من الصبر**'' (کسی کو صبر سے بہتر اور وسیع تر عطا نہیں بخشی گئی) (بخاری) یعنی صبر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ تمام محاسن اور خوبیوں کو جامع ہے، زندگی کے اعلیٰ اقدار کا حصول صبر ہی کا رہین منت ہوتا ہے، صبر ہی ہمہ نوع تنگیوں کو دور اور ذہن وفکر اور سعی وعمل کو وسیع کرتا ہے، ایک حدیث میں صبر کو روشنی قرار دیا گیا ہے (مسلم) صبر ایمانی اعلیٰ اخلاق کا اہم ترین شعبہ ہے اور عزیمت کے کاموں میں سے ہے، حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ ایمان کے چار ستون ہیں (۱) جہاد (۲) یقین (۳) عدل اور صبر کو وہ مقام حاصل ہے جو جسم میں سر کو حاصل ہے جس کے پاس سر نہ ہو اس کا جسم بے کار ہے، ایسے ہی جس میں صبر نہ ہو اس کا ایمان بے کار ہے (احیاء العلوم) صبر کی اسی اہمیت کے پیش نظر آپ ﷺ نے اسے اپنی پوشاک اور لباس قرار دیا ہے۔

(۱۰) رضا میرا مال غنیمت ہے (والرضاء غنیمتی):

اللہ کی رضا جوئی کو رسول اکرم ﷺ نے اپنا مال غنیمت قرار دیا ہے، جہاد فی سبیل اللہ اور دیگر تمام عبادات میں آپ ﷺ کے پیش نظر اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کا حصول ہوتا تھا، آپ ﷺ نے مجاہدہ اسی کو قرار دیا جو رضائے الٰہی کے حصول کے لئے لڑے، مال و دولت کے حصول کے لئے لڑائی جہاد نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے یقین اپنے اصحاب کے دلوں میں پیوست اور راسخ فرمادیا تھا کہ:

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت، نہ کشور کشائی

مختلف اعمال وعبادات کے ذکر میں آپ ﷺ نے احتساب کا لفظ استعمال کیا فرمایا ہے: جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو نیک عمل بھی کیا جائے اس کا باعث ومحرک صرف اللہ کے اجر و ثواب کی امید وطلب ہو، کوئی دوسرا جذبہ ومقصد اس کا محرک نہ ہو، حدیث میں آیا ہے ''**من صام رمضان ايمانا واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه، ومن قام رمضان ايمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه، ومن قام ليلة القدر ايمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه**'' (جو ایمان واحتساب کے ساتھ رمضان کے روزے رکھیں گے رمضان کی راتوں میں نوافل پڑھیں گے، شب قدر میں نوافل پڑھیں گے ان کے پچھلے تمام گناہ معاف کردئے جائیں گے)۔ (بخاری ومسلم)

قرآن کریم میں بھی تمام اعمال صالحہ کی غرض وغایت رضائے الٰہی ہی بتائی گئی ہے، یہ اسلامی اخلاق کا بنیادی اصول ہے، قرآن کہتا ہے کہ انسان اپنی جان ومال دونوں دولتیں رضائے الٰہی کی راہ میں لگادے، ارشاد ہے: ''**وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَه ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَاد**'' (انسانوں میں بعض ایسے ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپادیتے ہیں، ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے) (البقرہ: ۲۰۷) ''**وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتاً مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ، فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ**'' (جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لئے دل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بلند سطح پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو تو دوگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لئے کافی ہوجائے)۔ (البقرۃ: ۲۶۵) صدقات وخیرات کی تلقین، اعمال صالحہ کا حکم، لوگوں کے معاملات کی اصلاح، صبر وتحمل، اہل

قرابت کے حقوق کی ادائیگی، مساکین وفقراء کی مدد، مسافروں کے ساتھ حسن معاملہ یہ تمام نیکیاں ہیں جن کی نام بہ نام صراحت قرآن میں ہے اور ہر ایک کے ساتھ جذبۂ طلب رضائے الٰہی کو اساس دین وبنیادی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ حصول رضائے الٰہی کی طلب تمام اعمال کی روح ہے، اس کے بغیر تمام اعمال بے جان ہیں۔

(۱۱) تواضع وانکساری میرا فخر ہے (والعجز فخری):

انسانیت کی سب سے بڑی بلندی اور رفعت تواضع، خاکساری، انکساری اور عبدیت ہے، کبریائی صرف خدائے واحد کے لئے زیبا ہے اور اسی کی شایان شان ہے، انسان کا سب سے بڑا سرمایۂ افتخار تواضع اور فروتنی ہی ہے، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''**من تواضع للہ رفعه الله**'' (جو شخص خدا کی خاطر تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اسے لازماً بلند کر دیتا ہے) (مسلم) ارشاد نبوی ہے ''**من تواضع لله رفعه الله، فهو فی نفسه صغير، وفی اعين الناس عظيم، ومن تكبر وضعه الله، فهو فی اعين الناس صغير، وفی نفسه كبير، حتى لهو اهون عليهم من كلب او خنزير**'' (جس نے اللہ کا حکم سمجھ کر اور اس کی رضا کے حصول کے لئے خاکساری اور تواضع کا رویہ اختیار کیا تو اللہ اس کو بلند کر دے گا پھر وہ اپنی نگاہ میں تو چھوٹا ہوگا، لیکن عالم بندگان خدا کی نگاہ میں اونچا ہوگا اور جو تکبر کا رویہ اختیار کرے گا تو اللہ اس کو نیچے گرا دے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عام لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل وحقیر ہو جائے گا اگر چہ وہ خود اپنے خیال میں بڑا ہوگا، لیکن دوسروں کی نظر میں وہ کتے اور خنزیر سے بھی زیادہ ذلیل اور بے وقعت ہو جائے گا) (بیہقی)

تقویٰ اور خدا ترسی کا لازمی نتیجہ تواضع ہے، چونکہ آپ ﷺ تقویٰ کے لحاظ سے سب سے برتر تھے۔ اسی لئے تواضع وعبدیت میں بھی آپ سب پر فائز تھے، حضرت انس کا بیان ہے کہ ہم رسول اکرم ﷺ سے زیادہ محبوب نہ تھے، مگر ہم آپ کو دیکھ کر اس لئے کھڑے نہیں

ہوتے تھے کہ آپ اس کو ناپسند فرماتے تھے'' (ترمذی) روایات میں آتا ہے کہ مدینہ کی لونڈیاں اور باندیوں میں سے کوئی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتی اور جو کچھ کہنا ہوتا کہتی اور جتنی دور چاہتی لے جاتی'' (مسند احمد) آپ ﷺ نے عدی بن حاتم طائی کو اپنے گھر بلایا، باندی نے ٹیک لگانے کے لئے تکیہ پیش کیا مگر زمین پر بیٹھے، ٹیک نہ لگایا (زاد المعاد) خود گھر کی صفائی، اونٹ کو باندھنا، جانور کو چارہ دینا، غلاموں کے ساتھ کھانا، ان کی دعوت بخوشی قبول کرنا، بازار سے سودا لانا یہ سب آپ کی تواضع کے نمونے ہیں اور اسی نے آپ کو رفعت کے سب سے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اسی لئے آپ نے تواضع کو فخر قرار دیا۔ قرآن کریم میں آپ ﷺ کو اسی کا حکم دیا گیا فرمایا گیا: ''اہل ایمان کے ساتھ تواضع سے پیش آیئے'' (الحجر:۸۸) ''ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ آپ کی پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آیئے'' (الشعراء)

رحمان کے بندوں کے اوصاف میں ایک وصف زمین پر فروتنی کے ساتھ چلنا بیان ہوا ہے، (الفرقان) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے تواضع کے ذیل میں متعدد نصائح کیں جو قرآن میں مذکور ہیں، ان میں بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی واعراض نہ کرنا، اکڑ کر نہ چلنا، چال میں غرور نہ ہونا، آواز میں متکبرانہ کرختگی نہ ہونا وغیرہ شامل ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ''تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیے۔ (سیرت النبی:۶/۲۴۱)

(۱۲) زہد میرا پیشہ ہے (والزہد حرفتی):

زہد کے معنی ہیں ''دنیا سے قلبی اعراض، آخرت کے لئے دنیا کی لذتوں سے بے رغبت ہونا، عیش وتنعم کی زندگی سے دست بردار ہونا'' امام مالکؒ کے بقول زہد حلال کمائی

اور دنیوی آرزوؤں کی کمی کا نام ہے، ترک مال واسباب کا نام زہد نہیں ہے، بلکہ دنیا سے بے رغبتی، بخل اور فضول توقعات سے پرہیز اور اللہ پر کامل اعتماد زہد ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ''دنیا میں زہد کا مطلب مال کو ضائع کرنا اور حلال کو حرام کرنا نہیں ہے، بلکہ اپنے پاس موجود چیزوں کے بجائے اللہ کے خزانے پر زیادہ اعتماد کا نام زہد ہے'' (طیبی شرح مشکوٰۃ)

رسول اللہ ﷺ نے زہد کو اپنا پیشہ قرار دیا ہے، آپ کی پوری زندگی زاہدانہ تھی، زہد نبوی کے سلسلہ میں کتب احادیث میں بڑے بڑے واقعات وروایات ہیں، آپ کا فقر اختیاری تھا، آپ نے اپنے لئے اللہ سے دعا کی کہ ''**اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین**'' (اے اللہ مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں دنیا سے اٹھا اور مسکینوں کے گروہ میں میرا حشر فرما) (ترمذی)

روایات میں ہے کہ دو دو ماہ تک آپ ﷺ کا چولہا ٹھنڈا رہتا تھا، کھجور اور پانی پر گزارا ہوتا تھا، ایک بار تیس دن رات آپ ﷺ پر اس طرح گزرے کہ کھانے کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے کوئی جاندار کھا سکے، اپنی پوری زندگی آپ نے اور آپ کے اہل خانہ نے جو کی روٹی سے بھی متواتر دو دن پیٹ نہیں بھرا۔ (بخاری وترمذی)

آپ ﷺ کھجور کے پتوں سے بنی چٹائی پر لیٹتے تھے، آپ کے جسم پر چٹائی کے گہرے نشانات تھے، حضرت عمرؓ نے درخواست کی کہ اے اللہ کے رسول! خوشحالی وفراخی کی دعا کیجئے، روم وفارس والے بڑے خوشحال ہیں، جب کہ وہ خدا پرست بھی نہیں ہیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابن خطاب! ان کو ان کی لذتیں دنیا میں دے دی گئی ہیں، کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ ان کے لئے دنیا کا عیش اور ہمارے لئے آخرت کا عیش'' (بخاری ومسلم) ایک روایت میں فراخی کی دعا کے مطالبہ پر آپ کا یہ جواب بھی مذکورہ ہے کہ ''میں دنیا میں اس مسافر کی طرح ہوں جو سایہ کے لئے کسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا ہو اور پھر اپنی منزل کی طرف چل دے۔'' (ترمذی)

صلاح وتقویٰ کے ساتھ حاصل ہونے والی دولت کو بھی اللہ کی نعمت قرار دیا گیا ہے، بلکہ مقاصد حسنہ کے لئے حصول دولت کی فضیلت بھی آئی ہے، دولت کے حصول میں مکمل انہماک اور ضروریات دین سے بے اعتنائی سے منع کیا گیا ہے، حدیث میں آیا ہے کہ اس امت کے صلاح کی بنیاد زہد اور یقین ہے۔ (بیہقی)

احادیث میں زہد کو محبت الٰہی کا ذریعہ بتایا گیا ہے، زاہدوں کی صحبت کی تلقین کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے خاص بندے عیش وتنعم سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی کا ہر لمحہ زہد واستغناء سے عبارت تھا، اسی لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ زہد واستغنا آپ کا پیشہ تھا۔

(۱۳) یقین میری توانائی ہے (والیقین قوتی):

پہلے یہ حدیث ذکر کی جا چکی ہے کہ ''اس امت کے صلاح کی بنیاد زہد اور یقین ہے'' یہ دونوں باہم اسی طرح مربوط ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہی تمام بھلائیوں کا منبع بھی ہیں۔

یقین کی ایک قسم علم الیقین ہے جو عقل سے حاصل ہوتا ہے، دوسری قسم عین الیقین ہے جو مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے اور تیسری قسم حق الیقین ہے جو تجربہ سے حاصل ہوتا ہے، گویا یقین کے حصول کے تین ذریعے ہیں، عقل ومشاہدہ اور تجربہ، اسی لئے اس میں علم، واقعیت اور راستی کی توانائی بھی ہوتی ہے اور یہ توانائی صبر وتحمل پامردی، استقلال عزیمت وشکیمت، ہمت وحوصلہ عطا کرتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی بڑی سے بڑی قربانی پیش کر دیتا ہے، عقائد وایمانیات میں روح اسی یقین کامل کی بدولت پڑتی ہے۔ یقین کی قوت سے محرومی موت کے ہم معنی ہے، قوت یقین سے مالا مال قومیں زندہ اور قائد ہوتی ہیں، جبکہ اس سے تہی دست اقوام مردہ اور پس ماندہ ہوتی ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کو اللہ پر آخرت اور اپنی دعوت کی حقانیت اور اپنے مشن وپیغام کی

صداقت اور واقعیت پر مکمل یقین تھا اور اسی یقین کے نتیجہ تھا کہ مسلسل کامیابیوں نے آپ کے قدم چومے، یقین کا رتبہ سب سے بلند اور مقدم ہے بقول اقبال:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

حدیث میں شک وارتیاب کو کفر قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین وایمان لازم ملزوم ہیں، یقین کا مطلب صرف یہ نہیں کہ کسی عقیدہ کو عقلی دلائل کی روشنی میں مان لے یا دماغ اس کے مان لینے کا رسمی وسطحی انداز میں اعتراف کرلے، بلکہ یقین تو یہ ہے کہ دل وجان سے کسی چیز پر اعتقاد ثابت وراسخ ہوجائے اور عقل وارادہ اور جذبات سب پر وہی غالب ہوجائے اور چھا جائے۔

(۱۴) صدق میرا حامی اور سفارشی ہے (والصدق شفیعی):

عقیدہ، زبان، دل، عمل، فکر ونظر سب کی سچائی آدمی کو صدیق بناتی ہے، راستی پیغمبر اسلام ﷺ کا بیحد امتیازی وصف تھا۔ دعوائے نبوت سے قبل ہی آپ کو ''الصادق'' کے لقب سے پکارا جاتا تھا، تمام باطل قوتوں کے جھوٹ کو آپ کی راستی اور سچائی نے شکست دی تھی۔ سچائی ایمان کی اور جھوٹ نفاق کی علامت ہے، قرآن سچوں کی صحبت میں رہنے کا حکم دیتا ہے، سچائی کو باعث اطمینان وسکون چیز قرار دیا گیا ہے، اسے نیکی اور جنت کی طرف راہنمائی بتایا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ سچائی انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں نیک بنادیتی ہے اور جھوٹ انسان کو ہر شعبہ میں زندگی میں بدکردار بنادیتا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ مومن سب کچھ ہوسکتا ہے مگر جھوٹا اور بددیانت نہیں ہوسکتا، ایمان کے ساتھ دروغ گوئی اور خیانت کا تصور نہیں کیا جاسکتا، حضرت عمر کا فرمان ہے کہ ''سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ کبھی چھوڑو چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے'' حضرت

کعب بن مالک کو پچاس روز کے پر مشقت مقاطعہ سے اسی سچائی کی بدولت نجات ملی تھی، اسی لئے کہا گیا ہے کہ سچائی کی موت جھوٹ کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ حدیث میں آیا ہے ''الصدق ینجی والکذب یھلک'' (سچائی نجات دیتی ہے اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے) مسلمان اپنے وقار اور نرم کلی اور راست گوئی سے پہچانا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اہل صدق کو فلاح یاب اور خداترس قرار دیا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ قیامت میں نجات اہل صدق ہی کو ملے گی۔ سچائی اپنی ذات میں ایک طاقت ہے، حق اور راستی پر ہونے کا احساس انسان کو دلیر بنادیتا ہے، سچا انسان بلند ہمت اور عالی حوصلہ ہوتا ہے، اس کے انداز میں کوئی جھول نہیں ہوتا جبکہ جھوٹ انسان کو بے زبان اور پست بنادیتا ہے۔

(۱۵) طاعت الٰہی میرے لئے بس ہے (والطاعۃ حسبی):

اللہ کی اطاعت، اس کی عبدیت، اس کی غلامی، اس کے تمام اوامر ونواہی کی پابندی، ہر شعبہ زندگی اور ہر مرحلہ حیات میں اسی کی پیروی ہی مومن کا اصل سرمایہ ہے، انسان جب عبدیت کاملہ کا مقام حاصل کرلیتا ہے، تو پھر اللہ اس کے لئے کافی ہوجاتا ہے اور وہ ہر چیز سے مستغنی ہوجاتا ہے، اطاعت الٰہی کے فائدے دنیا میں نقد بھی ہوظاہر ہوتے ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ ''اللہ نے فرمایا کہ اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں ان پر رات کو بارش برساؤں اور دن میں ان پر دھوپ نکالوں اور انہیں بجلی کی کڑک کی آواز نہ سناؤں۔'' (مسند احمد)

رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اطاعت الٰہی کی حسین زندگی تھی، اسی لئے قرآن میں جابجا اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا بھی حکم ہے۔ فرمایا گیا: ''اے نبی! آپ فرمادیجئے کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے، آپ فرمادیجئے کہ اللہ کی اطاعت قبول کرو'' (آل عمران: ۳۱-۳۲) ''اے

ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو‘‘ (النساء:۵۹) ’’جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا تو بہر حال ہم نے آپ کو ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے‘‘ (النساء:۸۰) جگہ جگہ اطاعت خدا اور رسول کو فوز وفلاح کا ذریعہ دیا گیا ہے اور اسے رحمت الٰہی اور فیضان خداوندی کا ذریعہ بتایا گیا ہے، خود جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، کہ جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا اور نافرمان جہنم میں جائے گا اور میری لائی ہوئی تعلیمات کے تابع جب تک خواہش نفس نہ ہوگی ایمان مکمل نہ ہوگا۔

(۱۶) جہاد میرا خلق ہے (والجہاد خلقی):

حق کی سربلندی، اس کی اشاعت وحفاظت کے لئے ہر قسم کی کوشش اور سعی جہاد ہے، قرآن میں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں کا ذکر جابجا آیا ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی اور قتال جہاد اصغر ہے اور نفس کی خواہشات کو دبانا اور کچلنا جہاد اکبر ہے، جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم جہاد بالنفس ہے، قرآن کہتا ہے ’’اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے‘‘ (الحج:۷۸) جہاد کی ایک قسم جہاد بالعلم ہے، یعنی علم کی روشنی پھیلا کر اور علم کے چراغ جلا کر جہالت کی تاریکی چھانٹ دینا، ہر صاحب علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہالت کا خاتمہ کرنے کی مہم میں لگ جائے، دعوت دین بھی جہاد ہے، جہاد بالمال یہ ہے کہ راہ خدا میں مال خرچ کیا جائے، حق گوئی جہاد باللسان ہے، حق نویسی جہاد بالقلم ہے، ہر نیک کام میں اپنی جانی ومالی ودماغی قوت صرف کرنا جہاد ہے، رسول اکرم ﷺ کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی، بعثت سے پہلے آپ کا جہاد نفس وشیطان سے تھا اور بعثت کے بعد نفس وشیطان کے ساتھ کفار ومشرکین سے بھی تھا، عظمت وبلندی کا راز جہاد میں پنہاں ہے، اس موضوع پر بے شمار نصوص ہیں، کتب احادیث میں ان کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱۷) میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے (قرۃ عینی فی الصلاۃ):

ایمان کے بعد اعمال میں سب سے افضل اور عبادت میں سب سے اعلیٰ عبادت نماز ہے، حدیث میں آتا ہے کہ نماز ایمان کا ایسا لازمی جزء اور شعار ہے کہ اس کو قصداً چھوڑنے کے بعد انسان گویا کفر شرک کی گمراہیوں میں پہنچ جاتا ہے، قرآن وحدیث میں نماز کے تعلق سے تعلیمات کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔

نماز کو دین کا ستون اور بنیاد قرار دیا گیا ہے، اسے توحید کا عملی ثبوت بتایا گیا ہے، نماز کی اہمیت، فضیلت، برکات وثمرات ایک مستقل موضوع ہے جس پر کتابیں موجود ہیں، حضور ﷺ نے نماز کو آنکھ کی ٹھنڈک اور دل کا سکون قرار دیا ہے، نماز کے بے شمار فوائد ہیں، ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ترقی ایمان اور اس کی حفاظت۔

(۲) زندگی میں کنٹرول۔

(۳) حالات کا سدھر جانا۔

(۴) زندگی کا پرسکون ہونا۔

(۵) معاشرت ومعاملات کا درست ہونا۔

(۶) اللہ سے بے پایاں تعلق قائم ہونا کیونکہ نماز اللہ سے سرگوشی اور مخاطبت کا نام ہے۔

(۷) نماز سے جذبات میں اعتدال آتا ہے۔

(۸) اجتماعیت اور اتحاد والفت۔

(۹) جسمانی طہارت اور پاکی کا حصول۔

(۱۰) روحانی پاکیزگی وبلندی کی یافت۔

☆☆

پیغمبر اسلام ﷺ اور تعلیمی نظام

● مولانا عقیدت اللہ قاسمی

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے وقت پہلی وحی کے موقع پر ہی پڑھنے کا حکم دیا گیا۔''**اقراء باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقراء وربک الأکرم الذی علم بالقلم**''.

(اے نبیؐ! پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا)۔(العلق:۱-۵)

اس طرح خالق کائنات نے اپنی مخلوقات میں سے سب سے اشرف مخلوق انسان کو جسے روز اول ہی اس نے زمین پر خلیفہ بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔''**وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰئِکَةِ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الارضِ خلیفة**''. (اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں)۔(البقرہ:۳۰) اور جس نے اپنی برگزیدہ اور مقرب ترین مخلوق فرشتوں پر انسان کے اشرف ہونے کا معیار اور بنیاد اس کے علم کو قرار دیا تھا۔''**وَعَلَّمَ آدَمَ الأسماءَ کلها ثم عرضهم علی الملئکة فقال انبئونی بأسماء هولاء إن کنتم صادقین**''. (اور آدم کو تمام اسماء کا علم دے دیا پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو اور اس اعتراض میں خود کو حق بجانب سمجھتے ہو تو تم ان چیزوں کا نام بتاؤ) فرشتوں نے کہا''**أتجعل فیها من**

یفسد فیها وسیفک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک''.(کیا تو زمین میں ایسی مخلوق کو اپنا خلیفہ بنا رہا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گی اور خونریزی کرے گی۔اس بنیاد پر وہ نہ صرف اشرف المخلوقات قرار دئے جانے کی مستحق ہے اور نہ ہی خلیفہ جیسے جلیل القدر منصب کی اہل ہے اور ہم تیری حمد اور تسبیح نیز تیری تقدیس بیان کرنے کے لئے کافی ہیں)۔(البقرہ:۳۰) اور اس طرح اس سے زیادہ اشرف اور خلیفہ قرار دئے جانے کے زیادہ مستحق ہیں۔تو ذرا ان کے نام بتادو۔(البقرہ:۳۱) اس وقت فرشتوں نے اعتراض، الزام اور دعویٰ کے اس تصور سے بھی جو ان کے کلام سے ظاہر ہو رہا تھا، برأت کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا۔''**سبحنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم**''.(اس طرح کے اعتراض والزام کا مصداق قرار پانے سے ہم تیری ذات کو پوری طرح پاک اور بہت بلند وبالا مانتے ہیں اور ہمیں تو صرف اتنا علم ہے جتنا کہ تو نے ہمیں عطا کردیا، آپ علم کے منبع ہیں اور اپنی حکمت اور مصلحت کو تو ہی زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے)۔(البقرہ:۳۲) اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے فرشتوں تک سے اشرف ہونے کا محاکمہ اور فیصلہ فرمادیا اور اس کے لئے معیار اور بنیاد علم کو قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کی عظیم نعمت اور دولت سے سرفراز فرمایا:''**الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان**''. (اللہ نہایت مہربان ہے اس نے انسان کو قرآن کی تعلیم دی ہے، اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس نے اس کو بولنا سکھایا)(الرحمٰن:۱-۴) اور علم کی نعمت کی عظمت کو خصوصیت کے ساتھ یوں واضح فرمایا:''**وَلَقد اٰتینا داؤدَ وسلیمٰن عِلْمًا**'' (اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم کی دولت سے سرفراز فرمایا):(النحل:۱۵) جہاں جن وانس کے مقصد تخلیق کو یوں بیان فرمایا تھا''**وَمَا خلقتُ الجنَّ والانسَ اِلَّا لیَعبُدون**'' (میں نے جن اور انس کو صرف اس لئے تخلیق کیا ہے وہ میری عبادت کریں)(الذیارت:۵۶) عبادت کے لئے مطلوب خشیت ایزدی کے لئے علم کی اہمیت

یوں بیان فرمائی: ''**انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء**'' (حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف سچا علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں): (فاطر:۲۸) اس نے اپنے پسندیدہ دین کی تکمیل اور اپنی نعمت کے اتمام کا اعلان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ میں تم سے دین اسلام کے حوالے سے راضی اور خوش ہوسکتا ہوں تم میری رضا اور خوشنودی دین اسلام ہی پر عمل کر کے حاصل کر سکتے ہو۔ ''**الیوم اکملت لکم دینک وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا**''. (آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمہیں دین اسلام عطا کر کے راضی ہوں)۔ (المائدہ:۳۰) ہدایت اور گمراہی کے لئے علم اور جہل کو معیار اور بنیاد قرار دیا۔ ''**انا ھدینہ السبل إما شاکرا واما کفورا**''. (ہم نے انسان کو راستہ دکھایا اب خود وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا)۔ (الدہر:۳) اس کے ساتھ ہی جہل پر علم کی برتری کا اظہار یوں فرمایا: ''**قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون إنما یتذکرو أولوا الباب**''. (ان سے پوچھو کیا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے دونوں کبھی یکساں ہوسکتے ہیں؟ نصیحت کو تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔ (الزمر:۹) اس طرح عقل اور علم دونوں کا آپس میں جو گہرا رشتہ ہے اس کو بھی واضح فرما دیا۔ آیت کا سیاق وسباق بتا رہا ہے، جب کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تحریر فرماتے ہیں کہ معاملہ دو قسم کے انسانوں کے درمیان کیا جا رہا ہے۔ ایک وہ جو سخت وقت آپڑنے پر تو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور عام حالات میں غیر اللہ کی بندگی کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے اللہ کی اطاعت اور اس کی بندگی و پرستش کو اپنا مستقل طریقہ بنالیا ہے اور راتوں کی تنہائی میں ان کا عبادت کرنا ان کے مخلص ہونے کی دلیل ہے، ان میں سے پہلے گروہ والوں کو اللہ تعالیٰ بے علم قرار دیتا ہے خواہ انہوں نے بڑے بڑے کتب خانے کیوں نہ چاٹ رکھے ہوں اور دوسرے گروہ والوں کو وہ عالم قرار دیتا ہے، خواہ وہ بالکل ہی ان پڑھ کیوں نہ ہوں کیونکہ اصل چیز حقیقت کا

علم اور اس کے مطابق عمل ہے اور اس پر انسان کی فلاح کا انحصار ہے۔ (تفہیم القرآن)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو بغیر علم کے بحث کرتے ہیں۔ ''**ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر**''. (اور کچھ لوگوں کا حال ہے کہ وہ اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا ہدایت یا روشنی دکھانے والی کتاب) (لقمان:۲۰) اسی طرح ان لوگوں کی بھی مذمت فرمادی ہے جو جیب سے روپیہ پیسہ خرچ کر کے لغو و دلفریب کلام یا اشیاء خرید کر لاتے ہیں، اور ان کے ذریعہ اس طرح ان لوگوں کو راہ حق سے بھٹکاتے اور گمراہ کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف دعوت حق اور دعوت دین کا کام کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں ایسے لوگوں کو سخت ذلیل کرنے والے رسوا کن عذاب کی بشارت بھی دی ہے۔ **ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ویتخذھا** اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کلام دلفریب خرید کر لاتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستہ کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے ایسے لوگوں کے لئے سخت ذلیل کرنے والا، رسوا کن عذاب ہے (لقمان:۶) ان باتوں کے ساتھ ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کو زیادہ سے زیادہ علم کے حصول کے لے دعا کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ ''**وقل رب زدنی علما**'' (اور دعا کرو کہ اے میرے پروردگار مجھے مزید علم عطا فرما): (طہ:۱۱۴)

اللہ تعالیٰ کے ان واضح احکام اور ہدایات کی روشنی میں پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے تمام امتیوں کو علم حاصل کرنے کی طرف مختلف انداز میں متوجہ فرمایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ''**طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم**'' (ہر مسلمان پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے)۔ (ابن ماجہ وبیہقی) اتنا ہی نہیں آپ نے علم حاصل کرنے اور پھر اسے دوسرے تک پہنچانے کا بھی حکم فرمایا: ''**تعلموا الفرائض والقرآن وعلموا الناس فانی مقبوض**''. (فرائض کا علم حاصل کرو اور قرآن سیکھو اور لوگوں کو علم سکھاؤ کہ میرا آخری وقت قریب ہے)

(ترمذی) ایک اور موقع پر فرمایا: ''تعلموا العلم وعلموه الناس تعلموا الفرائض وعلموها الناس، تعلمو االقرآن وعلموه الناس''. (علم حاصل کرو اور دوسرے لوگوں کو علم سکھاؤ۔ فرائض کا علم حاصل کرو اور دوسرے لوگوں کو ان کا علم سکھاؤ قرآن کا علم حاصل کرو اور لوگوں کو اسے سکھاؤ) (دار قطنی) آپ نے دوسرے تک علم پہنچانے کی یوں بھی ہدایت کی ''بَلِّغُوْ عَنِّی وَلَوْ آیة'' (میری طرف سے باتیں دوسرے لوگوں تک پہنچا دو۔ خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو)۔ (بخاری) آپ نے دوسرے کو علم سکھانے کی فضیلت اور علم سکھانے والے یعنی استاذ کی فضیلت ان الفاظ کے ذریعہ بیان فرمائی۔ ''انما انا بعثت معلما'' (مجھے معلم یعنی استاذ بنا کر مبعوث کیا گیا ہے)۔ (دارمی) آپ نے یہ بھی فرمایا 'رات بھر درس وتدریس میں مشغول رہنا اللہ کی عبادت اور ذکر میں شب بیداری کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ (دارمی) آپ نے مزید فرمایا اللہ تعالیٰ دنیا میں سب سے زیادہ جود وسخا کرنے والا ہے۔ پھر نوع بنی آدم میں میں سب سے زیادہ سخاوت کرنے والا ہوں اور میرے بعد انسانوں میں سب سے بڑا سخی وہ شخص ہے جس نے علم سیکھا پھر اسے پھیلایا، نشر کیا یعنی دوسرے کو سکھایا۔

نبی کریم ﷺ نے علم کے حصول کی فضیلتیں مختلف انداز میں بیان فرمائی ہیں ارشاد ہے: ''من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین، وانما انا قاسم (للعلم) والله یعطی، (الفهم فی العلم)'' (اللہ تعالیٰ جس کے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دینی امور میں گہری سمجھ اور بصیرت عطا فرما دیتا ہے اور میں علم تقسیم کرنے والا ہوں جبکہ اللہ تعالیٰ علم کی فہم عطا فرماتا ہے)۔ (متفق علیہ) ایک اور موقع پر فرمایا: ''اذا مات الإنسان انقطع عنه عمله، إلا من ثلثة إلا من صدقة جاریه أو علم ینتفع به أو ولد صالح یدعوله''.

(انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ سوائے تین امور کے،

ایک یہ کہ وہ صدقہ جاریہ کا کام کرتا جائے، یا کوئی ایسا علمی کام (کسی دینی علمی کتاب کی تصنیف وتالیف، تعلیمی اداروں کا قیام یا درس وتدریس کے ذریعہ شاگردوں کا بنانا) کر جائے جس سے دوسروں کو نفع وفائدہ ملتا رہے یا ایسی نیک وصالح اولاد چھوڑ جائے جو اس کے لئے دعائے خیر کرتی رہے)۔ (مسلم) اس سلسلہ کی دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا: ''ان ما یلحق المؤمن من عمله وحسناته بعد موته علما عمله ونشره وولداً صالحاً ترکه أو مصحفا ورثه ومسجداً بناه أو بیتا لابن السبیل بناه أو نهرا اجراه اور صدقة اخرجها من ماله فی صحته وحیاته تلحقه من بعد موته''. (انسان کے موت کے بعد بھی اس کے عمل اور نیکیوں میں سے اسے جو حاصل ہوتا رہتا ہے اس میں وہ علم ہے جو اس نے حاصل کیا، پھر اسے پھیلایا، اس کی نشر واشاعت کا کام کیا اور وہ نیک اولاد جو اس نے اپنے پیچھے چھوڑی یا قرآن جو اس نے اپنی وراثت کے طور پر چھوڑ آیا، مسجد بنائی یا مسافر خانہ، یا سرائے بنوائی یا نہر جاری کروائی یا وہ صدقہ جو اس نے اپنے مال سے اپنی صحت وتندرستی اور اطمینان کی زندگی کے زمانہ نکالا۔ اعمال اور نیکیاں اس کے کھاتے میں اس کی موت کے بعد بھی لکھی جاتی رہتی ہیں۔) (ابن ماجہ وبیہقی) آپ نے اہل علم کی فضیلت یوں بیان فرمائی: ''فضل العالم علی العابد کفضلی علی أدناکم إن الله وملائکته و أهل السموات والأرض حتی النملة فی جحرها وحتی الحوت لیصلون علی معلم الناس الخیر''. (عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسی میری فضیلت معمولی آدمی پر۔ اللہ اور اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمینوں والے یہاں تک کہ سوراخوں میں چیونٹیاں اور مچھلیاں بھی لوگوں کو خیر وبھلائی کی تعلیم دینے والوں کے لئے رحمت کی دعائیں کرتی ہیں)۔ (ترمذی ودارمی) طالب علم کی فضیلت ان الفاظ میں بیان فرمائی: ''من جاء ه الموت وهو طلب العلم لیحی به الإسلام فبینه وبین النبین درجة وأحدة فی الجنه'': (جسے اس مقصد

کے لئے علم حاصل کرتے ہوئے موت آ گئی کہ اس کے ذریعہ اسلام کا احیاء کرے تو جنت میں اس کے نبیوں کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق رہے گا)۔

علم حصول کے لئے سفر کرنے والوں کی فضیلت یوں بیان فرمائی: ''**من سلک طریقا یطلب فیه علما سلک الله به طریقا من طرق الجنة و إن الملئکة لتضع اجنتهها رضاء لطالب العلم وان العالم یستغفر له من فی السموات وفی الأرض وحیطان فی جوف الماء و إن فضل العالم علی العابد کفضل لیلة البدر علی سائر الکواکب و إن العلماء ورثة العلم فمن أخذه اخد بحظ وافر**''. (جس نے علم حاص کرنے کی غرض سے سفر کیا اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے راستوں میں سے ایک راستہ پر چلائے گا اور فرشتے طالب علم کی رضا وخوشنودی کے لئے اپنے بازو پھیلائے اور ہاتھ بچھاتے ہیں اور عالم کے لئے آسمانوں اور زمین والے اور پانی میں رہنے والی مخلوقات بھی مغفرت کی دعائیں کرتی ہیں اور عالم کی عابد کے اوپر فضیلت ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی تمام ستاروں پر فضیلت ہوتی ہے اور یہ کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں، انبیاء ورثات میں نہ دینار چھوڑتے ہیں نہ درہم چھوڑتے ہیں وہ علم کے وارث بناتے ہیں، سو جس نے علم کی وراثت لی اس نے بہت بڑی دولت لی)۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی) ایک اور موقع پر فرمایا: ''**من خرج فی طلب العلم فهو فی سبیل الله حتی یرجع**'' (جو علم حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلتا ہے وہ واپس لوٹنے تک اللہ کے راستہ میں ہوتا ہے)۔ (ترمذی، دارمی) آپ نے فرمایا: ''**من طلب العلم کانا کفارة لما مضی**'' (وہ جس نے علم طلب کیا اس کے لئے یہ علم طلب کرنا ماضی کے تمام گناہوں کے لئے کفارہ ہو گیا)۔ (ترمذی) اور سچے مومن کی مثال یوں بیان فرمائی: ''**لن یشبع المومن من خیر (علم) یسمعه حتی یکون منتهاه الجنة**'' (خیر و بھلائی یعنی علم سے مومن کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا وہ علم حاصل کرتا رہتا ہے

یہاں تک کہ اس کی منزل جنت اسے حاصل ہو جاتی ہے)۔ (ترمذی) علم کی اہمیت یوں بھی بیان فرمائی: ''**الکلمة الحکمة ضالة المومن حیثت وجدها فهوا حق بها**'' (علم وحکمت کی بات اہل دانش کی متاع گم گشتہ ہے، سو وہ جہاں بھی مل جائے صاحب دانش اس کا سب سے زیادہ حق دار ہوتا ہے)۔ (ترمذی وابن ماجہ) جس علم کی اسلام اہمیت وفضیلت بیان فرماتا ہے اور جس کے حصول پر زور دیتا ہے، پیغمبر اسلام نے اس کی نشاندہی بھی فرما دی ہے۔ علم کی تین قسمیں ہیں۔ قرآن کریم کی محکم آیات، ٹھوس وقائم سنت نبوی اور عدل وانصاف پر مبنی فریضہ اور ان کے سواء جو کچھ ہیں وہ سب زیادہ ہیں (ابوداؤد، ابن ماجہ) آپ نے حدیث کے نام پر اپنی طرف ایسی باتیں منسوب کرنے والوں کے لئے سخت وعیدیں بھی بیان فرمائیں ہیں جن کا آپ سے تعلق نہ ہو یا آپ نے بیان نہ فرمائی ہوں اور کوئی اپنی طرف سے جھوٹ گڑھ کر موضوع حدیث کو آپ کی طرف منسوب کر کے بیان کر دے فرمایا: ''**من حدث عنی بحدیث یری أنه کذب فهو أحد الکاذبین**'' (جس نے جانتے بوجھتے میری طرف منسوب کر کے ایسی حدیث بیان کی جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ خود بھی جھوٹ بولنے والوں میں شامل ہے)۔ (مسلم) ایک اور موقع پر فرمایا: ''**من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار**'' (جس نے میری طرف منسوب کر کے کوئی جھوٹی بات بیان کی اس نے جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالیا)۔ (بخاری) اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کوئی بھلی اور اچھی بات بھی خود اپنے آپ میں اچھی اور بھلی ہو اس کا نتیجہ بھی اچھا نکلتا ہو، اس کا مقصد بھی اچھا ہو اور جو نیک نیتی سے ہی کہی بھی جائے، لیکن وہ بات خود رسول اللہ ﷺ نے نہ فرمائی ہو اس کو رسول اللہ کا قول، حدیث بنا کر پیش کرنا جہنم میں لے جانے کا باعث ہوگا۔

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت عربوں میں لکھنے پڑھنے کا عام رواج نہ تھا عربی زبان طویل عرصہ سے بولی جانے والی زبان تھی، تحریر کی زبان نہیں بنی تھی۔ روایات کے مطابق

مکہ معظّمہ میں لکھنے کا آغاز آپ کے دور ولادت یا بچپن میں ہی ہوا تھا۔ قدامہ بن جعفر کی ''الخراج'' اور اس کے استاذ بلاذری کی ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ ایک شخص عراق کے علاقہ سے وہاں آیا تھا اس نے حرب بن امیہ کی بیٹی یعنی ابوسفیان کی بہن سے شادی کی اور لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ ایسی کام کی باتیں جنہیں بھول جانے کا اندیشہ ہو لکھ لیا کریں، مشہور و معروف دانشور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مطابق حیرہ سے آنے والے شخص نے ان لوگوں کو وہی خط لکھایا جو حیرہ میں رائج تھا۔ وہاں کی زبان میں کل ۲۴ حروف تھے، جب کہ عرب میں حروف کی تعداد ۲۷ ہے۔ اس طرح حیرہ والا رسم الخط عربی کے لئے ناکافی تھی، اس لئے حیرہ میں رائج خط سے عربی زبان کے خصوصی حروف میں امتیاز کی تدابیر کی گئی خود عربی زبان کے حروف میں امتیاز قائم کرنے کے لئے مختلف حروف پر نقطے لگائے گئے۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس سمت میں بھی رسول اللہ ﷺ نے ہی رہنمائی فرمائی۔ روایت ہے کہ ایک دن خلیفہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبید غسانی نام کے کاتب کو بلایا اور فرمایا کہ میں تمہیں کچھ لکھواتا ہوں اسے لکھو اور نقش کرو، غسانی نے کہا نقش کیا ہے تو انہوں نے مسکرا کر فرمایا۔ مدینہ منورہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ نے مجھے طلب فرمایا اور حکم دیا کہ لکھو اور نقش کرو میں نے بھی تمہاری طرح دریافت کیا تھا نقش کیا ہے، تو حضور ﷺ نے فرمایا تھا ''حروف پر جہاں ضرورت ہو نقطے لگاؤ'' اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نقطے لگا کر حروف کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کا آغاز عہد نبوی میں ہو گیا تھا، اگرچہ کتب رسم المصاحف، یعنی قرآن املا کے مؤلفوں یا خط عربی کے عام مؤرخوں کے یہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس کا آغاز حجاج بن یوسف کے زمانے میں ہوا، لیکن کئی چیزیں ایسی سامنے آگئی ہیں جو اس روایت کی تائید کرتی نظر آتی ہیں۔ طائف کے مضافات میں ایک کتبہ ملا ہے جو حضرت معاویہ کے دور خلافت، یعنی ۵۰ ہجری کا ہے، آپؓ کے حکم سے طائف کے گورنر نے ایک تالاب تعمیر کرایا تھا اس پر یہ کتبہ لگایا

گیا تھا۔ اس کتبہ کے کئی حروف پر نقطے لگے ہوئے ہیں، اس کتبہ کے سب حروف پر، بلکہ صرف چند حروف پر نقطے ہیں۔ یہ ذرا پرانی دریافت تھی ایک اور نئی اور زیادہ مؤثر چیز کے طور پر مصر میں کچھ جھلیاں دریافت ہوئی ہیں جن پر کچھ تحریریں ہیں ان میں حضرت عمرؓ کے دور خلافت ۲۲ھ کے دو خطوط ہیں ان میں سے بھی ایک حد تک نقطوں کا اہتمام نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ نے عملی تحریر میں اصلاح کے لئے کچھ اور بھی ہدایات فرمائیں، مثلاً جب کوئی خط لکھیں تو فوراً تہہ نہ کریں بلکہ اس پر ریگ ڈال کر خشک کر لیا کریں۔ ابن اثیر کے مطابق آپ نے یہ بھی حکم فرمایا کہ ''س'' لمبے خط کی طرح نہ لکھیں، بلکہ اس میں شوشہ کا اہتمام کریں۔ کیونکہ اس سے دوسرے حروفوں کے ساتھ التباس کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً بم اور بسم کے خط کے سلسلہ میں اس طرح کی کچھ اور بھی حدیثیں ملتی ہیں۔ ایک ترکی فاضل نے تو تحریر کے متعلق ایک چہل حدیث لکھ ڈالی ہے۔

دنیائے عرب کی سب سے پہلی تحریری شکل میں کتاب قرآن ہے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، صرف چند چیزیں ہی تحریر کی گئیں تھیں، مثلاً سبعہ معلقات کو لکھ کر بطور اعزاز و احترام اور بغرض چیلنج کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا۔ اس طرح بعض معاہدے بھی ضبط تحریر میں لائے گئے۔ ابن ندیم کے مطابق خلیفہ مامون کے خزانے میں ایک مخطوطہ تھا جس پر عورتوں کے خط کے مشابہ ذرا بھدے خط کی کچھ عبارت تھی، کہا جاتا ہے یہ عبدالمطلب کا خط تھا۔ اہل مکہ کے ایک تحریری معاہدہ کا ذکر ملتا ہے جو خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا اور جس کے نتیجہ میں حضور ﷺ کو اپنے اعزاء و اقربا کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور رہنا پڑا تھا۔ ایک دوسرا واقعہ حضرت تمیم الداری کا ہے کہ وہ فلسطینی تھے اور ہجرت سے پہلے مکہ آکر مسلمان ہو گئے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ جب مسلم سپاہ ملک شام فتح کر لیں تو فلاں فلاں گاؤں جاگیر کے طور پر مجھے دے دئے جائیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے ایک پروانہ لکھ دیا۔ کہ اگر بیت مرطوم جبران اور فلاں فلاں مقام فتح ہوں گے تو وہ

تمیم داری کو دے دئے جائیں گے۔

بلاذری تو اسرار کے ساتھ لکھتے ہیں کہ عہد نبوی کے آغاز میں مکہ میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے ''اقـــرا'' کا حکم ملنے کے بعد لوگوں کی تعلیم وتربیت پر پوری توجہ دی۔ اسی مقصد کے لئے تقریر اور وعظ ونصیحت کو ذریعہ بنایا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، نیز طلب علم کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیا۔ آپ نے اخلاق، ادب اور تہذیب کی زبانی طور پر اعلیٰ تربیت اور لکھنے پڑھنے یا قرأت وکتابت کے لئے لوح وقلم کے استعمال دونوں پر برابر توجہ دیتے اور تدبیر فرماتے تھے۔ پیغمبر اسلام معلم اعظم تھے، تعلیمی وتربیتی دونوں قسم کے اداروں کے نگران اعلیٰ اور سربراہ اعظم تھے۔ غار حراء میں جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا تھا اقراء (پڑھو) تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا ''ماانا بقاری'' (میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتا) اور جب آپ پر علم وحکمت کے خزانوں کی بارش ہونے لگی، تو آپ نے یہ خزانے دوسرے کو منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا کہ اسلامی عقائد وتعلیمات آداب اور احکام کی تبلیغ واشاعتِ علم کے ذریعہ ہی ممکن تھی اور اسلام تو تعلیمات کے ذریعہ ہی پہچانا جاتا ہے۔ خود آپ کی ذات والا صفات ہمیشہ ہی سے اخلاقی تربیت کا شاندار نمونہ اور عملی پیکر تھی۔ بعثت کے ساتھ آپ ﷺ نے اسلام کی تعلیمات اپنی دکھ درد کی ساتھی شریک حیات محترمہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ، رفیق وغمگسار دوست حضرت ابوبکر صدیق اور ہر وقت آپ کے زیر سرپرستی وزیر تربیت رہنے والے حضرت علی وحضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم کو بھی سکھائیں۔ اس طرح اسلام کی تعلیمات آہستہ آہستہ دوسروں میں بھی پھیلنی شروع ہوگئیں۔ قرآن کی جو آیتیں نازل ہوئی تھیں آپ انہیں سب زبانی بھی یاد کرا دیتے تھے اور کسی پڑھنے لکھنے جاننے والے شخص کو بلا کر لکھا دیتے تھے۔ صحابہ کرام کے اندر یہیں سے لکھنا پڑھنا سیکھنے کا جذبہ پیدا ہوا، یہاں تک کہ وہ زمانہ بھی آ گیا کہ مسلمانوں نے وہ علمی ترقیاں کیں کہ ان کے باعث وہ ساری دنیا کے معلم بن گئے اور ساری دنیا کے لوگ

ان کی کتابوں کو پڑھ کر جدید تحقیق وترقیات سے واقف ہوئے۔ اس کی اساس عہد نبوی کی تیار کردہ بنیاد، آپ کے عہد کا نظام تعلیم اور آپ کے علوم کی سرپرستی ہی ہے۔

پیغمبر اسلام نے علم کے حصول کو فرض قرار دینے اور تعلیم کے فرض کی ترغیب دلانے کے ساتھ ہی اس کی تعلیم کا بھی بھرپور انتظام فرمایا اور اس کے فروغ وترقی کے لئے ہر ممکن تدابیر اختیار کیں۔ آپ نے اسلامی تعلیم وتربیت کا سب سے پہلا مرکز مکہ معظّمہ کے نواح میں کوہ صفا پر واقع حضرت ابن ابی الارقم کے مکان کو بنایا یہاں زبانی تعلیم بھی دیتے تھے اور ان پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا جاننے والے لوگوں کے ذریعہ پڑھنا لکھنا سکھاتے اور پڑھواتے تھے۔ یہ مکان ایک کالج اور تعلیم بالغاں کا مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے والے اپنے اپنے گھروں میں مفت کو چنگ سینٹر چلاتے تھے اور لوگوں کے گھروں پر جا کر مفت ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے مکان کے سامنے واقع چبوترہ کو مسجد کی شکل دے رکھی تھی۔ آپ وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کرتے تھے اور قرآن کی تلاوت بھی فرماتے۔ شہر والوں کے لڑکے اور لڑکیاں آپ کے پاس آتے اور آپ انہیں تعلیم دیتے تھے۔ وہ آپ کی تلاوت قرآن سے متاثر ہوتے تھے اور اسلام کی تعلیمات حاصل کر کے حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے، یہ بات مشرکین مکہ کو سخت ناگوار گزری۔ انہوں نے آپ کا مکہ میں رہنا دوبھر کر دیا تو آپ ہجرت کے ارادہ سے نکل کھڑے ہوئے، اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر حبشہ کے لئے روانہ ہوگئے، راستہ میں قبیلہ قارہ کے سردار ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی وہ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ مگر آپ کے اخلاق وعادات سے بہت متاثر تھے۔ وہ آپ کو اپنی پناہ میں مکہ واپس لائے اور جب مکہ والوں کے سامنے آپ کو اپنی پناہ میں رکھنے کا اعلان کیا تو انہوں نے کہا کہ اپنے گھر کے اندر جیسے چاہیں عبادت کریں اور جو چاہیں پڑھیں، لیکن گھر سے باہر اور اونچی آواز میں قرآن نہ پڑھا کریں، کیونکہ اس سے ہماری عورتوں اور بچوں پر اثر پڑتا ہے۔ حضرت ابوبکر نے کچھ

دن تک ابن الدغنہ کی پناہ باقی رکھی اور اس وعدہ کو نبھایا، مگر جلد ہی وہ پناہ واپس کر دی۔ آپ قرآن پڑھتے تو بے اختیار رونے لگتے اتنا روتے کہ ہچکیاں بندھ جاتیں۔ آپ کی آواز سن کر لوگ گھروں سے نکل آتے، راستہ چلتے رک جاتے ان میں عورتیں بھی ہوتیں مرد بھی ہوتے، بچے بھی ہوتے اور جوان بھی، اللہ کے کلام کا ان پر بہت اثر ہوتا۔

جس وقت حضرت عمر فاروقؓ ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر العیاذ باللہ پیغمبر اسلام کا کام تمام کرنے کے عزم وارادہ سے نکلے تھے اور حضرت نعیم کے کنبے پر اپنی بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید کے گھر پہنچے تھے ان دونوں کو حضور کے ایک صحابی خباب بن الارث بطور مفت ٹیوشن ان کے گھر پر پڑھا رہے تھے۔ جو حضرت عمر کی آواز سن کر چھپ گئے تھے۔ اس وقت قرآن کے جو اجزاء ان کے ہاتھوں میں تھے وہ بھی چھپا دئے گئے تھے جو بعد میں حضرت عمرؓ کے کہنے پر حضرت فاطمہ نے انہیں دئے اور انہیں پڑھ کر متاثر ہوئے تب حضرت خباب نے باہر نکل کر انہیں خوشخبری دی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ سے دعا کی ہے کہ عمر بن ہشام یا عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کو اسلام کی توفیق دے دے۔ لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا تمہارے حق میں قبول فرمالی ہے۔

پیغمبر اسلام کے تعلیم وتربیت یافتہ حضرات میلوں اور بازاروں میں کاروبار کرنے والوں کو اور صحراؤں اور ریگستانوں، نیز چراگاہوں میں چرواہوں کو اوپن اسکول اور اوپن یونیورسٹی کی شکل میں تعلیم دینے کا انتظام کیا تھا۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہم لوگوں نے رسول اللہ کی زبان مبارک سے تمام حدیثیں خود نہیں سنیں، بلکہ جو لوگ حدیث کے وقوع یا بیان کے وقت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ دوسروں تک انہیں نہایت اہتمام کے ساتھ پہنچایا کرتے تھے اور ہم اونٹ چرانے میں مشغول انہیں سنتے چلے جاتے تھے۔ حصول علم کے لئے مسلمانوں کا یہی ذوق وشوق ان کی جہاں بینی کا سبب بنا۔ پیغمبر اسلام ﷺ ٹیوشن پر بھی اساتذہ بھیجا کرتے تھے۔ اہل مدینہ کی درخواست پر اپنے

ایک صحابی حضرت مصعب بن عمیر کو ان کے درمیان اسلام کی تبلیغ واشاعت اور ان کی تعلیم وتربیت کے لئے بھیجا جو مسلسل یہ کار عظیم انجام دیتے رہے جب آپ خود مدینے تشریف لے گئے اور مسجد نبوی تعمیر فرمائی تو اس میں بھی تعلیم وتربیت کے حلقوں کا انتظام فرمایا۔ ہوسٹل کی شکل میں صفہ نامی چبوترہ سے کام لیا جو مسجد نبوی کے سامنے واقع تھا اس کی حیثیت رہائش جامعہ یا Residentail University کی تھی، یعنی یہاں طلباء کے رہنے کا بھی انتظام تھا اور تعلیم وتربیت کا بھی۔ اس یونیورسٹی میں ایک وقت معاذ بن جبل بھی رہائش پذیر ہوئے اور حضرت عمر بن عبداللہ بھی۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اس کو ڈے ہوسٹل کی طرح استعمال کرتے تھے، یعنی صرف دن کے وقت وہاں رہتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے اور کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جو تعلیم بھی پاتے تھے اور رات کو رہتے بھی تھے۔ ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک بار حضرت سعد بن عبادہ نے اہل صفہ کے اس (۸۰) آدمیوں کو ایک دن اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ رسول اللہ ﷺ مختلف طریقوں سے اہل صفہ کی تعلیم وتربیت کا بھی اہتمام فرماتے تھے اور حسب ضرورت واستحقاق قیام وطعام کا بھی، ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی تھے جو دوسرے لوگوں پر یا بیت المال پر بوجھ بننے کے بجائے خود محنت ومزدوری کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر کبھی اصحاب صفہ میں سے تو کبھی دوسرے صحابی آپس کے قبیلوں میں ہی اسلام کی تبلیغ کرتے اس کی تعلیمات اور احکام ومسائل کی تعلیم اور قرآن پڑھانے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ جب کفر واسلام اور حق وباطل کا پہلا معرکہ غزوہ بدر پیش آیا جس میں نہتے اور بے سروسامان مسلمان کل تین سو تیرہ اور ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس کافر ایک ہزار تھے پھر بھی کفر کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے کافر مارے گئے، بہت سے گرفتار کر کے قید کر دئے گئے جنہیں بعد میں فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ ان میں جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کا یہ فدیہ قرار دیا گیا کہ وہ دس دس

مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ اس شرط کے پورا ہونے پر انہیں آزاد کر دیا گیا اور اس طرح مسلمانوں میں علم کی روشنی وار دولت پیدا ہوگئی۔'' جن قیدیوں کو مدینہ کے لوگوں کو پڑھانے لکھانے کو کہا تھا اور اسی کو ان کی طرف سے فدیہ قرار دیا گیا تھا وہ عرب تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب حضور کے زمانے میں پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ اس وقت عرب کا معاشرہ بالکل جاہل اور ناخواندہ نہیں تھا، البتہ وہ کفر وشرک جیسی شناعتوں میں متبلا تھے۔'' (مرتب)

حضرت شفاء بنت عبداللہ قریش خاندان سے تھیں۔ ہجرت سے پہلے مکہ معظّمہ میں ہی اسلام لے آئیں تھیں۔ بہت ذہین اور عقلمند صحابیہ تھیں بڑی عالمہ اور فاضلہ تھیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کے گھر تشریف لے جاتے کبھی کبھی وہیں قیلولہ بھی فرماتے وہ بھی حضور ﷺ کے یہاں برابر آتی تھیں اور امہات المومنین ازواج مطہرات کے پاس دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتی تھیں۔ انہوں نے ام المومنین حضرت حفصہ کو لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ وہ نملہ نامی علاج جانتی تھیں ایک بار حضرت حفصہؓ کے پاس بیٹھی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ان کو بیٹھے دیکھا تو فرمایا شفا تم نے جیسے حفصہ کو لکھنا پڑھنا سکھایا ہے انہیں نملہ کا علاج نہیں سکھاؤ گی؟ حضورؐ ارشاد فرمائیں اور حضرت شفا انکار کر دیں بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ فوراً تیار ہوگئیں اور حضرت حفصہ کو نملہ کا علاج سکھا دیا۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ طب Medical تعلیم کا بھی انتظام فرماتے تھے اور حسب ضرورت کبھی گھروں پر اور خود مسجد نبوی میں مریضوں کو گویا نرسنگ ہوم یا اسپتال میں بھرتی کرا کر علاج بھی کراتے تھے، آپ فزیشین معالجین اور مریضوں کو مشورے بھی دیتے تھے اور نسخے بھی تجویز فرماتے تھے، جنگوں اور غزوات میں زخمی ہونے والوں کا وقت کے اچھے تجربہ کار جراحوں اور سرجنوں سے علاج بھی کراتے تھے۔

جامعہ خواتین نسواں کی ممتاز عالمہ و فاضلہ حضرت عائشہ صدیقہؓ عنہا تو بہت سے

مردوں کی بھی استاذ تھیں۔ بہت سے مردان کے مخصوص ممتاز شاگردان رشید گزرے ہیں۔ حضرت زید بن ثابت مشہور انصاری صحابی ہیں وہ ہمارے رسول ﷺ کے بہت چہیتے تھے۔ جب رسول ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے، ان کی عمر گیارہ سال تھی۔ انہوں نے بچپن ہی میں عربی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لی تھی بہت عالم وفاضل تھے، فقہائے صحابہ میں گنے جاتے ہیں جب اللہ کی طرف سے ہمارے نبی پر وحی آئی تھی آپ ان کو بلا کر لکھوا لیتے تھے، اس لئے انہیں کاتب وحی اور کاتب نبی بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارے رسول ﷺ آس پاس کے قبیلوں کے سرداروں اور دور دراز کی حکومت کے بادشاہوں کو خط لکھا کرتے تھے اور ان کے خط آتے تو ان کو پڑھواتے تھے۔ یہودی سرداروں کے خط ان کی اپنی زبان سریانی یا عبرانی میں آتے تھے، ان خطوط کو پڑھوانے اور ان کا جواب لکھانے کے لئے شروع میں مدینہ کے کسی یہودی کو بلانا پڑتا تھا۔ ایک بار آپ نے حضرت زید سے فرمایا یہودیوں کا کوئی بھروسہ نہیں خط میں کچھ لکھا ہوا اور مجھے سنانے کے لئے کچھ اور پڑھ دیں یا میں جو کچھ لکھاؤں اس کی جگہ کچھ اور لکھ دیں، اس لئے میں چاہتا ہوں تم سریانی زبان پڑھنا لکھنا سیکھ لو۔ حضور کے فرمانے پر انہوں نے یہودیوں کی سریانی زبان سیکھنی شروع کر دی اور نصف ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ بہت اچھی طرح سیکھ گئے، پھر حضور کو جب بھی سریانی زبان میں لکھنا ہوتا تو انہیں سے لکھاتے تھے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حسب ضرورت دوسری قوموں کی زبان ان کے کارآمد ونفع بخش علوم وفنون سیکھنے کا حکم بھی دیا، ترغیب بھی دی انتظامات بھی کئے اور سہولتیں فراہم کرائیں۔ لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابت کو چار پانچ زبانیں آتی تھیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی ہی اس کے علاوہ انہیں عبرانی، سریانی، قبطی اور فارسی زبانیں بھی آتی تھیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے طبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے گورنر بنا کر یمن بھیجا تو ان کا فریضہ یہ تھا کہ ایک ضلع سے دوسرے

ضلع میں اور ایک کمشنری سے دوسری کمشنری میں جائیں اور تعلیم کا انتظام کریں۔ اس کے علاوہ یمن کے ایک دوسرے گورنر عمر بن حزم کی تقرری کے وقت ان کو جو حکم دیا گیا تھا اس میں دوسرے امور کے متعلق ہدایت کے علاوہ تعلیم کا بندوبست کرنے کا بھی حکم تھا۔ اسی طرح گورنر کے فرائض میں یہ بھی شامل کیا گیا کہ وہ اپنے دائرہ عمل کے اندر رہنے والوں کی تعلیم کا انتظام کریں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنی دو انگلیاں چوس رہا ہوں ایک پر شہد اور دوسرے پر گھی لگا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن مجید اور توریت دونوں سے استفادہ کرسکو گے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ بعد کے زمانہ میں انہوں نے بھی سریانی زبان کی تعلیم پائی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اجنبی زبانیں سیکھنے کا انتظام ہو چکا تھا جو بعد کے زمانہ میں ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ مسلم خلفاء اور حکمرانوں کے زمانہ میں باقاعدہ دارالتراجم قائم ہوئے اور دنیا بھر سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں لالا کر ان کے عربی میں تراجم کئے گئے اور پھر ان علوم وفنون میں خود تجربات کرکے ان کو ترقی کی بلند منزلوں تک پہنچایا گیا۔ یہ سب کچھ رسول اللہ ﷺ کی ہدایات احکام اور انتظامات کی بنیاد اور اساس پر ہی ہوا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات مبارکہ کا ہر گوشہ نوع انسانیت کے لئے ایک مکمل اسوۂ حسنہ اور رہنمائے حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا مطالعہ محض تبرک اور معلومات میں اضافہ کا ذریعہ نہیں، بلکہ زندگی گزارنے کے لئے آپ کے نقش پر گامزن ہونے کا متقاضی ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تعلیم کے فروغ کے لئے حکم، ترغیب اور انتظام کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس کا تقاضہ یہی ہے کہ آپ کے پیروکار اور امتی اپنے لئے رہنما بنائیں۔ اسلسلہ میں مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں شاندار ماضی کا مظاہرہ کیا بھی ہے اور دیندار حلقے اب بھی اس روشنی پر گامزن ہیں۔ کہ اپنے وسائل واستطاعت اور بساط بھر انتظام کرتے رہتے ہیں، لیکن دھن

میں مبتلا غیروں سے مرعوب جدید روش کے علمبردار عصری علوم کے ماہرین اور جدید تقاضوں کی اہمیت سے باخبری کا دعویٰ کرنے والے اپنے گھروں تک سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ انہوں نے نہ پیغمبر اسلام کے اسوۂ اور تعلیمات کو اپنا رہنما بنایا ہے نہ ہی اپنے ان آقاؤں کی روش اختیار کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں وہ اپنے نزدیک قابل اقتدا اور لائق ستائش تصور کرتے ہیں، چنانچہ ایک مسلم ملک کے ڈکٹیٹر سربراہ حال ہی میں یہ اعلان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آج دنیا میں ۵۷ مسلم ملک ہیں ان کی زبردست آبادی ہے ان کے پاس زبردست وسائل وذرائع ہیں اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ پوری مسلم دنیا میں جسے وہ عالم اسلام کہتے ہیں ۶۰۰ یونیورسٹیاں ہیں، جبکہ اکیلے جاپان میں ۱۰۰۰ یونیورسٹیاں ہیں، لیکن موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ اس شرمناک حالت کے لئے کون ذمہ دار ہے؟۔ کہ جب ۵۷ مسلم ممالک میں مغرب کے فیض یافتہ امریکہ کے لاڈلے نئی روشنی، عصری علوم کے فارغین ہی حکمراں ہیں جو علمائے دین کے مطالبات کے خلاف قوانین بناتے ہیں اسلام کی دھجیاں اڑاتے ہیں، اسلامی تحریکوں کو کچلتے ہیں، اسلامی قوانین کو مسخ کرکے اپنی مرضی کے اور اپنے آقاؤں کی مرضی کے مطابق، قوانین، نظام تعلیم، آداب معاشرت، ضابطہ ہائے اخلاق نافذ کرتے ہیں تو پھر پیغمبر اسلام کا نہیں ان آقاؤں کے طرز عمل کو ہی اپنا لیتے اگر ایسا نہیں کیا اور جب کہ حقائق اس کے شاہد ہیں تو اس کے لئے ذمہ دار اور مسلمانوں کی پسماندگی کا مجرم کس کو قرار دیا جائے۔ یہ اپنے آپ میں ان دانشوروں کے خلاف ایک سنگین فرد جرم ہے۔ مگر خود ہی منصف خود ہی مدعی۔

☆☆

رسول اللہ ﷺ کا تبسم

● ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

دنیا میں ہزاروں پیغمبر آئے، انہوں نے اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچایا اور اپنی زندگی کا عملی نمونہ پیش کیا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد ان کی تعلیمات مٹ گئیں یا ان میں بہت سی غلط باتوں کی آمیزش ہوگئی اور ان کی زندگی پر پردہ پڑ گیا۔ یہ امتیاز صرف خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کو حاصل ہے کہ آپ کا لایا ہوا پیغام قرآن مجید کی شکل میں حرف بحرف محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اسی طرح آپؐ کی حیات طیبہ بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ آپ کی ولادت سے اور خاص طور پر نبوت سے وفات تک کے تمام واقعات، تمام جزئیات کے ساتھ معلوم ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے آپ کی زندگی کے معمولی معمولی واقعات، آپ کے روزمرہ کے معمولات اور طبعی اوصاف کو بھی بیان کیا ہے۔ آپ ﷺ کی خلوت وجلوت، نشست وبرخاست، آمد ورفت، سفر وحضر، خواب وبیداری، بول چال، کھانا پینا، چلنا پھرنا، پہننا اوڑھنا، غرض آپ کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی نجی زندگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ اپنے متعلقین اور اصحاب کے ساتھ لطف وکرم، محبت ومودت اور نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ آپ کے مزاج میں درشتی اور سختی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ قرآن نے آپ ﷺ کے اس وصف کو اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار دیا ہے:

”فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ“. (آل عمران: ۱۵۹)

(اے پیغمبرؐ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے، کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد وپیش سے چھٹ جاتے) آپ ﷺ ملنے والوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے، ان سے مسکرا کر بات چیت کرتے، ان کی ظریفانہ مجلسوں میں شریک ہوتے، بسا اوقات ان سے لطیف مزاح بھی فرماتے۔ آپ ﷺ کا یہ برتاؤ تمام طبقات کے ساتھ تھا، اندرون خانہ ازواج مطہرات ہوں یا بچے آپ ﷺ کے قریبی اصحاب ہوں یا اجنبی، سب آپ ﷺ کے بحر الطاف وعنایات سے فیض یاب ہوتے تھے۔ سیرت نبویؐ کا یہ ایک ایسا باب ہے جس سے آپ کی نجی زندگی کے ایک اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

آنحضرتؐ کے قریبی اصحاب کا بیان ہے کہ آپؐ کے روئے اطہر پر ہمیشہ مسکراہٹ اٹکھیلیاں کرتی رہتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن حارثؓ فرماتے ہیں: ”میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی شخص کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا“ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ”میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کو ٹھٹھا مار کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپؐ صرف تبسم فرماتے تھے۔“

احادیث میں ”ضحک“ (ہنسنا) اور ”تبسم“ کے الفاظ آئے ہیں، ”ضحک“ چہرے کے انبساط کو کہتے ہیں جس سے دانت نظر آجائیں اور منہ سے ہلکی آواز نکلے۔ اگر آواز زور سے نکلے اور دور تک سنائی دے تو اسے ”قہقہ“ اور بالکل نہ نکلے تو اسے ”تبسم“ کہتے ہیں۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیشتر حالات میں صرف تبسم فرماتے تھے۔ بعض خاص مواقع پر آپ سے ضحک بھی ثابت ہے۔ بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کسی بات پر اتنی زور سے ہنسے کہ آپ کے نواجذ (داڑھ) دکھائے دئے، لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ صحابہ کو زیادہ ہنسنے سے منع فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: زیادہ نہ ہنسو، زیادہ ہنسنا دلوں کو مردہ کر دیتا ہے۔“

آنحضرت ﷺ ازواج مطہرات کے ساتھ لطف وکرم اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

آپ ﷺ ان کے ساتھ خوش طبعی فرماتے اور ان کے درمیان مسرت کے موتی بکھیرتے تھے۔ کبھی کوئی ہنسی کی بات آتی تو بے ساختہ مسکرا دیتے تھے۔

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبیؐ کے ساتھ سفر میں تھی، اس وقت تک میں ہلکی پھلکی تھی، فربہ بدن نہیں ہوئی تھی۔ آپؐ نے لوگوں کو آگے بڑھ جانے کی ہدایت کی۔ پھر مجھ سے فرمایا: ''آؤ دوڑ کا مقابلہ کرتے ہیں'' میں آپؐ کے ساتھ دوڑی اور آگے نکل گئی۔ آپؐ خاموش ہوگئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک مرتبہ پھر مجھے آپ کے ساتھ سفر میں جانے کا موقع ملا، اس وقت میں فربہ بدن ہوگئی تھی۔ آپؐ نے اس موقع پر بھی اپنے اصحاب کو آگے بڑھ جانے کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے فرمایا: ''آؤ دوڑ کا مقابلہ کرتے ہیں'' میں آپ کے ساتھ دوڑی تو آپ مجھ سے آگے نکل گئے۔ آپ ہنسنے لگے اور فرمایا: ''یہ اس دن کا بدلہ ہے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک دوسرا واقعہ بیان کرتی ہیں کہ میں نبیؐ کی خدمت میں حریرہ (یعنی دودھ، گھی اور آٹے سے تیار کیا ہوا کھانا) لے کر آئی جسے میں نے خود آپ کے لئے تیار کیا تھا۔ وہاں حضرت سودہؓ بھی تھیں، نبیؐ میرے اور ان کے درمیان تھے۔ میں نے سودہؓ سے کہا: ''کھاؤ'' انہوں نے انکار کیا میں نے کہا: ''کھاؤ ورنہ تمہارے چہرے پر لتھیڑ دوں گی'' انہوں نے پھر بھی انکار کیا۔ میں نے حریرہ میں اپنا ہاتھ ڈالا اور ان کے چہرہ پر لیس دیا۔ نبیؐ ہنسنے لگے۔ آپؐ نے سودہؓ سے فرمایا: ''اس کے بھی چہرے پر لتھیڑ دو'' (دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ کا بیان یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنا گھٹنا نیچے کر لیا، تاکہ سودہؓ مجھ سے بدلہ لے سکیں۔) چنانچہ انہوں نے بھی پلیٹ سے کچھ لے کر میرے چہرے پر لیس دیا اور رسول اللہؐ ہنستے رہے۔

آپ کی خوش طبعی اور خندہ روئی کا یہ معاملہ بچوں کے ساتھ بھی تھا۔ آپؐ کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتے۔ ان سے پیار بھری باتیں کرتے اور کبھی کبھی لطیف مزاح بھی فرماتے۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ کا ایک بچہ تھا جس کا نام ابوعمیرؓ تھا۔

آنحضرت ﷺ جب بھی ابوطلحہؓ کے گھر تشریف لے جاتے، اس بچے سے ہنسی مذاق کرتے تھے۔

ایک مرتبہ بعض لوگوں نے آپ ﷺ کو کھانے کی دعوت دی آپ ﷺ ان کے یہاں جا رہے تھے۔ راستے میں آپ ﷺ کے نواسےؓ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ملے۔ آپ ﷺ نے انہیں پکڑنا چاہا۔ وہ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ آپ ﷺ ہنستے ہوئے انہیں پکڑنے کی کوشش کرنے لگے، یہاں تک کہ پکڑ لیا۔ پھر اپنا ایک ہاتھ ان کی گدی پر اور دوسرا ان کی ٹھوڑی پر رکھا اور اپنا منہ ان کے منہ پر رکھ کر بوسہ لے لیا۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپ ﷺ سے ملنے آیا۔ اس وقت گھر میں حضرت عائشہؓ عنہا موجود تھیں، آپ نے آہستہ سے فرمایا یہ برا آدمی ہے۔ پھر حضرت عائشہ سے پردہ کرا کر اس شخص کو اندر بلا لیا اور ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ نے اسے برا آدمی قرار دیا اور پھر اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں بھی کیں۔ آپ ﷺ نے جواب دیا: سب سے برا آدمی وہ ہے جس کے شر کی وجہ سے لوگ اس سے بچیں۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کہیں تشریف لے جا رہے تھے حضرت انس بن مالک ساتھ میں تھے۔ آپ اس وقت موٹے حاشیہ کی ایک نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ راستے میں ایک بدو ملا اس نے آپ کی چادر پکڑ کر اتنے زور سے کھینچا کہ گردن پر اس کا نشان پڑ گیا اور کہا ''اے محمد اللہ نے تمہیں جو مال دیا ہے اس میں سے مجھے بھی دو'' آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کی اس حرکت پر مسکرائے اور اسے کچھ مال دینے کا حکم دیا۔

اللہ کے رسولؐ اپنے اصحاب کے درمیان کچھ ارشاد فرماتے تو صحابہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے، صحابہ کچھ بیان کرتے تو آپ بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوتے، کوئی بات تفریح طبع کی ہوتی تو آپ بھی اس سے پورا مزہ لیتے۔ صحابہ کسی بات پر ہنستے تو آپ بھی ان کا ساتھ دیتے۔

کسی صحابی کی کوئی ''حرکت'' یا کوئی انداز آپ کے روئے انور پر مسکراہٹیں بکھیر دیتی تھی۔

حضرت ابورمثہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے میری طرف اشارہ کرکے میرے باپ سے دریافت کیا: ''یہ تمہارا بیٹا ہے'' میرے باپ نے جواب دیا: ''جی ہاں رب کعبہ کی قسم! میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں یہ میرا بیٹا ہے۔'' ابورمثہؓ بیان کرتے ہیں: میری شباہت میرے باپ سے ملتی جلتی تھی۔ پھر بھی قسم کھا کر میرے باپ کے اس انداز سے جواب دینے پر اللہ کے رسول ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا: ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ تمہارا بیٹا کوئی جرم کرے گا تو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور تمہارے کسی غلط کام کا مواخذہ تمہارے بیٹے سے نہیں ہوگا، پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی''. (فاطر: ۳۵-۱۸) (کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا)۔ (۱۴)

ایک صحابیہؓ نے حضور کی خدمت میں حاضر ہوکر شکایت کی کہ ان کے شوہر نے انہیں مارا ہے۔ آپ ﷺ نے ان کے شوہر کو بلاکر وجہ دریافت کی۔ انہوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! یہ مجھے ستاتی ہے'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''سلمیٰ تم نے کیوں ستایا؟'' صحابیہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسولؐ! میں نے ستایا نہیں ہے، یہ بات تھی کہ نماز پڑھنے کے دوران ان کی ریاح خارج ہوگئی تو میں نے کہا کہ اللہ کے رسولؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اگر کسی کی ریاح خارج ہوجائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اسے دوبارہ وضو کرنا چاہئے۔ بس اسی بات پر انہوں نے مجھے مارا۔ یہ سن کر اللہ کے رسولؐ ہنسنے لگے اور فرمایا ''اے ابورافعؓ! اس نے تو تم سے اچھی بات کہی تھی۔''

حضورؐ کی ایک مجلس میں دیہات میں رہنے والے ایک صحابی موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جنت میں ایک شخص اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کرے گا کہ میں کھیتی کرنا چاہتا ہوں۔'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''کیا جو کچھ تمہیں حاصل ہے وہ کافی نہیں'' وہ عرض کرے گا

''لیکن میری خواہش ہے کہ کھیتی کروں'' چنانچہ وہ بوائی کرے گا اور دیکھتے ہی دیکھتے کھیتی بڑھ کر پک کر تیار ہوجائے گی۔ پھر کٹائی ہوکر پہاڑ کی طرح ڈھیر لگ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''یہ سب تمہارا ہے'' دیہاتی نے برجستہ کہا: ''خدا کی قسم وہ کوئی قریشی یا انصاری ہوگا وہی لوگ کھیتی کرتے ہیں۔'' اس کی اس برجستگی پر اللہ کے رسولؐ ہنس دئے۔

بسا اوقات آنحضرت ﷺ بغیر کسی بات کے اچانک ہنس دیتے۔ وہاں موجود صحابہ ہنسی کی وجہ دریافت کرتے یا دریافت نہ بھی کرتے، تب بھی آپ خود ہی اس کی وضاحت فرمادیتے اور کسی ایسی حکمت کی بات کی طرف اشارہ فرماتے جو درس وتعلیم سے پُر ہوتی۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے۔ آپ کے اردگرد صحابہ کی ایک جماعت تھی اچانک آپؐ ہنس دئے۔ پھر خود ہی صحابہ سے مخاطب ہوئے: ''کیا تم لوگ پوچھوگے نہیں کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں؟'' صحابہ نے عرض کیا: ''کیا بات ہے اے اللہ کے رسول!'' فرمایا: مومن کا معاملہ بھی عجیب وغریب ہے۔ اس کے ہر معاملے میں خیر ہے۔ اگر اسے کوئی بھلائی حاصل ہوتی ہے اور وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، تو اس میں اس کے لئے خیر ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے اور اس پر وہ صبر کرتا ہے تو اس صورت میں بھی وہ خیر کا مستحق ہوتا ہے۔''

ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے پانی منگوایا اور وضو کیا۔ پھر ہنسنے لگے پھر خود دریافت کیا: ''کیا تم لوگ میرے ہنسنے کی وجہ دریافت نہیں کروگے'' صحابہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہؐ فرمائیے'' آپ نے ارشاد فرمایا: ''بندہ مومن جب وضو میں اپنے چہرے کو دھوتا ہے تو اللہ تعالیٰ چہرے سے سرزد ہونے والی خطاؤں کو معاف کردیتا ہے۔ جب ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھ سے سرزد ہونے والی خطاؤں سے درگزر فرمادیتا ہے۔ اسی طرح جب سر کا مسح کرتا اور اپنے پیروں کو دھوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان اعضا سے ہونے والی لغزشوں کو معاف کردیتا ہے۔''

ایک مرتبہ آپ سواری پر سوار ہوئے تو آپؐ نے یہ دعا پڑھی: ''إنی ظلمت نفسی

فاغفرلی فإنہ لا یغفر الذنوب إلا أنت'' (اے اللہ میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ تو میرے گناہوں کو معاف کردے۔ تیرے علاوہ اور کوئی گناہوں کو معاف نہیں کرسکتا) پھر ہنسنے لگے۔ اس وقت وہاں حضرت علی بن ابی طالبؓ موجود تھے۔ انہوں نے یہ سوال کیا: ''اے اللہ کے رسولؐ! آپ کیوں ہنسے؟ فرمایا: ''جب بندہ اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتا ہے اور فرماتا ہے کہ اس بندے کو یقین ہے کہ اس کے گناہوں کو معاف کرنے والا میرے علاوہ کوئی اور نہیں۔''

احادیث میں بعض ایسے مواقع کی تفصیلات بھی محفوظ ہیں جب اللہ کے رسول کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس کے لئے احادیث میں ''**حتیٰ بدت نواجذہ**'' (یہاں تک کہ داڑھ کے دانت نظر آنے لگے) کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ عربی زبان میں دانتوں کے لئے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ سامنے کے اوپر نیچے کے دو دو دانتوں کو (ثنایا) اور ان کے بغل کے دانتوں (کچلی کے دانتوں) کو ''انیاب'' کہتے ہیں اور ان دونوں کے مجموعہ پر ''ضواحک'' کا اطلاق کیا جاتا ہے، یعنی وہ دانت جو ہنستے وقت دکھائی دیتے ہیں۔ ''انیاب'' کے بغل میں پائے جانے والے دانتوں کو ''نواجذ'' داڑھ کے دانت کہتے ہیں۔ یہ اس وقت دکھائی دیتے ہیں جب آدمی کھلکھلا کر ہنسے۔ ایسے چند مواقع کا تذکرہ جب اللہ کے رسولؐ کو بے ساختہ ہنسی آگئی تھی اور آپ کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے، دلچسپی کا باعث ہوگا۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن ایک شخص کو بارگاہ الٰہی میں لایا جائے گا'' اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: اس کے سامنے اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش کرو۔ اس وقت اس کے بڑے بڑے گناہ چھپالئے جائیں گے۔ پھر اس سے کہا جائے گا تم نے فلاں دن یہ گناہ فلاں دن یہ گناہ کیا تھا۔ وہ انکار نہ کرسکے گا۔ اقرار کرتا جائے گا۔ ساتھ ہی اسے یہ خوف بھی لاحق ہوگا کہ ابھی تو بڑے بڑے گناہوں کا حساب باقی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اسے اس کی ہر برائی کے بدلے ایک

نیکی کا اجر دے دو: یہ الٰہی الطاف وعنایات دیکھ کر وہ بول اٹھے گا: ''میرے اور بھی بہت سے گناہ ہیں جو میں یہاں نہیں دیکھ رہا ہوں'' اور حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں: میں نے دیکھا کہ یہ فرماتے ہوئے رسول ﷺ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے معلوم ہے کہ سب سے آخر میں جہنم سے نکل کر جنت میں جانے والا شخص کون ہوگا؟ ایک شخص جہنم سے گھسٹتا ہوا نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: ''جنت میں چلے جاؤ'' وہ جنت کی طرف جائے گا۔ تو اسے ایسا لگے گا کہ جنت بھر گئی ہے۔ وہ واپس آکر عرض کرے گا: اے میرے رب! جنت تو بھر گئی ہے'' اللہ تعالیٰ اس سے پھر فرمائے گا ''جا کر دیکھو'' وہ دوبارہ جائے گا اس بار بھی اسے محسوس ہوگا کہ جنت میں اب اس کے لئے کوئی جگہ نہیں بچی ہے۔ وہ واپس آکر عرض کرے گا: ''اے میرے رب! جنت میں اب کوئی جگہ نہیں بچی ہے'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''تم جنت میں جاؤ وہاں تمہارے لئے دنیا کے برابر اس کا دس گنا ہے۔'' وہ عرض کرے گا: ''اے اللہ! آپ شہنشاہ ہوکر مجھ سے مذاق کرتے ہیں!'' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں، یہ فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

یہ چند واقعات ہمارے سامنے سیرت نبویؐ کا ایک دلکش باب ادا کرتے ہیں جہاں الفت ومحبت ہے، لطف وکرم ہے، خوش طبعی اور خندہ روئی ہے، تفریح طبع اور مزاح لطیف ہے، مسکراہٹیں اور کھلکھلاہٹیں ہیں۔ یہ واقعات جہاں ایک طرف ہمارے سامنے آنحضرت ﷺ کی نجی زندگی کا ایک پہلو روشن کرتے ہیں وہیں دوسری طرف ہمیں زندگی گزارنے اور متعلقین کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ایک اسوہ بھی دکھاتے ہیں اور ان سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ بزرگی اور عظمت چہرے پر رعونت طاری رکھنے، پیشانی پر شکن ڈالنے، گردن ٹیڑھی کرکے بات کرنے یا مہر بہ لب رہنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل زندگی خوشیاں بانٹنے اور مسکراہٹیں بکھیرنے سے عبارت ہے۔

خاتم النبیین ﷺ کا بچپن

● بریگیڈیئر گلزار احمد

فخر انسانیت ﷺ کی ولادت باسعادت (ایک روایت کے مطابق) ۹ ربیع الاول بمطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو مکہ میں صبح صادق کے بعد ہوئی۔ نمود صبح وطلوع آفتاب سے کچھ قبل آفتاب دو جہاں اس جہاں میں تشریف فرما ہوئے یہ دوشنبہ کا دن تھا۔ تاریخ کے عجائبات کے راز کون جان سکتا ہے۔ آپؐ کی ولادت، نبوت، ہجرت اور وفات سبھی اہم واقعات دوشنبہ کے دن واقع ہوئے۔

آپؐ کی زندگی کا ہر واقعہ یوں تو معجزہ نظر آتا ہے اور پوری زندگی ایک دلکش معجزہ۔ البتہ طالب علم کے ذہن میں یہ جستجو پیدا ہونا فطری امر ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ آپؐ کا بچپن کس طرح گزرا۔ وہ کون سے واقعات وحادثات تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی زندگی کے خطوط اور سمت متعین کی اور وہ کون کون لوگ تھے جنہوں نے تربیت کے ذریعہ آپ ﷺ کے اخلاق وکردار کو متاثر کیا۔

جس انسان نے اپنی جان کے دشمنوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ جس نے دشمن فوج کے کمانڈر علی، ابوسفیان کو والئی نجران کے فرائض انجام دینے کے قابل بنادیا، جس نے احد کے میدان میں اسلامی فوج کو فتح سے محروم کردیا تھا، اسے سیف اللہ کے لقب کے شایان شان بنایا، جس نے سید الشہداء حضرت حمزہ بن عبدالمطلب جیسے جلیل القدر مجاہد کے قاتل کو ایمان کے قابل بنایا اور پھر اسے مسیلمہ کذاب کے قتل کے ذریعے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا

کرنے کا موقع عطا کیا، جس نے مساوات انسانی کا وہ سبق دیا کہ آزاد کردہ حبشی غلام کو خلیفۂ وقت کی جانب سے سیدنا کا خطاب دلوایا اور جس نے لاکھوں انسانوں کے قلب وذہن میں عجوبۂ روزگار تبدیلیاں لائیں۔ اس ''امی'' ہادیؐ کے بچپن اور اس کی تربیت کے مدارج سے آشنا ہونے کی خواہش ہر دل میں پیدا ہوتی ہوگی۔ اسباب وعلل اور علت ومعلول کا عادی انسان جب صحرا کی بدویانہ زندگی میں بچپن گزارنے والے ''امی امین'' کے حسن معاملہ اور عہد وپیمان کی پاسداری اور ایفاء وفا کے ایمان افزا واقعات پر نظر ڈالتا ہے یا پھر دوسری طرف بدر واحد کے دوران قیادت وسیاست کی بلندیوں کی جانب نگاہ اٹھاتا ہے یا جیزان کے میدان میں اپنے قتل کے خواہشمند مکہ کے قریش سرداروں کو ایک ایک سو اونٹ کا تحفہ دے کر ان کے سر نیاز کو اس یاد سے جھکا دیتا ہے، جب انہوں نے ندوہ میں بیٹھ کر اعلان کیا تھا کہ جو اسے ﷺ زندہ یا مردہ لے آئے گا اس کو ایک سو اونٹ انعام کے طور پر پیش کئے جائیں گے تو گنہگار انسان معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیا یہ سب کچھ ایک انسان کے قلب وذہن کی واردات کا نتیجہ ہے۔ اگر اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے والا اور اس پر مکمل ایمان لانے والا اور ''**انا بشر مثلکم**'' (**سورہ بنی اسرئیل:**) کہنے والا حدود بشریت کے اندر رہ کر یہ سب کچھ اور اس سے بھی زیادہ کارنامے اور فرائض ان حدود کے اندر رہ کر انجام دے سکا تو عقل ودانش پر بھروسہ رکھنے والا انسان یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ کون سا ماحول تھا جس نے اس کے ذہن وبدن کی نشوونما میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کی تھی۔

آپؐ کا خاندان بنو ہاشم مکہ کے سب سے بااثر قبیلہ قریش کا حصہ تھا۔ آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب قریش مکہ میں اثر ورسوخ رکھتے تھے، مگر یہ اثر ان کے بعد نہ رہ سکا۔ شاید اس لئے کہ قبائلی زندگی میں فرد کی عقل وفراست اور تدبر وتفکر ہی انسان کو اعلیٰ مقام دیا کرتا ہے۔ اگر آپؐ کے والد حضرت عبداللہ زندہ رہتے تو بہت ممکن تھا کہ وہ حضرت عبدالمطلب کا مقام حاصل کر لیتے، مگر وہ حضور ﷺ کی ولادت سے چند ماہ قبل مدینہ کے سفر کے دوران

مدینہ میں وفات پا گئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپؐ کے والد بزرگوار کی وفات ان واقعات کی پہلی کڑی تھی جن سے شاید قدرت کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ سید البشر ﷺ بشری رشد و ہدایت یا رہنمائی اور مثال کے حاجت مند نہ تھے۔

ہر بچہ اپنے والد کو انسانیت کا بہترین مظہر سمجھتا ہے۔ وہ اپنے والد کی ہر عادت ہر طریق کار، اس کی طرز گفتگو اور اس کے اخلاق و کردار کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ الہ العالمین جس ہستی کو قیامت تک کے لئے مثال بنانا تھا اس کے سامنے وہ کوئی مثال نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

اللہ کی عطا کردہ امانت جو آمنہ کو عطا ہوئی تھی۔ اس کے مستقبل کی فکر آمنہ سے بہتر کسے ہوسکتی تھی۔ ماں اپنے لخت جگر کو تعریف کے قابل دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے نومولود کا نام احمد رکھا۔ دادا کو بھی اپنے منظور نظر بیٹے کی اولاد سے پیار فطری بات تھی۔ وہ خود بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ گردوپیش میں احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے محمد ﷺ نام رکھا۔ دونوں کو شاید یہ معلوم تھا کہ یہ دونوں نام ماقبل کے صحیفوں میں آچکے ہیں۔ توریت نے اللہ کے آخری پیغام رساں کو محمد ﷺ اور انجیل نے احمد ﷺ کے نام سے یاد کیا ہے۔

چند روز چچا ابولہب کی کنیز ثوبیہ نے دودھ پلایا اور پھر آٹھ دنوں کے نومولود نے حلیمہ سعدیہ کی گود میں ایک لاغر سی اونٹنی کی پیٹھ پر صحرا کا رخ کیا۔ اماں حلیمہ سعدیہ کا کہنا تھا کہ اس روز اس کمزور ترین اونٹنی کی رفتار کا ساتھ باقی قافلہ نہ دے سکا تھا۔ حلیمہ سعدیہ خود بھی چنداں خوشحال نہ تھیں، مگر آج ان کے قلب و ذہن کو کسی نامعلوم وجہ سے سکون و اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ بی بی آمنہ جیسی جلیل القدر ماں کا لخت جگر ﷺ اماں حلیمہ کی گود میں تھا۔ طمانیت قلب کیوں نصیب نہ ہوتی۔

صحرا کی وسعتوں میں ایک سحر، ایک کشش، ایک مقناطیسی قوت اور ایک جلال ہوتا ہے۔ چشم بینا کا صحرا میں پیدا ہونا، اسے فطرت کے اس قدر قریب لے آتا ہے کہ پھر کسی

رہنما، کسی ہادی اور کسی استاذ کی ضرورت نہیں رہتی اور بنوسعد کے چھوٹے سے قبیلے میں تھا بھی کون؟ جو اس نومولود ﷺ کو کچھ سکھاتا یا فطرت کے راز ہائے سربستہ اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا۔ اس کے سامنے تو صرف صحرا کی وسعتیں تھیں اور آسمان کی بلندیاں۔ نہ حد ادھر نہ حد ادھر ذہن رسا کے سامنے فطرت بے نقاب تھی، جو قدم قدم پر ہر ہر لمحہ نئے خیال کا موجب بن رہی تھی۔

''ذرا نم ہو تو بہت زرخیز'' ہوتا ہے صحرا کا یہ ماحول۔ ان کے خیموں میں رہنے والے مطمئن اور صبر و شکر کے عادی صحرائی باشندے اپنے اونٹوں، بکریوں اور بھیڑیوں کی محدود دولت کو قیصر و کسریٰ کے خزانوں سے عظیم تر سمجھا کرتے ہیں، ان کے ساتھ ریت کے نرم و گداز ٹیلوں پر لیٹ کر غروب آفتاب سے سحر انگیز منظر کو دیکھتے رہنا اور پھر اول شب کی خاموشی میں تاروں کی چمک ذہن انسانی کا خالق و مخلوق کے تعلقات کے سبھی گوشوں سے شناسا کر سکتی ہے، مگر اس کے لئے تجربہ و مشاہدہ بھی ضروری ہے۔ یہ نومولودؐ اپنے سے بڑوں کو دن کے وقت گلہ بانی میں مصروف دیکھتا ہوگا اور رات کو الاؤ کے گرد بنوسعد کے فصیح و بلیغ مردان آزاد کا کاروبار زندگی پر تبصرہ کرنا بھی سنتا ہوگا۔ مگر ابھی آپؐ کے لئے اس میں کسی طرح کی رہنمائی نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ ماحول البتہ آپؐ کو کسی استاد، کسی ہادی اور کسی مرشد کی غیر موجودگی میں ایام طفلی سے ہی اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کا خوگر بنا گیا ہوگا۔ اس خداداد ماحول نے ضرور فراخیٔ قلب اور فکر و خیال کی بلندیوں کی بنیاد بھی غیر محسوس طور پر رکھی ہوگی۔ خالق ارض و سماء کو ہر قدم پر اپنے اس شاہکار کے اندر کردار و اخلاق کے کمال کے سامان خود ہی پیدا کرنے تھے۔ اس لئے کہ اسی ذات بابرکات کے متعلق اسے ایک دن یہ حکم دینا تھا کہ اس کے ہر قول اور ہر فعل میں تمہارے لئے رہنمائی حاصل کرنے کی نعمت موجود ہے۔

ممکن ہے کہ عمرانیات کے ماہر اماں حلیمہ سعدیہ کے قلب و ذہن کی صلاحیتوں کو ایک شہنشاہ بے مثل اور رہنمائے نسل انسانی کی پرورش کے قابل قرار نہ دیں، مگر اس حقیقت سے

انکار ممکن نہیں کہ اسی ماں کا دودھ پی کر افضل البشر ﷺ نے جسمانی نشو ونما پائی۔ جب فاتح بدر وحنین کے سامنے حلیمہ سعدیہ آئیں تو اس لاثانی سپہ سالار ﷺ ''میری ماں، میری ماں'' کہتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ حلیمہ سعدیہ دستور کے مطابق ہر چھ ماہ کے بعد اس عظیم امانت کو اپنی والدہ کی ملاقات کے لئے مکہ لے جاتی تھیں۔ یوں تو دستور تھا کہ اس طرح صحرا کی کھلی فضا کی زندگی کی مدت پانچ سال مقرر کی گئی تھی، مگر بی بی آمنہ نے فیصلہ کیا کہ آپ ﷺ کے لئے اس مدت کو ایک سال کے لئے مزید بڑھا دیا جائے۔ اب آپ ﷺ کو اپنے رضاعی بھائی بہنوں کے ساتھ ایک سال اور رہنے کا موقع مل گیا اور یوں بھیڑ بکریوں کو گلہ بانی میں عملی طور پر حصہ لینے کے مواقع ملتے رہے۔ یہ رضاعی رشتہ حنین کی لڑائی کے قیدیوں کے حق میں رحمۃ للعالمین کے ہاتھوں باعث رحمت وآزادی ثابت ہوا۔ قبیلہ اپنی آزادی حاصل کر کے اور رضاعی بہن شیما خوش وخرم تحائف لے کر قبیلہ کے ساتھ اسی صحرا کو لوٹی جہاں ریت کے ٹیلوں پر وہ اس چاند کو لئے پھرا کرتی تھی جس کے استقبال کے موقع پر یثرت کی لڑکیوں کے لئے ''طلع البدر'' کا گیت مقدر ہو چکا تھا۔

چھ سال کے بعد شرق وغرب کے لامتناہی تصور کو خیر باد کہہ کر یہ امانت ﷺ بیت اللہ کے سائے سے متعارف ہونے کے لئے والدہ محترمہ تک پہنچا دی گئی اور اماں حلیمہ سعیدہ انعام واکرام اور بوجھل سا دل لے کر واپس بنوسعد کے ٹیلوں کو لوٹیں۔

اب تھوڑے سے عرصہ کے بعد آپ ﷺ کو مکہ کی شہری زندگی کی گہما گہمی کو دیکھنے کا موقع ملا ہوگا۔ آپ کا مولد بازار کے بالکل قریب ہے۔ بیت اللہ بھی دور نہیں۔ صحرا کی خاموشیوں کی عادی طبیعت پر شہر کے شور وغل کا کیا اثر پڑا ہوگا۔ یہ وہی سمجھ سکتے ہیں جنہیں عرصہ تک کو صحرا کی زندگی گزارنے کے بعد کسی شہر کے مرکز میں زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑے۔ اس وقت مکہ جزیرۃ العرب کا معاشرتی، تمدنی، دینی اور تجارتی مرکز تھا۔ اس وجہ سے قریش مکہ آسودہ حال بھی تھے اور قبائل میں محترم بھی، اعیان قریش نے مکہ کو باقاعدہ تنظیم

کے ذریعہ منضبط کر رکھا تھا۔ زندگی کے شعبے متعین تھے، ان شعبوں کے سربراہ مقرر تھے۔ افراد قبیلہ کو آزادیٔ رائے اور اس کے بے باکانہ اظہار کے مواقع میسر تھے، مگر انضباط کی حدود کے اندر رہنا ضروری ہوتا تھا۔ شوریٰ کے اجلاس کے لئے دارالندوہ موجود تھا۔ البتہ چند سالوں کے بعد ''حلف الفضول'' کے وجود میں آنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شوریٰ کے فیصلوں میں بھی طاقت اور کمزوری کا عنصر داخل ہو چکا تھا۔ ان باتوں سے طفل شش سالہ کو کوئی سروکار نہ تھا، مگر آپ کا بالآخر ''حلف الفضول'' میں شامل ہونا دور رسالت میں اس کی یاد مسرت سے کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس دور کا عرب عدل انصاف کی پرانی روایات سے ہٹ چکا تھا، ورنہ غریبوں اور کمزوروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ''حلف الفضول'' کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مکہ کی زندگی کو طفل نو وارد نے کچھ اس طرح دیکھا ہوگا جیسے دھند کے غبار کے اس پار کچھ حرکت ہو رہی ہو اور دیکھنے والا محض چند خاکے دیکھنے اور چند آوازیں سننے کے ماسوا کسی طرح کا معلوماتی استفادہ نہ کر سکا ہو اور پھر جلد ہی توجہ کسی دوسری طرف مبذول کر لی ہو۔

ماں بیٹے کی ملاقات کے بعد ماں کو خیال ہوا ہوگا کہ بیٹے نے والد کو تو نہیں دیکھا، والد کے مدفن کو ہی دیکھ لے، اس لئے بی بی آمنہ نے یثرب کا سفر اختیار کیا۔ یثرب کے مسافر کی عمر اب چھ سال ہو چکی تھی۔ اب مشاہدے میں آنے والے مقامات اور واقعات کے خطوط حافظے پر اپنا نقش چھوڑ رہے تھے۔ ننھے محمد اور احمد کو والدہ کا یثرب لے جانا ہمیشہ یاد رہا۔ یہ بھی یاد رہا کہ والدہ نے اس جوان رعنا کا ذکر بھی کیا تھا، جو یثرب کے سفر سے مکہ کو لوٹا تھا۔ یہ بات پختگی سے واضح ہوتی ہے کہ خالق ارض وسما کا فیصلہ تھا کہ اس کے آخری پیغام کا اولین مخاطب اور نسل انسانی کا آخری رہبر وہادی امی رہے، تاکہ وہ دنیوی اثرات سے محفوظ رہ کر خالصۃً اللہ کا پیغام انسانیت تک پہنچائے۔ اس پیغام کو قیامت تک انسانیت کا ساتھ دینا تھا۔ اسے صدیوں تک بدلتے ہوئے زمانوں اور بدلتے ہوئے مقامات کی بدلتی ہوئی

ضروریات کے باوجود غیر متبدل رہنا تھا۔ اس لئے اس پیغام کو کاملاً اللہ کا بھیجا ہوا پیغام ہونا تھا۔ اگر والدہ یا کسی اور بزرگ کی نصیحتیں ارشادات عالیہ علم وخبر کے خزینے رسول آخر الزماں ﷺ کے ذہن پر نقش ہوجاتے تو اللہ کے پیغام کے متاثر ہونے کے امکانات وخدشات تھے۔ اور رسولؐ پیغام ربانی کے لئے ان خدشات سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ وہ یتیم بھی ہو اور ''امی'' بھی ہو۔ والد کا سایہ تو رب کعبہ نے اٹھالیا تھا، مگر ان کا مدفن وہ مقام قرار پایا جہاں خیر البشر ﷺ کو زندگی کے آخری دس سال گزار کر خود بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہیں رونق افروز رہنا تھا۔

یثرب کے سفر اور قیام کے دوران کے واقعات میں آپ کو تیرنا سیکھنا اور یثرب کے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنا آخر عمر تک یاد رہا۔ واپسی کا سفر یتیمی کو مکمل کرنے والا سفر تھا۔ ابوأ کے مقام پر والدہ محترمہ بی بی آمنہ نے انتقال کیا۔ کون جانتا تھا کہ مشیت ایزدی اس کم سن کو کس طرح زندگی سے دوچار کرنا چاہتی ہے۔ آج چودہ سو سال گزرنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے جو خاکہ مرتب کیا تھا اس میں کسی ایسے قلبی وذہنی عنصر کو شامل نہیں کیا گیا تھا جسے ورثہ میں ملی ہوئی تربیت اور تعلیم پر محمول کیا جاسکے۔ والدہ کے سائے کے اٹھ جانے سے اس کمسن کے لئے ایسی کوئی ہستی نہ رہی تھی جسے وہ فطری طور پر تقلید کے قابل قرار دیتا۔ ماں کی ممتا پیار ومحبت، رحم وکرم، لطف واحسان اور بخشش وعطا کی جانب رہبری کرتی ہے۔ ابوأ کے پڑاؤ پر وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ دوسروں پر لطف وکرم کے اسباب سیکھنا تو کجا، جب اللہ کا یہ شاہکار فہم وادراک کی دہلیز تک پہنچا تو خود اس کے لئے مہر ومحبت کا سرچشمہ موجود نہ رہا۔ شاید اس سے یہ مقصود تھا کہ خود اس کے اپنے ذہن پر کسی بشر کی کرم فرمائیوں کے نقش نہ ابھر سکیں اور اس کے تمام فضل وکرم، اس کی جود وسخا اور بخشش وعطا اللہ کی دین ہو۔ جب نصف صدی اور تین سال بعد حرم کعبہ کے صحن میں بیٹھے ہوئے سرداران قریش اور اہالیان مکہ کو مخاطب کر کے آپ نے فرمایا تھا۔ ''**لا تثریب علیکم الیوم**'' اور

آپ اپنے اور اپنے ساتھیوں پر کئے گئے تمام مظالم اور ان کی یاد کو ذہن کی سطح سے محو کر دیا تھا، تو وہ اللہ کی عطا کردہ ''رحمت عالم'' کی صفت کا نتیجہ تھا، نہ کسی بزرگ کی صحبت میں حاصل کردہ خصوصیت کا پرتو۔ یہ تو اس خلق عظیم کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا، جو خیر البشر کو ''**وانک لعلیٰ خلق عظیم**''. کہہ کے خالق کائنات نے یہ اشارہ کیا کہ اس بلند مرتبہ پر قائم کرنے والا وہ خود ہے۔ یہ وہ مقام عزت واحترام ہے جہاں رب العزت کے بغیر کوئی ہستی نہیں پہنچا سکتی اور نہ کوئی اس کی جانب رہنمائی کرسکتا ہے۔ یہ انسانوں کے اپنے رہنماؤں کے وعظ ونصیحت یا رشد وہدایت کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو ان گزشتہ چودہ صدیوں میں مثال موجود ہونے کی بناء پر اس سے ہدایت حاصل کر کے کوئی ایک انسان تو اس مقام کے قریب پہنچ سکتا۔ ''امی'' پیغمبر کا یہ خلق عظیم، آپ کا رحمت عالم ہونا، آپ کے ہر عمل کا شفقت ومحبت سے لبریز ہونا، اس رحمان ورحیم کا انعام تھا۔ جس کا قیامت تک آنے والی نسلوں کے ہر فرد کے لئے ایک مثال قائم کرنا تھی اور پھر اس کا مثال وجود میں نہیں لانا تھا۔ اس لئے کہ اب ذہن انسانی سن بلوغت کو پہنچ چکا تھا اور آئندہ صرف اور صرف اس مثال کی روشنی میں انسانی زندگی کو مرتب کیا جانا تھا۔

پڑاؤ کی مسافرانہ زندگی، قافلہ اور قافلہ والوں کی بے ترتیب اور پر ہیجان زندگی، ہر چہار سو ریت کے ٹیلے اور دور نیلگوں بے آب وگیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ اور عین غربت میں دنیا کے واحد سہارے کا اٹھ جانا۔ چھ سال کے کمسن محمد واحمد کے دل کی کیفیت تصور سے بالاتر ہے۔ وہ بچہ جو والد کی شفقت سے روز اول سے محروم رہا تھا جس نے بادیہ نشینوں کے خیموں کے سوا کوئی دوسرا مسکن زیادہ عرصہ کے لئے نہیں دیکھا تھا اور پھر اس ماحول سے بھی علیحدگی ہوگئی تھی۔ اس نے ایک پڑاؤ کی بستی میں واحد سہارے سے جدا ہوکر اپنی والدہ کی کنیز سے کیا کیا سوال کئے یا نہ کئے ہوں گے۔ اماں جان کو کیا ہوا ہے؟ کل تو بول رہی تھیں۔ آج کیوں نہیں بات کرتیں؟ لوگ انہیں کہاں لے جارہے ہیں؟ وہ کب واپس

آئیں گی۔ہم مکہ جائیں گے؟ وہ سفر تو سپہ سالار افواج مدینۃ النبیؐ کے لئے مقدر ہو چکا تھا ہاں، اگر یہ سب حادثات وواقعات ان سفروں کی تیاری کی بنیاد تھی، جو فخر انسانیت ﷺ کو پیش آنے تھے، کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس فرض شناس کنیز کو طفلی تسلیاں دینے کی ضرورت پیش آئی یا عین محفل میں بھی تنہائی کے عادی بچے نے غم کے اس کوہ گراں کو بھی معمول کے مطابق حادثہ سمجھ کر کچھ پوچھنے یا سننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر ام ایمن نے کن الفاظ میں حضرت آمنہ کے آخری الفاظ حضرت عبدالمطلب تک پہنچائے اور بی بی آمنہ کی یہ عظیم امانت کس طرح ان کے سپرد کی ہوگی۔ یہ تخیل اور تصور کا حصہ ہے جسے الفاظ کا جامہ پہنا کر قلم کا ورثہ نہیں بنایا جاسکتا۔اب آپ کی کفالت معمر دادا عبدالمطلب کے حصہ میں آئی۔ یہ وہی عبدالمطلب ہیں جن کو چاہ زمزم کو معلوم کرنے اور دوبارہ کھدوانے کی سعادت نصیب ہوئی۔آپ کے ذمہ حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات بھی تھیں۔ دادا نے ننھے یتیم پوتے کے ساتھ جی بھر کر پیار کیا ہوگا۔ کعبہ کے سائے میں گلیم عبدالمطلب پر بیٹھنے کی ہمت ان کے بیٹے نہ کر سکتے تھے، مگر محمد احمد نام پانے والا یتیم پوتا بھی بیت اللہ جاتا دادا کی گلیم پر ہی متمکن ہوتا اور دادا جب آتے تو اسے پیار سے گود میں بٹھا لیتے۔

اللہ نے اپنے آخری نبی ﷺ کے لئے جو تربیت مقرر کی تھی اس میں کسی بزرگ کی بزرگی، اس کا عام لوگوں سے ملنا جلنا، اس کا کاروبار روزمرہ میں رعب ودبدبہ اور اس کے اصول زندگی کا دخل نہیں ہوسکتا تھا۔ مبادا کہیں اس بزرگ کی صفات کی جھلک یا اس کا رنگ اس اللہ کے فرستادہ ہادی نسل انسانی کی طبیعت میں گھر نہ کر جائے، تاکہ اس کا خلق عظیم، اس کا جلال وجبروت، اس کی سپہ سالاری، اس کا عدل وانصاف اور اس مملکت، ریاست اور حکومت کے معاملات کو حل کرنا، مکمل طور پر وحی کی عطا کردہ بصیرت پر منحصر ہو۔ یہی وجہ نظر آتی ہے کہ مدینہ سے لوٹ کر آنے کے جلد بعد جب حضور اقدس کا سن بمشکل آٹھ سال کا ہوا تھا تو دادا نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔

دادا نے بستر مرگ پر فیصلہ فرمایا تھا کہ آپ ﷺ کی نگہداشت، آپ کے چچا حضرت ابوطالب کریں گے۔ ابوطالب کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی، مگر انہوں نے آپ کو انتہائی پیار اور شفقت سے رکھا۔ یہ وہ دور ہے جب آپ ﷺ نے گلہ بانی کے فرائض بھی انجام دئے۔ ان بھیڑ بکریوں میں دوسروں کے جانور بھی شامل ہوتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ امانت کی نگہداشت کا آغاز کمسنی میں ہی ہوگیا تھا۔ امانت ودیانت کا یہ معیار بعدازاں تجارت میں بھی جاری رہا۔ حتیٰ کہ ''امی یتیم'' کو ''امین'' کا لقب اس معاشرے نے دیا جس میں صاف گوئی، آزادئ رائے اور بے خوف تنقید کو معمول سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح آپ ﷺ کے اجرت پر بھیڑ بکریا چرانے سے ابوطالب کو ضروریات روزمرہ اور گھر کے اخراجات کے سلسلہ میں دشواریوں سے کسی حد تک نجات حاصل ہوگئی۔

ڈھائی، تین سال بعد جب آپ کی عمر بارہ سال کی تھی تو آپ نے حضرت ابوطالب کے ہمراہ تجارت کی غرض سے شام کا سفر کیا۔ قریش مکہ جاڑوں میں جنوب کی جانب اور گرمیوں میں شمال کی جانب تجارتی قافلے روانہ کیا کرتے تھے۔ جو لوگ خود نہیں جاسکتے تھے وہ دوسروں کو اپنا مال دے کر روانہ کرتے اور متفقہ فیصلہ کے مطابق منافع میں شراکت یا اجرت کے اصول پر کام کیا جاتا۔ شام اس وقت بازنطینی حکومت کے تسلط میں تھا۔ بازنطینی حکومت اس وقت ایشیا اور افریقہ کی سب سے طاقتور حکومت سمجھی جاتی تھی۔ شام کے سفر میں عام معلومات میں اضافہ ضرور ہوا ہوگا۔ مگر بازنطینی مقبوضات کی اخلاقی اور دینی سطح اس قدر گر چکی تھی کہ اس سفر کے دوران بارہ سال کا نوجوان معاشرتی ومعاشی امور کسی مکتب فکر فلسفہ یا دین کے پیچیدہ مسائل کسی فیلسوف یا راہب سے نہیں سیکھ سکتا تھا۔ بحیرہ راہب کا قصہ یوں بھی قابل توجہ نہیں، البتہ اس سے مستشرقین نے جو دوراز کار نتائج نکال کر اسلام کی تعلیمات کو ایک راہب کی سرسری ملاقات پر مبذول کیا ہے، اہل مغرب کی فطرت کو ظاہر کرنے کے علاوہ اس کا کوئی مقام نہیں۔

سن بلوغت کے بعد آپ ﷺ نے ضرور ایسے سفر اختیار کئے ہوں گے اور لامحالہ تجارت میں حصہ لیا ہوگا۔ اس لئے کہ ''امین'' کا لقب معاملات کی حسن کارکردگی پر ہی مبنی ہوگا۔ اسی طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا آپ ﷺ کو مختار کل کے طور پر اپنے سامان تجارت کے ساتھ روانہ کرنا ماقبل کے تجربہ اور امانت و دیانت میں معروف ہونے کی بنا پر کیا گیا ہوگا۔ یہ کہنا کہ یہ سفر یا گھر کے اخراجات کے لئے اجرت پر بکریاں چرانے کا تجربہ مابعد کی نبوت کا باعث بنا۔ اس قدر غیر منطقی استدلال ہے کہ اس پر غور کرنا ہی تضیع اوقات ہے۔ ایسے تجربے جہانگیر و جہانبانی کی بنیاد قرار نہیں دئے جاسکتے۔ نبوت و رسالت تو خالصتاً اللہ کی دین ہے۔ اکمل و کامل دین جس نے قیامت تک کے لئے درست نظام حیات کا مقام قائم رکھنا ہے، وہ بکریاں چرانے اور چند تجارتی سفر اختیار کرنے کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ یہ فرائض اور ان کی کما حقہ انجام دہی اور صبر و استقلال اور تدبیر و تفکر کی عادت کے موجب بن سکتے ہیں، مگر ایک مکمل دین کے جزئیات کامل اور ایک امت کی ہر شعبہ میں ہدایت و دستگیری کرنے کی صلاحیتیں بکریاں چرانے کا نتیجہ نہیں ہوسکتیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ باپ، ماں اور دادا کی رہبری سے محروم رکھا جانے والا کمسن بچہ جب شہری زندگی کی کفالت کے ذرائع پیدا نہ کرسکا تو بکریاں چرانے کی وجہ سے اس کے ''امی'' رہنے کی مدت اور کیفیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

یہ انسان اور اس کے گرد کی کائنات علیم و خبیر اور سننے، دیکھنے اور جاننے والے الہ العالمین کی تخلیق ہے۔ یہ نہ از خود وجود میں آئی ہے اور نہ ہی اسے کھیل تماشے کی غرض یا غلط مقصد کے لئے وجود میں لایا گیا ہے اور نہ ہی اس کائنات کو کسی غلط مقصد یا محض بے کار سی شے بنایا گیا۔ اس کائنات کی تخلیق کا بہت بڑا مقصد تھا۔ اس کے اندر الہ العالمین نے بے انداز قوتیں داخل کی تھیں اور پھر ان قوتوں کے عمل اور ردعمل کے نتیجہ میں اس کائنات کے ذرہ برابر کرۂ ارضی پر پانی کو وجود میں لایا اور پانی کو بلند مقام دیا گیا، جو کسی اور شے کو نہیں بخشا گیا تھا۔ خالق العالمین نے اپنا عرش اس پر قائم کیا، پانی کو ایک اور اہم خاصیت بخشی،

اس کے ذریعہ ہر زندہ شے کو پیدا کیا۔

اور پھر جب اس کرۂ ارضی پر ہر شے کا وجود آ گیا، جو خالق العالمین کے شاہکار کے رشتہ جسم و جاں کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھی، تو پھر اپنی اس متوازن ترین ہستی کو اپنا نائب بنا کر اس کرۂ ارضی پر اتارا۔ (البقرہ: ۲، ۳۰) گو اسے مٹی سے بنایا گیا تھا، مگر اس کے بننے سنورنے میں کوئی کمی روا نہیں رکھی گئی تھی، پھر فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اسے سجدہ کرو۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا بشر خاکی کے اندر اپنی روح کا پھونکنا عین درست تھا۔ اس لئے کہ اسے اپنا نائب بنا کر اس کرۂ ارض پر بھیجا جا رہا تھا اور یہ روح امر ربی کا نتیجہ ہے۔ اس کو سمجھنا اور اس کی انتہائے قوت کا پتہ لگانا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق الہ العالمین سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی قوتوں، یعنی اس کی صفات کا اندازہ لگانے کے یہ معنی ہیں کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے اور جس طرح ان تمام سیاروں ستاروں، تمام برقی اور مافوق البرقی رووں کا عمل اور ردعمل ہوتا ہے اس پر عبور پا لینے سے خالق کائنات کی قدرت، قوت اور اس کی صفات کا علم وسیع تر ہے۔ اگر اس کرۂ ارض کے تمام سمندروں کا پانی روشنائی بنالیا جائے اور اس کے تمام درختوں سے قلم تراش لئے جائیں تب بھی اس کی قدرت کے اوصاف گنائے نہیں جاسکتے۔

اس مٹی سے بنے ہوئے انسان کو باقی مخلوق پر ایک فوقیت بھی بخشی۔ اسے روز اول سے علم الاشیاء عطا فرمایا۔ یہ علم دے کر اسے اس کرۂ ارض پر بطور خلیفہ متمکن کیا اور پھر اسے بات سے بھی آگاہ کیا گیا کہ گو تمہاری خلافت کرۂ ارض کے لئے ہے، مگر اس کے باوجود میں نے ارض و سماء کی ہر شے تمہارے لئے مسخر کی ہے۔ اب انہیں استعمال کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لئے تمہیں ان کی خاصیتیں معلوم کر کے انہیں اپنے قبضے میں لانا ہوگا۔

اس کرۂ ارضی پر انسان کی زندگی لاتعداد مدوجزر سے گزری ہے۔ شروع کے ایام میں ایک ہی ملت بن کر زندگی گزارتا رہا، مگر جوں جوں اس کے علم میں ترقی ہوتی رہی بعض انسان علم کی موجودگی کے باوجود گمراہی میں مبتلا ہوتے رہے اور آپس کے اختلافات کی خلیج

وسیع کرتے رہے۔ یوں کہیے کہ جب اللہ کی جانب سے علم حاصل ہوجاتا ہے تو پھر علم کے اس غرور کی وجہ سے عجیب وغریب تاویلات کے ذریعہ آپس میں اختلافات شروع کردیتے ہیں۔ اہل کتاب علماء نے بھی اسی طرح کیا اور یوں انسانیت گروہوں، فرقوں اور حلقوں میں بٹتی گئی درست کہ اگر اللہ چاہتا تو انسان ایک ہی امت بنے رہتے۔ مگر مشیت ایزدی کو انسان کی بھلائی میں اس کی اپنی کوشش اور اپنا اختیار استعمال کرنا مقصود تھا۔ اس لئے کہ انسان کو جب روز اول علم الاشیاء بخشا گیا تھا اور کائنات کی جملہ اشیاء اس کے لئے مسخر کی گئی تھیں تو مقصود یہ تھا کہ یہ خاک کا پتلا جہاں کہیں بھی ہو اپنے خداداد علم کے ذریعہ خود تسخیر کائنات پر قدرت حاصل کرکے خلیفۃ اللہ فی الارض کے مقام کی ذمہ داریوں کو مکمل طور پر نباہ سکے۔ اس کے علم میں اور اس کے علم حاصل کرنے کی صلاحیت میں ہر دور میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جوں جوں انسانی ذہن ترقی کرتا رہا اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فرستادہ پیغامبروں کے ذریعہ اس کے علم میں اضافہ کرتا رہا۔ کبھی قبائلی سطح پر، کبھی جغرافیائی حدود کے اندر اور کبھی قبیلہ وجغرافیہ دونوں پر مشتمل انسانی گروہوں تک ہدایت بھی کی جاتی رہی۔ انسانوں کا مختلف ادیان میں بٹ جانا اس وجہ سے بھی تھا، مگر بالآخر انسانیت کو ایک ہی دین پر قائم ہوکر تسخیر کائنات کے ازازل مقرر شدہ منتہی مقصود کی جانب سفر اختیار کرنا تھا۔ انسانی سفر کی یہ آخری کڑی ہوتی تھی اور اس آخری مدت سفر کے لئے آخری پیغام اور آخری ہدایت کا آنا ضروری تھی۔ اس آخری پیغام کو عالم انسانی کا مشترکہ دین ہونا تھا۔ یعنی اس کا ہر دور میں ہر مقام کے لئے موزوں ہونا ضروری تھا۔ اس طرح کا زمان ومکان سے بلند تر نظام حیات صرف خالق کائنات ہی مرتب کرکے انسانوں تک پہنچا سکتا تھا جس پیغام کو قیامت تک کے لئے ہر دور میں اور ہر مقام پر قابل عمل ہونا تھا اس میں اصول بھی ضروری تھے اور جزئیات کا ہونا بھی لازمی تھا۔ اس میں اشارات وکنایات، تشبیہ وتمثیل بھی ہونا تھا اور اس میں بعض پہلوؤں پر باریکیوں اور تفاصیل کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اس قدر تنوع، اس قدر

ٹھہراؤ، اس ضرورت کے لئے استدلال اور براہین، اس قدر وسیع میدان اور اتنی طویل مدت کے بدلتے ہوئے حالات کی ضروریات کو ایک ہی کتاب میں سمو دینا صرف اور صرف خالق انسان ہی کرسکتا تھا اور جب اس کی نظر میں انسانی ذہن اتنے گہرے اور دقیق پیغام کو سمجھنے کے قابل ہوگیا تو پھر اس نے اس پیغام کو اس انسان ﷺ کے ذریعہ قیامت تک پیدا ہونے والی انسانیت کی جانب روانہ کیا اور واضح الفاظ میں اس سید البشر کو مخاطب کرکے فرمایا:

(ترجمہ) اور (اے محمدؐ) ہم نے تمہیں تمام انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (سبا:۳۴-۲۸)

اس پیغام کو گو قیامت تک کے لئے قائم اور قابل عمل رہنا تھا، مگر مکمل طور پر عمل کرکے مثال پیش کرنے کی ذمہ داری صرف ایک انسان کو دی گئی۔ اس ایک انسان نے عام شہری، تاجر، پڑوسی، معاشرے کا باعزت انسان امانتوں کا بار اٹھانے والا، مصلح، ہدایت دینے والا، خطیب، سپاہی، سپہ سالار اور حکمراں بن کر عملاً مثال قائم کرنا تھی، کہ زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف مقامات پر زندگی کو کس طرح گزارنا ہے۔ قرآن خالق کائنات کا کلام ہے، مگر اس پر عمل انسانوں کو مختلف ادوار میں مختلف جغرافیائی پابندیوں کے تحت کرنا ہے۔ دائمی پیغام کو حدود بشریت کے اندر رہ کر زندگی کی ایک ہی مدت میں اس مکمل طور پر پیغام پر عمل کرنا تھا، کیونکہ اس عمل کے مطابق رہتی دنیا تک پوری انسانیت کو عمل پیرا ہونا تھا۔ اس لئے اگر انسان میں کوئی معجزہ رونما ہوا ہے تو وہ یہ مکمل زندگی ہے جس نے اللہ کے عطا کردہ مکمل پیغام کے مطابق عمل کیا ہے اور اس واحد انسان کی اس واحد زندگی کو نمونہ بن کر انسانیت کو تسخیر کائنات کی منزل تک لے جانا ہے۔ یوں محسوس ہوتا کہ ''کن'' کے لمحہ جب کائنات وجود میں آئی اور اس کائنات کے مختلف حصوں کے عمل اور ردعمل کے نتیجے میں اس کرۂ ارضی کو حیات انسانی کے قابل بنایا، تو خالق کائنات کی نگاہوں میں پورا خاکہ موجود تھا اس حیات کو

لاتعداد رہنماؤں کے ذریعہ اس مقام تک لایا گیا جہاں وہ لافانی نظام حیات کے مطابق زندگی گزار کر اس کائنات کو مسخر کرنے کی مہم پر چل کھڑا ہو، مگر اس لافانی نظام حیات کے لئے ایک ہی مثال پیش کی۔ اس لئے کہ اس مثال کو تیار کرنے میں صدیاں گزارنی تھیں اور اسے بچپن سے بعثت تک بیرونی اثرات سے محفوظ رکھ کر صرف اپنے لافانی پیغام پر عمل کرنے کے قابل بنانا تھا، اگر اس لافانی انسان نے کسی استاد کسی رہبر یا کسی ہادی سے سبق حاصل کئے ہوتے تو پھر وہ اللہ کے نازل کردہ پیغام کے مطابق بے آمیزش زندگی نہ گزار سکتا اور اس کا ہر قول، ہر فعل اور ہر ردعمل اللہ کی جانب سے قابل اطاعت نہ ہوتا۔ قیامت کے لئے رہنے والے احکام کے دوران ''**اطیعوا الرسول**'' کا بار بار اعادہ اس بات کو پختہ کرتا ہے کہ اللہ کے آخری رسولؐ پر رسالت کے سلسلہ ختم کرنے کے معنی یہی ہیں کہ اب انسانیت ایک ہی نظام پر عمل کرتی اور آئندہ ادیان میں بٹنا بند ہو جائے، ورنہ علم آدم الاسماء سے لے کر ''اقراء'' تک جو ترقی ذہن انسانی کی تھی وہ رائیگاں جاتی، ختم رسالت کا اصول انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک ہونے کی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ صرف قرآن ہی نہیں، بلکہ سیرت کا ایک ہونا بالآخر انسانیت کا ایک ہی پیغام پر عمل پیرا ہونا یقینی بناتا ہے۔

جب تک عالم انسانی کی انتہائی اور آخری منزل، یعنی تسخیر کائنات پر نگاہ نہ رکھی جائے اور اللہ کے آخری پیغام کی اس منزل کی جانب رہبری کو نہ دیکھا جائے اس وقت تک یہ راز سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور سرور کونین خاتم الرسل، سید البشیر ﷺ کیوں اپنے بچپن کے دوران والد، والدہ، دادا اور کسی استاد و رہبر یا ہادی و مرشد سے استفادہ کرنے سے خود اللہ کی جانب سے دور رکھے گئے اور ان معنوں میں ''امی'' رکھے گئے کہ خود خالق کائنات آپ کو ''امی'' کہہ کے پکارنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ یعنی اس ہستی کو ''امی'' رکھا جس کو وجود میں لانے کے لئے اور جسے قیامت تک کے لئے مثال بنانے کے لئے صدہا صدیوں پر حاوی ایک آفاقی نظام قائم کیا اور پھر خود ہی فرمایا: ''**لولاک لما خلقت الافلاک**''.

رسول اللہ ﷺ اور طبقۂ نسواں

● بیگم خدیجۃ النساء ایم سراج، سنگاپور

کسی قوم کی تہذیب و تمدن اور ترقی کا حال معلوم کرنا ہو تو یہ دیکھو کہ اس کے معاشرے میں عورت کا درجہ کیا ہے۔ بہترین معیار یہی ہے، جس زمانے میں رسول اللہؐ خداوند تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لئے مبعوث ہوئے، عورت ساری دنیا میں محکوم تھی اور کمترین سمجھی جاتی تھیں، وہ بہت سے قانونی حقوق سے محروم تھی۔ بہت وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت جب مذاہب و قوانین کا دور دورہ تھا ان کی رو سے عورت مردوں کی اس قدر محکوم تھی کہ مذہبی امور تک میں حصہ لینا اس کے لئے ممنوع تھا۔ عورت ان کے نزدیک سرچشمۂ گناہ تھی۔ عرب کی عورتوں کا حال بھی دوسرے ملکوں کی عورتوں سے کچھ بہتر نہ تھا، بلکہ مقابلۃً بدتر ہی تھی۔ اس کی حیثیت اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھی کہ وہ مردوں کی تسکین ہوس کا ایک ذریعہ تھی، اس کا کام صرف یہ تھا کہ قبیلے کی عزت کو محفوظ رکھنے کے لئے جفاکش سپاہی پیدا کرتی رہے۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا رواج بھی مفاخرت کے اسی جھوٹے تصور کا پیدا کردہ تھا۔ زناکاری پر بے حیائی کے ساتھ عمل تھا۔ ان گنت بیویاں رکھنا بھی عام تھا اور اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ عورت کو حقوق مطلقاً حاصل نہ تھے۔ وہ کسی جائیداد کی وارث تک نہ ہو سکتی تھی، بلکہ وہ خود بھی جائیداد کا ایک حصہ تھی کہ جب اس کا شوہر مر جاتا تو وہ شوہر کے بیٹے اور جانشین کے حصہ میں جائیداد کی طرح منتقل ہو جاتی اور وہ اس کی مرضی کے خلاف اپنی بیوی بنا لینے کا حق دار سمجھا جاتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ جو خداوند تعالیٰ کی جانب سے آپؐ نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ جو خداوند تعالیٰ کی جانب سے آپ ﷺ نے انسانیت کو پہنچائیں، ان تمام باتوں کا یکسر خاتمہ کر دیا اور اس طرح سے بدقماشی اور ناپاکی کا خاتمہ ہوا۔ قرآن حکیم نے واضح طور سے اعلان کیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ''نفس واحدہ'' سے پیدا کئے گئے ہیں۔

(اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس نے جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائی اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو، جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں)۔ (سورہ النساء:۱)

اور اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے تمہارے لئے بیویاں بنائیں اور پھر ان بیویوں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور تم کو اپنی اچھی چیزیں کھانے (پینے) کو دیں، کیا پھر بھی بے بنیاد چیز پر ایمان رکھو گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے رہو گے۔ (النحل:۷۲)

خداوند تعالیٰ کی نظر میں عورت اور مرد قطعی مساوی سطح پر ہیں، نیکوکاری کے معاملہ میں بھی اور اس کی جزا اور انعام کے معاملہ میں بھی قرآن حکیم میں اس پر بار بار زور دیا گیا ہے۔

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو، ہم اس شخص کو (دنیا میں) خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے (اور) وہاں بے حساب ان کو لطف ملے گا۔ (المومن:۴۰)

اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ (النساء:۱۲۴)

بیشک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان

لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اپنی شرمگاہوں کی حفاظ کرنے والی مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ (احزاب:۳۵)

سو منظور کر لیا ان کی درخواست کو ان کے رب نے اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کرنے والا ہوا کارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو۔ سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دی گئیں میری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہو گئے میں ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دوں گا اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں ہوں گی۔ یہ عوض ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔ (آل عمران:۱۹۵)

اسلام کے مذہبی فرائض عورتوں اور مردوں دونوں پر یکساں عائد ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے تو احکام میں عورتوں کو رعایت بھی دی ہے اور بعض ایسے فرائض سے ان کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جن کی بجا آوری مردوں پر لازمی ہے۔ مسلمان عورت ''ایام'' کے زمانے میں نماز اور روزے سے مستثنیٰ ہے۔ عیدگاہ جانا یا جمعہ کی نماز کے لئے مسجدوں میں پہنچنا بھی اس کے لئے ضروری نہیں ہے اور اگر جانا چاہے تو ممانعت بھی نہیں۔

ہمیں قرآن حکیم نے یہ تعلیم دی ہے کہ جنت سے ہبوطِ آدم کی ذمہ دار تنہا حوا نہیں تھیں، بلکہ آدم اور حوّا دونوں شیطان کے فریب میں یکساں آ گئے تھے، اس لئے مورد الزام بھی دونوں یکساں ٹھہرے۔

اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم! رہا کرو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں، پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے ورنہ تم بھی انہیں میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ پھر لغزش دے دی آدم اور حوّا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو برطرف کر کے رہا، ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر چندے ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معین تک۔ (البقرہ:۳۶)

رسول اللہ ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ عورت شیطان کا آلہ کار نہیں اس کے برعکس شیطان (کی یورش) کے خلاف وہ ایک مضبوط قلعہ ہے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ فرما کر تو عورت کو انتہائی اعزاز کا مرتبہ عطا کیا کہ ''جنت ماں کے قدوں تلے ہے۔''

روایت ہے کہ جب ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ سب سے زیادہ واجب الاحترام اور حقدار کون ہے، جس کی خدمت نیکی اور حصول ثواب کی نیت سے کی جائے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری ماں۔'' صحابی نے پوچھا: ''ماں کے بعد؟'' رسول اللہ ﷺ نے پھر یہی فرمایا کہ ''تمہاری ماں'' حتیٰ کہ تیسری مرتبہ کے بعد چوتھی بار جب صحابی نے یہی سوال کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا باپ'' اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماں کی حیثیت بیٹوں اور بیٹیوں کی نظر میں باپ سے تین گنی زیادہ ہونی چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ نے نکاح کا معیار بھی بلند کر دیا اور اپنے پیروؤں کو اس کی تاکید کی، فرمایا کہ ''نکاح میری سنت ہے اور دوسری جگہ فرمایا جو شخص میری سنت سے منحرف ہو، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ (یعنی میرا پیرو نہیں ہے)'' اور پھر یہ بھی فرمایا کہ ''جس نے نکاح کر لیا اس نے نصف مذہب کی تکمیل کر لی۔''

نکاح کی مثال غایت کو اور بیوی کے مرتبے کو رفعت بخشی گئی۔ قرآن حکیم فرماتا ہے:

''اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں، تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو فکر سے کام لیتے ہیں۔'' (الروم:۲۱)

رسول اللہ ﷺ نے بیویوں کی محبت اور احترام کی بار بار تاکید کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ''تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں سے بہتر سلوک کرتے ہیں۔''

اور فرمایا: ''ایک مسلمان اپنی بیوی کے حق میں جتنا رحم دل اور مہذب ہوگا اتنا ہی وہ اپنے ایمان میں کامل ہوگا۔''

پھر یہ بھی فرمایا کہ: ''کسی مسلمان کو اپنی بیوی سے نفرت ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔''

پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے یادگار خطبہ ''حجۃ الوداع'' میں بڑی تفصیل سے عورتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور خاص طور پر یہ کہا کہ:

''اپنی بیویوں سے شفقت اور محبت کا سلوک کرو۔ تم نے اللہ کی ضمانت پر ان کو اپنے لئے حلال کیا ہے، ان کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور ان سے بہتر سلوک کرو۔''

لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا وہ رواج جو اسلام سے پہلے تھا اس کی سخت مذمت کی گئی اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو لڑکوں سے زیادہ چاہیں۔ قرآن حکیم میں ہے کہ:

''قیامت کے دن وہ لڑکیاں جن کو زندہ دفن کیا گیا تھا اپنے قاتلوں کے خلاف گواہی دیں گی۔ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ کس جرم میں قتل کی گئی تھیں۔'' (التکویر:۸،۹)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اور اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشے سے قتل مت کرو، کیونکہ ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، بیشک ان کا قتل کرنا بھاری گناہ ہے۔ (بنی اسرائیل:۳۱)

رسول اللہ ﷺ نے بیٹیوں سے ترجیحی سلوک کی ہدایت فرمائی اور کہا کہ:

''جب تم اپنے بچوں میں تقسیم کرنے کے لئے کچھ لاؤ تو بیٹیوں سے شروع کرو کیونکہ

بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیاں اپنے والدین سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔''

یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''جس کے کوئی لڑکی ہے اور اس نے زندہ دفن اس کو نہیں کیا، نہ غیر منصفانہ سلوک اس کے ساتھ کیا، نہ لڑکوں کو اس پر ترجیح دی، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرائے گا۔''

ظہور اسلام سے پہلے قانون نے مرد سے علاحدہ عورت کی کوئی آزاد حیثیت نہ دی تھی، مگر اسلام نے اس کو مردوں کی طرح قانون اور معاملات میں مساوی حقوق عطا کیے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین حیض تک اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کیا ہو (حمل یا حیض) اس کو چھپائیں، اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم قیامت پر یقین رکھتی ہیں اور ان عورتوں کے شوہر ان کے (بلاتجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں۔ اس عدت کے اندر بشرطیکہ اصلاح کا قصد رکھتے ہوں اور عورتوں کے لئے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے جو عورتوں پر ہیں قاعدہ (شرعی) کے موافق اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست حاکم اور حکیم ہیں۔ (البقرہ: ۲۲۸)

رسول اللہ ﷺ نے تاکید کی کہ:

''طلب علم ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔''

مغربی قوانین نے شادی شدہ عورت کو ذاتی املاک خریدنے اور بیچنے کا حق جواب دیا ہے، اسلام نے یہ آزاد حیثیت بہت پہلے عطا کی ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

''**ولا تتمنوا ما فضل الله بعضكم على بعض**'' (اور تم کسی ایسے امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے۔ مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ سے

اس کے فضل کی درخواست کیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں)۔ (النساء: ۳۲)

''پیرے کرابائٹس'' نے جو مصر کی مخلوط ٹریبونل کا سابق امریکی جج تھا اپنے ایک مقابلہ میں جس کا عنوان ہے ''محمد ﷺ نے عورت کے لئے کیا کیا'' یہ اعتراف کیا ہے کہ حقوقِ نسواں کے سلسلہ میں محمد ﷺ کا شاندار کارنامہ وہ حق ملکیت ہے جو انہوں نے اپنی امت کی بیویوں کو عطا کیا۔ قانونی درجہ عورت کا بالکل وہی ہے جو اس کے شوہر کا ہے۔ جہاں تک ایک مسلمان بیوی کے حق ملکیت کا تعلق ہے، اس کو وہی آزادی حاصل ہے جو کسی پرندے کو پرواز کی حاصل ہے۔ قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ عورت اپنے شوہر کی رائے لئے بغیر اپنے مال ومتاع کو جس طرح چاہے صرف کرے یا ٹھکانے لگا دے۔

قرآن حکیم کی بعض آیات اور احادیث نبوی کی تعبیر بعض اوقات اس طرح بھی کی گئی ہے جس سے مساوات کا انکار ہوتا ہے اور مردوں کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے، لیکن گہرا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ بظاہر کتنی ہی غیر مساوی صورت نظر آئے۔ درحقیقت اسلام نے عورت کے مکمل حقوق کی ضمانت دی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ:

اور عورتوں کے لئے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو عورتوں پر ہیں قاعدہ (شرعی) کے موافق اور مردوں کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے۔ (البقرہ: ۲۲۸)

یہ فرق جو دونوں صنفوں میں ہے، وہ ان کے حقوق کے بنیادی اختلاف کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ تو اس فرق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو معاشی مرتبے میں ان کے درمیان تھا۔ عملی طور پر عورت کو وہ سماجی مواقع حاصل نہیں جو مردوں کو تجربات، اختراعات اور معلومات عامہ کے سلسلے میں حاصل ہیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ معاشی طور پر عورتوں کا انحصار مردوں پر ہے اور یہی وہ پہلو ہے جو مردوں کو ایک طرح کی برتری اور ذمہ داری عطا کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے کہ:

''مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت

دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں، سو جو عورتیں نیک ہیں، اطاعت کرتی ہیں، مردوں کی عدم موجودگی میں بحفاظت اپنی نگہداشت کرتی ہیں اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بددماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو لیٹنے کی جگہ میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر بہانہ مت ڈھونڈو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے رفعت اور عظمت والے ہیں۔'' (النساء:۳۴)

اس آیت میں جو لفظ ''قوامون'' ہے اس سے مراد سرپرستی، نگہداشت اور اعانت وکفالت کا فریضہ ہے۔ یہ آیت اس شخص کا تذکرہ کر رہی ہے جو کسی دوسرے مشغلے میں پوری طرح لگا ہوا ہو، اپنے مفادات کا تحفظ کر رہا ہو اور اپنے معاملات کی دیکھ بھال میں مصروف ہو، یہی لفظ دوسری جگہ قرآن حکیم میں یوں استعمال ہوا ہے کہ:

اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے والے، اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو اور اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔ وہ شخص اگر امیر ہے تو اور غریب ہے تو دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے، سو تم خواہش نفس کی اتباع مت کرو، کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ اور اگر تم کج بیانی کرو گے یا پہلوتہی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کو پوری خبر رکھتے ہیں۔ (النساء:۱۳۵)

چنانچہ قرآن حکیم کی ان آیتوں میں مردوں کو عورتوں کے حقوق پامال کرنے کے بجائے ایک ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ایک فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کے محافظ رہیں، حتیٰ کہ مردوں کے مفادات کے خلاف بھی، تاکہ عورتوں کے لئے مراعات اور انصاف کی ضمانت ہو۔ یہ ہے قوامون کا مفہوم۔

وراثت کے سلسلہ میں اسلامی شریعت کا یہ قانون ہے کہ عورتوں کا حصہ مردوں کے مقابلہ میں نصف ہے۔ مثلاً قرآن حکیم کی یہ آیت دیکھئے:

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ تمہاری اولاد کے باب میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے

حصے کے برابر اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں، گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو مورث چھوڑ کر مرا ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا اور ماں باپ کے لئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے میت کے ترکے میں چھٹا حصہ ہے اگر میت کے کچھ اولاد ہو، اگر اس میت کے کوئی بھی اولاد نہ ہو تو اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہیں، تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا (اور باقی باپ کو ملے گا) وصیت نکال لینے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جاوے یا دین کے بعد تمہارے اصول وفروغ جو ہیں تم پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں سے کون سا شخص تم کو نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے۔ یہ حکم منجاب اللہ مقرر کر دیا گیا۔ بالیقین اللہ تعالیٰ بڑے علم اور حکمت والے ہیں۔ (النساء:۱۱)

عورتوں کی اس قانونی حصہ داری میں بظاہر جو عدم مساوات سی نظر آتی ہے اس کی تشریح علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے یوں کی ہے:

لڑکی کا یہ حصہ اس کی کسی فطری کمتری کی بناء پر نہیں، بلکہ اس کے معاشی مواقع کے پیش نظر ہے اور اس مقام کی وجہ سے جو اپنے معاشرے کے نظام میں اس کو حاصل ہے ''ممڈن لاء'' کے مطابق لڑکی اس جائداد کی پوری طرح مالک تصور کی گئی ہے، جو اس کو شادی کے وقت باپ کی طرف سے بھی ملتی ہے اور شوہر کی طرف سے بھی، مزید برآں مہر بھی کلیۃً اسی کی ملکیت ہوتا ہے، جو خود اس کی مرضی کے مطابق معجّل ہو یا موجل، اتنا ہی نہیں بلکہ مہر کی ادائیگی تک وہ اپنے شوہر کی ساری جائیداد اپنے قبضے میں رکھ سکتی ہے، ساری عمر کی کفالت کی ذمہ داری بھی (شادی سے پہلے باپ پر اور شادی کے بعد) شوہر پر ہے۔ اگر آپ اس زاویۂ نظر سے قانون وراثت کے عمل کو دیکھیں تو آپ کو بیٹے اور بیٹیوں کے معاشی مرتبے میں کوئی مادی تفاوت نظر نہیں آئے گا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ وراثت کی حصہ داری میں بظاہر غیر مساوی نظر آنے والی یہ صورت ہی اصل میں قانونی مساوات مہیا کرتی ہے۔

(اسلام کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید ص:۱۶۱،۱۶۲)

اسلام نے مرنے والے مسلمان کی جائیداد میں اس کی بیوی اور بیٹیوں کا متعین حصہ رکھا ہے اور یہ انتظام کیا ہے کہ اگر جائیداد میں کسی قسم کا تصرف بھی ہو، تو یہ اپنے قانونی حصوں سے محروم نہ ہونے پائے۔ قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: مردوں کے لئے بھی حصہ ہے، اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں اور عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر ہو، حصہ قطعی (النساء:۷)

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے مطابق نکاح دراصل ویسا ہی ''معاہدہ'' ہے جیسے دوسرے معاہدات دو افراد میں ہوتے ہیں، جہاں تک معاہدہ کی شرائط کا تعلق ہے تو عورت مرد دونوں شرکاء ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں اور ہر شریک کے فرائض ہیں اور حقوق بھی۔ اسلام ہر معاہدے میں عدل وانصاف کی تاکید کرتا ہے۔ معاہدہ نکاح میں بھی عدل وانصاف پیش نظر ہونا ضروری ہے۔

امام بخاری کے نزدیک ایک باپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنی لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر کسی کے حبالۂ عقد میں دے دے خواہ وہ دوشیزہ ہو یا ثیبہ۔ ایک روایت کے بموجب رسول اللہؐ نے یہ فرمایا کہ:

''کسی ثیبہ کو خود اس کے حکم کے بغیر کسی کے حبالۂ عقد میں نہیں دیا جاسکتا اور کسی دوشیزہ کو بھی اس وقت تک کسی کے حبالۂ عقد میں نہیں دیا جاسکتا جب تک پہلے اس کی مرضی نہ معلوم کرلی جائے۔''

یہ روایت بھی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض گزار ہوئی کہ ''میرے باپ نے مجھے ایک ایسے شخص کے نکاح میں دے دیا ہے جو مجھے پسند نہیں ہے'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ اس کی پسند پر چھوڑ دیا۔

طلاق رسول اللہؐ کے نزدیک ابغض المباحات ہے (جس کی اجازت بحالت مجبوری دی گئی ہے) چونکہ شوہر ہی کفالت کا ذمہ دار اور گھر کا نگراں ہوتا ہے، اس لئے اس کو یہ حق دیا گیا ہے کہ مجبوری یا ضرورت ہو تو معاہدۂ نکاح کو فسخ کرسکتا ہے، لیکن اس کی اجازت بھی اسی وقت ہے جب وہ بیوی اور بچوں کا انتظام کردے۔ مہر اور اخراجات کی ادائیگی سے سبکدوش ہوجائے۔ اس کو اپنا یہ حق طلاق استعمال کرکے بیوی کو جراحت یا نقصان نہیں پہنچانا چاہئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ ''اس سلسلہ میں نہ تو کوئی نقصان پہنچایا جائے نہ باہم نقصان پہنچانے کی کوئی نیت ہو۔''

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ طلاق صرف بوقت ضرورت دی جاتی ہے۔ بیوی کو بھی طلاق حاصل کرنے کا حق حاصل ہے، وہ خلع حاصل کرسکتی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے کہ:

وہ طلاق دو مرتبہ کی ہے۔ پھر خواہ رکھ لینا قاعدے کے موافق خواہ چھوڑ دینا، خوش عنوانی کے ساتھ اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (چھوڑنے کے وقت) کچھ بھی لو (گو) اس میں سے (سہی) جو تم نے ان کو مہر میں دیا تھا، مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے۔ سو اگر تم لوگوں کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑالے۔ یہ خدائی ضابطے ہیں، سو تم ان سے باہر مت نکلنا اور جو شخص خدائی ضابطوں سے بالکل باہر نکل جائے سو ایسے لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں۔ (البقرہ:۲۲۹)

حدیث میں بھی حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جمیلہ بنت عبداللہ جو ثابت بن قیس کی بیوی تھیں، رسول اللہؐ کے پاس آئیں اور کہا: یا رسول اللہ! جہاں تک ثابت بن قیس کا تعلق ہے میں ان کے کردار اور تقویٰ پر کوئی الزام نہیں دھر سکتی لیکن میں اسلام میں احسان

فراموشی کو پسند نہیں کرتی۔ رسول اللہؐ نے پوچھا کہ کیا تم وہ باغ واپس کر دینے پر آمادہ ہو جو ثابت نے تمہیں دیا ہے؟ جمیلہ نے کہا: جی ہاں! تو رسول اللہؐ نے ثابت بن قیس سے فرمایا کہ باغ لے لو اور ان کو ایک طلاق دے دو۔

رسول اللہ ﷺ نے تعدد ازدواج کو نہ تو نافذ کیا، نہ اس عمل کی تاکید کی۔ تعدد ازدواج قبل اسلام سے رائج تھا اور اس کی کوئی حد بھی مقرر نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے تحدید نافذ کی اور کئی بیویوں کی اجازت اس وجہ سے دی کہ ان عورتوں کو کفالت ہو سکے جن کے باپ یا شوہر جنگوں میں کام آ گئے ہوں۔ قرآن حکیم نے بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کر دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ سب کے ساتھ مساوی اور عادلانہ سلوک کیا جائے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

اور اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کر لو۔ دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں اور چار چار عورتوں سے۔ پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر بس کرو، یا جو تمہاری ملک میں ہو وہی سہی۔ اس امر مذکور میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔ (النساء:۳)

معاہدۂ نکاح کے شرائط، شرکاء معاہدہ کے طے کرنے کے ہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق۔ اگر شوہروں کو اجازت ہے کہ مجبوری کے وقت وہ اپنا حق طلاق استعمال کریں تو بیویاں بھی حقدار ہیں کہ اپنے مہر اور نفقہ کا اپنی پسند کے مطابق تعین کریں، نیز اپنے شوہروں سے علاحدہ ہو جانے کا اختیار طلب کریں کہ جب ضرورت پڑے تو اس اختیار کو استعمال کریں۔ اگر شادی کے وقت تمام امور کو پوری طرح لحاظ کر کے معاہدہ عمل میں آئے اور جانبین عملی طور پر ایک ہی سطح پر ہوں تو عورت کے لئے نقصان اٹھانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے کہ:

اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے (بھی) کہہ دیجئے کہ (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں۔ مگر جو اس (موقع زینت) میں سے (غالباً کھلا رہتا ہے، جس کو ہر وقت چھپانے میں ہرج ہے) اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں اور اپنی زینت (کے مواقع مذکورہ) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے (محارم پر یعنی) باپ پر یا اپنے شوہروں کے باپ پر اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں پر یا اپنے (حقیقی، علاتی یا اخیافی) بھائیوں پر یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی (حقیقی، علاتی اور اخیافی) بہنوں کے بیٹوں پر یا اپنی عورتوں پر یا اپنی لونڈیوں پر یا ان مردوں پر جو طفیلی (طور پر رہتے) ہوں اور ان کو ذرا توجہ نہ ہو، یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردوں کی باتوں سے ابھی ناواقف ہیں (مراد غیر مراہق ہیں) اور اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہو جائے اور مسلمانو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (النور:۳۱)

اگر اس آیت سے عورت کا اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر عزلت گزیں رہنا درست کہا جائے اور وہ اپنے جائز امور کو سرانجام دینے کے لئے بھی گھر سے باہر قدم رکھنے نہ پائے تو پھر یہی پابندی مردوں پر بھی عائد ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔ (النور:۳۰)

پھر دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

اے پیغمبر اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی بیویوں سے بھی کہہ دیجئے کہ (سر سے) نیچے کر لیا کریں اپنی ٹھوڑی سے اپنی چادریں، اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی تو آزار نہ دی جایا کرے گی اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان

ہے۔(احزاب:۵۹)

اس حکم کا مقصد عورت کی آزادی پر پابندی عائد کرنا نہیں تھا، بلکہ اس وقت مدینہ میں جو حالات تھے ان کے پیش نظر عورتوں کو چھیڑ چھاڑ اور دوسرے نقصانات سے بچانا مقصود تھا۔ زمانہ قدیم میں ایک خاص قسم کا لباس تھا جو عورت اور مرد دونوں کے لئے نشان عزت وامتیاز سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً ''آشورین'' کے قدیم قانون نے شادی شدہ عورت کے لئے نقاب ضروری قرار دیا تھا اور لونڈیوں کو یا بدنام عورتوں کو نقاب کی ممانعت تھی۔

ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی زوجہ مطہرہ سودہؓ بنت زمعہ باہر گئیں، تو حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھا اور پہچان لیا اور کہا کہ خدا کی قسم سودہؓ! تم ہم سے چھپ نہیں سکتیں۔ لہٰذا وہ واپس چلی آئیں اور رسول اللہؐ سے یہ واقعہ بیان کیا، تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو اجازت ہے کہ اپنی ضرورتوں کے لئے باہر جاؤ۔ اگر یہ سچ ہے کہ عہد رسالت کے سماجی حالات کے مطابق عموماً عورتیں زیادہ تر گھریلو معاملات میں اپنے شوہر اور بچوں کی نگہداشت میں غرق رہتی تھیں، لیکن اس کے باوجود ان کی مصروفیات ملی سرگرمیوں میں حصہ لینے میں کبھی مانع نہ تھیں۔ گھر کے کام کاج نے ان کو نہ تو مسجد جانے سے روکا، نہ عید کی نمازوں سے روکا، نہ میدان جنگ میں جانے اور شریک جہاد ہونے سے روکا اور نہ دوسرے بے شمار فرائض کی ادائیگی سے روکا۔ مثلاً عورتیں رسد کی فراہمی کا انتظام کرتیں، بیماروں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرتیں، میدان جنگ سے زخمیوں اور شہیدوں کو اٹھاتیں حتیٰ کہ ضرورت آپڑتی تو باقاعدہ لڑائی میں بھی حصہ لیتیں۔ رسول اللہﷺ کی ایک زوجۂ مطہرہ زینب رضی اللہ عنہا چمڑا تیار کرتی تھیں۔ یہ ان کا کاروبار تھا اور اس کاروبار کی آمدنی رفاہ عامہ پر صرف کرتیں۔ عورتیں کھیتی کے کاموں میں اپنے شوہروں کا ہاتھ بٹاتیں، دعوتوں کے موقعوں پر مہمانوں (مردوں) کی تواضع کرتیں۔ اس کے علاوہ تجارت بھی کرتیں، وہ مردوں سے چیزیں خریدتیں۔

رسول اللہﷺ نے عورت کا مرتبہ بہت بلند کر دیا ہے اور قانونی طور پر عورت کو مردوں کے برابر حقوق عطا کئے ہیں۔ عدل کی تاکید کی ہے، خصوصی مراعات کی ہدایت کی ہے اور ان کی حفاظت اور کفالت کی ذمہ داری مرد کے سر عائد کی ہے، مگر آج یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہﷺ کی تعلیمات کا نہ صرف غلط استعمال ہو رہا ہے، بلکہ بعض اوقات تو سرے سے ان کو نظر انداز کیا گیا۔ مرد عورتوں کے محافظ بنائے گئے تھے، مگر اس کے عوض وہی ان کے حق میں ظالم وجابر ہو گئے۔ آج بھی بہت سے ممالک میں ''مسلم لاء'' پر عمل درآمد اس انداز سے ہو رہا ہے کہ حقوق نسواں کے معاملے میں مخالفانہ امتیاز نمایاں ہے، لیکن ان تمام باتوں کے مورد الزام مسلمان ہیں۔ رسول اللہﷺ کی ذات گرامی اور دین وشریعت اس سے بری ہیں۔ شیخ محمد عبدہ، نے لکھا ہے کہ جو شخص اس سے واقف ہے کہ اسلام سے پہلے کی تمام قوموں نے کس طرح مردوں کو ترجیح دی اور عورتوں کو جانور بنائے رکھا اور وہ مردوں کی محض کھلونا سمجھی گئی اور کس طرح بعض مذاہب نے بھی مرد کو محض مرد ہونے کی وجہ سے فوقیت دی اور عورت کو عورت ہونے کی وجہ سے کمتر سمجھا اور کہیں بعض قوموں نے عورت کو مذہبی ذمہ داری تک انجام دینے کے قابل نہ سمجھا، حتیٰ کہ یہ تصور کیا کہ وہ روح کی بھی حامل نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے آگاہ ہونے کے بعد ہی وہ ان اصلاحوں کی حقیقی قدر ومنزلت کا اندازہ کر سکتا ہے جو عورتوں کے معاملے میں اسلام نے کی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی عیاں ہو جائے گی کہ اہل یوروپ کا یہ دعویٰ کتنا بڑا فریب ہے کہ عورتوں کو اعزاز واکرام اور مساوات سب سے پہلے انہوں نے عطا کیا۔ اولیت اسلام کو حاصل ہے، اسی نے عورتوں کو اعزاز واکرام اور مساوات سے نوازا اور اہل یوروپ کے قوانین اور احکام مذہبی میں تو آج تک مرد کی برتری بدستور قائم ہے۔

یقین کیجئے عورتوں کی تعلیم وتربیت اور ان کے حقوق سے آشنا کرنے میں ساری کوتاہی مسلمانوں کی ہے اسلام کی نہیں اور ہم تو یہاں تک تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے

مذہب کی ہدایات کو پورا کرنے سے اس قدر قاصر رہے ہیں کہ اب وہی اس کے خلاف ایک ثبوت بن کر رہ گئے ہیں۔

وقت آ گیا ہے کہ مسلمان اسے محسوس کریں کہ اسلامی معاشرہ اس وقت تک سرسبز نہیں ہوسکتا جب تک عورت کو محکومی سے نجات نہیں ملتی اور وہ امتیاز ختم نہیں ہوتا جو بیچ میں حائل ہے اور معاشرے میں اسے پوری طرح احکام قرآنی کے مطابق حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''عورتیں ریاست کا ستون ہیں اگر وہ اچھی ہیں تو ریاست بھی اچھی ہے، اگر وہ خراب ہیں تو ریاست بھی خراب ہوگی۔''

☆☆

راہ ارتقاء

● ڈاکٹر قیصر حبیب ہاشمی

جس وقت اسلام کا نیر تاباں طلوع ہوا، باطل شکست وریخت سے دوچار تھا۔ ایران، روم، ہندوستان اور عرب، بلکہ سبھی جگہ انسانوں نے انسانیت کو تقریباً بھلا دیا تھا جس کی وجہ تھی تعلیمات خداوندی سے بے توجہی، مذہب کے اصولوں اور قوانین کی پیروی کرنے کی بجائے نفسانی خواہشات کے مطابق زندگی گزارنا، بے راہ روی کو ترقی پسندی کا نام دینا اور اللہ سے نہ ڈر کر انسانوں سے ڈرنا۔

مذہب کے نام پر انسانوں کی قربانی دی جاتی تھی جو یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ رشتۂ ازدواج جیسے پاکیزہ، بامقصد اور جذباتی رشتہ کو لے کر عورت کی بے حرمتی اور بے وقعتی کا یہ حال ہوگیا تھا کہ کسی بھی پتھر کے ساتھ اس کی شادی کر دی جاتی تھی۔

ظالم اپنے کو دلیر اور بہادر کہتے تھے۔ کسی کی جان و مال اور عزت وآبرو محفوظ نہ تھی، بے انصافی کا بازار گرم تھا، مالدار، سردار یا اونچے خاندان سے تعلق رکھنے والا آدمی اگر کوئی جرم کرتا تو سزا کا مستحق نہ قرار پاتا، وہی جرم اگر غلام یا غریب آدمی کرتا تو پوری پوری سزا دی جاتی تھی۔ یہ طریقہ بھی عام تھا کہ اگر رئیس قوم قتل کرتا تو بدلے میں وہ قتل نہ کیا جاتا، بلکہ مقتول کی قدر کے حساب سے قاتل کے بے قصور غلام قتل کر دئے جاتے تھے۔

سرداروں اور رئیسوں کی اولاد ہی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ پڑھیں، لکھیں اور اچھے عہدوں پر فائز ہوں۔ غلاموں اور دوسرے پیشوں سے متعلق لوگوں کی اولاد چاہے کتنی ہی

باصلاحیت اور ذہین ہوتی ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ پڑھ سکیں یا کوئی اعلیٰ درجہ کا ہنر سیکھ لیں۔ اگر کوئی ہمت کرتا تو اس کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ بیٹی کی ولادت غم کا باعث سمجھی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ سماجی، اخلاقی، معاشی، اقتصادی اور سیاسی بے راہ روی کا دور دورہ تھا۔

رب العالمین نے رحمت للعالمین حضرت محمدؐ کو بھیج کر انسانوں کی ہدایت وتعلیم کا انتظام فرمایا۔ عرب کے شہر مکۃ المکرّمہ کے ابوقیس پہاڑی کے قریب محلّہ سوق میں ۵۷۱ء میں جناب عبداللہ بن شیبہ (عبدالمطلب) اور آمنہ بنت وہب کے یہاں احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ بچپن ہی سے آپ ﷺ دوسرے بچوں سے مختلف تھے۔ برائیوں میں حصہ لینا تو درکنار، انہیں سخت ناپسند فرماتے تھے۔ ۵۸۶ء میں ۱۵ سال کی عمر میں اپنے ہم لڑکوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا کہ مظلوموں کی مدد کریں گے، مسافروں کی حفاظت کریں گے، حق دار کو اس کا حق دلانے کی کوشش کریں گے۔ تاریخ وسیر میں اس معاہدے کو ''حلف الفضول'' نقل کیا گیا۔ (مرتب)

۶۰۵ء میں آپ ﷺ کی عمر ۳۵ سال تھی۔ کعبہ شریف کی عمارت کی مرمت ہو رہی تھی۔ ہر قبیلہ کی خواہش تھی کہ سنگِ اسود کو اس کی جگہ پہنچانے کی سعادت نصیب ہو۔ سخت تنازع ہونے لگا، بلکہ جنگ کے حالات رونما ہونے لگے تھے، کہ ایک معمر شخص ابوامیہ نے کہا کہ کل جو کعبہ میں سب سے پہلے آئے سب اس کا فیصلہ مان لیں۔ اگلی صبح لوگوں نے دیکھا، جناب محمد بن عبداللہ وہاں پہنچ چکے تھے۔ آپؐ نے فیصلہ فرمایا، ایک بڑی چادر منگائی حجر اسود اس میں رکھا اور ہر قبیلہ کے سردار نے چادر پکڑی اور حجر اسود کو اس کے مقام تک لے گئے، آپؐ نے اٹھا کر اسے نصب کر دیا، ہر شخص خوش تھا۔ اس بے نظیر فیصلہ سے جنگ ہوتے ہوتے رک گئی۔ سیکڑوں جانیں بچ گئیں۔

قوم کی بگڑی ہوئی حالت پر آپؐ بہت فکرمند رہتے تھے۔ ضرورت مندوں کی مدد فرماتے، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے، بے کس قرض داروں کا قرض چکا دیتے، رشتہ داروں کے

ساتھ حسنِ سلوک فرماتے، ہمیشہ سچ بولتے تھے، نبوت ملنے سے پہلے صادق اور امین جیسے پاکیزہ القاب سے پہچانے جاتے تھے۔

۶۱۰ء ۴۰ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے عظیم رتبہ سے سرفراز کیا۔

سب سے پہلے سورۃ العلق کی ۵ آیتیں نازل ہوئیں۔ اسلام میں تعلیم وتعلم کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ پہلی وحی پڑھنے اور پڑھانے سے متعلق نازل ہوئی۔

''اِقْرَا بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ''. (العلق: ۵-۱)

(اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے بنایا، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا)۔

آپ ﷺ نے اللہ کی وحدانیت کی تعلیم دی، لوگ اپنے اپنے دیوی دیوتاؤں میں بکھرے ہوئے تھے۔ توحید کی تعلیم دے کر آدمیت کا وہ سبق دیا۔ ان کو ایک جماعت بنایا، وہ ایک قوم ہوگئے، انسان نے اپنی حقیقت کو پہچانا، سمجھ میں آیا کہ سوائے خالق کے ہر شے انسان کی خدمت گار ہے، رتبہ میں انسان سے کم درجہ رکھتی ہے، آدمی کا سر صرف ایک اللہ کے سامنے جھکنے کے لائق ہے، جو اللہ کے سامنے جھکتا ہے، وہ ہر کس وناکس کے سامنے نہیں جھکتا، سربلند رہتا ہے۔

جب تک مومنین نے مسلم ہونے کا حق ادا کیا، اللہ سے کئے ہوئے عہد کا پاس رکھا، وفاداری کے جذبات بلند رہے، اس وقت تک روشن ستارے بنے رہے:

گلشن میں سرو فوج میں مثل نشاں رہے
عالم میں سربلند رہے ہم جہاں رہے

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ لوگوں سے کہہ دو:

''قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ''. (آل عمران: ۳۱)

(اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری (محمدؐ) پیروی کرو اللہ تم سے محبت رکھے گا)۔

نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ کی سیرت پاک قرآن کریم کا عملی نمونہ ہے، یہی وجہ ہے کہ سورۃ الاحزاب میں اللہ رب العزت نے فرمایا:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً". (الاحزاب: ۲۱)

(تمہارے لئے اللہ کے رسول ﷺ میں اچھا نمونہ ہے اور ان کے لئے جو اللہ اور آخرت کے دن میں امید رکھتے ہیں اور اللہ کا کثرت سے ذکر کیا)۔

نبی کریم ﷺ کی سرت کے مطابق زندگی گزارنے کا مطلب ہے حق شناسی، حقوق و فرائض کے توازن کو قائم رکھنا، رشوت خوری، سود خوری جو کہ سماج میں غریبوں اور مجبوروں کا خون چوسنے کا ذریعہ ہیں ان سے بچنا۔

حیاداری، جسم پوشی، نیک کرداری، عدل وانصاف، عہد کا پاس سچائی، امانت داری، دیانت داری، فلاحِ عام اور خدمتِ خلق نام ہے، آپ کی پیروی کا۔

قتل وغارت گری، چوری، ناپ تول میں کمی، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری سے بچے رہنا مومن کی صفت ہے۔

آپ ﷺ محسنِ انسانیت تھے۔ اخلاق کے بلند ترین درجہ پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے بارے میں فرمایا:

"وَانكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْم". (القلم: ۴)

(اور بیشک تیرا اخلاق بڑا اعلیٰ ہے)۔

آپؐ کا ذکر شہرت تو تمام عالم میں رب العزت ارفع کر چکا:

"وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ". (انشراح: ۴)

(اور ہم نے تمہارا ذکر بلند کر دیا)۔

تحریر وتقریر سے آپ کی سیرتِ طیبہ کا تذکرہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ امتِ مسلمہ اللہ کے ساتھ باندھے ہوئے اپنے عہد ومیثاق کو یاد کرے اور انسان غور وفکر سے کام لے، حق وباطل کے فرق کو پہچانے، نفع بخش تحریک وعمل میں حصہ لے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ". (الاعراف: ۱۷۶)

(واقعات بیان کرو تا کہ وہ غور وفکر کریں)۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور رشتہ اخوت قائم رکھا تو دنیا ودین کی خیر وبرکت ان کی تھی، فتح وکامرانی ان کے قدم چومتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس امت نے اللہ کی رسی کی گرفت ڈھیلی کرنا اور اخوت اسلامی اور بھائی چارے کے جذبات کو پس پشت ڈال دیا، تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خیر سے محروم ہونے لگی۔

زمانہ شاہد ہے کہ قومیں جب تک اپنے خود ساختہ اصول، رسم ورواج کی بوجھل زنجیروں میں گرفتار تھیں، ترقی سے محروم تھیں، ترقی سے محروم تھیں، جب انہوں نے اس قید وبند کو توڑا۔ اسلام کے سارے واضح روشن اور قابل پسند اصول اختیار کرنا شروع کئے تو ترقی کے عروج پر پہنچیں۔

آج مسلمانوں نے پھر اسلامی رسم ورواج کے بہت سے اصنام بنا رکھے ہیں اور مزاج میں باطل پسندی سی ابھر رہی ہے۔

آج اکیسویں صدی میں ترقی کا دور دورہ ہے، علم وفن بام عروج پر ہیں، ہر شخص بے حد مصروف ہے، سوال یہ ہے کہ دورِ جدید میں اسوۂ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کس حد تک کی جاسکتی ہے، اس سائنس اور مشینوں کے دور میں سیرتِ رسول ﷺ یعنی قرآن کریم کے عملی نمونہ کے مطابق زندگی گزارنا کہاں تک ممکن ہے؟

اس کے لئے آج کے مسائل کا جائزہ لینا ہوگا، دورِ حاضر میں تحفظ ماحول بین الاقوامی سطح کا مسئلہ بن چکا ہے۔ اگر سنت رسول ﷺ پر عمل کیا جاتا تو یہ مسئلہ رونما نہ ہوتا۔ پیڑ

پودے غیر ضروری طور پر کٹنے کی وجہ سے جنگل ختم ہوتے جارہے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا تھا: ''تم میں جو پیڑ لگاتا ہے اور اس میں سے کوئی جانور، پرندہ یا انسان کھائے تو اس کو ثواب ملتا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''سڑک کے کنارے درخت لگاؤ۔ (صحیح بخاری) حضورؐ نے فرمایا: عوامی مقامات پر گندگی نہ کرو۔'' (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

اسلام میں یہ بات نہایت درجہ ناپسندیدہ ہے کہ کوڑا کرکٹ اور گندگی پانی کے مقامات جیسے دریا وغیرہ میں ڈالی جائے، کیونکہ اس سے بیماریاں پھیلتی ہیں۔ (علم الفقہ)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''برتنوں کو ڈھک کر رکھو، صبح اٹھ کر بغیر ہاتھ دھوئے کسی برتن میں ہاتھ مت ڈالو'' (صحیح مسلم) یہ وہ زرّیں اصول اور نکھری ہوئی تعلیم ہے، جو نبی ﷺ نے اب سے ۱۴ سو سال سے بھی زیادہ پہلے انسانوں کو دی تھی، لیکن انسانوں نے ہٹ دھرمی اور ناسمجھی وکم عقلی کی وجہ سے نہ سمجھا۔ اب جب طرح طرح سے عمل نہ کرنے کے نقصانات آموجود ہوئے تب بیسویں صدی کے دم توڑتے وقت لوگوں میں یہ تعلیم مختلف ذرائع سے اس طرح دی جارہی ہے، جیسے کوئی نیا کام ہورہا ہے۔ اگر پہلے سے آپؐ کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کیا جاتا تو ماحول کی یہ درگت نہ بنتی۔ آج بھی خلوص کے ساتھ آپؐ کا اتباع کیا جائے تو حال بہتر ہوجائے گا۔

نبی رحمتؐ نے فرمایا تھا ''جو شخص بنجر زمین کو زرخیز بنانے کی کوشش کرے گا، زمین اس کی ہوگی۔'' (صحیح مسلم) اس طرح بھی آپ ﷺ نے ہریالی قائم رکھنے کی ترغیب دی۔

آج گھریلو انتشار، نشہ آور اشیاء کا استعمال، جوا اور لاٹری کا بڑے مسائل میں شمار ہوتا ہے۔ ان سب کا علاج صرف قرآن کریم اور اسوۂ حسنہ کی پیروی میں ہے۔ قرآن کریم ایک واحد مذہبی کتاب ہے جس میں ان سب کے سلسلے میں اصول وقواعد کی تفصیل ہے۔

رنگ ونسل اور زبان ووطینت کے مسئلہ پر جھگڑوں کا بازار گرم ہے۔ لوگ ترقی پسند ہیں۔ قومی یک جہتی کا تذکرہ بھی شروع ہوگیا ہے، لیکن تفریق وتنازع بڑھتے جارہے

ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام سنا کر جھگڑوں کو یک قلم موقوف کردیا۔ بتادیا کہ تمام انسانوں کی اصلیت یہ ہے:

''یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ''.

(الحجرات: ۱۳)

(لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ تمہارے گروہ اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کرو۔ اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت دار وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے اور سب سے باخبر ہے)۔

سورۂ ''روم'' میں اللہ رب العزت نے فرمایا: تمہاری مختلف زبانیں بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

نبی کریم نے کبھی کسی زبان کے لئے یہ نہیں کہا وہ نہ سیکھی جائے، بلکہ آپؐ نے حضرت زید بن ثابت سے فرمایا تھا ''تم یہود کی زبان سیکھ لو تاکہ خط وکتابت میں آسانی رہے۔'' (صحیح بخاری)

نبی رحمت ﷺ کے بعثت سے پہلے صنفِ نازک ابلا جیسے لقب سے پکاری جاتی تھی۔ حد یہ تھی کہ بحیثیت ماں کے بھی اس کا کوئی مقام نہ تھا۔ عورت کی بخشش کا تصور بھی شوہر یا بیٹے کی شکل میں مرد کی خدمت پر منحصر تھا۔ اسلام نے صنفِ نازک کو عزت بخشی۔

بیٹی کی ولادت پر غم کرنا باطل پرستوں کی صفت بتا کر واضح کردیا کہ مومن کی صفت ہے کہ وہ لڑکی کی ولادت پر ناخوش نہ ہو۔ قرآن کریم میں بیٹی کی ولادت کی خبر کو خوشخبری سے تعبیر کیا گیا ہے:

''وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ کَظِیْمٌ''.

(النحل: ۵۸)

(اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ (غم سے) کالا

پڑ جاتا ہے اور وہ اندوہناک ہو جاتا ہے)۔

آج اس ترقی کے دور میں لوگ اپنے کو روشن خیال اور وسیع النظر کہہ رہے ہیں۔ ساتھ ہی سیکس ڈٹرمینیشن کے بعد لڑکیوں کو پیدا ہونے کے حق سے بھی محروم کر رہے ہیں۔ ایسا کرتے وقت ان کی ماں کی صحت کی بھی پروا نہیں رہتی۔

قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق بیٹی کو زندہ دفن کرنے والا باپ اتنا مغضوب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس سے مخاطب ہونا تک پسند نہیں فرمائے گا:

"وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ". (التکویر: ۹)

رسول اکرمؐ کی حدیث ہے "جو شخص اپنی بیٹی یا غلام لڑکی کو اچھی طرح سے پالے، اچھی تربیت دے، اسے کمتر نہ سمجھے اور اس میں احساسِ کمتری پیدا نہ ہونے دے وہ جنتی ہے۔" (صحیح مسلم و صحیح بخاری)

بیسویں صدی کے آخری دور میں بھی عورت مجبور سمجھی جا رہی ہے اور کافی حد تک مجبور کر دی گئی ہے، کیونکہ دورِ جاہلیت کے اکثر خیالات اور رواج عملی طور پر آج بھی جاری ہے، کیونکہ دورِ جاہلیت کے اکثر خیالات اور رواج عملی طور پر چھوڑے نہیں گئے۔ افراط و تفریط جاری ہے۔ اسلام کی اعتدال پسندی پر عمل درآمد کیا جاتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

ام المومنین حضرت خدیجہؓ بنتِ خویلد اعلیٰ پیمانے پر تجارت کرتی تھیں، درآمد اور برآمد ہوتا تھا۔ ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے کہ کبھی آپؐ نے تجارت کرنے سے منع فرمایا ہو یا اس سے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہو۔ آپؐ نے ان کی محنت اور صنعت کی تعریف فرمائی اور ہمت افزائی کی۔ جنگ احد ۳ھ میں مسلم خواتین نے میدان جنگ میں جا کر زخمی سپاہیوں کی تیمارداری کی۔ جنگِ قادسیہ ۱۵ھ میں ساٹھ مجاہدہ خواتین نے میدانِ کارزار میں جا کر دشمن کے چھکے چھڑا دئے۔ یہ خواتین گھڑ سواری اور اونٹوں پر سواری کرنے میں ماہر تھیں۔ فن سپہ گیری سے بخوبی واقف تھیں۔

تمام عمر محض تلاش معاش اور دنیا کمانے میں لگا دینا ترقی نہیں ہے:

اسلامی تعلیمات کے مطابق علم نام ہے معرفتِ الٰہی کا، احکام خداوندی سے واقفیت کا اور حق شناسی کا۔ علم حقیقی وہ ہے جس سے انسانیت بیدار ہو، اخلاق و عادات بہتر بنانے میں مددگار ہو، شخصیت میں نکھار پیدا ہو، کردار بلند ہو، قدرتی صلاحیت کو جلا نصیب ہو۔

عقل کے حساب سے بہتر سے بہتر غذا اور ٹھکانہ تو جانور بھی تلاش کرتے ہیں، صرف تمام زندگی ان کے حصول میں لگا دینا ترقی نہیں ہے۔ ترقی کا نام ہے وسیع النظری، عدل پسندی، بھائی چارے کی رسم کو عام کرنا، امن و آشتی کو قائم کرنا اور قائم رہنے دینا، زندگی کے ہر معاملے میں اپنا محاسبہ کرنے کی قوت رکھنا، یہ سب حاصل ہو سکتا ہے اگر رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی جائے۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے کسی قوم کی اچھی بات سیکھنے سے کبھی منع نہیں کیا۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اسلامی تعلیمات ہمیشہ کے لئے قابل عمل ہیں، ہر جگہ کے لئے ہر طبقہ کے لئے اور وہ ہر دور میں تازہ ہیں، پر حیات ہیں، غور کرنے کا مقام ہے کہ تعلیمی سفر کا ذکر صرف قرآن کریم میں ہے:

"قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ". (العنکبوت: ۲۰)

(کہہ دے کہ زمین پر چلو پھرو (سیر کرو) اور دیکھو کہ اس نے (اللہ نے) کس طرح خلقت کو پیدا کیا ہے)۔

"قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قبل". (الروم: ۲۰)

(کہہ دے زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو لوگ پہلے تھے ان کا انجام کیسا ہوا"۔

اسلام ذہن اور عقل کی کشادگی اور معلومات کے حصول کے لئے مشاہدات کی دعوت دیتا ہے، کیونکہ مشاہدہ قدرت، معرفتِ الٰہی کا راستہ ہے۔

"قُلُ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالاَرْض". (یونس: ۱۰۱)

(اے نبی) لوگوں سے کہہ دے مشاہدہ کرو وہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے)۔

مندرجہ بالا آیت میں کائنات کی حقائق کا مشاہدہ کرنے اور غور وفکر کرنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یعنی بتادیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عالموں کا پالنے والا ہے اور نبی آخرالزماں محمد مصطفیٰ کے لئے فرمایا گیا رحمۃ للعالمین۔ تمام جہانوں کے لئے رحمت (الانبیاء:۱۰۷) اور قرآن کریم کو تمام عالموں کے لئے نصیحت فرمایا گیا ہے۔

"ذِکْرٌ لِلْعٰلَمِیْنَ" (یوسف:۱۰۴) اللہ تعالیٰ نے زمین کی مخلوق کی زندگی کے لئے کچھ اور اجزا ضروری بنائے ہیں۔ ہوسکتا ہے دوسری مخلوقات کی زندگی کے لئے کچھ اور اجزا ضروری ہوں۔ للہ علام الغیوب ہے۔ سمندر کی معلومات حاصل کرنے کی طرف بھی مائل کیا گیا ہے:

"ھُوَالَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" (یونس:۲۲)

(وہی تو ہے (اللہ تعالیٰ) جو تم کو خشکی اور سمندر میں سیر کرنے (چلنے پھرنے) کی توفیق دیتا ہے)۔

انسان اگر تعلیمات قرآنی اور اس کی عملی شکل یعنی نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی خلوص دل سے پیروی پر کمر بستہ ہو تو ہر شعبۂ حیات میں کامیابی اور عزت نصیب ہوگی۔ سماج سے تنگ نظری اور تعصب دور ہوگا۔

آج ضرورت ہے کہ ہم سب ان اخلاق وعادات کے پابند ہوکر دنیا کو اپنی طرف آنے کی دعوت دیں، جن کے ذریعہ رسول اکرم جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی قوم وعلوم وفنون اور آدمیت کے بامِ عروج پر پہنچی۔

دینِ احمد راستہ ہے سربسر تعمیر کا
ارتقاء کا، روشنی کا، خواب کا، تعبیر کا

☆☆

معاشرتی زندگی اور پیغمبر انقلاب کا اسوہ

● فرحانہ فردوس

سیرت نبوی کا یہ ایک عظیم امتیاز ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر گوشہ پر محیط ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ خالی نہیں ہے جس کے سلسلہ میں آپ ﷺ کے واضح ہدایات موجود نہ ہوں۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر کفار کے طعنہ پر جواباً عرض کیا "ہاں یہ میرے آقا کی شان ہے جو ہمیں ایک ایک چیز سکھاتا ہے حتیٰ کہ بیت الخلاء کرنے کا طریقہ بھی سکھاتا ہے"۔ الغرض نبی آخر محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہر گوشہ روشن ہے۔ اس کے اسوۂ حسنہ میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کے ہر درد کا درماں، راستگی اور اصلاح کے لئے نسخہ کیمیا ہے۔ گھریلو زندگی بالخصوص ازدواجی زندگی سے متعلق ہدایات نبوی حدیث کی کتابوں میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ گھریلو زندگی میں رونما ہونے والے اختلافات، زوجین کے مابین تنازعات کو ہدایات نبوی کی روشنی میں حل کرکے زندگی کو خوشگوار اور مسرت وراحت سے بھرپور زندگی بنائی جاسکتی ہے۔

زوجین کا ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ:

اس سے متعلق آنحضرت ﷺ کی تعلیم وہدایات کا خلاصہ یہ ہے کہ بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے لئے سب سے بالاتر سمجھے، اس کی فرمانبردار رہے، اس کی خیرخواہی اور رضا جوئی میں کمی نہ کرے اپنی دنیا اور آخرت کی بھلائی اس کی خوشی سے وابستہ سمجھے اور شوہر کو

چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت سمجھے۔ اس کی قدر اور اس سے محبت کرے، مگر اس سے غلطی ہو جائے تو چشم پوشی کرے، صبر و تحمل و دانش مندی اس کی اصلاح کی کوشش کرے اپنی استطاعت کے مطابق کی اس کی ضروریات اچھی طرح پورا کرے، اس کی راحت رسانی اور دل جوئی کی کوشش کرے۔

رسول اللہ ﷺ کی اپنی لخت جگر فاطمہ کو نصیحت:

دربار رسالت نبی ﷺ میں متعدد بار زوجین میں سے ایک فریق اپنی شکایات کو لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور مسائل آپ کے سامنے بیان کیا ہے اور آپ نے تنازعہ کو حکمت عملی سے حل کیا ہے۔ ایک بار خود آپ کی چہیتی اور لاڈلی بیٹی حضرت فاطمۃ الزاہرا رضی اللہ عنہا اپنے شوہر نامدار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شکایات لے کر پہنچیں۔ سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کو اس انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

ایک بار حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو گیا۔ حضرت فاطمہ زہراؓ اپنے شفیق باپؐ کی خدمت میں پہنچیں۔ پیچھے پیچھے داماد رسول اللہ ﷺ حضرت علیؓ بھی گھبرائے ہوئے پہنچے اور دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ سوچنے لگے کہ اگر خدانخواستہ اللہ کے رسول ﷺ ناراض ہو گئے تو دین و دنیا دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ حضرت فاطمہؓ نے حضور ﷺ سے اپنے شوہر کی شکایت کی، حال سنایا اور زار و قطار رونے لگیں، لیکن آپ ﷺ نے جو ردعمل ظاہر کیا وہ ہماری سوچوں کے بالکل برعکس، گھر بسانے والا رویہ تھا۔ باپ نے بیٹی کو جو اس طرح روتے دیکھا تو دل بھر آیا۔ آب دیدہ ہو گئے، بیٹی کو سمجھاتے ہوئے شفیق باپؐ نے کہا۔

''بیٹی'' میں نے تمہارا نکاح اس شخص سے کیا ہے جو قریش کے جوانوں اور اسلام لانے والوں میں سب سے افضل ہے۔

''بیٹی'' میاں بیوی میں کبھی کبھی ایسی باتیں ہو جایا کرتی ہیں۔ وہ کون سے میاں بیوی ہیں جن کے درمیان کبھی کوئی رنجش کی بات نہ ہوتی ہو اور بیٹی، یہ کیسے ممکن ہے کہ مرد سارے کام ہمیشہ عورت کی مرضی کے مطابق ہی کیا کرے اور اپنی بیوی سے کچھ نہ کہے۔ جاؤ، اپنے گھر جاؤ، خدا تمہیں خوش اور آباد رکھے اور میں تم دونوں کو خوش دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھوں۔''

بیٹی خوش ہو گئیں اور حضرت علیؓ کا دل بھر آیا۔ آڑ سے نکل کر سامنے آئے۔ آنکھوں میں آنسو اور رقت انگیز لہجہ میں حضرت فاطمہؓ سے کہا۔ ''خدا کی قسم، آئندہ تم ایسی کو بات نہ دیکھو گی جس سے تمہارے نازک دل کو دکھ پہنچے۔'' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا دل بھی بھر آیا اور کہنے لگیں کہ ''غلطی تو میری ہی تھی۔'' پھر دونوں خوشی سے سرشار اپنے گھر لوٹ آئے۔
(ماخوذ از کتاب- داعی عظیم محمد یوسف اصلاحی-ص ۱۵۱)

عورت پر سب سے بڑا حق اس کے شوہر کا ہے اور مرد پر اس کی ماں کا:

مذکورہ واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ بڑے سے بڑے اختلافات کو حکمت و دانش، جذبات کی رو میں بہنے کے صبر و تحمل، دانشمندی سے حاصل کیا جائے تو دو دو گھر، دو خاندان کو ٹوٹنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ سیرت طیبہ ﷺ کا یہی پیغام ہے۔

اچھائی اور بھلائی کا معیار متعین فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے خود اپنی مثال پیش فرمائی کہ..... وہ آدمی تم میں زیادہ اچھا اور بھلا ہے جو اپنی بیوی کے حق میں اچھا ہو۔ (اسی کے ساتھ فرمایا) اور میں اپنی بیوی کے لئے بہت اچھا ہوں (جامع ترمذی بحوالہ معارف الحدیث) اسی طرح آپ ﷺ بیویوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''عورت پر سب سے بڑا حق اس کے شوہر کا ہے اور مرد پر سب سے بڑا حق اس کی ماں ہے۔ دوسرے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو شوہروں کی اطاعت و فرمانبرداری اور رضا جوئی کی تاکید

فرماتے ہوئے اس پر عظیم اجروثواب بیان فرما کر ترغیب بھی دی ہے۔

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت جب پانچوں وقت کی نماز پڑھے اور ماہ رمضان کے روزے رکھے اور اپنے شرم وآبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کی فرمانبردار رہے تو پھر (اسے حق ہے کہ) جنت کے جس دروازے سے چاہے اس میں داخل ہو۔ (معارف الحدیث جلد ۶ صفحہ ۵۴)

اس سلسلہ میں آپ ﷺ کے بے شمار ارشادات وفرمودات وضاحت کے ساتھ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں جس کا مطالعہ کر کے انسانی زندگی میں آئے دن پیش آنے والے تنازعات پیدا ہوتے ہیں اس کی اکثر وجہ غلط فہمی اور ایک دوسرے کی عدم رعایت ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ سے ناچاقی اور اختلافات رونما ہوتے ہیں، بعد میں یہی اختلاف سنگین صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔ بسا اوقات جدائی اور علاحدگی تک کی نوبت آجاتی ہے، اگر ان تنازعات اور اختلافات کو شروع ہیں میں سیرت رسول اکرم ﷺ کی رہنمائی میں حل کر لیا جائے تو کبھی جدائی اور علاحدگی کی نوبت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

☆☆

رسول خدا کی ازدواجی زندگی

منصب رسالت کو مجروح کرنے کی مذموم کوششوں کے تناظر میں

● ڈاکٹر عین الحق قاسمی

پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات گرامی کو دشمنان اسلام نے ہمیشہ ہدف ملامت بنایا ہے اور محض انانیت، عناد وتعصب کی بنا پر آپ کی بے داغ سیرت وکردار کو داغدار کرنے کی مذموم کوششیں کی ہیں، تاکہ اہل ایمان کو دین کے تئیں شک وشبہات میں مبتلا کر دیں اور ام انسانوں کو آپؐ کی رسالت پر ایمان لانے سے روک دیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، کیونکہ تمام انبیاء ورسل کے بارے میں اس طرح کی افتراء پردازی و بہتان تراشی اور جھوٹے پروپیگنڈے ہوتے رہے ہیں۔ یہ اللہ کی سنت ہے اور اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: ''**وکذلک جعلنا لکل نبی عدو من المجرمین، وکفی بربک هادیا ونصیرا**''. (الفرقان:۳۱) (اے نبی ﷺ ہم نے اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے اور تمہارے لئے تمہارا رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے)۔

حضور پاک ﷺ کی ذات والا صفات اور گفتار وکردار پر اعتراضات کا ایک طویل سلسلہ ہے، منجملہ آپ کی ازدواجی زندگی بھی بے جا اعتراضات اور کیک حملوں کا نشانہ رہی ہے، برا ہو عناد پرست مستشرقین کا جنہوں نے آپ کے تعدد ازدواج کے بارے میں کہا کہ آپ نے اپنے متبعین کی طرح ایک سے چار بیویوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ گیارہ بیویاں رکھیں، یہ نفس پرستی اور زن پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ ''كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ

اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِباً''. (الکہف:۵) (بڑی بات ہے جوان کے منہ سے نکلتی ہے، وہ محض جھوٹ بکتے ہیں)۔

اس طرح کے اوچھے اعتراضات کی بازگشت ہر زمان ومکان میں برابر سنائی دیتی رہی ہے، یہ اس لئے ہے، تاکہ ایمان بالرسالت کے مضبوط ستون کو کمزور کردیا جائے، اس لئے ضروری ہے کہ اس طرح کے اعتراضات کی حقیقت اور ان کے واقعی جوابات کی اشاعت بھی ہوتی رہے کہ یہی دین مبین کی حفاظت وصیانت اور محبت کا تقاضا ہے۔

پیارے نبی کے تعدد ازدواج کو تنقید کا نشانہ بنانے والے اور آپ کی طرف شہوت پرستی کی نسبت کرنے والے دراصل اپنی سطحی ذہنیت اور نفسانیت کی ترجمانی کرتے ہیں، ان کی ذہنی سطح اس سے اوپر اٹھ کر کچھ سوچنے سے قاصر ہوتی ہے۔ جہاں تک چار سے زائد شادیوں کا سوال ہے تو اس کی اجازت تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی تھی۔ (ملاحظہ ہو سورہ احزاب کی آیت نمبر-۵۰)

یہ پروپیگنڈہ تو خوب کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر نے گیارہ شادیاں کیں، مگر نظر نہیں آتا کہ یہ شادیاں کس عمر میں ہوئی اور بیویوں کے ساتھ قیام کی مدت تریسٹھ سال کی عمر میں کتنی رہی ہے؟

آپ کی پہلی شادی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی، اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال تھی اور بیوہ تھیں، جب کہ آپ ﷺ کی عمر ۲۵ سال تھی، کیا یہی نفس پرستی ہے؟ نفس کا تقاضا تو یہ تھا کہ کم عمر کی کسی کنواری دوشیزہ سے نکاح کرتے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے علاوہ آپ کی تمام شادیاں ۵۰ سال کی عمر کے بعد ہوئی، جب آپ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ آپ کی تمام بیویاں بیوہ، سن رسیدہ اور ادھیڑ عمر، بلکہ بعض بوڑھی عورتیں تھیں۔ ان بیویوں سے آپ کے نکاحوں کا سلسلہ ہجرت کے بعد شروع

ہوا اور اس میں بھی عموماً آخری عمر میں، حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر تین ساڑھے تین سال سے زیادہ زمانہ ازدواج کو نکاح کے بعد نہ ملا اور یہی زمانہ آنحضرت کے جہاد اور حج وغیرہ اسفار کا ہے، اس کا اور عدل کے قانون پر شدت کے ساتھ عمل پیرا ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ تریسٹھ سال کی پوری زندگی میں عموماً ان بیویوں کے پاس آنحضرت ﷺ کے قیام کی مدت ساڑھے تین مہینے سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر نبی کی ان بیویوں کے بارے میں اللہ رب العالمین کا یہ خطاب کہ: ''يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلاً''. (الاحزاب:۲۸) (اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں سے کہو اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کردوں)۔

کیا ان تفصیلات میں نفس پرستی کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے؟ اگر نہیں اور واقعی نہیں تو آیئے دیکھیں کہ ان پاک بیویوں سے رشتۂ مناکحت میں کون سی حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔

تعدد ازدواج کی حکمتیں:

آپ ﷺ نے مختلف قبائل کی مختلف عمر کی تجربہ کار عورتوں کو جو اپنے نکاح میں جمع کیا تو اس میں بڑی حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ تھیں جو تعلیمی بھی تھی، تشریحی بھی، سماجی بھی تھیں اور سیاسی بھی۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک کا مختصر جائزہ لیں گے۔

تعلیمی حکمت:

تعدد ازدواج کا ایک بنیادی مقصد مردوں کے ساتھ ساتھ چند عورتوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا تھا۔ انہیں احکام شریعت سکھانا تھا کیونکہ وہ بھی تو سماج کا نصف حصہ ہیں اور مردوں کی طرح ان کے بھی کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ہیں۔ بہت سی عورتیں اپنے شرعی مسائل بالخصوص حیض ونفاس اور جنابت اور ازدواجی امور سے متعلق مسائل حضور سے

پوچھے میں حیا کرتی تھیں اور حضور بھی حیا کی وجہ سے ان کے ہر سوال کا جواب کھل کر نہیں دے پاتے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی اشارے کنائے میں جواب دیتے تو بھولی بھالی عورتیں سمجھنے سے قاصر رہ جاتیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ ان مسائل کی تعلیم آپ اپنی ازواج مطہرات کو دیتے تاکہ وہ عورتوں کے ان مسائل کا جواب دے سکیں۔ جیسا کہ یہی ہوا بھی کہ حضرت عائشہ عورتوں کے مسائل کا جواب دیتیں اور ان کی تفہیم کراتی تھیں۔

پھر یہ سنت مطہرہ صرف حضور پاک ﷺ کے اقوال تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ آپ کے افعال اور تائید بھی سنت مطہرہ کا حصہ ہیں جن کی اتباع امت پر واجب ہے، تو آپ کی عائلی زندگی کے احوال اور معاشرتی امور سے متعلق ہدایات نیز عادات واطوار اور روزمرہ کے معمولات، یہ بیویاں نہ ہوتیں تو کون لوگوں تک پہنچاتا؟ اس طرح سنت مطہرہ کا ایک بڑا حصہ امت تک نہ پہنچ پاتا۔ یہ آپ کی ازواج مطہرات ہی تھیں جو معلمات ومحدثات کی حیثیت سے دین کے اہم سرمایہ کو ہم تک پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔ رضی اللہ عہن اور یہ سب خدائی ہدایات کے تحت ہوا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

''وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ''.
(الاحزاب-۳۴)

(اے نبی کی بیویو! یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں)۔

اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ ''اصل میں لفظ ''وَاذْكُرْنَ'' استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہیں ''یاد رکھو'' اور ''بیان کرو'' پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اے نبی ﷺ کی بیویو! تم کبھی اس بات کو فراموش نہ کرنا کہ تمہارا گھر وہ ہے جہاں سے دنیا بھر کو آیات الٰہی اور حکمت ودانائی کی تعلیم دی جاتی ہے، اس لئے تمہاری ذمہ داری بڑی سخت ہے، دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ نبی کی بیویو! جو کچھ تم سنو اور دیکھو

اسے لوگوں کے سامنے بیان کرتی رہو، کیونکہ رسول کے ساتھ ہر وقت کی معاشرت سے بہت سی ہدایات تمہارے علم میں ایسی آئیں گی جو تمہارے سوا کسی کے ذریعہ سے لوگوں کو معلوم نہ ہوسکیں گی۔ (تلخیص تفہیم القرآن مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔۱۹۸۶ص:۹۷۱)

کہا جاسکتا ہے کہ ان عورتوں کو تعلیم وتربیت ہی دینا تھا تو ان سے شادی کرنا کیا ضروری تھا یہ عورتیں بھی آپ کے پاس اسی طرح رہتیں جس طرح مردوں کی ایک منتخب جماعت رہتی تھی یوں بھی یہ تعلیمی مقصد حاصل ہوجاتا، لیکن قربان جایئے اس نبوی بصیرت اور دوراندیشی پر کہ آپؐ نے نامحرم عورتوں کو اپنے پاس رکھ کر تعلیم وتربیت دینے کا دروازہ نہیں کھولا کہ یہ چیز آنے والے دنوں میں آپؐ کو متہم کرنے اور روحانی پیشواؤں اور مذہبی مقتداؤں کے لئے بڑے فتنے کا باعث بن جاتی جیسا کہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''ہیکل کی خدمت کے لئے عمران کی عورت نے صرف ایک لڑکی پیش کی تھی، کیونکہ دیکھو اس ایک کنواری کے آڑ میں چرچوں پر، گرجاؤں پر، ان کے اماموں پر، خطیبوں پر، رہبانوں پر، بطریق پر کتنی کنواریاں روز بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں، خدانخواستہ اگر کسی ایک اجنبی عورت کو نزدیک کی وہ حیثیت دی جاتی جو باہر میں مردوں کو حاصل تھی تو کون اندازہ کرسکتا ہے کہ بعد کو آدم اور ابلیس کے لئے قرب ونزدیکی کا مایہ حیلہ کن خباثتوں اور شرارتوں کی بنیاد بن جاتا، جب کوئی نمونہ موجود نہیں ہے، اس وقت تو بغیر نمونہ کے زندگی گزارنے والوں نے کتنے فتنے برپا کئے، خدانخواستہ اگر ''نیم بیضہ میسر ہوجاتا تو پھر سیخ میں کتنے ہزار مرغ گتھے جاتے، اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟'' (النبی الخاتم، عظیم بکڈپو دیوبند۔۱۱۰-۱۱۱)

تشریعی حکمت:

زمانہ جاہلیت سے عربوں میں یہ رسم چلی آرہی تھی کہ وہ منہ بولے بیٹے کو اپنے حقیقی

اور صلبی بیٹے کی حیثیت دیتے تھے اور اسی کے مطابق میراث، طلاق، نکاح، مصاہرت اور محرمات نکاح کے معاملے میں برتاؤ کرتے تھے۔ جب کوئی کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بناتا تو کہتا ہے ''انت ابنی، ارثک وترثنی'' تو میرا بیٹا ہے۔ میں تیرا وارث ہوں اور تو میرا وارث ہے۔ اسی ضابطے کے تحت وہ اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی بھی نہیں کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی حضرت زید بن حارثہ (جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے) کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا جنہیں لوگ اپنی عادت کے مطابق زید بن محمد کہہ کر پکارتے تھے۔ (بخاری، مسلم) اس پر قرآن کی آیت نازل ہوئی۔

''اُدعُوْهُمْ لِآبَائِهِم هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰه'' (الاحزاب:۵) منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت زید سے کہا کہ: انت زید بن حارثه بن شراحیل (تم زید بن حارثہ بن شراحیل ہو)

آپ ﷺ نے حضرت زید کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش الاسدیہ سے کرادی تھی، جو اسلام کے نظام معاشرت میں انسانی مساوات کا بہترین مظاہرہ تھا، بعد میں حضرت زید نے انہیں طلاق دے دی تو مشیت ایزدی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ آپ ﷺ حضرت زینب سے نکاح کر کے منہ بولے رشتے کے بارے میں غلط رسوم کا خاتمہ کردیں۔ اس پر آپ نے منافقین اور بدطینتوں کی الزام تراشی کے خدشے سے کچھ توقف کیا تو آپ کو تنبیہ کی گئی ساتھ ہی اس نکاح کی ضرورت اور حقیقت کو یوں واشگاف کیا گیا:

''تو لوگ ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو، پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے (اس مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا، تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے، جب کہ وہ

ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہئے تھا۔''

اللہ کا حکم عمل میں آیا اور آپ نے شادی کر کے غیر شرعی رسم کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح یہ شادی اپنی خواہش کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے بنا پر قانون سازی کا اہم مقصد پورا کرنے کے لئے ہوئی۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت زینب اپنی اس شادی سے حضور ﷺ کی تمام بیویوں پر فخر کرتیں اور کہتی تھیں تم سب کی شادیاں تو تمہارے گھر والوں نے کیں اور میری شادی ساتوں آسمان پر اللہ رب العالمین نے کی۔

سماجی حکمت:

آپ ﷺ کے تعدد ازدواج کی سماجی حکمت واضح ہے۔ آپ نے پہلے اپنے سب سے قریبی ساتھی حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت عائشہ سے پھر حضرت عمرؓ کی بیوہ بیٹی حضرت حفصہ سے نکاح کر کے ان کے مجد و شرف کو بڑھا دیا۔ حقیقت میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے تئیں ان دو جاں نثاروں کی جو وفاداریاں اور قربانیاں رہی ہیں ان کے اعزاز میں آپ نے انہیں اپنی مصاہرت کا شرف بخشا جو ان کے لئے دنیا و مافیہا سے بہتر تھا۔ اسی طرح آپ نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ سے اپنی اپنی بیٹیوں کا رشتہ کر کے انہیں بھی اپنی مصاہرت میں لے لیا کہ یہ چاروں حضرات آپ کے اجل صحابہ اور خلفائے راشدین تھے۔ جنہوں نے آپ کے بعد آپ کی سچی نیابت کی اور آپ کے مشن کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔

سیاسی حکمت عملی:

آپ ﷺ نے مختلف قبائل میں مصاہرت کا رشتہ قائم کر کے جہاں ان کی تالیف قلبی کی اور انہیں اپنا ہمنوا بنایا وہیں اپنے تعلقات کو وسیع کیا اور اثر و رسوخ کو مزید مستحکم کیا۔ اس طرح دعوتی کام میں وسعت اور رجال کار کی فراہمی میں سہولت پیدا ہوئی۔ یہ فطری بات

ہے کہ آدمی جس قبیلے اور خاندان میں شادی کر لیتا ہے اس میں اس کا اثر ورسوخ بڑھ جاتا ہے اور وقت ضرورت لوگ اس کی حمایت اور نصرت کرتے ہیں۔ اسی حکمت اور مصلحت کے تحت آپ نے مندرجہ ذیل شادیاں کیں۔

اولاً حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے جو بنو مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں اور اپنے اہل خاندان کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھوں قید کی گئی تھیں تو انہوں نے حضورﷺ کے پاس آ کر مالی مدد چاہی، تاکہ فدیہ دے کر چھوٹ جائیں اس پر حضورﷺ نے فدیہ دینے کے ساتھ ان کے سامنے نکاح کی پیش کش کی، جسے انہوں نے قبول کر لیا اور نکاح ہو گیا تو مسلمانوں میں یہ بات پھیلی کہ رسول اللہﷺ کے رشتے دار ہماری قید میں ہیں، چنانچہ لوگوں نے حضرت جویریہ کے خاندان کے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا، اس اخلاق ومروت سے متاثر ہو کر بنو مصطلق کے سارے لوگ مسلمان ہو گئے۔ اس طرح حضرت جویریہؓ سے آپ کا نکاح ان کے لئے اور ان کی پوری قوم اور خاندان کے لئے باعث برکت وآزادی ثابت ہوا۔

ثانیاً حضرت صفیہ بنت حیی اخطب سے، ان کے شوہر غزوہ خیبر میں مارے گئے تھے اور وہ قید ہو کر مسلمان کے حصے میں آئی تھیں تو لوگوں میں یہ چرچا ہوا کہ وہ بنو قریظہ کے سردار کے گھرانے کی ہیں، اس لئے انہیں رسول اللہﷺ کے پاس لائے کہ وہ جیسا مناسب سمجھیں گے فیصلہ فرمائیں گے۔ آپﷺ نے ان سے کہا کہ ''تمہارا باپ میری دشمنی میں یہودیوں میں سب سے آگے تھا جسے اللہ نے ہلاک کر دیا۔'' اس پر حضرت صفیہ نے کہا ''اے اللہ کے رسول! اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ''ولا تزر وازرۃ وزر اخری'' (کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کو بوجھ نہیں اٹھائے گا)۔ تو آپ نے فرمایا: ''چاہو اسلام قبول کر کے میری زوجیت میں آ جاؤ اور اگر یہودیت میں رہنا چاہتی ہو تو میں تمہیں آزاد کرتا ہوں اپنے گھر چلی جاؤ۔ انہوں نے کہا مجھے اللہ اور اس کا کے رسول کفر اور اہل خاندان سے زیادہ عزیز ہیں۔'' اس پر آپ نے ان سے نکاح کر لیا۔ ان کے اسلام

قبول کر لینے سے ان کی قوم کے اور بھی بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

ثالثاً حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے یہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں جو ان دنوں شرک کے علمبردار اور حضورﷺ کے سخت ترین دشمن تھے۔ حضرت ام حبیبہ مکہ ہی میں مسلمان ہو گئی تھیں اور اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ساتھ اپنے دین کی خاطر حبشہ کی راہ لی تھی جہاں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تو وہ بے یار ومددگار رہ گئیں۔ حضورﷺ کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے ان کے ایمان واستقامت کی قدر کرتے ہوئے ان کا سہارا بننے کے لئے نجاشی کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ ام حبیبہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں، نجاشی نے ام حبیبہ کو یہ خبر دی تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ واپس اپنے گھر جائیں گی تو لوگ انہیں سخت اذیتیں دیں گے اور کفر وارتداد پر مجبور کریں گے۔ چنانچہ نجاشی نے انہیں چار سو دینا بطور مہر رسول اللہﷺ اور دیگر قیمتی ہدایا اور تحفے دے کر مدینہ روانہ کر دیا۔ مدینہ پہنچنے پر آپ نے ان سے نکاح کر لیا، ابوسفیان کو جب اس کی خبر ہوئی تو عربی روایات کے مطابق آپ کی مخالفت ترک کر دی، پھر کبھی آپ کے مقابلہ پر نہ آئے، یہ رشتہ تالیف قلب کا سبب بنا اور ابو سفیان دولت ایمان سے سرفراز ہوئے۔ یہ تھیں وہ حکمتیں اور مصلحتیں جن کا تقاضا تھا کہ نبی ﷺ کے لئے نکاح کے معاملے میں کوئی تنگی باقی نہ رکھی جائے، تاکہ جو کار عظیم آپ کے سپرد کیا گیا وہ صحیح طور پر اپنے انجام کو پہنچ سکے۔

☆☆

اسلام اور مذہبی آزادی

● سید عبدالحکیم

اسلام نے دوسرے مذاہب وادیان کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا، اس کے متعلق قرآن میں واضح احکام موجود ہیں۔ جب قرآن نے کہا کہ ''**لا اکراہ فی الدین**'' (مذہب کے معاملے میں کوئی جبر نہیں) تو گویا اس نے غیر مبہم الفاظ میں تمام دوسرے ادیان کا پوری آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا بنیادی حق تسلیم کرلیا۔ آیت ''**لا اکراہ فی الدین**'' میں لفظ دین اپنے مفہوم کے لحاظ سے مروجہ لفظ ''مذہب'' سے بہت وسیع معنویت کا حامل ہے۔

قرآن میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱- کسی ملک یا ملت کے قوانین

۲- قانون کے مطابق سزا اور جزاء

۳- ایک قوت مطاع کی اطاعت

۴- طریقہ زندگی، جس میں عقائد اور اعمال شامل ہیں:

''**ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک**'' (ملکی قانون کے مطابق وہ اپنے بھائی کو گرفتار نہیں کرسکتا تھا)۔

''**دین الملک**'' میں دین کا لفظ دوسرے معنوں میں استعمال ہوا ''**لا اکراہ فی الدین**'' میں دین کا لفظ اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جس میں عقائد واعمال سبھی داخل ہیں۔ ایک فرد یا قوم کا طریقۂ زندگی درحقیقت اس نظریۂ حیات کا عکس ہوتا ہے،

جس کو وہ شعوری یا لاشعوری طور پر قبول کرتا ہے۔

دینی آزادی کا مفہوم:

جب مغرب میں انسانی زندگی کو دینیت اور لادینیت، روحانیت اور مادیت، مذہب اور ریاست کی مکمل اور مطلق ثنویت میں تقسیم کیا گیا، تو اس سے پہلے انسان کی تمام تر زندگی کی تشکیل، خواہ وہ پرائیویٹ ہو یا معاشرتی سب مذہبی عقائد پر ہی ہوتی تھی۔ مذہبی اقدار واصول زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہوتے تھے۔ عقائد، اخلاق، آداب وقوانین اور رسم ورواج سب ایک ہی کل کے مربوط اجزا سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے جب قرآن نے دین کے معاملے میں مکمل آزادی کا اعلان کیا، تو اس آزادی کا مفہوم مشہور صدر روزولٹ کی اعلان کردہ ''چار آزادیوں'' سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر کسی سلطنت میں کوئی قوم یا ملت اپنے شخصی قانون کی پیروی پر مصر ہو، تو اسے اس کی پوری آزادی ہونی چاہئے، اگرچہ دوسرے حقوق کی طرح اس حق کا استعمال بھی چند حدود کے اندر محصور ہوگا۔ اگر یہ بنیادی اخلاقی اقدار کے خلاف ہو یا معاشرے کے امن اور ملک کے دفاع میں خلل انداز ہو، تو اس پر عمل کرنے کی کلی ممانعت ہوگی، خواہ وہ کسی ملت یا قوم کے مذہب کا جزو ہی کیوں نہ ہو، مثلاً ایک اسلامی مملکت میں کسی بیوہ کو اپنے خاوند کی چتا پر جلنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، خواہ کسی ملت کے نزدیک یہ عمل کتنا ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ہر حالت میں بلاتفریق مذہب وملت ربا، جوا اور زنا مکمل طور پر حرام ہوں گے۔ اس قسم کی حدود اور پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف ملتوں اور قوموں کو اپنے عقائد واعمال کے مطابق زندگی بسر کرنے کی مکمل آزادی ہوگی اور اس بنیادی اصول کا جواز قرآن حکیم کی اسی آیت ''**لا اکراہ فی الدین**'' سے مستنبط ہے۔

صلح پسندی:

آنحضرت کی دفاعی جنگوں کے متعلق یہ غلط نقطۂ نگاہ پیش کیا جاتا ہے کہ آپ عرب کے بت پرست قبائل کو تلوار کے زور سے اپنے دین میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ کافی مدت تک آنحضرتؐ کی دفاعی جنگوں کے متعلق یہ غلط نقطۂ نگاہ پیش کیا جاتا ہے کہ آپ عرب کے بت پرست قبائل کو تلوار کے زور سے اپنے دین میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ کافی مدت تک آنحضرتؐ نے کوشش کی کہ لوگ مسلمانوں کو اپنے قائد اور نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دیں، تاکہ وہ اور مسلمان دونوں ایک پرامن ماحول میں اپنے طریقوں پر عمل پیرا ہوتے رہیں، لیکن آپؐ کو اس مقصد میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اس ناکامی کے بعد آنحضرت بقول کارلائل ایک انسان اور ایک عرب کی حیثیت سے مجبور ہوگئے کہ اپنے دین وعقیدے کی آزادی اور بقاء کے لئے قوت کا مقابلہ مناسب قوت سے کریں۔ وحشی اور ظالم قبیلوں کے ساتھ پرامن ترغیب اور رواداری ابرتاؤ ناممکن تھا۔ اگر ان کے خلاف قوت کا استعمال نہ کیا جاتا تو اسلام اسی وقت ختم ہوجاتا۔ ان کی ذہنیت کا اندازہ تو اس سے ہوسکتا ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کی خبر سنتے ہی انہوں نے مسلمانوں کی نوخیز مملکت کے مرکز مدینہ پر حملہ کردیا۔ اگرچہ انہوں نے بظاہر اسلام کی سیاسی طاقت کو تسلیم کرلیا تھا۔ یہ مسلمانوں کے بلند عزائم اور حوصلے کا نتیجہ تھا کہ وہ اس جوابی انقلاب کے ضرر رساں نتائج سے محفوظ رہے اور یہ رجعت پسند تحریک ہمیشہ کے لئے ختم کردی گئی۔ آنحضرتؐ کا رویہ ان لوگوں اور قبیلوں کے متعلق نہایت صلح کن اور رواداری کا بہترین مظہر تھا، جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ غیر جارحانہ رویہ اختیار کئے رکھا۔ جب وہ مکہ واپس آئے، جہاں ان وحشی اور ظالم لوگوں نے مسلمانوں پر ہر قسم کے جور وستم روا رکھے تھے، تو آنحضرتؐ نے ان تمام باتوں کو محض اس لئے فراموش کرکے انہیں معاف کردیا کہ اب اسلام کو ان سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔

یہود ونصاریٰ کی دل جوئی:

جب آنحضرتؐ پہلی دفعہ مدینہ پہنچے، جہاں کے باشندوں کی اکثریت نے انہیں دعوت دی تھی اور ان کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا تو وہاں یہودیوں کی ایک اقلیت بھی تھی، جو دولت اور زمین کی ملکیت کے لحاظ سے خاصی بااثر تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے ساتھ جس قسم کا معاہدہ کیا، اس سے اسلام کی روح کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ انہیں اپنے عقائد واعمال کی پیروی کرنے اور اپنے طریقۂ زندگی کو آزادی سے ادا کرنے کا مکمل حق تسلیم کیا گیا۔ اس کے ساتھ انہیں یہ یقین بھی دلایا گیا کہ اگر ان کے مقدمات آپ کے سامنے بھی پیش ہوئے، تو ان کا فیصلہ ان کی اپنی شریعت اور قانون کے مطابق کیا جائے گا، لیکن انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے کفار مکہ سے خفیہ ساز باز شروع کردی۔ انہوں نے پتھر کی ایک چٹان لڑھکا کر یا زہر دے کر آنحضرت ﷺ کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی اور ایک یہودی عورت نے تو آپ ﷺ کو زہر کھلا ہی دیا، لیکن خوش قسمتی سے اس کا اثر مہلک ثابت نہ ہوسکا۔ آپ ﷺ نے یہود ونصاریٰ کو یقین دلانے کی انتہائی کوشش کی کہ آپ کا مقصد محض ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ کے لائے ہوئے ابدی پیغام کی تکمیل ہے۔ ان کی فراخدلی سے تعریف کی۔ ان کی کتابوں کو الہامی اور ان کی تعلیمات کو نورِ ہدایت اور حیات افزا قرار دیا اور خود ان کو خدائے واحد کے سچے پیغمبر تسلیم کیا، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہودی ان سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ پیچیدہ اسرائیلی قوانین کی مکمل پیروی کریں اور عیسائی ان سے تثلیث، اوتاری اور کفارے کے عقیدوں کو تسلیم کرنے کی توقع رکھتے تھے، لیکن ان باتوں کو تسلیم کرنا آنحضرت ﷺ کی بنیادی تعلیمات اور اسلام کی اصلاحی تحریک کی روح کی منافی تھا۔ اس کے باوجود ان کی خواہش تھی کہ یہ دو ملتیں جو توحیدی عقیدے کی حامل تھیں، مسلمانوں کے ساتھ صلح، امن اور آشتی سے رہ سکیں۔ کیونکہ ان تینوں میں کم از کم ایک چیز تو

مشترک ہے یعنی عقیدۂ توحید: ''**قل یا اھل الکتاب تعالوا**.....'' الخ (۳:۶۴)

یہ پیشکش اس وقت قابلِ توجہ نہ سمجھی گئی، لیکن اب چودہ صدی کے بعد کم از کم عیسائی دنیا کے بہترین افراد بظاہر اس کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔ اس پیشکش میں صرف چند باتیں ہیں۔ ایک خدا پر ایمان، جو سب توحیدی مذاہب میں مشترک ہے اور خدا کے سامنے تمام انسانوں کی مساوات، یعنی کوئی فرد یا جماعت کسی شخص یا اشخاص کو اپنا خداوند یا الٰہ نہ تسلیم کرے۔ اس وقت بھی جب یہ پیشکش قبول نہ کی گئی تھی، مسلمانوں کو یہ ہدایت ملی تھی کہ وہ اہل کتاب سے ہر قسم کے بہترین روابط یا رشتہ مودت والفت قائم کریں، جو مشرک اور کفار کے ساتھ ممکن نہ تھا، چنانچہ مسلمانوں کو اجازت تھی کہ وہ یہود ونصاریٰ کی عورتوں سے تبدیل مذہب کا تقاضا کئے بغیر شادی کر سکتے ہیں اور ان کے اکل وشرب میں شامل ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں نیک عیسائیوں کی خاص طور پر تعریف کی گئی ہے کہ وہ اپنے ایمان اور ہمدردیوں میں مسلمانوں سے نزدیک ترین ہیں اور خدا کی محبت میں سرشار اور عجز وانکساری کے پتلے ہیں۔

ایک دوسری جگہ قرآن میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ایک قوم کے تمام افراد یکساں نہیں اور اس لئے محض کسی ایسی قوم کا فرد ہونا، جس کو تم ناپسند کرتے ہو یا جو تمہاری دشمن ہے، اس کے خراب ہونے کی دلیل نہیں۔ افراد کی اچھائی یا برائی کا معیار بھی انفرادی ہونا چاہیے نہ کہ مجموعی۔

عبادت گاہوں کا احترام:

انصاف کے معاملے میں دوست دشمن مسلم وغیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ اخلاقی یا قانونی حدود میں معیار ایک اور یکساں ہونا چاہیے اور اس میں کسی قسم کی دوئی قابل برداشت نہیں سمجھی گئی۔ ہر قسم کا جارحانہ اقدام ممنوع قرار دیا گیا۔ قرآن میں بے شمار آیات ہیں، جن میں

یہ چیز دہرائی گئی ہے کہ خدا حدود اللہ سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام کا بنیادی نظریۂ حیات تمام دیگر ادیان کو صرف آزادی دینا ہی نہیں، بلکہ سیاسی نظام اور معاشرتی ماحول میں ان کی مکمل حفاظت کا انتظام بھی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت دیکھئے: ''**ولو لا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت**''. (الحج:۴۰)

یہ چیز قابلِ غور ہے کہ ایسی کتاب جو اسلام کی داغ بیل رکھ رہی ہے، اس میں دوسرے ادیان کے معبدوں کی حفاظت کا ذکر مسجدوں کی حفاظت سے مقدم ہے، اپنے معبدوں کی حفاظت ایک فطری بات ہے اور یہ اجتماعی نفسیات کی ایک بنیادی حقیقت ہے، ایسے حالات میں جب مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا جائے وہ دوسرے ادیان کے پیروؤں کے معبدوں کی حفاظت کو اپنی مسجدوں سے بھی مقدم سمجھیں، تو انسانیت کی تاریخ میں گویا ایک عظیم الشان انقلاب کی داغ بیل ڈالنا ہے۔ دوسرے مذاہب اور ان کی آزادی کو برقرار رکھنے کا یہی شدید جذبہ تھا، جس کے باعث ابتدائی جنگوں میں مسلمانوں نے نہتے شہریوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی ہمیشہ حفاظت کی۔ کسی مذہب کے پجاریوں، پروہتوں اور راہبوں پر تلوار نہ اٹھائی اور نہ کسی عبادت گاہ کو مسمار ہونے دیا۔ ان جنگوں کا مقصد تمام انسانوں کی آزادی کو بحال کرانا تھا، نہ کہ کمزوروں اور مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کا استیصال، فلسطین کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ بذاتِ خود وہاں پہنچے، ان کے ساتھ کوئی حفاظتی فوجی دستہ نہ تھا۔ ایک ہی اونٹ پر وہ اور ان کا ملازم باری باری سفر کرتے رہے۔ حضرت عمرؓ عیسائی بشپ کے ساتھ محو گفتگو تھے کہ نماز کا وقت آ گیا اور آپ نے بشپ سے باہر جا کر نماز پڑھنے کی اجازت چاہی، لیکن بشپ نے گرجا ہی میں نماز پڑھنے کی پیش کش کی۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ٹھیک ہے ہم خدا کی زمین پر ہر جگہ نماز ادا کر سکتے ہیں، لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے اس عمل سے آئندہ زمانے میں مسلمان اس گرجے کو مسجد میں تبدیل کرنے کا جواز نہ پیدا کر لیں۔ اس سے اسلام کی صحیح ہیئت سامنے آ جاتی ہے کہ اس کا مقصد تمام ادیان وعقائد

کی آزادی کو بحال کرنا تھا نہ کہ دوسروں کی آزادی پر ڈاکہ ڈالنا اور ان پر غاصبانہ حملہ اور قبضہ کرنا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں ایک عیسائی وفد کے اراکین کو اپنی مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دی۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہماری عبادت میں موسیقی دار غنون وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ آپ کے خیال میں مسجد میں یہ چیز مناسب نہ ہو، لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کو اپنے طور پر نماز ادا کرنے کی اجازت دی۔ کیا کوئی ایسا روادار و فراخ دل پیغمبر دوسرے مذاہب وعقائد کے خلاف کسی قسم کی سختی اور تنگ نظری روا رکھ سکتا تھا۔ قرآن کریم میں ایک جگہ آتا ہے، کہ اس دنیا کے انسان کبھی ایک عقیدے اور ایک نظریے کے پیرو نہیں ہو سکتے اور اس لئے ان کے شرائع اور رسوم ورواج میں اختلافات یقیناً موجود رہیں گے، لیکن ان کے اختلافات کے باوجود ہر ایک کی یہی کوشش ہونی چاہئے اور یہی اصل چیز ہے کہ خیر کے حصول کی انتہائی کوشش کی جائے اور اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا عزم کیا جائے۔ ''**لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجا..... فاستبقوا الخیرات**''. (۵:۴۸)

آزادی و رواداری:

یہی وہ نظریہ تھا، جس کے باعث مسلمان ملکوں میں اسلامی سیاسی استیلاء کے باوجود غیر مسلم ملتیں اپنی انفرادی زندگی اور تمدن وتہذیب کو برقرار رکھ سکیں۔ عیسائی کلیسا سے ناقوس کی آواز متصلہ مسجد کی اذان کے ساتھ بلند ہوتی تھی۔ ہسپانیہ میں تقریباً آٹھ صدی تک مسلمانوں کی حکومت رہی، لیکن انہوں نے کبھی دباؤ یا جبر سے غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوشش نہ کی۔ ان کی اس حکمت عملی ہی کا نتیجہ تھا کہ جب مسلمانوں کی فوجی طاقت کمزور ہوئی، تو غیر مسلم اکثریت نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور ان کی عطا کردہ ثقافتی اور مذہبی آزادی کا بالکل پاس نہ کیا۔ وہ تمدن وتہذیب، جو مسلمانوں نے وہاں پیدا کیا اور

جس کی ضیا پاشوں سے تمام یورپ بعد میں منور ہوا، اس متعصّبانہ لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت کے بعد ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا۔ ترکوں نے مشرقی یورپ پر چار صدی تک حکومت کی اور مختلف عیسائی فرقوں اور گروہوں کو مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی دے رکھی۔ ایک عثمانی سلطان نے تمام غیر مسلم رعایا کو جبراً مسلمان کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن علماء نے قرآنی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی شدید مخالفت کی۔ انہوں نے اصول کی خلاف ورزی کرنے کے بجائے اقلیت میں رہنے کو ترجیح دی۔ اگرچہ آخر کار اس کے سیاسی نتائج ان کے حق میں اچھے نہ ثابت ہوئے۔

برعظیم پاک وہند میں یہی صورتِ حال تھی کسی سیاسی یا تبلیغی کوشش کے بغیر، ہندو عوام برہمنوں کی ذات پات کی تقسیم کے شدید عملی مضرات سے تنگ آ کر مسلمان ہوتے رہے اور یہ عمل اس وقت بھی جاری رہا جب مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ختم ہو گیا، حتیٰ کہ پنجاب میں سکھوں کے تاریک ترین دورِ حکومت میں بھی، جب شاہی مسجد رنجیت سنگھ کے اصطبل میں تبدیل کی جا چکی تھی، اسلام کی فتوحات بدستور جاری رہیں۔ اسی طرح جس طرح افریقہ میں عیسائی مشنری تنظیم اور کثیر دولت کے علی الرغم مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا باعث صرف اسلام کی سادہ تعلیم، غیر عقلی عقائد کا فقدان اور انسانی مساوات کے تصورات ہیں۔ انڈونیشیا میں بھی اسلام اس وقت پھیلا جب وہاں ہالینڈ کے عیسائی حکمران اپنے عقائد کی تبلیغ کے لئے سیاسی قوت اور سرمایہ صرف کرنے میں دریغ نہیں کر رہے تھے۔

یہودی جو قبل مسیح اور بعد میں خود عیسائی سلطنتوں اور علاقوں میں ہمیشہ ظلم وستم کا تختۂ مشق بنے رہے۔ ان کو اسلام کے بعد چین اور آرام کی زندگی میسر آ سکی۔ کسی شہر میں یہودی باڑہ نہ تھا، مغربی عیسائی سلطنتیں ان پر ظلم کرتیں تو وہ پناہ لینے اسلامی ملکوں میں جا پہنچتے جہاں ان کے لئے دوسرے باشندوں کی طرح ترقی کی تمام مواقع کھلے تھے۔ کسی اسلامی ملک میں ملک یہودیوں کے خلاف نہ کبھی جذبۂ عناد پیدا ہوا اور نہ ان پر حملے ہوئے، لیکن بدقسمتی

سے جدید دور میں ان مراعات اور رواداری کے بدلے میں جو سلوک بین الاقوامی جارحانہ صیہونیت نے کیا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔

غیر مسلموں سے معاہدے:

عیسائیوں اور یہودیوں کے متعلق جو رویہ مسلمانوں کا رہا ہے اس کے متعلق دو واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے مدینے کے یہود سے جو معاہدہ کیا، اس کے الفاظ درج ذیل ہیں: ''ان یھود.....'' الخ۔

''بنی عوف کے یہود مسلمانوں کی طرح ایک ملت شمار ہوں گے۔ ہر قسم کے حملے کے خلاف ان کا دفاع مسلمانوں کے ذمہ ہوگا۔ ان دنوں کے تعلقات خوش سگالی اور باہمی مشترکہ مفاد پر مبنی ہوں گے۔ یہود کے حلیف مسلمانوں کے حلیف شمار ہوں گے اور ہر مظلوم کی حمایت کی جائے گی، خواہ وہ کسی گروہ سے ہو۔''

نجران کے عیسائیوں کو جو آزادی کا منشور دیا گیا اس کے الفاظ یہ ہیں: ''لنجران جواز''۔ الخ۔

''نجران کے عیسائی خدا اور اس کے رسول کی حفاظت میں ہوں گے۔ ان کی جان و مال، عقائد اور علاقوں کی حفاظت کی جائے گی اور یہ حفاظت کی ذمہ داری نہ صرف ان تک محدود ہوگی، جو اس وقت موجود ہیں بلکہ پر ان بھی عائد ہوگی، جو اس وقت موجود نہیں (یعنی آنے والی نسلیں) اور ان پر بھی جو اس قبیلے کی حفاظت میں ہیں (وہ اس قبیلے سے متعلق ہوں یا نہ ہوں)۔''

فلسطین پر قبضہ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے جو آزادی کا منشور ایلیاء کے باشندوں کو دیا، اس کے الفاظ درج ذیل ہیں: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم.....الخ۔

''یہ امان کا وہ منشور ہے، جو خدا کے بندے عمر امیر المومنین نے ایلیاء کے باشندوں کو

دیا۔ ان کی جان و مال، گرجاؤں اور صلیبوں کی حفاظت کی جائے گی۔ ہر شہری خواہ وہ تندرست ہو یا بیمار، ہماری امان میں ہوگا۔ صلیبوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا، نہ ان پر کسی قسم کا مذہبی دباؤ ڈالا جائے گا اور نہ کسی کو پریشان کیا جائے گا۔''

آذربائیجان، جرجان اور مدائن کے شہریوں کو جو امان نامے حضرت عمرؓ نے دئے، ان کے الفاظ بھی تقریباً ایسے ہی ہیں۔ صرف یہ اضافہ ہے کہ ان کے مذہبی قوانین کی حفاظت کی جائے گی اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے اور ان کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔

تبلیغ کے طریقے:

قرآن میں اسلام کی تبلیغ و توسیع کے لئے قوت یا دباؤ کا استعمال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے عملی کردار سے دوسروں کو متاثر کریں اور ان کے سامنے ان ابدی حقائق کو پیش کریں، جن کی اسلام نے تصدیق کی ہے اور ان حقائق کو بھی جو وسیع تر اور ارتقاء پذیر انسانیت کے لئے ناگزیر ہیں۔ قرآن کریم نے اس کام کے لئے صرف تین طریقوں کی اجازت دی ہے اور آنحضرت ﷺ کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششیں صرف ان ذرائع کے استعمال تک محدود رکھیں۔

''ادع الیٰ سبیل ربک..... (الخ'' .(۱۶:۱۲۵)

(اے پیغمبر! لوگوں کو اپنے خدا کے راستے کی طرف حکمت، موعظت اور اچھے دلائل کے ساتھ دعوت دو)۔

مذہبی جھگڑوں میں عام طور پر لوگ مخالفین کے قابلِ حرمت اشخاص اور اشیاء کے متعلق ناواجب اور ناروا الفاظ استعمال کرتے ہیں، قرآن نے اس قسم کے غیر مہذب حملوں سے منع کیا ہے۔ حتیٰ کہ مشرکین کے جھوٹے دیوتاؤں کے متعلق بھی برے الفاظ استعمال

کرنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اس طرح ان کی طرف سے خدائے واحد کے خلاف غلط باتیں منسوب کئے جانے کا خطرہ ہے۔

"ولا تسبو الذین..... (الخ". (۱۰۶:۱۰۲)

"قل یایها الکفرون لا اعبد..... الخ". (۱۰۹:۱۰۲)

اس سورت میں آنحضرت ﷺ کو اعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ معبود کے متعلق مخالفین میں کسی قسم کی مصالحت کی گنجائش نہیں، اس لئے مختلف عقائد کے پیروؤں کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کو مکمل آزادی دیں۔ صداقت اور کذب واضح ہو چکے ہیں، اس لئے اب لوگوں کو سوچنے اور آزادی سے اپنا راستہ اختیار کرنے کا موقع دینا چاہئے۔

"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی". (۲:۲۵۶)

"فان اعرضوا فما ارسلنک علیهم..... (الخ)" (۴۲:۴۸)

(اے رسول! اگر وہ صداقت سے اعراض کریں، تو انہیں چھوڑ دو، جب تم نے پیغام پہنچا دیا، تو تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا)۔

"لست علیهم بمصیطر". (۸۸:۲۲)

"قل لست علیکم بوکیل". (۶:۶۶)

"نحن اعلم بما یقولون وما انت علیهم بجبار". (۵۰:۴۵)

اے رسول! ہم جانتے ہیں، جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ تم انہیں ایمان لانے کے لئے مجبور کرنے پر مامور ہوئے ہو۔ کچھ یہودی مسلمان ہو چکے تھے، لیکن ان کے بیٹے ابھی اپنے قدیم دین پر تھے۔ ان کے والدین نے ان کو مجبور کرنا چاہا، تو اس وقت پر یہ آیت اتری کہ لا اکراہ فی الدین ایک دوسری جگہ یہی تنبیہ دہرائی گئی۔ "افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین". (۱۰:۹۹)

بنیادی تصور:

اسلام نے جو رویہ دوسرے ادیان کے متعلق اختیار کیا ہے، اس کی بنیاد اس تعلیم پر کہ صحیح دین ہمیشہ سے توحیدی رہا ہے اور ان تمام توحیدی ادیان کے ہاں بنیادی اخلاقی اقدار مشترک رہے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں پیغمبر اور رسول مختلف قوموں کے پاس آتے رہے ہیں، جو انہیں صحیح تعلیم دیتے رہے، لیکن مرورِ زمانہ سے یہ تعلیم خراب ہوتی رہی۔ ایک مسلمان کو تمام مذاہب کی اصلی اور بنیادی سچائیوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ غیر مسلموں نے عام طور پر آنحضرت پر حملہ کرنا ضروری سمجھا اور مغرب نے جو کتابیں اسلام پر لکھی ہیں، ان میں اس ترقی پذیر، لبرل دین کی غلط ترجمانی کے علاوہ آپ کی ذات کے خلاف زہریلے حملے کئے گئے ہیں، لیکن اپنے عقائد کی رو سے مسلمان ان کا ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے۔ اس لئے اسلامی کتب میں کسی دین کے رہنما کے متعلق ناروا حملے نہیں پائے جائیں گے۔ کوئی مسلمان ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام یا دوسرے نبیوں کے خلاف کیسے منہ کھول سکتا ہے؟ قرآن میں مذکور ہے کہ لاتعداد رسولوں میں سے صرف چند کا ذکر کیا گیا ہے، اس لئے غالب خیال یہ ہے کہ وہ نیک ہستیاں جن کو ہندو یا چینی نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ بھی حق تعالیٰ کے پیغمبر ہوں گے۔ وہ قومیں جن کے پاس الہامی کتابیں ہیں، ان کو اہل کتاب کہا جاتا ہے۔ عرب میں صرف عیسائی اور یہودی ہی ایسی دو قومیں آباد تھیں۔ اس کے بعد کئی اور قوموں سے بھی انہیں ملنے کا اتفاق ہوا، جن کے ہاں قدیم دینی روایات تھیں۔ اس نے اہل کتاب کی اصطلاح ان سب پر حاوی ہے اور مسلمانوں کو حکم ہے کہ ان کے اور اپنے درمیان عقائد کے اشتراک اور اتفاق و ہم آہنگی کی نشان دہی کریں، تاکہ باہم میل جول اور خیر سگالی کی تعلق قائم کرنے میں آسانی ہو۔ قرآن نے توحیدی عقائد رکھنے والے گروہوں سے جو تعاون کی اپیل ہے، وہ تمام مذہب انسانیت سے تعاون کی اپیل کی ہے، لیکن اگر کوئی قوم چھوٹی چھوٹی یا بڑی الحادی مادیت کو مع اس کے تقاضوں کو بطور عقیدہ قبول کرتی ہے، تو

اس سے البتہ کسی قسم کا تعاون کرنا بہت مشکل ہے، لیکن پھر بھی قرآن کی دعوت یہی ہے کہ ہر اس شخص اور گروہ سے تعاون کیا جائے جو نیکی اور بھلائی کی تعلیم دیتا اور ان پر عمل کرتا ہے اگر لادین اشخاص بھی اخلاقی کوشش میں دیانت داری سے تعاون کرتے ہیں تو اس حد تک ان سے تعاون کیا جا سکتا ہے:

"تعاونوا علی البر..... الخ". (۵:۲)

تمام توحیدی مذاہب میں نیکی اور تقویٰ کی تعریف تقریباً یکساں طور پر کی گئی ہے۔ اس لئے تعاون کا دائرہ خاصا وسیع ہے، لیکن جہاں اس کے متضاد نظریات کارفرما ہوں وہاں تعاون کا حلقہ بہت محدود ہو جاتا ہے۔ دوسرے توحیدی مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ اسلام کا رویہ محض سلبی اور انفعالی رواداری کا نہیں، بلکہ ایجابی افہام و تفہیم کا ہے۔ قرآن میں نجات یافتہ افراد کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ رنج و خوف سے بالا ہیں۔ قرآن ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو صداقت یا نجات کی اجارہ داری کا دعویٰ کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں دو جگہ ذکر کیا گیا ہے کہ کائنات کی بنیادی صداقتیں یہ ہیں: خدائے واحد پر ایمان، موت کے بعد انسانی انا کی بقا اور ایک اخلاقی نظام کا وجود جس کے باعث موت کے بعد انسان کو اس کے اعمال کے مطابق سزا اور جزا ملتی ہے۔ جو شخص بھی ان صداقتوں پر ایمان لائے اور نیک اعمال کرے، وہ نجات یافتہ ہے اور اس نے اپنا فرض ادا کیا، خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔

"ان الذین آمنوا.....". (۲:۶۲)

لوگوں میں رسم و رواج اور شرائع کے لحاظ سے اختلاف ہوتا رہے گا اور ایک ہی منزل تک پہنچنے کے لئے مختلف راستے اختیار کئے جاتے رہیں گے، لیکن تمام وہ لوگ جو ایک روحانی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں، سب نجات پائیں گے، بعض تنگ نظر مسلمان علماء نجات کے متعلق قرآن کے اس فراخ دلانہ رویے کو پسند نہیں کرتے اور اسے اپنی اجارہ داری کے

خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ اس کی تشریح اس کے واضح مفہوم کے بالکل برعکس کرتے ہیں۔ ان کی ذہنیت تقریباً وہی ہے جس کا تذکرہ قرآن نے متعصب اور تنگ نظر عیسائی اور یہودی علماء کے متعلق کیا ہے:

"قالت الیھود لیست النصاریٰ علیٰ. الخ" (۲:۱۱۳)

لارڈ ہیڈلے نے خود مجھ سے بیان کیا کہ جب انہوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کیا، تو ان کا ایک عزیز ترین دوست ایک بشپ ان کے پاس آیا اور کہا: "مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اس تبدیلی مذہب سے جہنم واصل ہو جاؤ گے۔" ہیڈلے نے جواب دیا: "تمہارے مذہب کی یہی تنگ دلی اور تعصب ہے، جس نے مجھے ان کو چھوڑ کر ایک دوسرے زیادہ لبرل مذہب میں داخل ہونے پر مجبور کیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ چونکہ میں نے چند اذعانات پر ایمان لانا ترک کر دیا ہے، اس لئے میں جہنم میں جاؤں گا، لیکن اسلام جس کو میں نے اختیار کیا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ چونکہ تم خدا پر ایمان رکھتے ہو اور بہت اچھے آدمی ہو، اس لئے تم جہنم میں نہیں جاؤ گے۔ اسلام کا خدا ان چھوٹے مسائل کے متعلق متعصب اور تنگ نظر نہیں۔" عقلیت پسند، انسیت کے علمبردار اور تجربیت پر یقین رکھنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ مذہب انسانوں میں تفریق اور اختلاف پیدا کرتا ہے، لیکن قرآن کا خیال ہے کہ یہ خرابیاں مذہب کے باعث نہیں، بلکہ مذہب کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسلام انسانیت کی بنیادی وحدت کا قائل ہے، جو ابدی حقائق کے مشترکہ حلقے میں ناگزیر اور شائد پسندیدہ کثرت کو تسلیم کئے بغیر ممکن الحصول نہیں۔ صحیح اور خیر سگالی، محبت اور تعاون و تفہیم کا دائرہ وسیع ہو جائے۔

☆☆

محمد ﷺ بے زبانوں کے ہمدرد وغمگسار

● مولانا محمد سعیدی

اسلام ایک آفاقی اور ابدی مذہب ہے، جس کی خوبیوں اور خصوصیتوں کو پورے طور پر حیطۂ تحریر میں لانا مجھے بے بضاعت کے لئے ناممکن ہے تاہم اتنا ضرور عرض کروں گا کہ سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت سے سسکتی، بلکتی اور دم توڑتی انسانیت نے سکون واطمینان کا سانس لیا، جاہلیت اور اس کے رسوم سے چھٹکارا ملا، کالے گورے کا امتیاز مٹا، عربی اور عجمی کا فرق ختم ہوا، عجمی پر عربی اور عربی پر عجمی کو کوئی فضیلت نہیں۔ ''**لا فضل لعربی علیٰ عجمی ولا لعجمی علیٰ عربی ولا فضل لاحمر علیٰ اسود ولا لاسود علی احمر**'' معیار فضیلت تقویٰ ہے۔''**ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم**'' (تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔)

محسن انسانیت ﷺ کا یہ پیغام پوری دنیا کے لئے تھا، دنیا کے کسی بھی خطہ اور علاقہ میں کوئی بھی انسان آباد ہو، اس کی فلاح وبہبود اس کی کامیابی وکامرانی، اس کی تعمیر وترقی اور اس کے عروج وارتقا کی ضمانت صرف اور صرف اسلام کی تعلیمات میں پوشیدہ ہے۔

اسلام نے بنی نوع انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لئے جو اصول وضع فرمائے ہیں وہ صرف اسلام ہی کے لئے نہیں، بلکہ پوری دنیا کے دیگر مذاہب وادیان کے لئے بھی مفید ثابت ہوئے ہیں۔ صدق وسچائی، اخلاص ومروت، طہارت وصفائی عفوودرگزر، حلم وبردباری، انسانی طبقات کے لئے نفع رسانی، جانوروں، پرندوں، چرندوں اور درندوں

کے لئے محسن انسانیت ﷺ نے اصول مقرر فرمائے تھے وہ اصول چودہ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی روشن ومنور ہیں اور مسلمانوں کے علاوہ اغیار بھی اس سے استفادہ کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

جارج برناڈ شاہ نے کہا تھا ''دنیا کا آخری مذہب اسلام ہوگا'' اور یہی حقیقت ہے۔ نام کے مذاہب، اسلام کی حقیقت اور اصلیت کے سامنے کہاں ٹک سکتے ہیں؟

آپ ﷺ نے اپنے قول وعمل سے اسلام کی روشن، قابل اور لائق استفادہ تعلیمات کو آشکارا کردیا، اسلام کسی پر ظلم کی اجازت نہیں دیتا، اسلام اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ غیر مسلم طبقات کے لئے بھی دردمند دل رکھتا ہے، ان کے حقوق کی پامالی کی اجازت نہیں دیتا، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک، چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کا ادب، صنف نازک کی عفت وعصمت کا غایت درجہ پاس ولحاظ، زہد وایثار، سادگی وقناعت، نیک چلنی، کیریکٹر کی بلندی، صبر وتحمل، رفق ونرمی، امن وصلح جوئی، شرم وحیاء، خاکساری وتواضع، عہد ومعاہدہ کی پابندی، کسب حلال، محنت ومشقت، عدل ومساوات، اخوت وبھائی چارگی، اقتصادی معاشی اور صنعتی امور کی راہ نمائی، اخلاق وکردار کی بلندی، ہوائے نفسانی سے اجتناب وکنارہ کشی، حق گوئی وحق شناسی، تعلیم وتربیت، یتیم کی پرورش اور جانوروں تک کے حقوق کا خیال رکھتا ہے۔ آپ ﷺ خود بھی ان تعلیمات پر عمل پیرا رہے اور اپنے متبعین کو بھی ان امور پر چلنے کی تلقین وہدایت فرماتے رہے۔

آپ ﷺ ایک طرف تو معاشرہ کی اصلاح کے لئے دن رات مصروف عمل رہے۔ دوسری طرف بدنظری، بے پردگی، اختلاط مرد وزن، فحاشی، شراب نوشی، زناکاری، حرام خوری، جوا قمار، سود ورشوت اور اس قسم کی دیگر لعنتوں سے بنی نوع انسانی کو دور رہنے کی ہدایت فرماتے رہے۔

تجارت میں دیانت کو فوقیت دی، امانت میں خیانت سے منع کیا، سچائی اور صفائی کی

تعلیم دی، ناپ تول میں کمی پر متوجہ کیا، دھوکہ دہی، فریب اور ملاوٹ سے بھی ممانعت فرمائی، خراب مال دینے سے منع کیا، تولتے وقت جھکتا ہوا تولنے کی ہدایت فرمائی۔

حضرت محمد ﷺ کی سیرت مقدسہ میں ایسے بے شمار واقعات آپ کو ملیں گے کہ آپ ﷺ نے محض انسانی حقوق کا خیال نہ رکھا، بلکہ بے زبانوں کی زبان کو بھی سمجھا ان کے درد کو اپنے نہاں خانہ دل میں محسوس کیا، جانوروں کے کھانے پینے کی ضرورت پر دھیان دیا، چنانچہ ابوداؤد شریف میں ایک روایت ہے کہ ایک اونٹ نے آپ ﷺ کو دیکھ کر بلبلانا شروع کیا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ آپ ﷺ اس کے پاس تشریف لائے، اس کو کنپٹیوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا جب وہ چپ ہوا تو آپ ﷺ نے اس کے مالک کا پتہ لگایا اور اس سے فرمایا کہ کیا تم جانوروں کے بارے میں خدا کا خوف محسوس نہیں کرتے جن کا خدا نے تمہیں مالک بنایا ہے، اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسے تکلیف دیتے ہو، کام زیادہ لیتے ہو ڈاس کے کھانے پر توجہ نہیں دیتے۔

جو لوگ تیتر، مرغ اور کبوتر یا دیگر جانوروں کو بغرض تفریح لڑاتے ہیں وہ بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف کرتے ہیں اور شیطانی لہو لعب میں شامل ہیں جس سے اجتناب ضروری ہے کیونکہ اس سے بھی جانوروں کے حقوق کی پامالی اور ان کی جان کے اتلاف کا خدشہ واندیشہ رہتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے ''سیرت النبی ﷺ'' میں ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ایک سفر میں آپ کے کچھ ساتھی ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے، چڑیا اپنے بچوں کا ممتا میں ان کے اوپر منڈلانے لگی، آپ ﷺ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا کہ اس چڑیا کے بچوں کو پکڑ کس نے اس کو بے قرار کیا اس کے بچوں کو چھوڑ دو۔

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر آپ ﷺ سفر میں تھے، ساتھیوں نے کھانا پکانے کے لئے چیونٹیوں کے بل پر آگ جلائی تو حضور ﷺ نے فوراً حکم دیا کہ اسے جلدی بجھاؤ۔ یہ

واقعات تو اس پاک ذات سے متعلق ہیں جو بانی شریعت تھے، لیکن متبعین شریعت میں بھی اللہ کے بعض ایسے بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنی ایمانی استقامت اور اسلام کے جادہ مستقیم سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے عراق کی فتح کے دوران بغداد کے ایک خیمہ کو محض اس لئے چھوڑ دیا کہ اس کے اوپری حصہ میں ایک کبوتری نے انڈے دے رکھے تھے اور کبوتری ان انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی، خیمہ اکھاڑنے کی صورت میں انڈے ضائع ہوجاتے، کبوتری کو تکلیف ہوتی، چنانچہ اس خیمہ کو اس وقت کے لئے اکھاڑنے سے منع فرمادیا جب تک ان انڈوں سے بچے نکل کر اڑنے کے لائق نہ ہوجائیں۔

حضرت شبلیؒ ایک بار شہر سے گیہوں خرید کر گاؤں پہنچے، جب گٹھر کھول کر دیکھا تو ایک پریشان حال چیونٹی نظر آئی، آپ کو اس پر ترس آیا کہ نہ معلوم اپنے کس عزیز سے الگ ہوگئی ہوگی۔ اس چیونٹی کی پریشانی کو دیکھ کر اس گندم کو پھر باندھا، سر پر لاد کر شہر پہنچے اور اسی دکان پر گٹھری کھول کر اس چیونٹی کو آزاد کردیا۔

حضرت ابو حامد دوستانؒ مرو میں ایک دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے، سقہ نے پانی دیا، آپ کچھ دیر تک پانی کے کٹورے کو پکڑے رہے، کسی نے پانی نہ پینے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ ایک مکھی پانی پی رہی ہے وہ سیراب ہوجائے اس وقت تک میں صبر کررہا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دوست کسی کی تکلیف دیکھ کر کچھ کھاتے پیتے نہیں۔ حضرت مولانا رومؒ کے راستہ میں ایک کتا سو رہا تھا، گلی تنگ تھی، راستہ رک گیا، مولانا روم وہیں کھڑے رہے، اسی دوران ایک دوسرے راہ گیر نے کتے کو ہٹا دیا تو مولانا آزردہ ہوئے اور فرمایا اس کو ناحق تکلیف دی۔ حضرت محمد الترمذیؒ ایک بزرگ گزرے ہیں ان کی ایک مختصر سی کٹیا تھی، جس میں گزر بسر کرتے تھے، آپ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، تو موقعہ پا کر ایک کتیا نے اس کٹیا میں بچے جن دئے، جب واپس تشریف لائے تو یہ ماجرا دیکھا، لیکن ہٹانے کی ہمت نہ کرسکے، کیونکہ اس کو تکلیف ہوتی، پھر بھی اس دوران ستر بار اس خیال سے آتے

جاتے رہے کہ شاید کتیا از خود اپنے بچوں کو لے کر باہر چلی جائے۔

اس قسم کے سینکڑوں واقعات تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں جن کو پڑھ کر عقل انسانی حیران وششدر رہ جاتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں تمام مذاہب سے زیادہ حقوق کا پاس ولحاظ رکھا گیا ہے۔

آج کے دور میں اسلام کو مکمل صداقت وحقانیت اور تعلیمات کے ساتھ عملی طور پر سمجھے جانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ آج کی تہذیب اور آج کی معاشرت اس چیز پر دھیان نہیں دیتی کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کتابوں میں کیا لکھی ہیں، شارع اسلام محمد ﷺ نے کیا فرمایا ہے، صحیفہ ربانی قرآن کریم نے کیا کہا ہے، بلکہ عام طور پر لوگ دیکھنے کے عادی اور خوگر بن گئے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کا اثر لوگوں پر کیا ہے، ہمارا طور طریقہ کیا ہے، ہمارے قول وعمل میں تضاد تو نہیں، ہمارے افکار ونظریات میں کمی تو نہیں، دنیا ہماری زندگیوں کو اسلام کا ترجمان سمجھنے لگی ہے، اس لئے حقیقت میں ہمیں اسلام کی پاسبانی اور ملت اسلامیہ کی جہاں بانی کے لئے خود کو بھرپور طریقہ سے تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

☆☆

کتاب اللہ کی تفسیر اسوۂ رسول اللہ

● حضرت مولانا مفتی ثمین اشرف قاسمی

قرآن مجید حق جل مجدہ کی آخری کتاب ہے، جو جامعیت اور مرکزیت کا مقام رکھتی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی ذات جامع کمالات ظاہری وباطنی کا مظہر اتم ہے، دو ایسی نعمتیں حق جل مجدہ نے اس امت کو عطا کی ہے۔ جو تمام نعمتوں پر فائق وبرتر ہے۔ کتاب اللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ، کتاب اللہ کا رشتہ حق جل مجدہ سے جس طرح جدا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ کا رشتہ بھی دونوں سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا ہے، خود کتاب اللہ کی جامعیت اور اس کی صحیح مراد سمجھنے کے لئے یقیناً ایک ایسے معلم کی بھی ضرورت تھی، جو تعلیم کے ساتھ ساتھ کتاب اللہ کی عملی تفسیر بن کر لوگوں کے سامنے پیش ہو۔ کیونکہ کتاب اللہ صرف ایک علمی کتاب نہیں جس کا مقصد صرف علمی طور پر حاصل کر لینا ہو اور بس، بلکہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا مقصد بھٹکتی ہوئی دنیا اور تہذیب وتمدن سے عاری قوم کو ایک دستور العمل سے آراستہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ایک ایسے معلم کی ضرورت تھی جو دستور کی تعلیم کے ساتھ دنیا کے سامنے دستور پر عمل کر کے بتلائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی کے لئے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔

دنیا میں بے شمار ایسے علوم ہیں جو پریکٹس کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے ہیں، جیسے سائنس اور ڈاکٹری کے علوم، جب تک تجربات اور پریکٹس نہیں کئے جاتے ہیں اس وقت تک کوئی بہترین ڈاکٹر اور سائنٹسٹ نہیں ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے جہاں یہ علوم پڑھائے جاتے ہیں

وہاں لیب کا اعلیٰ پیمانہ پر انتظام ہوتا ہے۔

جب ان معمولی علوم کا یہ حال ہے۔تو پھر ربانی علوم کو بغیر کسی معلم کے کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔اس لئے ضروری تھا کہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معلم کو مبعوث کیا جائے جو اللہ کے احکامات کی تعلیم کے ساتھ اس پر عمل کر کے بھی دکھلائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول صرف وحی لے کر نہیں آتے، بلکہ عملی طور پر احکام الٰہی کے نمونہ بھی ہوتے ہیں۔ ہر عمل میں ان کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔اسی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے امت محمدیہ کے سامنے کتاب اللہ کی تعلیم کے ساتھ اسوۂ بن کر خود کو پیش کیا۔ قرآن مجید نے اس کی گواہی یوں دی ہے۔

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْراً". (احزاب آیت: ۲۱ پارہ ۲۱)

(تم لوگوں کے لئے جو اللہ سے اور روز آخیرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا)۔

آپ ﷺ نے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، امارت وامامت غزوات وجہاد، نظم ونسق اور فصل خصومات الغرض قرآن کے ہر چھوٹے بڑے احکام کی عملی تصویر دنیا والوں کے سامنے پیش کیا۔شعبہ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ باقی نہیں ہے جس میں آپ ﷺ کے عمل سے رہنمائی نہ ملتی ہو۔ بلکہ جو کچھ قرآن میں کہا گیا تھا وہ سب آپ ﷺ کی زندگی مبارک میں موجود ہے۔

ایک شخص نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا آپ ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا: قرآن ہی آپ کا خلق تھا۔خلق میں اقوال وافعال سب داخل ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آپ کا کوئی قول کوئی فعل ایسا نہیں ہے جو قرآن سے باہر ہو، گویا اسوۂ رسول کی جامعیت بھی کتاب اللہ کی ہم رنگ ہے۔اس لئے آپ کی ذات بلا کسی تفصیل کے تمام عالم کے لئے اسوہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں جن احکامات کو کرنے کا حکم دیا ہے اگر اس کے لئے عملی پریکٹس کی ضرورت ہو تو ہو آپ ﷺ کی زندگی مبارکہ میں مل جائے گا۔ چنانچہ وحی کی دو قسمیں۔ایک وحی متلو جسے قرآن مجید کہا جاتا ہے دوسرا وحی غیر متلو وہ آپ ﷺ کا قول وفعل ہے۔اسی وجہ سے حدیث کی معتبریت کا انکار کرنے والا بالاتفاق کافر ومرتد ہے۔

آپ ﷺ کی بعثت اس قوم میں ہوئی جو دنیا کی تہذیب وتمدن سے عاری اور امی قوم تھی، ان کے یہاں تعلیم وتربیت کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم کی تعلیم وتربیت کا بہترین ذریعہ یہی تھا کہ ان کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ان احکامات پر عمل دکھایا جائے۔جس طرح وہ ایک نومولود بچہ جس میں سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے، لیکن وہ لوگوں کو بولتے، کھاتے اور بات کرتے ہوئے دیکھتے دیکھتے خود بخود کھانا اور بولنا شروع کر دیتا ہے۔اسی طرح صحابہ کرام نے بھی دین کا بڑا حصہ آنحضرت ﷺ کی صحبت میں سیکھا ہے۔اسی عملی تربیت وتعلیم کے اثرات تھے کہ تمام دین ان کے رگ وپے میں اس طرح سرایت کر گئے، جیسے طبعی اخلاق انسان میں غیر شعوری طور پر سرایت کئے ہوتے ہیں۔اگر یہ وسیع دین صرف زبانی طور پر آج کل کی طرح اسکولوں میں پڑھایا جاتا تو عمریں صرف ہو جاتیں اور اس کا ایک حصہ بھی حاصل نہ ہو پاتا۔امی اور آزاد دماغ لوگ لفظوں کے رٹنے میں اور غیر مانوس طریقوں کے نقشہ بنانے اور جمانے میں اتنا بار محسوس کرتے کہ جس کو زیادہ مدت نبھانا مشکل ہو جاتا، اس لئے ان کی دماغی سختی کے مطابق ہی اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا جس نے اپنے کمالات سے اپنی ذات میں ایسی جاذبیت حاصل کر لی کہ ہر شخص کا منظور نظر بن گیا۔اس کے طور وطریق عادات کو عبادات ودلوں میں اس طرح گھر کر گئے کہ اس نمونہ کے سوا سب نمونے دل سے محو ہو گئے، اس لئے دین کے عملی حصہ کے سمجھنے میں کم سے کم الجھنیں پیش آئیں اور اگر پیش آئیں تو ذرا سے اشارہ سے دور ہو گئیں۔ آج وہی اسوۂ حسنہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں رہا جس کے ساتھ کل تک ہم قرآن کو ملا

ملا کر پڑھا کرتے تھے۔اس لئے جہاں ایک طرف اللہ کی تعلیم دینے کے لئے رسول بھیجا گیا تھا۔اسی کے ساتھ اس کا نقشہ بھی خود اپنی جانب سے مکمل کر کے بھیج دیا گیا، تا کہ انسان حتی الوسع حق جل مجدہ کی عبادت کا نقشہ اپنے دماغ سے تراشے اور اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی حرکت وسکون میں اس نقشہ الٰہی کے مطابق اتباع کرتا رہے اور اس مختصر راہ پر چل کر حق جلد مجدہ کی محبوبیت کے مقام تک بہت جلد پہنچ جائے۔جس امت کے لئے جدوجہد کی مدت قلیل رکھی گئی ہو اور تقدیر یہ ہو کہ اس کو تمام امتوں پر فائق رکھا جائے اس کے لئے صورت یہی تھی کہ تھوڑے عرصہ میں اسی کو بڑی مسافت طے کرادی جائے جس کا غیبی نظام اتباع رسول اور اسوۂ رسول کی راہ ٹھہری۔حق جلد مجدہ تک رسائی کی راہ صرف اور صرف اسوۂ رسول ہے،حق جل مجدہ سے دعا ہے کہ ہمیں کمال اتباع رسول کی توفیق بخشے۔

اللھم آمین، یا رب صل وسلم دائما ابداً علی حبیبک خیر الخلق کلھم.

☆☆

یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا

● ابواحسن مہتاب

اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ عادت ہے، خالق کائنات کا یہ طریقہ ہے، مبداء فیاض کا یہ اصول ہے اور قسام ازل کا یہ ضابطہ اور دستور ہے کہ جب اس کے بندے ظلمتوں اور تاریکیوں کی پرخار جھاڑیوں میں بھٹکنے لگتے ہیں، تو نبوت کی نورانی کرنوں سے ان کی رہبری کی جاتی ہے۔اسی طرح جب کسی چیز کی ضرورت پیدا ہوتی ہے تو اس کی تدبیریں اور صورتیں عالم وجود میں آجاتی ہیں، خالق کائنات اس کی تکمیل کے لئے اسباب وذرائع مہیا کردیتا ہے، شب کی سیاہی اور رات کی تاریکی کو دور کرنے کے لئے چاند ستاروں کے باب روشن کردیتا ہے اور آفتاب عالم تاب کی شعاعوں سے دن کو منور کردیتا ہے، جب گرمی شباب پر ہوتی ہے تو آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں، جب انسان اقتصادی پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ رازق ورحمان موسم ربیع کو بھیج دیتا ہے۔اسی طرح انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں، ابھی ملک میں امن وامان کے جھونکے چل رہے ہیں تو، کبھی فسادات کی آندھیاں چلتی ہیں اور ملک بحرانی دور سے گزرتا ہے، ٹھیک یہی حال امراض باطنی اور احوال نفسانی کا ہے جس طرح صانع حقیقی نے رات کی تاریکی کو دور کرنے کے لئے چاند اور ستاروں کی تخلیق کی اور ان کو آفتاب جہاں تاب کی ضیاپاش شعاعوں سے منور کیا۔اسی طرح اس رحیم وکریم مولیٰ نے نبوت ورسالت کے چاند ستارے بھی روشن کئے، ہر ملک اور ہر قوم میں الگ الگ ہدایت کا آفتاب چمکا، حضرت یعقوب، ویوسف، وموسیٰ، وعیسیٰ علیہم السلام

کے بعد جب زمین کا پیمانہ تمرد وسرکشی سے لبریز ہوگیا تھا، قتل وغارت، فسادات وخونریزی تہذیب انسانی کے اہم ترین اجزاء قرار پا چکے تھے۔ انبیاء کرام کی پھیلائی ہوئی تعلیم وتبلیغ تقریباً مفقود ہوچکی تھی۔ نہ کوئی وحدانیت کا قائل تھا اور نہ اس کی عبادت کے طریقوں سے کسی کو واقفیت تھی، یہی نہیں، بلکہ فسق وفجور کا عام رواج تھا زندہ انسانوں کو آگ میں جلانا اور دہکتے ہوئے انگاروں پر بھوننا، معصوم بچیوں کو زندہ درگور کرنا، اہل جاہ ثروت کا تفریحی مشغلہ بن گیا تھا، ہر طرح تمرد وسرکشی کے سیلاب امنڈ آئے تھے جس کی ہلاکت خیزی سے پیغمبروں کی بنائی ہوئی تہذیب وتمدن تعلیم وتبلیغ، رشد وہدایت کی عمارتیں حباب کی طرح تیر رہی تھی خس وخاشاک کی طرح بہہ تھیں، خلاصہ یہ ہے کہ صفحۂ ہستی پر وحشیانہ اور حیاسوز مظاہرے ہورہے تھے اور ظلم ودرندگی، شروفساد کی کوئی ایسی قسم نہ تھی جس میں دنیا مبتلا نہ ہوچکی ہو، یکا یک خدا کی رحمت میں تلاطم برپا اور رحیم وکریم خدا کے لئے یہ ممکن کیسے تھا کہ انسان کو تباہی وبربادی کی پرخار جھاڑی میں بھٹکتا چھوڑ دے اور وہ اپنی دینی ودنیوی زندگی کو سنوار سکے اور اس کے مقاصد کو پورا کرسکے اور اس کے بعد دائمی زندگی، یعنی آخرت کو کامیابی وکامرانی سے مزین کرسکے۔ یہ اس کے شان رحیمی سے بعید تر تھا، چنانچہ ارحم الرحیم نے انسانی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے سب سے آخر میں منبع رشد وہدایت محسن انسانیت محمد بن عبداللہ کو ریگستانی زمین میں مبعوث فرمایا، جس ذات گرامی کا انتخاب صانع عالم نے صبح ازل ہی میں کرلیا تھا اور انبیاء سابقین جس شخصیت کی آمد کی مژدۂ جانفزا ہر دور میں دئے۔ ۱۲ ربیع الاوّل بقول دیگر ۹ ربیع الاوّل صبح کے وقت جب ہر طرح نسیم سحر کے روح پرور نشاط انگیز جھونکے چل رہے تھے اور کائنات کا ذرہ ذرہ جام صبوحی سے مخمور تھا آپ نے ایسے سہانے وقت میں جہاں رنگ وبو پر پہلی نظر ڈالی تو کائنات رقص کرنے لگی ہر طرح بہاروں کے نغمے گنگنانے لگے، شبستان عالم میں روح پرور ہوائیں چلنے لگیں، چمنستان ہدایت کا ہر شاخ سرسبز وشاداب نظر آنے لگا، ظلمت کے بادل چھٹ گئے، بت کدوں میں

آندھیاں چل گئیں، صنم کدوں میں زلزلہ آگیا اور جب آپ کی عمر کی چالیس بہاریں گزر گئیں تو آپ کی قامت پاک کو آخری نبوت کی قباء زریں سے درخشاں کیا گیا۔ آسمانوں کے دروازے کھل گئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام کا نزول ہونے لگا، پھر آپ سب سے پہلے لوگوں کو خالق کائنات کی ذات وصفات کے متعلق صحیح علم سے روشناس کرایا، توحید کے عقائد وضوابط مستحکم کئے اور ان کی تمام قسم کی برتری وبالائی کو مٹا ڈالا جس میں فرعونیت کی جھلک نمایاں تھی اور آپ نے اپنی معجزانہ قوتوں کے ذریعہ استبداد کے پرچم سرنگوں کردئے، قومی عصبیت کو ختم کرنے کے لئے لوگوں کو اس حقیقت سے آشنا کیا کہ سب کا خالق ایک ہے۔ لہٰذا نسب وفخر لایعنی ہے اور نسبی غرور بے معنی ہے۔ اب ہر طرف تہذیب وتمدن کا بول بالا ہونے لگا۔ حضورؐ نے اس بھٹکتی ہوئی قوم کو اپنے بلند اخلاق واعلیٰ کردار اور اپنی فطری الفت وشفقت کی بنا پر راہ راست پر لا کھڑا کیا۔ ۲۳ رسال کے قلیل عرصہ میں آپ نے اس قوم کو اخلاق حسنہ کا مالک بنادیا، پاکبازی ان کے نفس میں کوٹ کوٹ کر بھردی، اب انصاف پسندی ان کا شیوہ بن گیا، رحم وشفقت کی یہ قوم خوگر بن گئی اور آپ نے اس قوم کو ان قوانین وضوابط سے بھی آگاہ کردیا تھا جس پر عمل پیرا ہوکر یہ قوم بادشاہت کرنے لگی، عزت وعظمت، شان وشوکت سے ان کی زندگی کے لمحات بسر ہونے لگے اور ایک عرصہ دراز تک انہیں قوانین نبویا ورضوابط محمدی پر عمل کرنے کی بدولت دارین کی فلاح وبہبود حاصل کی اور کامیابی وکامرانی سے سرفراز رہی۔ یہی وہ قوم ہے جس کو قرآن نے۔ "کنتم خیر امت اخرجت للناس" کے معزز الفاظ سے نوازا ہے اور کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے کہ:

غرض میں کیا کہوں تم سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیرو جہادار جہاں بان و جہاں آراء

☆☆

سیرت محمدی ﷺ کا راز

● مولانا رضوان احمد ندوی

ربیع الاوّل کا مہینہ ہر سال عالم انسانیت کو سیرت کا وہ پیغام دیتا ہے جس پیغام نے چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو عالم گیر اجتماعی خودکشی سے بچالیا تھا۔ اسی مہینہ میں ہادی عالم خاتم النبین حضرت محمدؐ کی ولادت باسعادت ہوئی جنہوں نے منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد دنیا کو حق وصداقت کا پیغام دیا، دم توڑتی، اونگھتی، سوتی انسانیت کو حیات جاوداں کا مژدہ سنایا، بے معنی زندگی کو بامعنی بنایا، لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم ومعرفت کی روشنی عطا کی، قوموں کی تقدیر کو بدل دیا، خواہش پرست انسانوں کو خدا پرست اور حق پرست انسان بنادیا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بہت خوب لکھا ہے کہ:

''حقیقت میں محمد رسول اللہؐ نے نبوت کی کنجی انسانی فطرت کے قفل پر رکھ دی تھی، بس وہ کھل گیا اور ان کے تمام خزانے عجائبات، طاقتیں اور کمالات دنیا کے سامنے آگئے، آپ ﷺ نے جاہلیت کی شہ رگ کاٹ دی اور اس کے طلسم کو پاش پاش کردیا، آپ ﷺ نے سرکش اور ضدی دنیا کو خدائی طاقت سے مجبور کردیا کہ زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہو اور تاریخ میں انسانیت کا ایک بالکل نئے دور کا آغاز کرے، یہ وہ اسلامی دور ہے جو تاریخ کی پیشانی پر ہمیشہ دمکتا رہے گا۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر-۱۳۱)

مذاہب عالم کی تاریخ بتاتی ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں ایران وروم، مصر وشام حتی کہ ہندوستان بدتہذیبی کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تہذیب واخلاق اور علم وحکمت کی

کہیں کوئی کرن نظر نہیں آرہی تھی، خاندان اور قبیلے اونچ نیچ کے خانوں میں تقسیم تھی، حسب ونسب اور غربت وامارات کی حد بندیاں قائم تھیں، جس سے انسانیت کراہ رہی تھی، محسن اعظم حضرت محمد ﷺ نے اپنے ۲۳ رسالہ دور نبوت میں انسانوں کو ان کی حقیقی قدر ومنزلت سے آگاہ کیا۔ اونچ نیچ کے فاصلوں کو ختم کیا طبقاتی حد بندیوں کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں اور پیغام دیا ''**الناس کلھم إخوۃ**'' تمام انسان آپس میں بھائی ہیں۔ انسان بحیثیت انسان برابر ہے، پھر عملی طور پر اسے کر دکھایا، بخاری شریف میں ہے کہ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے سے ایک جنازہ گزرا، تو حضرت محمد ﷺ کھڑے ہوگئے۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ یہ تو یہودی کا جنازہ ہے۔ آپ نے فرمایا کیا وہ انسان نہیں تھا؟ پھر آپ نے ''حجۃ الوداع'' کے خطبہ میں وحدت انسانی اور اسلامی مساوات کا جو پیغام دیا وہ اقوام عالم کے لئے نیا عالمی نظام تھا۔ ارشاد فرمایا: ''تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔'' **لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ**'' عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ ہی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر وہاں تقویٰ کی بنیاد پر کسی کو کسی پر فضیلت ہوسکتی ہے۔

یاد رکھئے کہ انسانیت کے محسن اعظم حضرت محمد ﷺ کی دعوت وحدت اور پیغام وحدانیت وصداقت کسی مخصوص قبیلہ اور ملک تک محدود نہیں تھی، بلکہ آپ کی نبوت ورسالت تمام عالم کے لئے تھی ''**وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کافۃً لِّلنَّاسِ بشیراً ونذیراً**'' آپ تمام کائنات انسانی کے رسول ہیں، قرآن کریم نے آپ کے بارے میں کہا'' **وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین** '' ہم نے آپ کو سارے جہاں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے بھی انبیاء ورسل اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے ان میں سے کسی کو بھی رحمۃ للعالمین کے لقب سے سرفراز نہیں کیا گیا، رحمۃ للعالمین کا خطاب صرف خاتم النبین حضرت محمد رسول اللہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا۔

ہزاروں رحمتیں اور درود وسلام ہو اس نبی رحمت پر جنہوں نے انسانوں اور چوپایوں پر بھی رحم وکرم کی تعلیم دی۔ ہر قسم کے جور واستبداد کا خاتمہ کیا، " **ولا یجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلو اعدلو ھو اقرب للتقویٰ**" کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف نہ کرسکو اس لئے انصاف کرو یہی تقویٰ کے قریب ہے، اس آیت پر عمل کیا اور کرایا آپ نے فتح مکہ کے بعد فرمایا "**لا تثریب علیکم الیوم**" آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں "**انتم الطلقاء**" جاؤ تم سب آزاد ہو حالانکہ برسوں کے انتقام کا دن تھا، مگر آپ نے عام معافی کا پیغام دیا۔

سیرت کا ایک پیغام ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم انسانیت کی جان ومال کے تحفظ کیلئے دنیا کو امن وسکون اور حقوق انسانی کے احترام کا پیغام سنائیں "**لا تقتل النفس التی حرم اللّٰہ إلا بالحق**" کسی جان کو جسے اللہ نے قابل احترام ٹھہرایا ہلاک نہ کرو، مگر حق کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ نے روئے زمین پر بسنے والے ہر طبقہ کو اس کا واجبی حق دیا، کمزوروں، بے سہارا انسانوں، بے کسوں اور مظلوموں کی دستگیری کو عبادت قرار دیا۔ فرمایا کہ تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ الفت ومحبت کے پیکر نبی رحمت نے معاشرہ میں امن وامان قائم کرنے اور انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنے کو انسانیت کا زیور قرار دیا۔

افسوس کہ آج پوری دنیا میں ملت اسلامیہ گوناگوں مصائب ومشکلات سے دوچار ہے، عالمی قیادت خدا ناشناس طاقتوں کے ہاتھوں میں ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہم ان کے دست نگر بنے ہوئے ہیں، حالات کی ٹھوکریں ہمیں بیدار نہیں کرسکیں، ہم نے رسول اللہ ﷺ کے پیغام امن اور حق وصداقت کی تبلیغ نہیں کی، جان لیجئے کہ جب کوئی داعی قوم اپنا داعیانہ کردار چھوڑ دیتی ہے تو وہ مدعو ہوجاتی ہے۔ آج ضرورت ہے کہ محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ کی ہستی کا از سر نو تعارف کرایا جائے، ان کی تعلیمات سے دنیا کو باخبر کرایا جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ خدمت جوہری وتوانائی کے انکشاف سے بھی بڑی خدمت ہوگی۔ میں

نے اسیر مالٹا نامی کتاب میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کا ایک واقعہ پڑھا کہ جب وہ اسارت مالٹا سے واپس ہوئے تو ایک دن دارالعلوم دیوبند کے اکابر علماء ومشائخ کو جمع کیا اور فرمایا کہ میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی حیثیت سے کیوں تباہ وبرباد ہورہے ہیں، تو اس نتیجہ پر پہنچا اس کے دو سبب ہیں، ایک ان کا قرآن اور سنت رسول سے انحراف اور دوسرے ان کے آپسی اختلاف اور خانہ جنگی جس نے ملت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کردیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی پوری زندگی اشاعت قرآن اور سنت رسول کو زندہ کرنے میں وقف کردی۔ ہم بھی عہد کریں کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک ایک سنت کو زندہ کریں گے اور اتحاد واجماعیت کی زندگی گزاریں گے۔ صرف یہ کافی نہیں کہ ماہ ربیع الاول میں چند جلسے جلوس کرلئے جائیں، برقی قمقموں سے محفل کو جگمگالیں۔

کافی نہیں کہ بیٹھ کر مدح وثنا کریں
اٹھو کہ آج حق محبت ادا کریں

ہم اس مبارک ماہ ودن کو یوم احتساب وجائزے کے طور پر منائیں، اپنے نفس کا محاسبہ کریں، دل کے چور کو پکڑیں "**قد افلح من زکھا**" اپنے قلب کو نور ایمانی سے منور کرنے کی فکر کریں، اپنے طریق زندگی کو حضرت محمدؐ کی سیرت پر ڈھال کر ساری دنیا کے انسانوں کے لئے نمونہ عمل اور پیغام عمل بن جائیں "**لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر**" (سورہ احزاب) اور دنیا والوں کو بھی بتائیں کہ اگر تم حقیقی امن وسکون اور ابدی خیر وفلاح چاہتے ہو تو اپنی زندگی کو رسول اللہ کی مثالی زندگی سے ہم آہنگ کرو۔

☆☆

حضور ﷺ کی امتیازی خصوصیات

● مولانا محمد یوسف انور قاسمی

حضور انور ﷺ کی خصوصیات کو قرآن پاک میں اجمالاً اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

"وَلَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلٰى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ." (آل عمران: ۱۶۴ ديكهيں البقرة: ۱۵۱ . الجمعة: ۲)

یعنی اللہ پاک کی آیات کی (۱) تلاوت (۲) لوگوں کو تزکیہ نفس (۳) قرآن پاک کا علم (۴) اور حکمت یہ چار خصوصیات ایسی ہیں جو حضور انور ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ ہیں۔

خود حضور انور ﷺ نے اپنی پانچ خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِى. نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِداً وَطَهُوْرا فَاَيَّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِيْ اَدْرَكَتْهُ الصلوٰةُ فَلْيُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِيَ الْمَغَانِمُ وَلاَ تَحِلُّ لِاَحدٍ مِّن قَبْلِى وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةُ وَكَانَ النبّى يُبْعَثُ اِلٰى قومهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً".

مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں:

(۱) ابھی ایک ماہ کی مسافت ہو کہ دشمن پر میرا رعب طاری ہو جاتا ہے۔ (۲) ساری زمین میرے لئے مسجد اور پاکیزہ بنادی گئی ہے جو جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے۔ (۳)

غنیمت کا مال میرے لئے حلال کر دیا گیا ہے، جو پہلے کسی پر حلال نہیں تھا۔ (۴) مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔ (۵) پہلے کے نبی اپنی قوم کے لئے خاص ہوا کرتے تھے مگر میں ساری دنیا کے لئے نبی ہو کر آیا ہوں۔

قرآن پاک میں آتا ہے: "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ". (انبیاء: ۱۰۷)

(اور آپ کو جو ہم نے بھیجا تو سارے جہانوں کے واسطے رحمت بنا کر)۔

رب العالمین نے اپنے محبوب ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنایا۔

قرآن میں ہے کہ: "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَنَذِيْراً": (سبا: ۲۸)

(اور آپ کو جو ہم نے بھیجا تو سارے لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو)۔

حضور انور ﷺ خاتم النبیین ہیں: "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ من رِجَالِكُمْ وَلٰكن رسول اللّٰه وخاتم النَّبِيِّن وكان اللّٰه بِكُلِ شئيٍ عَلِيْمًا". (احزاب: ۴۰)

محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں پر مہر ہیں اور اللہ پاک سب چیزوں کو جانتا ہے۔

آپ ﷺ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ اس لئے کہ آپ کے صاحبزادے بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ وہ رسول ہیں اور نبیوں پر مہر ہیں یعنی نبیوں کے سلسلے پر مہر ثبت کرنے والے ہیں اور جب وہ رسول ہی ہیں "وما محمد الا رسول" تو پھر ان کی جائیداد میں اولاد صلبی کا حق نہیں رہا۔

صرف حضور انور ﷺ کو خصوصی معراج پر بلایا گیا:

"سُبْحٰنَ الَّذِىْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الاقْصٰى الَّذِى بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ البصيرُ". (بنی

اسرائیل: ۱)

(پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس میں ہم نے خوبیاں رکھی ہیں کہ دکھائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے، وہی ہے سنتا دیکھتا)۔

پھر سورۃ النجم کی ابتدائی اٹھارہ آیتوں میں اس معراج کی تفصیل ہے، کچھ آیتیں یہ ہیں:

"فکان قاب قوسین او ادنی"

(پھر رہ گیا فرق دو کمانوں کا بلکہ اس سے بھی نزدیک۔

"مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی"

بہکی نہیں نگاہ اور حد سے نہیں بڑھی، حالانکہ موسیٰؑ نے ایک تجلی دیکھی تھی، تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور وہ بیہوش ہو گئے تھے۔ (الاعراف:۱۴۳)

صرف حضور انور ﷺ کے قول کو وحی فرمایا گیا ہے: "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى". (النجم:۳-۴)

(اور نہیں بولتا اپنی چاؤ سے۔ یہ تو وحی ہے جو پہنچی ہے)۔

"تجلی ربانی کا یہ استیلائے تام ہوا کہ جو کچھ حضور انور ﷺ فرماتے ہیں وہ وحی الٰہی ہوتی ہے۔" (روح البیان)

صرف حضور انور ﷺ کو خصوصی کوثر دیا گیا۔ "اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ". (الکوثر:۱)

بے ہم نے آپ کو کوثر فرمایا۔

یعنی آخرت میں جس کو چاہیں گے کہ حوضِ کوثر سے پلائیں گے۔ کوثر کے معنی بے شمار خوبیاں بھی ہیں۔ بہر حال کوثر عطا کیا گیا ہے اور عطا کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔

بخاری اور مسلم میں بھی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بخشی ہوئی چیز کو واپس لینے سے منع فرمایا ہے۔ (منقول از ریاض الصالحین نوویؒ مترجم: صفحہ ۳۲۴)

صرف حضور اکرم ﷺ کے نام کو اللہ پاک نے سب سے زیادہ بلند کیا۔ "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ". (الانشراح:۴)

اور ہم نے تمہارے لئے تمہارا ذکر بلند کر دیا۔

حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے اس آیت کو دریافت فرمایا تو انہوں نے کہا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ کے ذکر کی بلندی یہ ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے تو میرے ساتھ آپ کا بھی ذکر کیا جائے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "اذان میں تکبیر میں تشہد میں، منبروں پر، خطبوں میں۔" پس اسی طرح درود و سلام میں، نیز بے شمار درس و تدریس اور گفتگو کے مواقع میں اللہ پاک کے بعد سب سے زیادہ ذکر آپ ﷺ ہی کا آتا ہے۔

صرف حضور اکرم ﷺ کے امتیوں کے دل میں آپ ﷺ کے لئے جو محبت پیدا کی گئی ہے وہ کسی دوسرے نبی کے لئے ان کے امتیوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود ایک بے عمل اور گناہ گار امتی بھی آپ کے نام پر مر مٹنے کو تیار ہے اور آپ کی شان میں ذرا سی گستاخی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک حدیث ہے کہ:

"لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ".

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ میری محبت اس کو اس کے والدین اور اس کی اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ نہ ہو۔

آج کا بے عمل مسلمان بھی ایسی محبت کا احساس اپنے دل میں رکھتا ہے۔ "الحمد للّٰہِ علیٰ إحسانه".

حضور اکرم ﷺ کی پیروی ہی ہر مسلمان کو محبوبیت کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ قرآن میں ہے: "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ".

(آپ فرمادیں کہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری پیروی کرو کہ اللہ تم سے محبت کرے اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے)۔

حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کامل و مکمل ہے اور ایسی بے داغ ہے کہ کسی موقع پر اور کسی زمانے میں اسے بلا تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔ فرمایا ہے کہ "جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اس کو جلوت میں برملا بیان کرو، جو حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چھڑ کر پکارو۔" اَلاَ فَلْيُبَلِّغُ الشاهدُ الغائب".

اسی لئے حضور اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو اللہ پاک نے دنیا کے سامنے بطور چیلنج کے پیش کر دیا ہے کہ: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰه كَثِيْراً". (الاحزاب:۲۱)

(بیشک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے، اس کے لئے کہ جو اللہ اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرے)۔

یعنی حضورِ اکرم ﷺ کی پیروی، ایمان والے کے لئے ہر طرح بہتر ہے اور ان کی حیاتِ طیبہ ایسی مثال ہے کہ اسی کی پیروی سے ہر خیر و فلاح کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

توبہ کرنے والے کے لئے بھی حضور اکرم ﷺ کی شفاعت ہی قابل قبول ہے، بغیر اس شفاعت کی محض توبہ کافی نہیں۔

"وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا". (النساء: ۶۴)

اور جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں (نافرمانی کریں) تو اے محبوب ﷺ وہ تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ﷺ ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور وہ اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔

اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی شفاعت ان کے امتیوں کے لئے ضرور کارگر ہوگی۔

حضور اکرم ﷺ ہی قیامت میں ہر امت کے گواہ اور نگہبان بنائے جائیں گے سورۃ النساء (۴۱) میں ہے۔ "فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا"۔ (تو کیسا ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں (جو امت کے تمام افعال پر گواہ ہوگا) اور اے میرے محبوب، تمہیں ان سب پر گواہ اور نگہبان بنا کر لائیں گے)۔

اسی طرح سورۃ النحل (۸۹) میں ہے اور سورۃ البقرہ (۱۴۳) میں بھی ہے:

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِتَكُوْنُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً".

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب امتوں میں افضل کہ تم، لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان اور گواہ ہیں۔

اس دوسری آیت کے سلسلے میں بخاری (کتاب التفسیر جلد دوم ص ۷۱۶) میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ پاک نوح علیہ السلام کو بلائے گا۔ وہ آئیں گے اور عرض کریں گے کہ اے رب میں حاضر ہوں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے ہمارے احکامات کو لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ وہ کہیں گے جی ہاں، اس کے بعد ان کی امت سے دریافت کیا جائے گا کہ تمہارے پاس اللہ کے احکامات لے کر کوئی رسول آیا تھا یا نہیں؟ امت کہے گی کہ نہیں آیا اس وقت میری (حضورؐ کی) امت گواہی دے گی کہ بے شک نوحؑ نے احکامِ الٰہی کی تبلیغ کی تھی اور میں کہوں گا کہ یہ لوگ سچ کہہ رہے ہیں۔"

"عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْداً". (بنی اسرائیل: ۷۹)

آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر ضرور کھڑا کرے گا۔ مقامِ محمود ہی مقامِ شفاعت ہے

کہ جب حضور اکرم ﷺ وہاں کھڑے ہوں گے تو جملہ اوّلین وآخرین حضور کی حمد کریں (تفسیر خازن)

اس آیت کی تفسیر میں صحیحین میں وہ حدیث موجود ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ ہی سب کی شفاعت فرمائیں گے۔

حضور اکرم ﷺ ہی باعثِ تخلیق کائنات ہیں۔ وہ نہ ہوتے تو کائنات پیدا نہ کی جاتی۔ ''لَولاکَ لَمَا خَلَقتُ الافلاکَ'' ان الفاظ میں تمام وکمال حقیقت کی قوت پوشیدہ ہے۔

صرف حضورِ اکرم ﷺ کو اللہ پاک نے ہمیشہ پیار کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو یا آدم یا نوح یا ابراہیم یا موسیٰ یا عیسیٰ کہہ کر خطاب کیا ہے، لیکن حضور ﷺ کو کبھی یا محمد کہہ کر خطاب نہیں کیا۔ بلکہ یا مزمل (اے کملی والے) یا مدثر (اے لحاف والے) یٰس (اے سید) جیسے القاب سے یاد کیا ہے اور خود اپنے توصیفی ناموں میں حضور اکرم ﷺ کو شریک کیا ہے۔ مثلاً اللہ پاک رؤف بھی ہے، رحیم بھی ہے اور حضور اکرم ﷺ کو بھی رؤف اور رحیم کہا ہے: ''بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ''. (توبہ: ۱۲۸)

وہ مومنوں سے بہت پیار کرنے والے اور ان پر ہمیشہ رحم کرنے والے ہیں۔

ان کے علاوہ نور، متین، عزیز، بر، رشید بھی اللہ پاک کے اور سرکار دوعالم ﷺ کے بھی توصیفی نام ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی یہ چند امتیازی خصوصیات ہیں ورنہ آپ کی حیاتِ طیبہ کا ہر واقعہ ایک امتیازی شان رکھتا ہے اور جامی نے ہرگز مبالغہ نہیں کیا جب کہ انہوں نے یہ کہا کہ:ع

ہمہ قرآن درشانِ محمدؐ

☆☆

معاشرہ کی اصلاح میں محسن انسانیتؐ کی رہنمائی

● مفتی معظم علی قاسمی

حضرت محمدؐ کی آمد سے قبل سطح زمین نورانیت کے فیض سے یکسر محروم تھی اور عالم انسانیت پر باطل کی گھٹاٹوپ سیاہی چھائی ہوئی تھی، جس میں کسی ملک کی تخصیص نہیں، بلکہ سارا عالم اس کی لپیٹ میں تھا، خاص کر عرب کی حالت دیگر مقامات سے بدتر تھی، ظلم وشقاوت، بدچلنی وشہوت پرستی، باہمی نفرت وعداوت، مکروفریب، آوارگی واوباشی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا، قمار بازی، سودخوری، شراب نوشی، زنا کاری ان کے لئے بہت معمولی بات تھی، کسی کی عزت سے کھیلنا، کسی بے گناہ جان کا ناحق قتل کرنا ان کے یہاں گناہ نہ تھا، گویا کہ سارا عرب گمراہی وسرگشتگی کی آخری حد پار کر چکا تھا، حضرت مولانا شبلی نعمانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں ''بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہ تھی، قمار بازی، شراب خوری، زنا کاری کا رواج تھا۔'' (ذکر رسول ص: ۱۷)

حالات کے اس تناظر میں ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اس دور میں کسی نبی کی شریعت اپنی اصل شکل میں باقی نہ تھی، اگر کوئی معاشرہ سے تنگ آ کر اصلاح کا بیڑا اٹھاتا تھا، تو انتھک کوشش کے باوجود ناکامی ومحرومی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک مؤرخ کے بقول ''محمد ﷺ کی بعثت سے قبل عربوں میں مذہبی اصلاح کا ہوجانا ایسا ہی بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا، جیسا کہ ان کا ملکی وملی حیثیت سے ایک قوم بن جانا'' (ذکر رسول: ۱۶)

ایسے بگڑے ہوئے ماحول میں ایک بچے کا ورود مسعود ہوا اور چالیس سال کی عمر میں نبوت سے سرفراز کئے جانے کے بعد مشکل ترکام اصلاح عام کا بیڑا اٹھایا تھا اور سارا وقت، ساری قوت اور سارا زور، ساری جوانی اس میں کھپا دینا اپنی سعادت سمجھا اور سارے عالم کا نقشہ بدلنے، ضلالت سے ہدایت کی راہ پر لانے کے لئے سب سے پہلے توحید خالص کی صدائیں بلند ہی ہوتی رہیں، آخرش چند مراحل کے بعد نفس پرستی، شہوت پرستی کا شب دیجور زوال پذیر ہوا، تاریکی چھٹی اور روحانیت کا آفتاب اور اصلاح وہدایت کا سورج طلوع ہوگیا۔

دلوں کو روحانیت کے نور سے منور کردینے اور تجلی الٰہی سے معمور کردینے کے ساتھ ساتھ آپ کا ایک بڑا مقصد اور مطمح نظر معاشرہ کی اصلاح اور انسانوں کی رہنمائی تھی، کیونکہ پورا معاشرہ، ضلالت وگمراہی کا آخری نمونہ آماجگاہ بن چکا تھا، بری خصلتوں اور رسومات وقیودات میں گھر چکے تھے، اسی لئے آپ کی سوچ، آپ کی فکر، آپ کی دھن، آپ کی نیند آپ کی مشغولیت سب کچھ اسی کے لئے نذر تھی، کیونکہ ایک دو چند نہیں، بلکہ آپ پوری انسانیت کے ہر ہر فرد کے لئے مصلح بنائے گئے تھے، جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ آپ زندگی کے تیز وتند طوفان کا رخ موڑ دیں، مال ودولت کی محبت دلوں سے نکال دیں، قمار بازی، سود خوری، زنا کاری، عصبیت، مکروفریب، ظلم وجبر، خیانت وبدمعاملگی، شراب، بے حیائی، عریانیت، بے جا حرص وہوس، بخل، کنجوسی، تکبر وحسد، چغلخوری وبہتان، بے ہودہ گوئی وسخت کلامی، غیبت وعیب جوئی، جھوٹ وبدعہدی، چوری، ڈکیتی، بدظنی وبدنگاہی، سختی ودرشتی اور دیگر برائیاں جو جڑیں پکڑ چکی تھیں ان کے خلاف حق اور اصلاح کی ایک زبردست دیوار کھڑی کردی۔

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ آپ کی سعی اور جدوجہد نے ان عرب بدوؤں کے دلوں میں انسانیت کی روح پھونک دی اور آپ کی انتھک کوششوں نے دیکھتے دیکھتے کائنات کا نقشہ

بدل دیا، جتنی برائیاں معاشرہ کو اپنی گندگیوں سے پلید اور ناپاک کرچکی تھیں، ان کو کافور کرکے لوگوں کے سامنے صالح، مطہر اور پاکیزہ ماحول پیش کیا، جس کا اعتراف تو غیروں نے بھی کیا ہے، ڈاکٹر ای اے فریمن کے الفاظ ہیں ''اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد ﷺ بڑے پکے راست باز اور سچے ریفارمر تھے، آپ کی ہی ہستی ایسی مفصل ہے، جس کے حالات ہم تک صحیح اور بالتفصیل پہنچے ہیں، انسانی اخلاق کی جو آپ نے اصلاح فرمائی، اجتماعیات کے اندر جو بلند انقلاب آپ کی تعلیم نے پیش کیا ہے، سوسائٹی کے تزکیہ اور اعمال کی پاکیزگی کے لئے جو اسوہ حسنہ آپ نے پیش کیا وہ آپ کو انسانیت کا محسن اول قرار دیتا ہے۔ (اسلام مکمل دین، ص:۳۹۶)

زندگی کے جس شعبہ پر نظر ڈالئے اس میں آپ کی رہنمائی اکمل طور پر موجود ہے، جو ایک صالح معاشرہ کی روح ہے، آپ نے اس شعبہ سے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمیاں ناجائز رسوم پر روک لگا کر اس کی جگہ فطری اسلامی طریقہ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ محسن انسانیت نے عبادت کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ عبادت صرف خدائے واحد کی ہونی چاہئے۔ دوسرا اس میں کوئی شریک نہ ہو: ''اَنْ تَعْبُدُ اللّٰہ ولا تشرکونَ بہ شیئا''. (ابوداؤد شریف: کتاب الزکوٰۃ۔ ج:۱، ص:۲۳۹ بحوالہ مشکوٰۃ الآثار)

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے تفصیلی احکام بیان فرما کر دلوں کے بدلنے، رخ پلٹنے اور مردہ ضمیروں کی سچائی کا ایک جامع اصول عطا کیا، جو معاشرہ کی اصلاح کے لئے عظیم نسخہ کیمیا ہے۔ اگر ان کے علاوہ کوئی معاشرتی حکم نہ دیا جاتا تو بھی صالح معاشرہ کی تشکیل کے لئے کافی اور وافی ہوتا، کیونکہ ان جامع عبادات کی تاثیر اصلاح ظاہر وباطن ہے، لیکن شریعت انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاح بھی چاہتی ہے۔ بلکہ ضروری قرار دیتی ہے۔ چنانچہ آپ نے والدین اور بیوی، اولاد، قرابت داری، پڑوسی، ساتھی، خادم ومخدوم، مہمان ومیزبان، حاکم وآقا، مومن وغیر مومن، قیدی حتیٰ کہ جانوروں کے بھی حقوق

متعین فرما کر ظلم و جبر، تشدد و بربریت، حق تلفی و ناانصافی، قطع رحمی کی مذمت فرمائی، فرقہ پرستی، تعصب پرستی، منافقت، بے جا فخر و مباہات پر بندش لگا کر کامیاب بہتر اور افضل انسان اس کو قرار دیا جو ایک دوسرے کے حقوق کا پاس ولحاظ رکھے، حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے، ہر ایک کے حدود متعین فرمائے اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کو خوشخبری سنائی اور غفلت برتنے والوں کی شدید مذمت فرمائی، تاکہ ان مذموم حرکتوں کو ترک کر کے ایک مہذب، با اخلاق، بلند کردار اور نمونہ کا انسان بن سکے، چونکہ فرد اخلاق کے بغیر صالح نہیں بن سکتا اور فرد کے بغیر معاشرہ صالح نہیں بن ہوسکتا اسی لئے آپ نے حسن اخلاق کو اصلاح معاشرہ کی خشت اول اور بنیاد قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ محسن انسانیت ﷺ نے انسان کے بیچ اپنا تعارف معلم اخلاق کہہ کر کرایا۔ ''**انا بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**'' اسی لئے آپ نے پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دی اور ایام برائیوں شراب، چوری، ڈاکہ، زنا، قتل وخوں ریزی، غارت گری ولوٹ مار، غیبت وبدگوئی، چغل خوری و بہتان، کینہ وحسد وغیرہ کو غلط اور انسانیت سوز عمل قرار دے کر حسن اخلاق، خوشی کلامی، الفت ومحبت، عدل وانصاف، تواضع وانکساری، حق کی حمایت، عفت و پاکدامنی، سچائی ایفائے عہد کا درس اور اول الذکر کو حرام کر کے ثانی الذکر کو لازم وضروری قرار دیا۔

اسی طرح معاملات میں خرید وفروخت، لین دین قرض ورہن اعارہ اجارہ تجارت میں شرکت کے لئے فیصلہ کن راہ نما آفاقی اصول دے کر سود، قمار، دھوکہ دہی، خیانت، بدعہدی، وعدہ خلافی اور ناجائز حمایت کو باطل اور ناجائز قرار دیا۔

عورتیں زینت بزم کائنات ہیں جو سکون وراحت، گناہوں سے بچنے کا محفوظ طریقہ اور افزائش نسل کا واحد ذریعہ تھیں۔ ان حقائق کو سامنے لاکر ان کے حقوق دلائے، ان کو انتہائی پستیوں سے نکال کر رفعت وبلندی عطا کئے، حقوق متعین فرمائے۔ ان کی ادائیگی کو لازم قرار دیا، جب کہ یہی عورتیں شیطان کی بیٹیاں، نجاست کے مجسمے، فساد کی جڑیں، برے

لوگوں کی روحیں اور سبب زوال کہی جاتی تھیں۔ ان کے لئے نہ کوئی حق تھا نہ ان کی کوئی قیمت نہ کوئی عزت تھی، نہ احترام، بلکہ ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرنا اس ناپاک معاشرہ میں قابل فخر سمجھا جاتا تھا، رسول مقبول ﷺ نے ان کے ساتھ ہر قسم کی ناروا، غیر انسانی حرکتوں کو ختم کر کے اعتدال ورواداری کا حکم فرمایا اور ان کو پورے حقوق وعزت کے ساتھ دنیا میں رہنے اور جینے کا حق دیا جس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔

غرضیکہ شعبہ ہائے زندگی کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں، بلکہ آپؐ نے افراط وتفریط سے بالاتر اعتدال پر مبنی ایسے قوانین امت کو عطا کئے جو پاکیزہ اور صالح معاشرہ کو وجود بخشتے ہیں، لیکن اگر ان قوانین سے جداگانہ زندگی گزاری جائے تو گمراہی کی وادیوں میں بھٹکنا، چین وسکون، راحت وآرام کا چھن جانا، ذلت وخواری، بے اعتباری اور غیر مؤثر ہونا مقدر بن جاتا ہے۔ آج ہماری زبوں حالی کا اصل راز یہی ہے۔ آج پورے عالم میں نہ ہمارے پاس ریاستوں کی کمی ہے نہ افراد کی گوہر لحاظ سے ہم صف اول کی قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔ کاش ہماری توجہ نبی رحمت عالم ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر ہوجاتی، ہم ان کی رہنمائی کو تلاش کر کے عمل پیرا ہوتے اور ہم سنور جاتے۔

☆☆

شہ لولاک ﷺ کا عفو و درگزر

● ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب قاسمی

''عَفَا یَعفُو عفواً'' کے معنی معاف کرنے اور درگزر کرنے کے آتے ہیں، اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کی زیادتی کو درگزر کیا جائے، اس کے برے سلوک کے جواب میں برا سلوک اختیار نہ کیا جائے اور دل سے اس کی زیادتی کے خیالوں کو اس طرح نکال دیا جائے کہ گویا اس نے زیادتی کی ہی نہیں۔

عفو اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک ہے جو قرآن میں پانچ مرتبہ آیا ہے، مگر رب العالمین کے معاف کر دینے اور بخش دینے کی صفت کا کم وبیش سو دفعہ ذکر موجود ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ معاف کر دینا اور بخش دینا بڑی فضیلت کی بات ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کے قصور کو معاف کر دیتے ہیں اللہ ایسے نیکوکاروں سے محبت رکھتا ہے'' بلاشبہ یہ کام بے انتہائی مشکل ہے، مگر جتنا مشکل ہے، اتنا ہی ضروری بھی ہے کیونکہ اگر انسانی معاشرے سے عفو و درگزر ختم کر دیا جائے، تو انسانوں کے دکھ اس قدر بڑھ جائیں گے کہ زندگی وبال جان بن جائے گی، اس لئے خالق کائنات نے عفو کا جا بجا حکم فرمایا ہے اور محبوب دو عالم محمدؐ نے خدا کے اس عظیم فرمان (''پس تم معاف کرو اور درگزر سے کام لو'') کو قولاً فعلاً بخوشی انجام دیا ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے بخشش و درگزر سے کام لیتا ہے اور انسانوں کے لئے بھی

اس نے یہی پسند کیا کہ وہ بھی ایک دوسرے کی خطاؤں کو معاف کرتے رہیں۔ رسول پاک ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں تو ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبیؐ نے اپنے جانی اور سخت ترین دشمن کو معافی دے کر ایک عجیب وغریب تاریخ رقم فرمائی ہے، مکہ میں جب رسول اللہ ﷺ نے کلمہ حق کو بلند کیا تو اپنے اور پرائے سبھی نے آپ کو ایذاء پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے ان گستاخوں کو کبھی اف تک نہیں کہا۔ صبر و تحمل سے اپنے دعوتی کام کو انجام دیتے رہے۔ اہل مکہ کی شدت ظلم و جبر سے تنگ آ کر آپ ﷺ طائف تشریف لے گئے، مگر اہل طائف نے رسول خدا ﷺ کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا، اس کو پڑھ کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ طائف والوں کے ظلم وستم کو نہ صرف آپ ﷺ نے برداشت کیا بلکہ ان کے حق میں دعائیں مانگی۔ ''روح الاسلام'' کے مصنف نے اس واقعہ کو اس طرح رقم کیا ہے: ''آپ اپنے خادم خاص حضرت زیدؓ کے ساتھ جب بنی ثقیف کے یہاں پہنچے اور انہیں اپنی رسالت سے مطلع کیا اور ایک خدا کی عبادت کی طرف بلایا تو آپ ﷺ کی تقریر سے غیظ وغضب کا ایک طوفان برپا ہو گیا، ان لوگوں نے آپ کو شہر سے نکال دیا اور آوارہ لوگوں کا ایک گروہ آپ کے تعاقب میں لگا دیا، جو نبی رحمت پر پتھر برستا رہا یہاں تک کہ آپ زخموں سے چور ہو کر طائف سے تین میل کے فاصلے پر ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے، آپ ﷺ زخموں سے نڈھال ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے وہاں پر رحمت للعالمین نے جو دعا فرمائی وہ دنیا کے بادشاہوں کے لئے عظیم پیغام کی حیثیت رکھتا ہے، دنیا کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اس قدر بدسلوکی سے دوچار ہونے کے باوجود کسی حاکم اس قوم کے حق میں دعا اور صلہ رحمی کا معاملہ کیا ہو ''الٰہی میں اپنی بے بسی اور تدبیر کی ناکامی اور لوگوں کے ہاتھوں اپنی توہین کا شکوہ تیرے ہی حضور میں کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور میرا بھی۔ اے پروردگار! تو مجھے چھوڑ کر کسے سونپ رہا ہے، جو مجھے اور بھی کمزور بنا دیں

گے؟ مجھے میرے دشمنوں کے حوالے نہ کرا گر تو میری اس حالت میں بھی مجھ پر خفا نہیں تو میں مطمئن ہوں۔ میں تیرے اس نور کی روشنی میں رہنا چاہتا ہوں، جس نے ظلمات کو منور رکھا ہے اور جس کے پرتو سے دنیا اور آخرت دونوں کی صلاح حاصل ہوتی ہے۔ الٰہی! اپنے غضب کو مجھ پر نازل نہ فرما اور جس طرح تو چاہے میری مشکلات حل کر دے اللہ کے سوا نہ کوئی قدرت ہے، نہ کوئی طاقت۔''

اس واقعے کی تفصیل صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اس طرح مروی ہے۔ ''انہوں نے ایک روز رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ کیا آپؐ پر کوئی ایسا دن بھی آیا ہے، جو احد کے دن سے زیادہ سنگین رہا ہو؟ آپؐ نے فرمایا ہاں! تمہاری سے مجھے جن جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان میں سب سے سنگین مصیبت وہ تھی جس میں گھاٹی کے دن میں دوچار ہوا۔ جب میں نے اپنے آپ کو عبد یالیل بن عبد کلال کے بیٹے پر پیش کیا، مگر اس نے میری بات منظور نہ کی تو میں غم والم سے نڈھال اپنے رخ پر چل پڑا اور مجھے قرن ثعالب پہنچ کر ہی افاقہ ہوا وہاں میں نے سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بادل کا ایک ٹکڑا مجھ پر سایہ فگن ہے۔ میں نے بغور دیکھا تو اس میں حضرت جبریل علیہ السلام تھے۔ انہوں نے مجھے پکار کر کہا آپ کی قوم نے آپ سے جو بات کہی اللہ نے اسے سن لیا ہے۔ اب اس نے آپ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے تا کہ آپ ان کے بارے میں اسے جو حکم چاہیں دیں۔ اس کے بعد پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے آواز دی اور سلام کرنے کے بعد کہا: اے محمد ﷺ! بات یہی ہے۔ اب آپ جو چاہیں۔ اگر چاہیں کہ میں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان کچل دوں، تو ایسا ہی ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا نہیں۔ بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ عزوجل ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کرے گا، جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرائے گی۔''

رسول پاک ﷺ کے اس جواب درگزر میں آپ کی یگانہ روزگار شخصیت اور نا قابل

ادراک گہرائی رکھنے والے اخلاق عظیمہ کے جلوے دیکھے جا سکتے ہیں۔

جب رسول خدا ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو وہاں کے رئیس عبداللہ بن ابی بن سلول کو آپؐ کی آمد بڑی ناگوار گزری وہ مسلمانوں کے دبدبہ کی وجہ سے بظاہر مسلمان تو ہو گیا، مگر دل سے اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت کرتا رہا، اس کی کدورت و دشمنی اتنی بڑھی کہ وہ منافقوں کا سردار بن گیا۔ ایک مرتبہ جب حضور اقدس ﷺ اس کی مجلس سے گزرے تو آپ نے سلام کیا اور ان لوگوں کو خدا کی طرف بلایا اور ان کے سامنے قرآن عظیم کی تلاوت فرمائی، عبداللہ بن ابی کو یہ ناگوار لگا، اس نے اپنے مخصوص گستاخانہ انداز میں کہا ''ہماری مجلس میں آ کر اس طرح کی باتیں سنا کر ہمیں تنگ نہ کرو، اسی مجلس میں صحابی رسول عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا اے اللہ کے رسول آپ ہماری مجلسوں میں ضرور تشریف لایا کریں اور اپنی بات سنایا کریں، کیونکہ ہم اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ اس بات پر مسلمان اور مشرکین و یہودی ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے ،مگر رسول خدا نے سبھی کو سمجھا کر پرسکون کیا۔ آپ کو عبداللہ بن ابی کی باتوں سے رنج ہوا مگر حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ آپ اسے معاف فرما دیجئے در اصل آپ کے تشریف لانے سے قبل اس شہر کے لوگ اس کو اپنا سردار بنانے والے تھے مگر خدا کو یہ منظور نہ ہوا اور آپؐ کے ذریعہ حق سامنے آ گیا تو اس کو یہ بات سخت ناگوار گزاری یہی وجہ ہے کہ اس نے وہ حرکت کی، حضرت سعد بن عبادہؓ کی بات سن کر عبداللہ بن ابی کو معاف کر دیا اور یہ معافی اس کی زندگی تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس گستاخ رسولؐ کو اس کے وفات کے وقت بھی آپؐ نے نصیحت فرمائی اور پھر جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے کفن کے لئے رحمت عالم نے اپنی قمیص مبارک عنایت فرمائی۔''

سرور کونین محمد عربیؐ کے معاف کر دینے کا یہ واقعہ بھی کافی مشہور و معروف ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول خدا کے ساتھ نجد کے ایک غزوے میں

تھے، دوپہر کے وقت آپ اپنی تلوار لٹکا کر درخت کے سایہ میں آرام فرما رہے تھے، تبھی غورث بن الحراث کا ادھر سے گزر ہوا اس نے چپکے سے تلوار اتار لی اور اسے تان کر آپ کو جگایا اور بولا اب تم کو کون بچا سکتا ہے۔؟

رسول اکرمؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر فرمایا ''خدا'' غورث پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ آپؐ نے اس کی ہاتھ سے تلوار چھین لی اور ارشاد فرمایا: بولو! اب تم کو کون بچائے گا؟ غورث کے پاس اس وقت کوئی جواب نہیں تھا آپ ﷺ چاہتے تو اس کی گردن اسی وقت سر قلم کر دیتے، مگر رحمت عالمؐ نے اسے بھی معاف کر دیا۔

آپ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا حمل سے تھیں اور ان کو ہبار نے نیزہ مار دیا جس کی وجہ سے آپؓ کا حمل ساقط ہو گیا اور وہی صدمہ حضرت زینب کی موت کا سبب بنا۔

یہ ہبار کا بہت بڑا جرم تھا، مگر جب اس نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر معافی طلب کی تو آقائے نامدارؐ نے اسے بھی معاف کر دیا۔ صلح حدیبیہ میں جب ۸۰ کفار غفلت کا موقع ڈھونڈ کر چپکے سے لشکر اسلام میں گھس آئے اور پکڑ لئے گئے اور پھر حضور اقدس کی خدمت میں پیش ہوئے، تو نبی اکرمؐ نے انہیں سزا دے کر قید نہیں کیا، بلکہ اپنی رحمت کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو معاف کر کے چھوڑ دیا۔ اسی طرح جب لبید بن اعصم نے رسول اللہؐ پر جادو کر دیا تو باوجود علم اور قدرت کے شہ لولاکؐ نے درگزر فرمایا اور کوئی بدلہ نہ لیا۔

رحمت عالمؐ کے مکارم اخلاق اور معاف کرنے کی ایک اور عظیم مثال فتح مکہ کے وقت سامنے آئے جب مکہ فتح ہوا تو اس وقت تمام مشرکین مغلوب ہو کر رسول خدا اور صحابہ کرام کے قبضہ میں تھے۔ آپ چاہتے تو ایک ایک سے بدلہ لے سکتے تھے۔ اسلام کے سارے دشمن قدموں میں پڑے تھے مسلمانوں کے رحم وکرم کے محتاج تھے، لیکن فتح وظفر کی اس گھڑی میں تمام برائیاں بھلا دی گئیں۔ تمام زیادتیاں معاف کر دی گئیں اور مکے کی تمام آبادی کو

عام معافی دے دی گئی، نہ کوئی گھر لوٹا گیا اور نہ کسی عورت کی توہین کی گئی۔ فتوحات کی تاریخ میں اس فاتحانہ دور کی کوئی مثال نہیں ملتی، رسول اکرمؐ نے پہلے تو انسان کی فطری مساوات کو اخوت کے بارے میں قرآن کے احکام بیان کئے اور فرمایا ''اے قریش میری طرف سے تمہیں اپنے لئے کس سلوک کی توقع ہے؟ انہوں نے جواب دیا آپ ہمارے شفیق برادر اور مہربان برادر کے فرزند ہیں، ہمیں آپ سے بھلائی کی ہی توقع ہے'' طبری کے مطابق یہ الفاظ سن کر نبی رحمت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ نے فرمایا: ''اچھا میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا'' (خدا تمہیں معاف کرے، آج تم پر کوئی ملامت نہیں اور وہ بڑا رحیم ورحمٰن ہے۔)

☆☆

محمد عربیؐ غیر مسلم مصنّفین اور دانشوروں کی نظر میں

● محمد رضوان الحق قاسمی

سید العرب والعجم ہادی اعظم حضرت محمد ﷺ کی شخصیت وسیرت عظمیٰ ازل سے ابد تک زمان ومکان کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کائنات کی ہر شئی رسالت مآبؐ کی نبوت ورسالت کے بے کراں جلال و جمال کی گرفت میں ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ سرکار دو جہاں ﷺ کی مدحت ورفعت کا شاہد ہے۔ ایک تاریخی اور نا قابل تردید حقیقت ہے کہ آج کرۂ ارض پر آباد کوئی خطۂ زمین ایسا نہیں ہے، جہاں شب وروز سرور دو عالم ﷺ کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، سرکار دو جہاں ﷺ کی سیرت اور حیات مقدسہ کا یہ تاریخی اور ابدی اعجاز ہے کہ اپنے اور بے گانے مسلم اور غیر مسلم سب ہی آپ کے ثنا خواں اور آپ کی عظمت اور رفعت کے معترف نظر آتے ہیں، مسلمانوں کو تو اس وقت چھوڑ دیجئے ان کا دین وایمان ہی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ومحبت میں مضمر ہے۔ غیر مسلموں کے کیمپ میں آیئے وہ بھی آپ کے شخصی عظمت کے قائل نظر آتے ہیں۔ ''الفضل ماشہدت بہ الاعداء'' اصل عظمت ورفعت یہی ہے کہ دشمن بھی اس کی گواہی دے۔

میسور کالج برائے خواتین کے شعبہ فلاسفی کے صدر پروفیسر ایس راما کرشنا راؤ نے ایک کتاب Mohammad The Prophet of Islam تصنیف کی ہے جس میں انہوں نے آپ ﷺ کی آمد سے قبل دنیا کی حالت اور آپ کی آمد کے بعد دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا غیر جانبدارانہ انداز میں جائزہ لیا ہے وہ لکھتے ہیں: مسلم مؤرخین کے

مطابق حضرت محمد ﷺ ۲۰/اپریل ۵۷۱ء کو عرب کے صحرا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نام کا مطلب ہے ''بہت تعریف کیا ہوا'' میرے نزدیک وہ تمام فرزندان عرب میں سب سے زیادہ عالی دماغ انسان تھے، سرخ ریت کے اس نا قابل عبور صحرا میں جتنے شاعر اور بادشاہ ان سے پہلے یا ان کے بعد ہوئے ہیں ان سب پر بدر جہا زیادہ فوقیت رکھتے ہیں۔ محمد ﷺ کا ظہور ہوا تو عرب ایک صحرا تھا وہ کچھ بھی نہ تھا۔ خالی صحرا سے محمد ﷺ کی طاقت وروح نے ایک نئی دنیا بنائی۔ نئی زندگی، نئی کلچر اور نئی سلطنت پیدا کی جو کہ مراقش تک پھیلی ہوئی تھی اور جس نے تین براعظموں (ایشیا، افریقہ، یوروپ)'' کے خیالات اور زندگی کو متاثر کیا۔ میری اس تحریر کا موضوع ایک ایسے مذہب کے اصولوں کی بابت لکھنا ہے کہ جو تاریخی ہے اور اس کے پیغمبر بھی ایک تاریخی شخصیت ہیں، سر ولیم میور جیسا ایک معاند ناقد بھی قرآن کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''دنیا میں غالباً قرآن کے سوا کوئی دوسری کتاب نہیں ہے جس کا متن بارہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس درجہ خالص صورت میں محفوظ ہو'' میں یہ اضافہ کروں کہ محمد ﷺ ایک تاریخی شخصیت ہیں آپ کی زندگی کا ہر واقعہ نہایت احتیاط سے منضبط کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دی گئی ہیں۔ آپ کی زندگی اور آپ کا کام اسرار کے پردہ میں چھپا ہوا نہیں کہ ایک شخص صحیح معلومات کے لئے اس مشکل مہم کو سر کرے۔ وہ بھس کے ڈھیر میں چھان کر سچائی کے دانے نکالے۔ میرا کام اس لئے بھی ہلکا ہو چکا ہے کہ وہ زمانہ بہت تیزی سے رخصت ہو رہا ہے، جبکہ ناقدین سیاسی اور غیر سیاسی وجوہ سے اسلام کو بہت بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ پروفیسر بوان ''میکرج میڈیول ہسٹری'' میں لکھتے ہیں کہ ''محمد ﷺ اور اسلام کے بارے میں کتابیں جو یوروپ میں ۱۹ ویں صدی کے آغاز سے پہلے چھپی تھی آج ان کو محض قلمی عجوبہ سمجھا جاتا ہے، مثال کے طور پر اسلام اور تلوار کا نظریہ آج کہیں بھی قابل لحاظ نہیں سمجھا جاتا۔ اسلام کا یہ اصول ہے کہ مذہب میں کوئی زبردست نہیں آج سب کو پوری

طرح معلوم ہے'' مشہور مؤرخ گبن نے لکھا ہے ''مسلمانوں کی طرف ایک مجرمانہ اصول منسوب کیا جاتا رہا ہے، کہ ہر مذہب کو تلوار کے زور سے ختم کر دیا جائے گا'' مگر گبن کہتا ہے کہ ''جہالت اور تعصب کا یہ الزام قرآن سے، مسلم فاتحین کی تاریخ سے، نیز مسلم عوام کے رویہ سے غلط ثابت ہوتا ہے جو کہ ہمیشہ قانونی اور سماجی طور پر مسیحی عبادت کے ساتھ رواداری کا طریقہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ (محمد ﷺ) کی زندگی کی عظیم کامیابی صرف اخلاقی طاقت کے ذریعہ ہوئی، تلوار کی کسی مار کے بغیر۔''

پروفیسر کرشنا راؤ لکھتے ہیں کہ ''محمد ﷺ نے ایتھنز، روم، فارس، ہندوستان یا چین میں فلسفہ کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی، لیکن انہوں نے انسانیت کو لافانی حیثیت کے حامل عظیم ترین حقائق سے باخبر کیا۔ محمد ﷺ خود تو ان پڑھ (امی) تھے، لیکن وہ اتنی فصاحت اور جوش سے بولتے تھے، کہ لوگ بے اختیار رو پڑتے تھے۔ اگر چہ کہ محمد ﷺ یتیم اور دنیا کی دولت سے محروم پیدا ہوئے تھے، لیکن پھر بھی سب ان سے محبت کرتے تھے۔ انہوں نے کسی فوجی کالج میں تعلیم نہیں حاصل کی تھی، لیکن پھر بھی بڑی بڑی مشکلات پر قابو پا کر انہوں نے اپنی فوجوں کو منظّم کیا اور اپنی ماہرانہ اخلاقی قوتوں کے بل پر جنگیں جیت لیں۔ خوبیوں سے بھرپور ایسے لوگ بہت نادر ہیں جن میں دوسروں کو بھی دعوت دینے کا ملکہ ہو۔''

کرشنا راؤ آگے کہتے ہیں کہ ''ایک یتیم بچے اور مظلوم مہاجر سے ابتدا کر کے آپ ﷺ ایک پوری قوم کے روحانی و مادی، حاکم اعلیٰ اور اس کی تقدیر کے مالک بن گئے، اس عمل کے دوران پیش آنے والے امتحانات و ترغیبات، مشکلات و تغیرات، روشناسیاں اور سارے اونچ نیچ، دہشت اور عظمت کے درمیان وہ دنیا کے امتحان میں کامیاب ہو کر زندگی کے ہر میدان میں ایک نمونہ بن کر حاضر ہوئے۔ ان کی کامیابیاں زندگی کے کسی ایک میدان میں متعلق نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے تمام احوال پر حاوی ہیں، مثال کے طور پر عظمت اگر یہ ہے کہ بربریت اور مکمل اخلاقی تاریکی میں پڑی ہوئی قوم کو پاک کیا جائے تو

جس نے اس پوری قوم کی کایا پلٹ دی، اس گری ہوئی قوم کو اتنا اونچا اٹھا دیا کہ وہ تہذیب و معرفت کی روشنی کے حامل بن گئی۔ اس عظیم شخصیت کی عظمت یہ ہے کہ کسی سوسائٹی کے متنفر عناصر کو آپس میں بھائی چارگی اور خیر خواہی کے روابط میں جوڑ دیا جائے، تو صحراء میں ہونے والے نبی کو عظمت کے امتیاز کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر عظمت ذلیل کن توہمات اور ہر قسم کی مہلک عادتوں میں مبتلا قوم کی اصلاح کرنا ہے تو پیغمبر اسلام نے لاکھوں آدمیوں کے دل سے توہمات اور غیر معقول خوف کو نکال باہر کیا۔ اگر عظمت بلند مظاہرہ ہے تو محمد ﷺ کے دوستوں و دشمنوں سبھی نے ان کو ''الامین'' اور ''الصادق'' کا لقب دیا تھا، اگر فاتح عظیم ہونا ہے تو محمد ﷺ بھی ایک مجبور یتیم اور عام انسان کی زندگی سے بلند ہو کر جزیرہ عرب کے حاکم بن گئے جو کسریٰ اور قیصر کا ہم پلہ تھا۔ محمد ﷺ وہ تھے جنہوں نے ایک عظیم سلطنت قائم کی، جو ان گزری ہوئی ۱۴ صدیوں میں بھی برقرار ہے۔ اگر لیڈر کے لئے اس کے تابعین کا احترام اس کی عظمت کا معیار ہے، تو پیغمبر ﷺ کا نام آج بھی دنیا میں پھیلے ہوئے کروڑوں لوگوں کے لئے جادو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ انتہائی حد تک بے غرض انسان تھے۔ انہوں نے اپنے لئے صرف دو ٹائٹل چنے ایک اللہ کا بندہ اور دوسرے اس کا رسول۔ ان کے پور پور میں انسانیت رچی بسی تھی۔ ان کا مشن ہی تھا کہ انسان کی خدمت کی جائے، انسان کو بلند کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو انسان بنایا جائے، یہی ان کی زندگی کا سارا مدعا تھا، ان کے خیالات، الفاظ اور اعمال سب کا مقصد انسانیت کی بہتری تھی۔''

پروفیسر راؤ آگے رقم طراز ہیں ''مدینہ منورہ کا پورا شہر جہاں آپ رہتے تھے آپ ﷺ کے آخری دنوں میں بہت مالدار ہو گیا تھا ہر جگہ وہاں سیم و زر کی فراوانی تھی، لیکن آپ ﷺ پر کئی کئی ہفتے اس طرح گزرتے تھے کہ اس جزیرۂ عرب کے حکمراں کے گھر آگ نہیں جلتی تھی۔ ان کا سارا کھانا ان دنوں میں پانی اور کھجور ہوتی تھی۔ ان کا پورا خاندان بہت سے راتوں کو بھوکا سوتا تھا، کیونکہ شام کو انہیں کھانے کو کچھ بھی میسر نہیں ہوتا تھا۔ ایک لمبے مشغول

دن کے بعد وہ کھجور کے پتے کی بنی ہوئی چٹائی پر سوتے تھے۔ان کی موت کے دن ان کا سارا اثاثہ چند سکے تھا، جس کا کچھ حصہ قرضہ ادا کرنے کے لئے دیا گیا اور باقی ایک غریب کو دے دیا گیا، جو ان کے گھر خیرات مانگنے آیا تھا۔جس کپڑے میں ان کی زندگی تمام ہوئی اس میں بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے، وہ گھر جس سے ساری دنیا میں روشنی پھیلی وہ تاریک تھا، کیونکہ اس کے پاس دیا جلانے کے لئے تیل نہیں تھا۔حالات بدل گئے، لیکن اللہ کے پیغمبر نہیں بدلے۔ جیت میں اور ہار میں حکمرانی یا بدحالی میں، فراوانی میں یا محتاجی میں وہ ایک ہی آدمی تھے اور ہر حال میں ان کا سلوک ایک ہی تھا اور وہ تھے (محمد ﷺ)۔''

ایک امریکی عیسائی ماہر فلکیات، ریاضی داں اور سائنس داں مائکل ایچ ہارٹ نے کافی تحقیق کے بعد ہر تاریخ کے ۱۰۰ انتہائی بااثر شخصیتوں کا ایک تذکرہ شائع کیا ہے۔ تذکرے میں اس نے مذہبی وسیاسی رہنماؤں، موجدوں، ادیبوں، فلسفیوں، سائنسدانوں کے حیات اور کارنامے پر روشنی ڈالی ہے۔

مائیکل ہاٹ نے اپنے اس تصنیف میں دنیا کی سو عظیم شخصیتوں میں حضرت عیسیٰ مسیح، حضرت موسیٰ، نیوٹن، کولمبس اور مائیکل انجلو جیسی نامور شخصیتوں کو شامل کیا ہے۔ان سو عظیم شخصیتوں میں سرفہرست حضرت محمد ﷺ کو قرار دیتے ہوئے اس نے اس تذکرے کو اپنے ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے:

''قارئین میں سے ممکن ہے کچھ لوگوں کو تعجب ہو کہ میں نے دنیا جہاں کی مؤقر ترین شخصیات میں محمد ﷺ کو سرفہرست کیوں رکھا ہے اور مجھ سے وجہ طلب کریں گے۔حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں صرف وہی ایک ایسے انسان تھے، جو دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے غیر معمولی طور پر کامیاب وکامران اور سرفراز رہے۔اسی وجہ سے ان کے وصال کو کئی صدیاق بیت جانے کے باوجود دنیا کے ہر گوشہ میں آج بھی، ان کی عظمت اور رفعت شان کے قصیدے پڑھے جارہے ہیں۔''

ذیل کے چند نامور اور عظیم شخصیتوں کے تاثرات مختصر جملوں میں پیش کئے جارہے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں۔

میں ایک اللہ پر اور اللہ کے رسول محمد ﷺ پر ایمان لاتا ہوں'' یہ ہے اسلام کا سیدھا سادا طریقہ۔کوئی بھی مورتی رسول کی عظمت کو کبھی کم نہیں کرسکی ہے۔پیغمبر کے وقار وعظمت کو انسان اپنی حد درجہ کی پاکبازی کے باوجود پھلانگ نہیں سکا ہے اور ان کے زندہ اصولوں نے ان کے ماننے والوں کے اظہار تشکر کو، حجت اور مذہب کے حدود کے اندر باندھ رکھا ہے۔(ایڈورڈ گبن اور سائمن اوکلے۔تاریخ سلطنت اسلامیہ لندن: ۱۸۷۰ صفحہ: ۵۴)

(۲) محمد روح رحمت تھے اور آپ ﷺ کا یہ اثر باقی رہا اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ نے اسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا (دیوان چند شرما-پیغمبر مشرق، کلکتہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۲۲)

(۳) جسٹینین کی موت کے ۴ سال بعد ۵۶۹ء میں عرب کے شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ وہ انسان جو ساری نسل انسانی پر لازوال اثر چھوڑا۔محمدؐ'' (جان ولیم، ایم ڈی، ایل ایل بی-یوروپ کے فروغ فراست کی تاریخ، لندن: ۱۸۷۰ء جلد اول صفحہ ۳۳-۳۲۹)

(۴) مجھے شبہ ہے کہ کوئی ایسا بھی انسان ہو (سوائے آپؐ کے) جس کے بیرونی حالات جس قدر تبدیل ہوئے ہیں اتنی ہی اس نے اپنے اندر بھی تبدیلی کی ہو۔(وی سی باڈرے، پیغمبر-لندن ۱۹۴۶ء صفحہ: ۹)

(۵) یہ کہ محمدؐ نے عورت کا مرتبہ بلند کرنے کی جو اصلاح کی ہے اسے آفاقی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔(ایچ ایم گب-محمدیت لندن صفحہ: ۱۳۳)

(۶) صرف ایک سال کے اندر آپؐ واقعتاً مدینہ کے روحانی اور دنیوی حکمران بن گئے اور آپؐ کے ہاتھ ایک ایسی نبض پر تھے جو پوری دنیا کو تہہ وبالا کرسکتے تھے۔(جان آسٹن-محمد، اللہ کے رسول-ٹی پی سینڈ کلاسیز ہفتہ وار شمارہ، ۲۴ ستمبر ۱۹۲۷ء)

(۷) اگر محمد جیسا انسان جدید دنیا کی ڈکٹیٹر شپ اختیار کرلے، تو وہ اس کے ہر اس

مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا جس سے اسے امن اور راحت مل جائے گی جس کی اسے زبردست ضرورت ہے۔ (جارج برنارڈ شا)

(۸) پاسچر اور سالک جیسے لوگوں کو پہلا احساس ہی لیڈر مان لیتا ہے۔ ایک طرف گاندھی اور کنفیوشش تو دوسری طرف سکندر، سیزر اور ہٹلر جیسے لوگوں کو دوسرے اور شاید تیسرے احساس میں لیڈر مانا جاسکتا ہے۔ مگر عیسیٰ اور بدھ کا تیسرے خانے سے تعلق ہے، لیکن ہر دور کے لئے عظیم ترین رہنما محمد ﷺ ہی ہیں جن میں تینوں درجے کی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان سے قدرے کم حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ (پروفیسر جولیس ماسرمان)

(۹) ریاست اور چرچ کے سربراہ، وہ بیک وقت سیزر بھی تھے اور پوپ بھی، وہ پوپ تھے، مگر پوپ کے تصنع کے بغیر وہ سیزر تھے، مگر سیزر کے لشکر کے بغیر- کوئی تیار لشکر نہیں، کوئی ذاتی محافظ نہیں، کوئی پولیس فورس نہیں، کوئی مقرر آمدنی نہیں، اگر کوئی یہ کہے کہ آپؐ نے امداد الٰہیہ کے ساتھ حکمرانی کی تو وہ محمد تھے، کیونکہ کسی جماعت کے بغیر ساری طاقت ان کے پاس تھی۔ انہیں اقتدار کی پرواہ نہیں تھی۔ آپؐ کی ذاتی زندگی کی سادگی آپ کی عوامی زندگی میں بھی عیاں تھی۔ (ریورینڈ آر بوسورتھ اسمتھ)

(۱۰) صرف ایک سال کے قلیل عرصے میں آپ مدینہ کے روحانی اور دنیوی رہنما بن گئے اور آپ کی انگلیاں دنیا کی نبضوں پہ تھیں۔ (جان آسٹن محمد اللہ کے رسول- ہفتہ وار پی ٹی اور کیسلز شمارہ ۲۴ ستمبر ۱۹۲۷ء)

(۱۱) فلسفی، خطیب، داعی، قانون ساز، معقول عقائد کا بحال کرنے والا ایک فرقہ بغیر دیوی دیوتا کے ۲۰ دنیاوی سلطنتوں اور روحانی سلطنت کے بانی- یہ ہیں محمدؐ- معیار کے ہر اس پیمانے کے مطابق جن سے عظمتوں کی پیائش ہوتی ہے، ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ کیا آپ سے بھی کوئی عظیم المرتبت شخصیت ہے؟ (لامارٹین، ہسٹر داں ترکی،

پیرس ۱۸۰۴ء) جلد دوئم صفحات ۲۷۲-۲۷۶-

(۱۲) ہر اس شخص کے لئے جو عرب کے عظیم رسول کی زندگی اور سیرت کا جائزہ لیتا ہے، جو یہ جانتا ہے کہ آپ نے کیسے تعلیم دی اور کیسی زندگی گزاری۔ اس عظیم المرتبت پیغمبر، رب العالمین کے عظیم رسول کے لئے عقیدت کے سوا کچھ اور محسوس کر ہی نہیں سکتا ہے اور اگر چہ جو کچھ بھی ہیں اور جس انداز میں بھی کہنا چاہوں گا ممکن ہے کہ دوسروں سے مطابقت رکھتے ہوں اس کے باوجود جب کبھی میں ان کا مطالعہ کرتا ہوں عرب کے اس عظیم استاذ کے لئے قدردانی کا ایک نیا جذبہ، احترام ایک نئے انداز میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ (انی بسینٹ، اسوہ تعلیمات محمد مدراس، ۱۹۳۲، صفحہ:۴)

سرکار دو عالم جہاں کی مدحت و رفعت اور تعریف کی یہ وہ مثال اور تاریخ ساز پہلو ہے جس کی روشنی میں اجالا بڑھتا ہی جارہا ہے، آپ کے ذکر مبارک سے دنیا روشن اور آپ ﷺ کی تعلیمات کے نور سے انسانیت منور ہوتی جارہی ہے ان تمام باتوں کے باوجود یہ بھی ایک ابدی اور تاریخی حقیقت ہے کہ:

لا یمکن الثناء کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

☆☆

اسوۂ نبوی ہی ہر دور میں کامیابی کا ضامن

● محمد جسیم الدین قاسمی

سرکار دو عالمؐ نے اپنے ماننے والوں کو جو تعلیم دی ہے وہ افراط و تفریط سے منزہ ہے، لیکن آج امت مسلمہ بے شمار امور میں افراط و تفریط کا شکار ہے، جس کی وجہ سے وہ غیروں کے اعتراضات کا نشانہ بنی ہوئی ہے، حضور کریمؐ نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ امت کو جو سبق دیا وہ ہر پہلو سے نہایت جامع ہے، اس کو اختیار کئے بغیر دنیا و آخرت کی کامیابی ناممکن ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی ہم مسلمانوں کے لئے اسوۂ نبوی ہی مشعل راہ ہے، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہم مغرب کی ظاہری چمک دمک کے پرفریب جال میں پھنسے جارہے ہیں اور اسی کے عمل کو زندگی کے شعبوں میں بلا جھجک اپناتے جارہے ہیں اور کامیابی کی تلاش و جستجو سیرت طیبہ کے بجائے غیروں کے طریقہائے معاشرت میں کررہے ہیں۔ آج جو عمومی صورت حال ہے وہ ناگفتہ بہ ہے، بڑے بڑے اسکالر جو اسلامیات پر ریسرچ کرنے میں اپنی عمر عزیز کے بیشتر حصے کو گنواتے ہیں اور اسلامیات کے ڈگری کے حامل ہوتے ہیں۔ جب ان کی عملی زندگی کا جائزہ لیجئے تو یہی سامنے آئے گا کہ جدت پسندی نے انہیں اسوۂ نبوی سے دور کردیا ہے۔ شادی بیاہ جو انسانی ضرورت کے ساتھ شرعی ضرورت بھی ہے ایسے موقع پر حضور کریم کے فرمودات وارشادات کی جو پامالی ہوتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا تھا۔''**ان اعظم النكاح بركة ايسرها مؤنة**''.

لیکن آج ریاکاری و خودستائی کا عفریت اس طرح شکنجہ کسے ہوا ہے کہ ہر مذموم وغیر

اخلاقی حرکتوں کو تقریب نکاح میں روبہ عمل لایا جاتا ہے۔ جہیز کے نام پر لڑکی والوں سے اس قدر خطیر رقم کا مطالبہ ہوتا ہے کہ والدین نہایت اضطراب و بے چینی سے دوچار ہوتے ہیں اور ان کے سامنے زمانہ جاہلیت کا نقشہ ابھر آتا ہے کہ وہ لوگ کیوں اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کیا کرتے تھے۔ اسی نازیبا حرکت کی پاداش میں آج نہ جانے کتنی بہنیں اپنے والدین کی دہلیز پر بوڑھی ہوجاتی ہیں اور نہ جانے کتنی بہنیں جہیز میں خطیر رقم نہ لانے کے جرم میں مطلقہ ہوجاتی ہیں۔ اس سے آگے بڑھیے تو اہل ثروت جو غیر منصفانہ عمل اپناتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنی تقریبات اور پارٹیوں میں صرف امراء و رؤسا کو مدعو کرتے ہیں، ان کے محلے اور قرب وجوار کے بے شمار افراد جو بھوک کی شدت سے پیٹ کھولے رہتے ہیں انہیں دعوت نہیں دی جاتی ہے۔ ایسی دعوتوں کو محسن اعظمﷺ نے نہایت ناپسندیدہ قرار دیا ہے جس میں فقراء کو نظر انداز کیا گیا ہو، پھر غیر اسلامی کے منافی ہے اپنایا جاتا ہے، جس سے یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ اسلام کے پیروکاروں کی تقریب ہے یا غیروں کی۔

معاشرتی زندگی کے حوالے سے حضورؐ نے جو مساوات کی تعلیم دی ہے اس کی بھی خوب پامالی ہوتی ہے، ذات پات، بھید بھاؤ کو اپنے عمل اور کردار سے فروغ دیا جاتا ہے جبکہ آقائے مدنیؐ نے فرمایا تھا:''**لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لابيض على اسود و لا لاسود على ابيض كلكم بنو آدم و آدم خلق من تراب**''.

حضور کریمؐ کے اس فرمان کی بنیاد پر دشمنان اسلام بھی اس بات کے معترف رہے ہیں کہ اسلام دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جس نے مساوات انسانی کا نہ صرف ایک عجیب و غریب اور انوکھا اصول دیا بلکہ اپنے رسول کے ذریعہ اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔

لیکن آج اسلام کے نام لیوا بھی شعوری طور پر غیر اسلامی ذہن کو اپنانے میں نہیں ہچکچاتے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے امت محمدیہ کو ایک امت بنایا تھا، مگر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس ایک امت کو ذات و برادری کے نام پر سیکڑوں طبقوں میں تقسیم

کر دیا اور مسلک و مشرب کے نام پر متعدد خانوں میں بانٹ دیا ہے، نماز کی صفوں میں تو ہم قدم سے قدم اور شانہ سے شانہ ملا کر کھڑے ہوتے ہیں، مگر عملی زندگی میں اس کا اثر ایک مخالف اور حریف کی طرح زائل کر دیتے ہیں، عبادت گاہوں میں اللہ اور اس کے رسول کا جو حکم بجالاتے ہیں، سماجی زندگی اور معاشرتی زندگی میں اس کا ہم ذرا سا بھی پاس ولحاظ نہیں رکھتے ہیں، ہمارے سماجی مزاج ایمان کی بنیاد پر نہیں بنتے، بلکہ مسلک وفرقہ اور برادری واد پر بنتے ہیں۔ ہمارے دریچے ملت کے بجائے گروہ وجماعت کے نام پر کھلتے ہیں، ہماری شادیاں دین کے طریقے کے بجائے غیر مسلموں کی طرح ذات وبرادری کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا ''تم شادی کا رشتہ دین کی بنیاد پر کرو'' مگر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم شادیاں ذات پات کی بنیاد پر کرتے ہیں، کوئی کتنا ہی دین دار اور کتنا ہی اچھا مسلمان کیوں نہ ہو، اگر وہ ہماری خود ساختہ برادری کا نہیں ہے، یا نو وارد اسلام ہے تو اس سے ہم اپنا خاندانی رشتہ نہیں قائم کرتے اور کوئی خواہ کتنا ہی بے دین اور شریعت بے زار کیوں نہ ہو مگر خود ساختہ برادری کا ہے، تو ہم فراخ دلی سے اس کا رشتہ قبول کر لیتے ہیں، جو اسلامی مساوات کے یکسر منافی ہے، اسی طرح ظاہری وضع قطع میں بھی ہم غیروں کی تہذیب کو گلے لگانے میں کراتے نہیں خصوصاً داڑھی جو تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت رہی ہے، اسلام کا دم بھرنے والے بھی شعوری طور سے داڑی منڈا رہے ہیں، نکیر کرنے پر بعض دانشوران تو یہاں تک کہہ ڈالتے ہیں کہ مقصد بعثت کو سمجھنا چاہئے، حضور کریمؐ کی بعثت داڑھی رکھوانے کے لئے نہیں ہوئی تھی، بلکہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے ہوئی تھی، حالانکہ جمہور فقہا ومحدثین کا اتفاق ہے کہ ایک مشت داڑھی رکھنا واجب ہے۔ مذکورہ بالا تمام امور کے پیچھے جو اسباب کارفرما ہیں، وہ ہماری نفسیاتی شکست خوردگی ہے کہ ہم نے غیر کی تہذیب کو آقائے مدنی کی تہذیب وثقافت پر فوقیت دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم خود اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں ذلیل وخوار ہوئے اور جن کی تہذیب کا اپنایا انہوں نے بھی کوئی لائق پذیرائی متاع دنیا نہ دیا جیسا کہ

طارق بن ثاقب نے کہا ہے:

پیغمبر اعظم کے ثنا خواں ہم ہیں　　اسلام کی عظمت کے نگہباں ہم ہیں
اور یہ بھی کہ تعلیم نبی سے پھر کر　　دنیا میں ذلیل اور پریشاں ہم ہیں

آج بھی اگر ہم اسلامی انقلاب برپا کرنے کا انداز واسلوب سیکھ سکتے ہیں تو آپ سے ہی سیکھ سکتے ہیں۔ آج اگر ابن آدم کو حقیقت کی شعور افزا کرنیں، اخلاق کی لازوال قدریں اور زندگی کی فلاح کے اٹل اصول ہاتھ آسکتے ہیں تو محمدؐ کی بارگاہ ہی سے ہاتھ آسکتے ہیں، محسن اعظم سرکار دو عالمؐ جیسا داعی، معلم ومربی اور قاعد اگر مبعوث نہ ہوا ہوتا تو کبھی کارگاہ ظلمت میں ہدایت کی قندیلیں روشن نہ ہو پاتیں۔

کردار کی عظمت اور اخلاقی بلندی کے حصول کے لئے قدم بہ قدم اور زندگی کے ہر موڑ پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو اور اسوۂ رسولؐ کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ نبی کریم کی محبت کو دل وجان میں بسانا ہوگا جو ایمان کی بنیاد ہے، پھر ہم کائنات میں کوئی انقلاب برپا کر سکتے ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنے عہد میں دینی انقلاب پیدا کرنے میں کامیابی اسی بنیاد پر ملی کہ ان کا قول عمل سے متصادم نہ تھا، بلکہ جو کہتے تھے اسے عملاً کر کے بھی بتاتے تھے۔ ان کے عمل ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رضامندی کا پروانہ عطا کیا۔ تب آج بھی اسی کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے رہن وسہن اور زندگی کے تمام شعبوں میں عملاً سرکار دو عالمؐ کے اسوہ کو اپنائیں پھر ہمیں کامیابی مل سکتی ہے ورنہ ہمیں دنیا میں ذلت وخواری ہاتھ آئے گی اور آخرت میں بھی نجات نہ مل سکے گی۔

جو پیرو سرکار دو عالم ہوجائیں
حالات کے آزار سے بے غم ہوجائیں
ممکن نہیں مل جائے ہمیں راہ نجات
تعلیم سے آقا کے جو برہم ہوجائیں

☆☆

سیرت طیبہؐ کے چند دعوتی پہلو

● مولانا ابوریحان ندوی

صبح کا سہانا وقت تھا، ستارے جھلملا رہے تھے، بہار آفریں ماہ ربیع الاوّل کی ۹؍تاریخ (۲۰؍اپریل ۵۷۱ء) دوشنبہ کا مبارک دن تھا کہ عالم انسانیت کے آفتاب وماہتاب محمد عربی ﷺ بے آب و گیاہ سرزمین مکہ کے ایک باعظمت ورفعت خاندان قریش، عبداللہ بن عبدالمطلب کے جگر گوشۂ آمنہ بنت وہب کے بطن مبارک سے عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف لائے اللہم صلی وعلی الہ واصحابہ وسلم۔ آپ کی ولادت باسعادت سے چمنستان دہر میں بہار آ گئی۔ آفتاب ہدایت کی شعائیں ہر طرف پھیلنے لگیں، ظلمت کدہ عالم پر کپکپی طاری ہوگئی، توحید کا غلغلہ اٹھا، ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور زیادہ صفائی وستھرائی کے ساتھ چہار دانگ عالم پر پھیلتا گیا! ابھی محمد ﷺ کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں سنبھالے کم وبیش تین سال کا ہی عرصہ گزرا تھا کہ بہت سے سعادت مند انسان آغوش اسلام میں داخل ہونے لگے، ان میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن حارثہ اور ام ایمن رضی اللہ عنہم اجمعین نے اسلام قبول کیا۔ بعثت کے تیسرے سال آیت نازل ہوئی فاصدع بما تومر آیت کے نزول کے بعد اعلانیہ طور پر پیام الٰہی لوگوں تک پہنچانا شروع ہوگیا، اللہ رب العزت نے حکم دیا۔

"یایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت

رسالته واللّٰه یعصمک من الناس." "اے پیغمبر تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچا لے گا۔

حضور اکرم ﷺ نے پیغام الٰہی اور دعوت وتبلیغ کا کام سب سے پہلے اپنے گھر اور خاندان والوں سے شروع کیا۔ صاف حکم آیا: "وَانذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ" اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرایئے پھر تمام نوع انسانی کو وحدانیت کی دعوت دی۔ آپ ﷺ موسم حج میں قبائل عرب کے پاس جا کر حق کا پیغام پہنچاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے۔ جہاں کہیں بھی دو چار آدمی کو دیکھتے انہیں اسلام کی طرف بلاتے اور اسلام قبول کرنے میں دین ودنیا کے جو فوائد ہیں اس سے مطلع کرتے تھے۔ بسا اوقات ابولہب آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو منع کرتا کہ ان کی نہ سنو، مگر آپ نہ مایوس ہوتے نہ تبلیغ چھوڑتے، بلکہ دعا فرماتے کہ خداوند یہ بے سمجھ ہیں اگر تو چاہے تو یہ راہ راست پر آجائیں۔ ان کی ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ کے بہت سے معزز گھرانے دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے اور پھر انہیں اسلام قبول کرنے سے کوئی لالچ یا خوف روک نہ سکا۔ آپ کی دعوت کا دائرہ مدینہ، یمن اور حبشہ تک وسیع ہوگیا اور نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ اسلام پھیلتا اور پھولتا گیا۔ جب حضور ﷺ نے اعلانیہ طور پر شرک اور بت پرستی کی مذمت بیان کرنا شروع کر دی تو قریش کے چند معززین نے ابوطالب سے کہا تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین وتذلیل کرتا ہے۔ اس لئے یا تو تم بیچ سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آجاؤ کہ مقابلہ کرلیں، ابوطالب نے حضور اکرم ﷺ سے رؤسائے قریش کی باتیں بتائیں اور کہا کہ اے جان عم! اب حالت نازک ہوگئی ہے میرے اوپر اتنا بار نہ ڈالو کہ میں برداشت نہ کرسکوں، حضور ﷺ نے آبدیدہ ہوکر فرمایا: "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے ہاتھ میں سورج رکھ دیں جب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا"

ایمانی قوت اور پیغمبرانہ شان کا یہ وہ دعوتی پہلو تھا جس کی وجہ سے قبائل عرب کے دہل دہل گئے، حضورﷺ میں دعوت تبلیغ کی بے پناہ صلاحیت تھی اسی وجہ سے آپ اپنی قوم کے سرداروں اور لیڈروں سے زیادہ خطاب کرتے تھے اور اپنی پوری قوت سے ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے تھے، کیونکہ اس طبقہ کا ایک فرد بھی خدا کے دین کو قبول کر لیتا ہے تو بہت سے افراد کے لئے قبول دین کا راستہ کھل جاتا۔

حضورﷺ کی دعوت کو سب سے زیادہ مؤثر دلکش اور جاذب نظر کرنے والی آپ کے ذاتی اخلاق و کردار، رفق و ملاطفت، حسن معاملات، جود وسخا، عدم تشدد اور عفو درگزر کا وہ معاملہ تھا جو دشمنان اسلام کے قلوب کو بھی مسخر کر دینے والے تھے، آپ کا یہی وہ کردار ہے جو درحقیقت اسلام کی نشر و اشاعت میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے، قرآن مجید میں اس نکتہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ''**ولو کنت فظا غلیظ القلب لا انفضوا من حولک**'' (اور محمدؐ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے) حضور اکرمﷺ کی فیاضی اور جود وسخا کا ایک واقعہ صحیح مسلم نے نقل کیا ہے۔ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگی۔ آپﷺ نے انہیں دے دی۔ اس شخص پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلے میں جا کر کہا لوگو! مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمدﷺ اس قدر دیتے ہیں کہ ان کو خود اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا'' یہ پیغمبرانہ دعوت کا ایک اہم اصول ہے کہ فریق مخالف خواہ کتنا ہی سرکش اور غلط عقائد و خیالات کا حامل ہو اگر اس کے ساتھ نرم خوئی اور ہمدردانہ جذبہ اور خیر خواہی کا انداز اختیار کیا جائے تو مخالف غور و فکر پر مجبور ہو جائے گا اور اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوگا۔ آپﷺ کی دعوتی سرگرمیوں پر نظر رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپﷺ نے اپنی دعوت دین میں چند باتوں کا لحاظ رکھتے تھے۔ لوگوں کی آمادگی کا انداز، موقع محل کا لحاظ، غلط کار لوگوں کا نام لئے بغیر انہیں عمومی انداز میں فہمائش، گفتگو میں اختصار سے کام لینا تاکہ لوگ اکتا نہ جائیں، صاف اور

صریح پیرایہ بیان اختیار کرتے، تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنے ذہنوں پر نقش کر لیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: حضورؐ جب کوئی بات فرماتے تھے تو اسے تین مرتبہ دہرایا کرتے تھے، تاکہ لوگ سمجھ لیں اور جب آپ کسی جماعت کے پاس تشریف لاتے تو ان کو تین مرتبہ سلام کرتے۔

حضور اکرمﷺ جو عالمگیر شریعت، دائمی ہدایت اور بنیادی دعوت لے کر آئے وہ چار چیزوں پر منحصر ہے۔ عقائد، عبادت، معاملات، اخلاقیات انہیں چاروں کی اصلاح و تعلیم و تکمیل کے لئے آپﷺ کو بھیجا گیا اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔ دنیا کے عشرت کدوں میں آپﷺ نے لوگوں کو انہیں باتوں کی دعوت دی، کبھی بشارت اور خوشخبری کا پیغام سنایا اور کبھی خدا کے جلال سے ڈرایا اور عذاب الٰہی سے خوف دلایا اور لوگوں کو ان کے انجام بد سے آگاہ کیا۔ پس ہر داعی کا فرض ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں رسول اکرمﷺ کا اسوۂ حسنہ قدم قدم پر ملحوظ رکھے اس کے بغیر دعوت کی کامیابی دشوار، بلکہ محال ہے۔

☆☆

طب نبوی ﷺ

● حکیم سید امین الدین

جس طرح کلامِ پاک میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ''وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ'' یعنی کوئی رطب و یابس چیز ایسی نہیں ہے جو کتابِ روشن میں موجود نہ ہو۔'' اسی طرح انسانی حیات وممات کا کوئی گوشہ اور پہلو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں احادیث پاک میں ہم کو واضح ہدایات نہ ملتی ہوں چونکہ حضور ختمی مرتبت ﷺ کا منصب رسالت ونبوت تھا۔ آپ اقوام وامم عالم کی رشد وہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ آپ گم کردہ راہ انسانوں کے قلب ونظر کو جلا بخشنے، انہیں اخلاقی اور تمدنی بلندی عطا کرنے، ان کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی رہنمائی کے لئے بھیجے گئے تھے۔ آپ جسمانی اور روحانی امراض کے طبیب اور معالج تھے۔ امی لقب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر دنیا جہان کی حکمتیں نثار ہوں۔ آپ ہر روگ اور ہر دکھ کا درماں بن کر آئے۔ آپ کی کوئی بات حکمت سے خالی نہ تھی اس لئے یہ ناممکن تھا کہ علم الابدان کا باب اس سلسلہ میں تشنہ رہ جاتا۔

طب کا موضوع جیسا کہ آپ جانتے ہیں حفظ صحت حاصلہ اور استردادِ صحتِ زائلہ ہے۔ پہلے حصہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم حفظانِ صحت کے ان اصولوں کو اپنائیں اور حفظِ ماتقدم کے ان طریقوں پر عمل کریں جن کے ذریعہ بیماریوں کے حملوں سے محفوظ رہا جاسکے اور دوسرے حصہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بیماری لاحق ہوجائے تو اس کا ممکن طور پر علاج کریں۔

جہاں تک حفظانِ صحت اور صفائی کے اصولوں کا تعلق ہے تو ہم کو احادیث پاک میں

بڑا ذخیرہ ملتا ہے بعض چھوٹی سے چھوٹی، مگر اہم اور بنیادی باتوں کی جانب آپ نے زیادہ سے زیادہ توجہ فرمائی ہے۔ مثلاً حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ ہفتہ وار ناخن ضرور ترشوائے جائیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تاکید فرمائی ہے کہ ناخن دانتوں سے نہ کاٹے جائیں کیونکہ یہ طریقہ حفظانِ صحت کے اصول کے خلاف ہے۔

حضرت ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص حضور اقدسؐ کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوا اور آسمان کی خبریں دریافت کرنے لگا تو اس پر آپ نے فرمایا: تم میں ایک شخص آتا ہے اور آسمان کی خبریں دریافت کرتا ہے، مگر اس کو اپنے سامنے کی چیزیں نظر نہیں آتیں، یعنی اس کے ناخن پرندوں کے پنجوں کی طرح بڑھے ہوئے ہیں جن میں ہر طرح کا میل کچیل بھرا ہوا ہوتا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ نے اپنی عبادات اور ان کے ارکان وشرائط تک میں حفظانِ صحت کے اصولوں کو بڑی خوبصورتی سے سمو رکھا ہے۔ نماز اور نماز کے لئے غسل وطہارت اور پاکیزگی لباس ومکان کا جو نظام اسلام نے قائم کیا ہے اگر اس پر صحیح معنیٰ میں عمل کیا جائے تو صحت وصفائی اور پاکیزگی کا وہ ماحول پیدا ہوجاتا ہے کہ لوگ بڑی حد تک بیماریوں سے نجات پاسکتے ہیں۔

اگر اسلامی طہارت کے طریقوں پر غور کیا جائے تو اس کا معیار سائنس کے طریقوں سے بھی اعلیٰ وارفع نظر آئے گا نماز سے پہلے وضو کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ روحانی اور جسمانی دونوں فوائد پر حاوی ہے اسی وجہ سے خود وضو کو روحانی عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ ایک موقعہ پر ایک غیر مسلم سائنسداں نے ایک مسلمان کو وضو کرتے دیکھا وہ وضو کی ترتیب کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے ناک میں پانی لینے پر غور کیا۔ اس نے دیکھا کہ کلائی سے کہنی تک کا حصہ دھوتے وقت مستعمل پانی کو دھلے ہوئے پنجوں کی طرف سے نہیں، بلکہ کہنی کی طرف سے بہایا جاتا ہے اس طریقہ سے بہت متاثر ہوا۔ پھر اس نے سر اور گردن پر مسح کی سائنٹفک

ترکیب کو دیکھا۔ اس نے غور کیا کہ سر اور گردن کو دھویا نہیں جاتا جس سے گرم گرم حالت میں یہ نقصان پہنچ جانے کا امکان ہے بلکہ صرف ہاتھ پھیرا جاتا ہے جس سے تسکین کے علاوہ اعصاب میں انتعاشی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو دھونے سے نہیں ہوسکتی چونکہ پشت اور گردن کا تعلق مبدأ التخاع سے ہے اور دماغی وعصبی اعمال میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس طریقہ کو دیکھ کر وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام کے سامنے اپنی گردن جھکادی اس نے سوچا کہ تیرہ سو برس پہلے جس انسان نے نماز سے پہلے طہارت اور تفریح اعضائے بدن کا یہ طریقہ سکھایا ہے وہ نبی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح اسلام میں دانتوں کی صفائی اور خلال کو انتہائی اہمیت دی گئی ہے اور دانتوں کی صفائی کے لئے مسواک کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مسواک سے بہتر دانتوں کی صفائی کا کوئی اور طریقہ ممکن نہیں یہ طریقہ مضرات سے پاک اور فوائد سے مملو ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مسواک انسان کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے اور یہ قول جتنا سائنٹفک ہے موجودہ طبی سائنس کی روشنی میں اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دن رات میں اکثر کم از کم پانچ مرتبہ نمازوں سے پہلے وضو کرنا ہوتا ہے اور وضو کے ساتھ مسواک کرنے کی بھی شدید تاکید کی جاتی ہے۔ ذیل میں اسی قسم کی چند احادیث پاک بیان کی جارہی ہیں۔

۱۔ ”عَنْ حُذَيْفَةَؓ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ النَّوْمِ يَشُرْصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ“. (بخاری ومسلم)

(یعنی حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ جب حضور خواب سے بیدار ہوتے تو اپنے دہن مبارک کو مسواک سے صاف کرتے تھے)۔

۲۔ ”عَنْ عَائِشَةَؓ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ اَلسِّوَاكُ مُطَهَّرَةٌ لِلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ“. (نسائی)

(حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا: مسواک منہ کو پاکیزہ کرنے

والی اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے)۔

۳۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِیْ اَوْ عَلَى النَّاسِ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ صَلٰوةٍ. (بخاری ومسلم)

(حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا: ”اگر مجھ کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میری امت مشقت میں پڑ جائے گی تو میں ان کو ہر نماز کے لئے ضرور مسواک کرنے کا حکم دیتا)۔

۴۔ مسند احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ لوگ آئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے پیلے ہو رہے تھے، آپ کی نظر پڑی تو فرمایا: تمہارے دانت پیلے پیلے کیوں نظر آتے ہیں مسواک کیا کرو۔

بہ ظاہر اس عمل کا فائدہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ دانت صاف رہیں اور ان کے تعفن سے دوسری بیماریاں پیدا نہ ہوں چونکہ دانتوں کا ہضم غذا سے بڑا تعلق ہے اور غذا اگر اچھی طرح ہضم نہ ہوئی تو پرورش انسانی کرنے والی اخلاط کا توازن بگڑ جائے گا اور ان کے فساد سے صحت انسانی پر اثر پڑے گا۔

اسی طرح انسانی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے پانی کا استعمال اشد ضروری ہے، کیونکہ پانی انہضام غذا میں ممد ومعاون اور اخلاط کو رقیق کرکے بدن کے ہر عضو میں نفوذ کرانے کا ذریعہ بنتا ہے، لیکن پانی پینے کے بھی کچھ آداب ہیں جس کی رہنمائی ہمیں احادیثِ نبویہ سے ملتی ہے، مثلاً آپ نے فرمایا کہ پانی پیتے وقت تین بار سانس لیا کرو اور سانس برتن کے اندر نہیں، بلکہ باہر لیا جائے نیز مشروب میں پھونک مارنے سے بھی منع فرمایا جس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کے اندر سے سانس کے ذریعہ سے جو ہوا خارج ہوتی ہے وہ مضرِ صحت ہے۔ لہٰذا زہریلے اور گندے جراثیم سے بچاؤ کے خیال ہی سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ پانی تین سانسوں میں پیا جائے اور تینوں مرتبہ پانی کے برتن کو منہ سے الگ کرکے سانس لیا جائے۔

اس لئے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ گرم کھانے کو منہ سے پھونک مار کر ٹھنڈا نہ کیا جائے۔ ارشادِ گرامی ہے:

۱۔ "عَنْ عَبَّاسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَهٰی اَنْ یُّتَنَفَّسِ فِی الْاِنَاءِ اَوْ یُنْفَخَ فِیْهِ". (ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجه)

(حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے برتن کے اندر سانس لینے اور اس میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے)۔

۲۔ "عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ یَتَنَفَّسُ فِی الشَّرَابِ ثَلاثًا خَارِجَ الْاِنَاءِ".

(حضرت انسؓ سے روایت ہے فرمایا حضور ﷺ کسی مشروب کے پینے کے دوران برتن سے باہر تین بار سانس لیا کرتے تھے)۔ جس طرح کلام پاک میں "وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ" کے ذریعہ کپڑوں اور جسم کو پاک صاف رکھنے اور میل کچیل سے صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے بھی لباس کو صاف ستھرا رکھنے اور گندگی سے علیحدہ رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ایک بار آپ نے کسی شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا اس کے پاس اتنا بھی نہیں کہ اپنے کپڑے دھو لیتا۔

صفائی سے متعلق بخاری شریف میں روایت ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ ہفتہ میں ایک دن غسل کیا کرے اور اپنے سر اور بدن کو دھویا کرے۔ آپ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ روزانہ ہر شخص صبح کو اٹھ کر کسی کھانے پینے کی چیز کو ہاتھ لگانے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ اپنے ہاتھ دھوئے۔ اسی طرح کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی تاکید فرمائی چونکہ جب بغیر دھلے ہوئے ہاتھ کھانے کے ساتھ منہ میں جائیں گے تو میل یا جراثیم کے جسم کے اندر جانے کا احتمال رہے گا اور اس میں لگ جائیں گے اور کھانے کے ساتھ منہ میں چلے جائیں گے اور اسی مصلحت کی بنا پر آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ دوسرے کے

تو لیے میں شرکت نہ کی جائے۔

انسانی صحت کی حفاظت کا حضور پاک ﷺ کو اس درجہ خیال تھا کہ آپ نے یہ عام ہدایت فرمائی کہ بیمار آدمی تندرست آدمی کے پاس نہ آئے اور متعدی اور اڑ کر لگنے والی بیماریوں سے بچنے کے لئے تو آپ نے یہاں تک حکم دے دیا کہ جذامی سے ایسا بھاگ جیسے شیر سے بھاگتے ہیں۔ ان تمام ہدایتوں اور احتیاطوں کا مقصد یہ ہے کہ انسانی صحت بیماریوں سے محفوظ رہے۔ اسی طرح بخاری اور مسلم کی یہ حدیث پاک ہے:

"فَاِذَا سَمِعْتُمْ بِالطَّاعُوْنِ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدِمُوا اِلَیْهِ وَاِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَاَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا مِنْهَا فَرَاراً مِّنْهُ".

(جب کسی بستی میں تم سنو کہ وہاں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے تو وہاں نہ جاؤ اور جہاں تم رہتے ہو اگر وہاں پھوٹ پڑے تو اپنی بستی سے نکل کر نہ بھاگو)۔

کس قدر حکیمانہ ارشاد ہے کہ جہاں یہ متعدی وبا پھیلی ہوئی ہے وہاں خود جا کر اپنے ہاتھوں بیماری کو دعوت نہ دو اور اگر خود تمہاری بستی اس وبا سے متاثر ہو جائے تو وہاں سے بھاگ کر اس متعدی مرض کو دوسرے شہر میں نہ لے جاؤ۔

جسمانی صفائی کے بعد غذا کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ غذا کے متعلق بھی اسلام نے تفصیلی ہدایات دی ہیں اور اس ضمن میں پیغمبر عربی ﷺ کی فہم و فراست اور عقل و دانش کے قربان جائیے جب احادیث نبویہ کو جدید علم طب کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ آپ کا ہر فرمان ٹھوس سائنسی حقیقت پر مبنی ہے اور آپ کی تعلیمات حکیمانہ اور سائنٹیفک ہیں اور سائنس کے اس ارتقائی دور کے علم سے بھی سبقت لے گئی ہیں۔

انسان کی صحیح غذا کیا ہے؟ سبزی یا گوشت؟ یہ مسئلہ سے ما بہ النزاع بنا ہوا ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کو چودہ سو سال پہلے طے کر دیا ہے۔ گوشت کھانے کو اسلام جائز رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ گوشت سب سالنوں کا سردار ہے۔ گوشت بلغم کی تولید کو کم کرتا

اور چہرے کے رنگ کونکھارتا ہے اور خون بہتات کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور پیٹ کو بڑھنے نہیں دیتا، یعنی لطیف قسم کی غذا ہے اور اسے کھا کر راحت ہوتی ہے، جن جانوروں کا گوشت کھانے کے قابل ہے اور جن کا قابل استعمال نہیں ہے اس کی اسلام نے ایسی سائنٹیفک تقسیم کی کہ سائنس سے اس کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی ہے، جن جانوروں کے گوشت کھانے سے منع کیا گیا ہے وہ مضر صحت ہیں اور جن کے نقصانات سے طب جدید خوب واقف ہے۔ خنزیر کا گوشت سراسر مضر صحت اور بے حد مخرب اخلاق ہونے کے علاوہ مولد امراض بھی ہے اور کیا عجب ہے کہ یوروپ اور امریکہ میں امراض قلب اور ہائی بلڈ پریشر کا مرض زیادہ پائے جانے کی وجہ منجملہ اور اسباب کے سور کا گوشت بھی ہو؟

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ گوشت میں کدو، یعنی لوکی ڈال کر استعمال کیا کرو، کیونکہ وہ مقوی دماغ ہونے کے علاوہ گوشت کی بھی اصلاح کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سبزی آمیز گوشت بہتر غذا ہے اور حضور پاک ﷺ کا یہ ارشاد سائنس کی تحقیقات کے بالکل مطابق ہے۔ آپ ﷺ نے دست اور پشت کا گوشت کھانے کی تلقین فرمائی ہے اور وجہ بھی بتلادی ہے کہ اس سے کمر اور باز ومضبوط ہوتے ہیں۔ اس قول سے علاج بالاعضاء کے اصول کی تصدیق ہوتی ہے۔

آج اناجوں اور پھلوں کے چھلکوں میں بہترین اور نہایت ضروری اجزاء کی موجودگی کی سائنس تصدیق کرتی ہے۔ ہمارے نبی ﷺ بغیر چھنے ہوئے آٹے کی روٹی تناول فرمایا کرتے تھے اور زیادہ تر جو کی روٹی استعمال فرماتے تھے۔ جالینوس کا قول ہے کہ ''جو ایسا اناج ہے جو بیماریوں اور تندرستوں کے لئے یکساں مفید ہے'' آج بھی جو کو نہایت مفید اور اعلیٰ درجہ کا مقوی ومغذی اناج قرار دیا جاتا ہے اور ہر قسم کی مضرت سے پاک اور لطیف غذا سمجھا جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ سیال غذاؤں میں سب سے اچھا دودھ ہے۔ دودھ سے دہی،

مسکہ، پنیر، چھاچھ اور بالائی وغیرہ بھی حاصل ہوتی ہے جو اپنی اپنی جگہ غذا بھی ہیں اور دوا بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی تو م کو پینے کے لئے دودھ پیش کرے تو اس کو رد مت کرو کیونکہ یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے، نیز فرمایا کہ پنیر تنہا مضر ہے اس کو جوز کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ انسانوں کے لئے شہد میں شفا ہے۔ حضور پاک ﷺ کو بھی شہد بہت محبوب تھا۔ شیر اور شہد ہزاروں قسم کی بوٹیوں کے مرکب ہوتے ہیں۔ کوئی حکیم ان سے بہتر مرکب دوا اور غذا تیار کرنے پر قادر نہیں ہے۔

روح اور جسم کے طبیب اعظم آنحضرت ﷺ بعض اشیاء کو بدرقات کے ساتھ استعمال فرماتے تھے چنانچہ دودھ میں اکثر پانی ملا لیا کرتے تھے۔ اس طرح دودھ اور زیادہ لطیف اور سریع الاثر ہوجاتا ہے۔ شہد کو پانی میں حل کر کے نوش فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح شہد کی حدت کم ہوجاتی ہے۔ کبھی کھجور کو پانی میں ایک رات اور کبھی دورات تر کر کے اس کا زلال استعمال فرماتے تھے اور کبھی دودھ شہد آمیز کر کے استعمال فرماتے تھے۔

اسی طرح کبھی آپ ؐ کھیرا، ککڑی اور خربوز کے ساتھ کھجور ملا کر تناول فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے کہ اس طرح کھانے سے ایک دوسرے کے حدت اور برودت کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ آپ ؐ کے اس فرمان سے دواؤں اور غذاؤں میں حدت اور برودت کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں زنجبیل، یعنی سونٹھ اور کافور کے مزاج کی تعریف کی گئی چنانچہ کہا گیا ہے کہ جنت کی اغذیہ کا مزاج ادرک کافور جیسا ہے۔ یہ دونوں خوشبودار ہیں ان میں سے ایک بارد اور ایک حار ہے۔ زنجبیل اور کافور کی تاثیر کے لئے خاصہ یا فعل یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ مزاج کہا گیا ہے۔ اس طرح ادویہ واغذیہ کا مخصوص مزاج بھی قرآن سے ثابت ہوتا ہے جس کا طبِ جدید انکار کرتی ہے۔

حضور پاک ﷺ مکھن کو کھجور کے ساتھ ملا کر استعمال کرنا بہت پسند فرماتے تھے۔ اسی طرح کھیرے کو نمک لگا کر بھی استعمال فرماتے تھے۔ آپ کو پھل بہت مرغوب تھے، چنانچہ

انجیر اور زیت سے بڑی رغبت تھی۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ زیت کھایا کرو اور اس کا تیل لگایا کرو بلاشبہ زیتون کا تیل تمام تیلوں سے بہتر ہے۔ پھلوں میں سے آپؐ نے انگور اور انار کی بھی تعریف فرمائی ہے اور انجیر کو بواسیر اور نقرس میں مفید بتلایا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی پسندیدہ غذائیں:

آپ ﷺ کو کھانوں میں ثرید بہت پسند تھا۔ ثرید شوربے میں روٹی بھگو لینے کو کہتے ہیں اور دودھ میں کھجور کو بھگو کر اس میں تھوڑا سا مکھن کا اضافہ کر لیا جائے تو اس کو بھی ثرید کہا جاتا ہے۔ تلبینہ بیماری میں جب کوئی شخص کھانا نہیں کھاتا تھا تو آپ اس کو تلبینہ پلانے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تلبینہ دھوڈالتی ہے شکموں کو جس طرح کوئی دھوڈالتا ہے اپنے شہرہ کو میل سے۔ تلبینہ کی تیاری کی ترکیب یہ ہے کہ بغیر چھنے ہوئے جو کے آٹے کو دودھ میں پکایا جائے اور جب وہ پک جانے کے قریب ہو تو اس میں تھوڑا سا شہد ملا دیا جائے اور پھر اسے ٹھنڈا کر کے پیا جائے، بعض اوقات اس کو ثرید میں ملا کر بھی پیا جاتا تھا۔

حضور ﷺ سبزی کو دسترخوان پر بہت پسند فرماتے تھے۔ سبز رنگ کو بھی آپ ﷺ بہت پسند فرماتے تھے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جاری پانی اور سبز چیز کو دیکھنے سے نگاہ تیز ہوتی ہے۔ فرمایا: زینت دیا کرو اپنے دسترخوان کو سبز چیزوں سے، اس لئے کہ سبز چیز بھگاتی ہے شیطان کو اللہ کے نام سے علماء کہتے ہیں کہ سبز چیز سے مراد پودینہ، ہرا دھنیا اور سبز ترکاریاں ہیں، نیز آپ ﷺ فرماتے تھے کہ سرکہ بہترین سالن ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ خدا نے معدہ سے بڑا کوئی ظرف پیدا نہیں کیا یہ کبھی نہیں بھرتا۔ اس لئے مناسب ہے کہ معدہ کے تین حصے کئے جائیں۔ ایک حصہ غذا کے لئے، ایک حصہ پانی کے لئے اور ایک حصہ سانس کی آمدورفت کے لئے، ڈکار سے آپ

ﷺ کو سخت نفرت تھی۔ ڈکار کی آواز سن کر فرماتے تھے کہ اتنا کیوں کھاتے ہو۔ نبی کریم ﷺ نے رات کو فاقہ کرنے سے منع فرمایا ہے چونکہ وہ جلد بڑھاپا لاتا ہے۔ بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

طب جدید نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ زیادہ کھانا نہ صرف بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے بلکہ یہ عادت قبل از وقت بوڑھا کر دیتی ہے اور زندگی کے بہت سے مصائب مثلاً ذیابیطس، فالج اور مخبوط الحواسی اسی چیز کا نتیجہ ہے۔ رسول پاک ﷺ نے اپنے متبعین کو یہی تعلیم دی ہے اور زیادہ کھانے کو سختی سے منع فرمایا ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث پاک میں آپ ﷺ نے اپنے متبعین کو یہی تعلیم دی ہے اور زیادہ فرمایا ہے جس کی مثال کسی طب، کسی سائنس اور کسی ازم میں نہیں ملتی فرمایا: ''یَا نَحْنُ قَوْمٌ لاَنَا کلُ حتیٰ نَجُوْعَ وَاِذا اَکَلْنَا فَلاَ تَشْبَع'' (ہم ایسی قوم ہیں کہ جب تک بھوک نہ لگے نہیں کھاتے اور جب کھاتے ہیں تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتے)۔

پرہیز:

پرہیز بھی دوا علاج کی طرح سنت ہے۔ مرض میں غسل یا وضو کی بجائے تیمّم کی نہ صرف اجازت بلکہ ہدایت ہے۔ حضور پاک ﷺ نے آنکھ دکھنے کی حالت میں حضرت رومیؓ کو کھجور کھانے سے منع فرمایا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو آشوبِ چشم میں کھجور استعمال کرنے سے باز رکھا۔ اس وقت جو کے ساتھ چقندر پکا ہوا موجود تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں سے کھاؤ یہ تمہارے لئے مناسب ہے۔ جس برتن کا پانی دھوپ سے گرم ہو اس پانی کو استعمال کرنے سے منع فرمایا اور بتلایا کہ ایسے پانی سے برص ہو جایا کرتا ہے۔ تیز گرم مسہلات سے بھی منع فرمایا ہے۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ مٹی کھایا کرتی ہیں۔ آپ ﷺ نے مٹی کھانے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ مٹی کھانے

سے انسان ہمیشہ بیمار رہتا ہے، پیٹ بڑا ہو جاتا ہے اور رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ نیز آپ ﷺ نے مچھلی کو دودھ کے ساتھ کھانے یا دودھ کے ساتھ ترشی کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے دو گرم غذاؤں دو سرد غذاؤں، دو قابض غذاؤں یا دو مسہل اشیاء کو جمع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اب استردادِ صحتِ زائلہ کی طرف آیئے، یعنی اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کے معالجے کے بارے میں بھی ہم کو حضور پاک ﷺ کے ارشاداتِ عالیہ میں بے شمار ہدایات ملتی ہیں اور صرف علاج معالجہ ہی نہیں، بلکہ احادیثِ پاک کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اور آپ کے صحابہ کرامؓ علم طب اور معالجہ میں نہ صرف یہ کہ علمی بصیرت رکھتے تھے بلکہ علمی معلومات اور علم الجراحت سے پوری واقفیت رکھتے تھے جیسا کہ زاد المعاد کی مندرجہ احادیث اس بات کی شاہد ہیں:

۱. "عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اَمَرَ طَبِیْبًا اَنْ یُّبْسُطَ بَطْنَ رَجُلٍ اَجْوَى الْبَطْنِ فَقِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ یَنْفَعُ الطِّبُّ قَالَ الَّذِیْ اَنْزَلَ الدَّاءَ اَنْزَلَ الشِّفَاءَ فِیْمَا شَاءَ".

(حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک استسقا کے مریض کے بارے میں اس کے معالج کو حکم دیا کہ وہ مریض کے پیٹ میں شگاف دے، اس پر حضور سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا طب میں بھی کوئی چیز ہے آپ نے جواب دیا جس ذات نے بیماری اتاری ہے اس نے جس جس چیز میں چاہا شفاء بھی رکھی ہے)۔

۲. "عَنْ عَلِیٍّؓ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَلٰی رَجُلٍ یَعُوْدُهٗ بِظَهْرِهٖ وَرَمٌ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! بِهٰذِهٖ مِدَّةٌ فَقَالَ بُطُّوْ عَنْهُ قَالَ عَلِیٌّ فَمَا بَرِحْتُ حَتّٰی بَطَتُ وَالنَّبِیُّ ﷺ شَاهِدٌ".

(حضرت علیؓ سے روایت ہے فرمایا: میں ایک مرتبہ ﷺ کے ساتھ ایک بیمار کی عیادت

کے لئے گیا اس شخص کی پشت پر کسی جگہ ورم تھا لوگوں نے عرض کیا کہ حضور! ورم میں پیپ پڑ گیا ہے۔ آپ نے فرمایا اسے شگاف دے دو۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی وقت آپ کی موجودگی میں اس شخص کو شگاف دے دیا اور وہ ٹھیک ہو گیا)۔

اسی طرح زخموں کا علاج اور مرہم پٹی کرنا بھی صحابہ کرامؓ اور اہلبیت متطہرین کی سنت ہے۔ چنانچہ جب احد میں حضور پاک ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی اور سامنے کا دانت شہید ہو گیا تو حضرت علیؓ اپنی ڈھال میں پانی لے کر آئے اور حضرت بی بی فاطمہؓ نے اپنے والد کے زخم دھونے شروع کئے، مگر خون نہ تھما تو حضرت فاطمہؓ نے چٹائی کو ٹکڑا اجلایا اور اس خاکستر زخم پر چھڑک دی تو خون فوراً بند ہو گیا۔

ایک بار جب حضرت سعد بنؓ معاذ کو تیر لگا تو حضرت پاک ﷺ نے ان کا علاج داغنے سے کیا اور یہ عمل خود اپنے دستِ مبارک سے سرانجام دیا اور جب زخم پر ورم ہو گیا تو دوبارہ پھر داغ دیا۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ترمذی شریف میں ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے حضرت اسعدؓ بن زرارہ کو کانٹا لگ جانے پر داغ دیا۔ نیز "مشکوٰۃ شریف" میں "ابن ماجہ" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے علاج کے لئے سینگھ لگانے والے کو بلایا اور اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ میرے خون میں جوش پیدا ہو رہا ہے اس لئے تم کسی حجام کو بلا لاؤ اور دیکھو پچھنا لگانے والا جوان ہو، نہ ضعیف ہو، نہ نو عمر۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے حضور پاک ﷺ سے سنا ہے کہ نہار منہ پچھنا لگوانا زیادہ بہتر ہے اس سے عقل وفہم میں اضافہ ہوتا ہے اور قوتِ حافظہ زیادہ ہوتی ہے۔ اگرچہ دیسی جڑی بوٹیاں طب یونانی کے علاج کی اساس اور بنیاد ہیں اور جڑی بوٹیوں پر برصغیر پاک و ہند میں بڑے وسیع تجربات کئے گئے ہیں مگر ابھی حال میں چینی وجود کے تبادلہ سے اہل پاکستان میں اس سلسلہ میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے اب ہم آخر میں مشتے نمونہ

ازخروارے کے طور پر دیسی جڑی بیوٹیوں سے علاج اوران کے خواص کے بارے میں آنحضرت ﷺ کے چندارشادات گرامی بیان کرتے ہیں، چونکہ احادیث پاک کے مطالعہ سے یہ روشن حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو جوعلوم عطا فرمائے تھے ان میں خواص الاشیاء کا علم بھی شامل تھا اور بکثرت ایسی حدیثیں ہیں جن میں آپ نے متعدد دواؤں کی طبی خاصیتیں بیان فرمائی ہیں۔ امراض کے لئے ان کا مفید ہونا سمجھایا اوران سے فائدہ اٹھانے کی تلقین فرمائی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ کھمبی کا پانی آنکھوں کے لئے شفا بخش ہے، چنانچہ ترمذی شریف میں ہے حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تین یا پانچ یا سات کھمبیاں لے کران کا پانی نچوڑا اور ایک شیشی میں رکھ لیا۔ میری ایک کنیز کی آنکھیں کمزور اور خراب تھیں میں نے وہ پانی اس کی آنکھوں میں ڈالا اور وہ اچھی ہوگئی۔

سناء کے متعلق ابن ماجہ اور ترمذی میں ہے کہ حضور پاک ﷺ نے سناء کے متعلق فرمایا اگر کسی چیز میں موت سے شفا ہوسکتی تو وہ سناء میں ہوتی۔ اسی طرح مہندی کے متعلق ترمذی شریف میں ہے ''عَنْ سَلْمٰی خَادِمَةَ النَّبِیُّ ﷺ قَالَتْ مَایَکُوْنُ بِرسول اللّٰهِ ﷺ قَرْحَةٌ وَلاَ نَکْبَةٌ اِلاَّ اَمَرَنِیْ اَنْ اَضَعَ عَلَیْهَا الْحِناءَ''. (حضور کی خادمہ حضرت سلمیٰؓ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا جب کبھی رسول اکرم ﷺ کو زخم، چوٹ یا پھنسی کی تکلیف ہوتی تو آپ ﷺ مجھ کو حکم دیتے کہ میں اس پر مہندی لگاؤں)۔

☆☆

'محمد ﷺ خدا کے پیغمبر اور ایک عظیم ہیرو'

● تھامس کارلائل
(ترجمہ) ڈاکٹر شبیر احمد بن عبدالرشید

صاحبو! اللہ تعالیٰ تھامس کارلائل پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ بے شک وہ ایک سچا عاشق رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ اس پائے کا فلسفی، مصنف، ماہر سماجیات اور مؤرخ یورپ کی سرزمین نے کم ہی دیکھا ہے۔ اس کی چند ہی کتابیں ہیں لیکن لازوال ہیں۔ اس کی قابلیت کا عالم یہ تھا کہ اس کی شاہکار کتاب ''دی فرنچ ریوولیوشن'' The French Revolution کا مسودہ گھر کی خادمہ نے غلطی سے آتش دان میں پھینک دیا۔ کوئی اور ہوتا تو سر پیٹ کر رہ جاتا لیکن کارلائل نے تو یہ کہا ''کوئی بات نہیں غم نہ کرو''۔ ہم یہ کتاب دوبارہ لکھ لیں گے۔ اور صاحبو! کیا کتاب لکھی اس نے اس غضب کی کتاب جو انگریزی تاریخ وادب کا کلاسک سمجھی جاتی ہے۔ جتنا بلند مفکر تھا اتنا ہی اعلیٰ پائے کا مقرر بھی تھا کارلائل۔ ایڈنبرا میں اس کے لیکچر اور تقریر سننے کیلئے بڑے بڑے ہال کھچا کھچ بھر جاتے تھے۔

۸/مئی ۱۸۴۰ء کی بات ہے تھامس کارلائل ایڈنبرا کے ایک وسیع ہال میں تقریر کیلئے کھڑا ہو۔ اس وقت وہاں ۵۰۰ سامعین موجود تھے۔ صبح ۹ بجے اس نے اپنا لیکچر شروع کیا اور رات ۹ بجے تک اسی جذبے، دل کی گہرائی اور عقیدت کے ساتھ بولتا رہا کہ مسلسل بارہ گھنٹے تک سامعین ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہ لیکچر تھوڑے ہی عرصے میں اس کی مشہور زمانہ کتاب ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' کا ایک درخشاں باب بن کر شائع ہوا۔ کتاب کا پورا نام

ہے ''اون ہیروز، ہیرو ورشپ، اینڈ دی ہیروئک ان ہسٹری'' "On Heroes, Hero worship and the Heroic in history"

آج کے لیکچر کا موضوع ہے۔ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر اور ایک عظیم ہیرو'' تمام لیکچر میں تھامس کارلائل یہ کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

کرم اے شہ عرب وعجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

کتاب میں لیکچر ادارت کے بعد شائع ہوا ہے۔ اصل لیکچر ہمیں برمنگھم سے محترمہ نورا کارلائل نے بھیجا ہے جو تھامس کارلائل کی پانچویں نسل میں ہیں۔ اس لیکچر کا ترجمہ اور تلخیص احترام کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

زبان و بیان واظہار اور فکر ونظر کا گوہر آبدار ہے یہ خطاب! آج ہم نے اسے تیسری بار نہایت عقیدت سے پڑھا تو جی میں آیا کہ اسے آپ تک پہنچایا جائے۔ کارلائل جیسا عظیم دماغ ہو اور موضوع سخن ہو وہ ہستی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام میرے واسطے عنوان حیات! اب دیکھئے کیا کہہ گیا ہے تھامس کارلائل اپنے خطاب میں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں سرشار اس انگریز نے زمین سخن کو آسمان کر دیا ہے۔ صاحبو! ۸ مئی ۱۸۴۰ء بروز جمعہ تھامس کارلائل اینڈ نبرا کے شاہی آڈیٹوریم میں ''دین ومذہب اپنی معراج پر ایک مقدس ہستی کے طفیل''۔

(مترجم)

انقلاب! ایک عظیم انقلاب! اتنی زبردست گہما گہمی انسانوں کے خیالات میں، افکار میں گویا ایک نئی کائنات ان کی عظمت ایسی عظمت کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو دنیا انہیں خدا کی طرح پوجتی۔ ان کی بلندی وہ بلندی کہ محمد صلی اللہ کے بعد کوئی شخص خود کو ان کا ہمسر نہ سمجھ سکے۔ ایسا انقلاب کہ آپ کے بعد کوئی خدائی کا دعویٰ کرنے سے پہلے مرجائے

اس لئے تاریخ عالم کا یہ عظیم ترین انسان خود کو محض ایک بشر کہتا رہا۔ انسان کی چھپی ہوئی آرزوؤں کی تکمیل وہ شخص جو خدا تو نہیں لیکن خدا سے جدا بھی نہیں۔ ایسا انسان جو خدا کی رضا چاہے اور خدا اس کی رضا چاہے ان معنوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے جدا نہیں تھے۔ لوگ حیران وسرگردان ہیں کہ ان کے اعزاز واحترام کا حق کیسے ادا کریں۔ کیا ہم انہیں کامل کہہ سکتے ہیں؟ جی ہاں! کہہ سکتے ہیں۔ ہر عمر میں ہر حال میں ہر محل ومقام میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہیرو رہتے ہیں اور مخالفین کے بھی ہیرو! آپ چاہیں تو اسے ہیرو پرستی کہہ لیں، جی ہیرو پرستی کہہ لیں۔ معزز سامعین میں آپ کو محمڈن بن جانے کی تبلیغ نہیں کر رہا۔ میں اس عظیم ہستی کے بارے میں ہر ہر اچھی بات کہوں گا جو میں انصاف کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہمارے موجودہ خیالات ۱۸۴۰ء کہ وہ (نعوذ باللہ) ایک جعلی پیغمبر تھے اور ان کا پیش کردہ مذہب بے سروپا عقیدوں کا مجموعہ ہے غور وفکر کی روشنی میں یہ خیال صاف پگھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جس دروغ گوئی کا انبار ہم نے اس مقدس ہستی کے گرد لگا دیا ہے وہ اس عظیم ہستی کیلئے نہیں ہم مسیحیوں کیلئے باعث شرم ہے۔ گزشتہ بارہ صدیوں کے نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے اس پیغمبر عالی مقام کا پیغام آج بھی ۱۸ کروڑ انسانوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ کیا یہ ۱۸ کروڑوں انسان خدا کے بنائے ہوئے نہیں ہیں؟ اگر ہم ان تمام کروڑ افراد کو بھٹکے ہوئے اور راہ گم کردہ سمجھیں تو سوچنے کا مقام ہے کیا جعلی پیغام بارہ صدیوں تک اس کامیابی سے آگے بڑھ سکتا ہے؟ کیا میرے ہم مذہب بھائی بہن یہ بات نہیں جانتے کہ آج بھی کرہ ارض میں قرآن کریم کے اصول آگے بڑھ رہے ہیں۔ بناوٹ، بناوٹ ہوتی ہے اور اسے ظاہر ہونے میں صدیاں نہیں لگتیں۔

ایک عظیم انسان اور پھر عظیم ترین انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف سچا ہو سکتا ہے۔ سچ کے سوا کچھ نہیں۔ مخلص، اخلاص کا مجسم پیکر! گہرا خلوص، عظیم خلوص، اصل خلوص! یہ ہے آپ کی عظمت کی پہلی شان۔ ایک ایسی ہستی جو بنی نوع انسان کے ساتھ اور اپنے خدا کے

ساتھ اتنا مخلص ہے کہ دوسرے تو دوسرے شاید اس نے خود بھی کبھی اپنے اخلاص پر شک نہ کیا ہو۔ ہم اسے شاعر کہیں، پیغمبر کہیں، خدا کہیں، کیا کہیں! ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس کی کہی ہر بات حقیقت کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھرتی ہے۔ خدا نے پہلے بھی کئی بار وحی بھیجی ہے لیکن کیا خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہیں بنایا؟ ایک ایسی زندگی کا حامل فرد جو شعلۂ جوالہ ہو، ایسا شعلہ جو فطرت کے سینے سے نمودار ہوا ہو، تاکہ دنیا کو روشن کر دے۔ خالق کائنات کے حکم سے ہی روشنی کا یہ شعلہ ابھر سکتا تھا۔ جانتے ہیں کہ سب سے بڑی خامی انسان میں کیا ہو سکتی ہے؟ اپنی خامیوں سے ناآشنا رہنا۔ ہم اس ہستی کا ذکر کر رہے ہیں جو انسان کامل ہونے کے باوجود روزانہ ستر بار اپنے رب کے حضور استغفار کرتا ہے۔

وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار پر انگشت نمائی کرتے ہیں آپ کو جاننا چاہئے کہ وہ اپنے جھوٹ کا جالا کہاں بنتے ہیں؟ ان لوگوں کے حسد پر جنہوں نے دو تین صدیوں بعد اس مقدس ہستی کے بارے میں کہانیاں گھڑیں۔ خدا کی قسم! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اتنے عظیم انسان تھے کہ اگر انہوں نے کوئی غلطی بھی کی ہوتی تو زمانے بھر کے لئے بھلائی اور خوبی کا معیار بن جاتی۔ میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ نسل در نسل دنیا میں لوگ آتے رہیں گے، جاتے رہیں گے۔ صحرا کے اس فرزند کی عظمت کو پوری طرح ایک شخص بھی سمجھ نہ سکے گا۔ ریت کے سمندر میں پیدا ہونے والی ہستی دنیا بھر کو گلزار بنانے کا درس دے گئی۔

ایرانیوں کو مشرق کا فرانس کہتے ہیں۔ عربوں کو مشرق کے اطالوی کہتے ہیں۔ آپ صحرا میں کسی بدو، کسی مسلمان کے خیمے میں پہنچ جائیں اگر آپ اس کے جانی دشمن بھی ہوں گے یا اس کیلئے دریاؤں کی طرح اجنبی، وہ آپ کی مہمان نوازی کیلئے اپنی آخری بھیڑ کو بھی قربان کر دے گا۔ وہ آپ کی خاطر داری کو عبادت سمجھے گا۔ صحرائی عرب کو آپ یہودی کی طرح باحواس دیکھیں گے لیکن اس سے بڑھ کر اس میں وہ متانت، سادگی اور وقار ملے گا جو آپ

یہودی میں نہیں پائیں گے، یہ خوبیاں اسے کس نے سکھائیں؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے!

عکاظ کا جو میلہ لگا کرتا تھا۔ اس میں شاعری کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ کوئی ہے جو زبان کی گھن گرج میں ان شعرا کا ہی مقابلہ کر سکے اور میں ذاتی تحقیق کی بنا پر کہتا ہوں کہ عبرانی زبان میں جو صحیفہ ایوبی لکھا گیا تھا۔ زبان و بیان، عظمت کلام کے اعتبار سے قرآن کے سوا اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے کوئی قلم صحیفہ ایوبی سے بہتر تحریر نہ کر سکا۔ ہاں! اس سے بہتر کچھ ہے تو وہ ہے قرآن جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوا۔

قرآن ایسی زندہ اور متحرک تحریر۔ ایسا نغمہ جو انسانیت کے دلوں کو تسخیر کر لے۔ اتنا پر ہیبت، اس پر نرم رو، عظیم، پر اثر! ٹوٹے ہوؤں کو جوڑنے والا۔ گرمیوں میں خنک چاندنی رات۔ سمندروں اور ستاروں کو محیط۔ میں سمجھتا ہوں اتنی بلند پایہ تحریر ابن آدم کی نگاہوں سے کبھی نہیں گزری۔

وہ سیاہ پتھر حجر اسود گویا بہشت سے گرتا ہوا۔ زم زم کے پر بہار چشمے کے نزدیک زم زم جیسے زمین سے حیات پھوٹتی ہوئی۔ بلبلے ابھرتے پھوٹتے ہوئے۔ زم زم کرتے ہوئے۔ وہ آب رواں جو ہاجرہ اور اس کے ننھے بچے اسماعیل نے خاص بارگاہ خداوندی سے پایا اور اسی مقام پر وہ انوکھی عمارت ہزاروں برس سے کھڑی ہوئی جسے ہم کعبہ کہتے ہیں۔ سلطان ترکی ہر سال اس کعبے کیلئے چمکیلا سیاہ غلاف بھیجتا ہے۔ ۲۷ کیوبٹ اونچا (CUBIT= کہنی سے درمیانی انگلی تک کا فاصلہ اندازاً ۲۰ انچ) ستونوں کے دو دائروں کے درمیان خوبصورت چراغوں کی قطاریں۔ نادر زیورات سے جھلملاتا ہوا۔ آج رات یہ چراغ پھر جگمگائیں گے۔ کھلے آسمان میں ستاروں کی طرح۔ ماضی کا حسین لیکن مستند ٹکڑا۔ یہ ہے دہلی سے مراکش تک بسنے والے مسلمانوں کا قبلہ! ہمیشہ کی طرح آج بھی بے شمار آنکھیں اس قبلے کا رخ کریں گی۔ انسانیت تہذیب کی تاریخ میں کوئی ایسا مرکز آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ سنگ اسود، ہاجرہ کا چشمہ، عرب قبیلوں کے حاجی، ان سب نے مل کر مکہ کو مقدس ہی نہیں عظیم شہر

بنادیا تھا۔ آج یہ کچھ بجھا بجھا سا دکھائی دیتا ہے۔ (یاد رہے تھامس کارلائل ۱۸۴۰ء کا ذکر کررہا ہے) جغرافیائی اعتبار سے قدرت نے اس مقدس شہر کو خصوصی طور سے نہیں نوازا۔ ریت کا لامتناہی سمندر۔ پھر خشک پہاڑیوں کے بیچ میں گھرا ہوا شہر سمندر سے دور۔ یہاں تک کہ روٹی بھی باہر سے منگانی پڑتی تھی۔ اسے فطرت کا مذاق کہئے کہ دنیا میں جہاں کہیں زائرین جمع ہوتے ہیں، تاجروں کی کاروباری نگاہ انہیں تاک لیتی ہے۔ روحانی کاروبار کے ساتھ ساتھ دنیاوی تجارت بھی اہل دل خوب کر لیتے ہیں۔ بہرکیف یہ بے آب وگیاہ مقام مکہ، عرب کی آنکھوں کا تارا بن کر رہا۔ تاجر لوگ زیادہ تر انڈیا، شام، مصر اور اٹلی سے آتے تھے، جس میں مذہبی پیشوائیت کا خاصا حصہ تھا۔ ایک بڑے قبیلے کے دس سردار چنے جاتے تھے جو شہر کے امیر اور کعبے کے پاسبان ہوا کرتے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ خاص قبیلہ قریش تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے گھرانے کا تعلق قریش ہی سے تھا۔ بقیہ عرب قوم چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹی ہوئی جزیرہ نما عرب کے چھوٹے چھوٹے نخلستانوں میں بکھری ہوئی تھی۔ چرواہے، ساربان، تاجر، کسان، چور اچکے۔ اکثر بلکہ ہمیشہ آپس میں برسرجنگ۔ اتنے وسیع عرب میں بکھرے ہوئے بدوؤں کے درمیان اگر کوئی رشتہ قائم تھا تو وہ تھا زبان کا رشتہ یا پھر اسی حسین کعبے کا۔ یوں لگتا تھا کہ ان قبیلوں کے بت بھی خانہ خدا میں آکر خوش ہوجاتے تھے۔ دیوتا سب کے الگ لیکن کعبہ سب کا ایک۔ صدیوں پر صدیاں گزر گئی تھیں۔ باہر کی دنیا صحرا کے ان خانہ بدوشوں سے ناآشنا رہی۔ قدرت کو یہ منظور تھا کہ ایک دن آئے جب یہ بے انتہا خوبیوں والی قوم خود ابھر کر دنیا پر چھا جائے۔ وہ عظیم ہستی جسے مسیحؑ ابن مریم کہتے ہیں اس کا پیغام عرب تک پہنچا تو ضرور تھا لیکن وہاں کی سخت اور خشک مٹی کو نرم نہ کرسکا تھا۔

یہ تھا عرب اور وہاں کے لوگ جہاں ۵۷۰ء میں اس روشن ہستی کو نمود ہوئی۔ اس کی

ولادت باسعادت ہوئی جنہیں دنیا سلام کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ جنہیں آسمان آفریں کہتا ہے اور کہتا رہے گا۔ آپ کی پیدائش سے ذرا پہلے آپ کے والد جہاں فانی سے کوچ کرجاتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ جو مکہ میں اپنے کردار، دانش، حسن سیرت اور حسن صورت کے باعث محترم سمجھی جاتی تھیں صرف ۲۶ سال کی عمر میں اپنے چھ سالہ جگر گوشے کو داغ مفارقت دے جاتی ہیں۔ اس خوش بخت بچے کے سر پر ہاتھ رکھنے کا شرف ایک ۱۰۰ سالہ بزرگ کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ بزرگ ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب۔ عبداللہ ان بزرگ کا سب سے چھوٹا اور چہیتا بیٹا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے اس چہیتے بیٹے کی نشانی۔ عبدالمطلب کی ۱۰۰ سالہ ضعیف آنکھوں میں نہ جانے کس بلا کا کمال تھا! ان بوڑھی آنکھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف عبداللہ کو ہی نہیں پالیا آنے والے دنوں کی رحمت العالمین بھی دیکھ لیا۔ بھرے پرے خاندان میں دادا عبدالمطلب کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پیارا کوئی نہ تھا۔ مکہ کا شاندار بزرگ عبدالمطلب اپنے رب کے پاس جا پہنچا تو ان کے سب سے بڑے بیٹے ابوطالب اس معزز گھرانے کے سربراہ ہوگئے۔ ابوطالب جو ایک نہایت شفیق عادل اور باصلاحیت انسان تھے۔ دانش مندی کا پیکر تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے گوہر آبدار کی دیکھ بھال ابوطالب سے بہتر کوئی نہ کرسکتا تھا۔ ابوطالب انہیں اپنے ساتھ ساتھ رکھتے، سفر میں اور حضر میں۔ ملک شام کے تجارتی سفر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نئی دنیا میں لے جاتے۔ انہیں کوئی مدرسہ میسر نہ آیا تھا۔ لکھنے کا رواج عرب میں نیا نیا شروع ہوا تھا۔ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ان کے ماحول اور خداداد حکمت سے ہوئی۔ دنیا میں جو بڑے بڑے حکیم اور فلاسفر گزرے تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے نیاز فطرت کی تنہائی اور صحرا کے ویرانوں میں اپنے خیالات اور مشاہدات کے ساتھ رہتے تھے۔ شہر کے لوگ انہیں الامین کہتے تھے۔ ایسا سچا اور کھرا شخص جو اپنے قول و فعل میں ہی سچا نہیں اپنے خیالات کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی صادق تھا۔ خاموش طبع لیکن

کوئی بات کہنی ہو تو خلوص، وضاحت اور دانشمندی کے ساتھ۔ موضوع سخن کو روشن کرتی ہوئی۔ اس کی ہر بات کہنے کی بات، سننے کی بات، مضبوط شخصیت، برادرانہ انداز، سنجیدہ مزاج، پرخلوص کردار، اس پر گرم جوش جو چاہے اس کے قریب ہونا چاہے۔ پھر نہایت خوبصورت انسان، معصوم روشن چہرہ، صحرا کی دھوپ میں کھلتا ہوا گندمی رنگ، سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں۔ مجھے تو آپ کی پیشانی مبارک کی وہ دربد بھی بہت بھلی لگتی ہے جو جوش کے عالم میں ابھر آیا کرتی تھی۔ آگ اور نور، جلال اور جمال کا مظہر ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم''۔

خدیجہؓ سے آپ کی شادی کی داستان کتنی حقیقی اور پیاری ہے۔ خدیجہؓ کے خادم کے ساتھ تجارتی قافلہ ملک شام تک لے جاتا، الامین کی امانت داریاں، آپ کے بلند کردار کے بارے میں خادم کے انتھک بیان خدیجہؓ کے دل میں ان کیلئے احسان مندی اور عقیدت کیسے نہ جاگتی؟ یہ پچیس برس کے تھے، وہ چالیس برس کی تھیں لیکن اب بھی پھول کی طرح حسین ان کی زندگی محبت، امن وسکون اور تکمیل ذات کا جیتا جاگتا نمونہ تھی اور آج بھی ہے۔ لوگ جو اس ذات پاک پر جھوٹے الزامات لگاتے ہیں وہ سب اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب پاکباز، پاک دل، خدیجہ ۶۵ برس کی عمر میں وفات پا گئیں! آپ ﷺ اس وقت بچاس برس کے ہو چکے تھے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ زندگی ایک ایسی شمع ہے جس کا شعلہ پچاس برس کے بعد سرد ہونے لگتا ہے۔ انسان کو امن وسکون ہمیشہ سے زیادہ عزیز ہو جاتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ ہستی تھے جو عالم شباب میں بھی حسن کردار کا مرقع تھے۔ اب اگر ان کے کردار میں ذرا سا جھول آ جاتا تو ان کے پروانے بڑھنے کے بجائے گھٹنے لگتے۔ معزز سامعین یاد رکھئے کہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب خدا کے رسول ﷺ ہی نہیں ریاست مدینہ کے بانی حکمران تھے۔ پیغمبر اور حکمران جو دن رات کی کسی گھڑی میں بھی کھل کر اعلان کر سکتا تھا لوگو! میں یہاں ہوں۔ اس کا دل اس کا گھر اپنے اور پرائے کیلئے دن رات کھلا تھا۔ ایسا اعتماد، اتنی دیانتداری، صرف خدا کی جانب سے عطا

ہو سکتی ہے۔ ایسے شخص کا ہر لفظ قدرت کے دل کی براہ راست آواز کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ انسانوں کے سننے کی بات ایسی جس کا کوئی ثانی نہیں۔ اس کے سوا جو کچھ ہے مقابلتاً ہوا سے ہلکا۔ میں یہاں ہوں، میں یہ ہوں، میں یہ کرتا ہوں اور وہ نہیں کرتا۔ اس کی زندگی بڑے بڑے حروف میں لکھی ہوئی کھلی کتاب۔ فلسفوں کی بحثیں، یونانی حکیموں کی دلیلیں، یہود کی گنجلک روایات، عربوں کی روز وشب کی بت پرستیاں، کیا یہ اس تہذیب میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب دے سکتی تھیں؟ کیا آج کی تہذیب کے سوالوں کا جواب دے سکتی ہیں؟ جی نہیں! محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو نازل ہوا اس کے مقابل جو کچھ ہے ہوا سے ہلکا ہے۔ جی ہاں! ہوا سے ہلکا ہے۔ اس لئے کہ اس مقدس پیغام کا خالق وہ ہے جس نے کائنات کو بنایا ہے۔

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

سامعین! میں ایک بار پھر پورے اعتماد، یقین اور قوت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز فطرت کے دل کی آواز تھی۔ براہ راست آواز۔ اس محترم ہستی کے سامنے صرف کائنات ہی نہیں تھی، کائنات کا ضمیر بھی تھا۔ ذوق نظر ہی نہیں کائنات کی حقیقتوں کو دیکھنے والی نگاہ تھی۔ آپ ﷺ نے عربوں کو کیا خوب سمجھایا۔ جو فرمایا دلوں میں اتار دیا۔ پتھر اور سیاہ لکڑی کے بنے ہوئے آبنوس اور ہاتھی دانت کے ترشے ہوئے خوبصورت صنم شاید خود بھی کلمہ توحید پڑھنے لگے ہوں۔ بت پرستی کی خوگر قوم تھوڑے عرصے میں سمجھ گئی کہ ان بتوں کے گرد وہ کتنے ہی پھیرے لگا لیں، وہاں کتنی رونقیں سجا لیں اور ان کے قدموں میں بڑی سے بڑی دولت نچھاور کر دیں۔ سچا خدا ان دیوی دیوتاؤں اور ان پجاریوں اور داسیوں کو دیکھ مسکرا رہا ہے۔

عرب والے مکہ کے اس عظیم فرزند کے لئے کیا کر سکتے تھے؟ سب کچھ کر سکتے تھے۔ جی ہاں! تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے ریاست مدینہ کی مقدس زمین پر رومی بادشاہ

ہرقل کا تاج لاڈلا تھا اور فارس کے زبردست فرمانروا خسرو کا تاج اور ان کے خزانے لیکن اجازت ہو تو ایک سوال پوچھوں۔ اگر لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں دنیا بھر کے بادشاہوں کے تاج خزانے اور جاہ وجلال لاکر نثار کر دیتے تو آپ کیا کرتے؟ جواب دینے سے پہلے سوچ لیجئے کہ وہ زمین پر پیدا ہوئے لیکن زمین کے نہیں تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ انسان کو دنیا کیلئے نہیں بنایا گیا۔ دنیا اور کائنات کو اس کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس مقدس ہستی کو اگر کوئی ادا پسند آسکتی تھی تو انسانوں کی صرف ایک ادا کہ وہ اپنے رب کی زمین پر وہ بہشت اتار دیں جس کا نقشہ قرآن نے کتنی خوبی سے کھینچا ہے اور پھر اپنی بنائی ہوئی جنت کو اگلے جہاں میں دوسری زندگی میں وراثت کے طور پر حاصل کریں۔ آپ نے شاید سنا ہوگا کہ اس فخر انسانیت کو عرب کی بادشاہت، حسین ترین ملکہ اور زر وجواہر کے ڈھیر عربوں نے پیش کئے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ میرے لئے یہ حیرت کی بات نہیں، اس لئے کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا تھوڑا سا ادراک رکھتا ہوں۔ حیرت مجھے ان لوگوں پر ہے جنہوں نے بارگاہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی پیشکش کی۔ ظاہر ہے وہ لوگ آپ کے مقام عالی سے واقف نہ تھے۔ میرے ہم وطنو! میرے ہم رنگو! میرے ہم مذہبو! ہو سکے تو یہ سچائی تسلیم کرلو کہ تم بھی دنیا کی مقدس ترین ہستی کی عظمت سے ان جاہل بدو سرداروں کی طرح نابلد ہو۔ مغرب کے اہل قلم نے تمہیں وہ زہر پلایا ہے اس عظیم ہستی کے خلاف جو تمہاری نس نس میں سما گیا ہے۔ کیا یہ اس کا نقصان ہے؟ سورج کو دیکھنا ہو تو ادب سے نگاہیں جھکا کر دیکھو۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھو گے تو بینائی جاتی رہے گی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ماہ رمضان میں چند روز کے لئے گوشہ نشین ہو جاتے تھے۔ اپنے دل سے بات چیت پہاڑوں کے سناٹوں، ریگستان کی تنہائیوں میں ایسا پرسکوت ماحول میں انسان فطرت کی وہ آوازیں بھی سن لیتا ہے جو بہت دھیمی، بڑی مدھر ہوتی ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ اس طرح کی گوشہ نشینی کا عربوں میں ایک عام رواج چلا آرہا تھا۔ عمر مبارک

کا چالیسواں سال تھا۔ آپ ﷺ مکہ کے قریب ماہ رمضان میں غار حرا کی سنسان تنہائیوں میں عبادت اور غور فکر میں مشغول تھے۔ وہ اپنی سلیقہ مند بیوی خدیجہؓ کے پاس آہستہ سے تشریف لائے اور کہنے لگے ''خدیجہ! اندھیرے چھٹ گئے ہیں، سچائی کی شمعیں روشن ہوگئی ہیں۔ دیکھ! یہ جو لکڑی، پتھر، ہاتھی دانت، آبنوس کے بت ہیں، یہ جھوٹ ہیں، انہیں تو بندوں نے خود تراش لیا ہے۔ سچا خدا ایک ہے اور وہ بہت بڑا ہے، اتنا بڑا کہ اس کے سوا کوئی اور بڑا نہیں، وہ حق ہے، وہ اصل ہے اللہ اکبر! ہمیں ہر طرح کے بتوں کو ترک کرنا ہوگا تاکہ ہم صرف سچے واحد خدا کی بارگاہ میں سر جھکا سکیں سنو خدیجہ! اس کا نام اسلام ہے۔

سامعین! میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ عظیم جرمن فلاسفر اور شاعر گوئٹے نے اٹھارہویں صدی میں کہا تھا ''اگر خدا کی رضا کے آگے سر جھکانے کا نام اسلام ہے تو کیا ہم سب اسلام میں نہیں جی رہے ہیں؟'' ٹھیک کہا تھا گوئٹے نے۔ ہم سب جن میں اخلاقیات کا ایک شمع بھی باقی ہے۔ اسلام میں جی رہے ہیں۔ حکمت انسانی کی بلندی یہ ہے کہ وہ حقیقت پہنچانے کہ اسے خالق کائنات کے قوانین کے آگے سر جھکانا چاہئے، اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو یہ قوانین اسے جھکنے پر مجبور کر دیں گے۔ ایسا اس لئے ہے کہ حکمت خداوندی اعلیٰ ترین اور بہترین ہے اور یہ حکمت کائنات کی ضرورت ہے۔ حکمت خداوندی کو چیلنج نہ کیجئے۔ خاموشی سے اس کی تکمیل کیجئے۔

میں سچ سچ کہتا ہوں کہ دنیا کی واحد اخلاقی اقدار یہی اقدار ہیں، جو خالق کائنات نے اپنے آخری پیغمبر پر نازل فرمائیں۔ آج نہیں تو مستقبل میں لوگ سمجھیں گے کہ کائناتی قوانین سے ہم آہنگ صرف یہی قدریں ہیں۔ اے میرے سننے والو! فتح یاب ہونا چاہتے ہو، کامرانی کے آرزومند ہو تو ان احکام کو سینے سے لگاؤ۔ ایسا نہ کروگے تو تمہاری روح مٹ جائے گی فنا ہو جائے گی۔ نیکی، اچھائی، خوبی، بھلائی، اسلام کی روح ہے۔ جیسے تم سمجھتے ہو کہ عیسائیت کی روح ہے۔ عیسائیت دنیا میں اسی لئے وارد ہوئی تاکہ اسلام کی راہ ہموار کر سکے۔ تمام خیر اور

معراج حکمت خدا کی جانب سے ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ اکبر'' خدا سب سے عظیم ہے۔ اسلام کے تحت ایمان کی انتہا کیا ہے؟ یہ ہے کہ اے خدا تو میری جان لے لے پھر بھی میں تیرا ہوں اوہ! یہ میں نے کیا کہہ دیا؟ پانچ سو سامعین میں سے کسی نے مجھے نہیں ٹوکا! اسلام میں یہ ایمان کی انتہا نہیں ابتدا ہے۔ اسلام تو وہ اعلیٰ ترین راہ زندگی ہے جہاں پہلے قدم پر بندے کی آرزوئیں، تمنائیں، خواہشات، احکام خداوندی میں مدغم ہوجاتی ہیں۔ بندے کے لئے اس سے بڑی حکمت ودانش آسمان سے زمین پر کبھی نازل نہیں ہوئی۔

نگاہوں کو، عقل وخرد کو چندھیا دینے والی روشنی جو اس عرب امی پر جلوہ گر ہوئی اتنے سیاہ اندھیروں میں جب انسانی تہذیب کے سر پر ظالم موت منڈلا رہی تھی۔ اس چکا چوند کر دینے والی روشنی کو اس حیات بخش نور کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کہا، وہی بواسطہ جبرائیل۔ کیا میں اور آپ اس انوکھے تجربے کو اتنا خوبصورت نام دے سکتے تھے۔ وہ چاہتے تو آیات الٰہی کو اپنے جینئس ذہن کی تخلیق قرار دیتے۔ پھر کیا ہوتا؟ ایسا پرشوکت کلام کہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پوجنے لگتے لیکن انہوں نے کہا لوگو! میں تو تم جیسا ایک بشر ہوں اور یہ کلام میرا نہیں ہے۔ کیا آپ کوئی ایک مصنف ایسا بتا سکتے ہیں جو اپنی سحر انگیز تصنیف کو اپنانے سے انکار کرے۔ کیا ایسا فرد امین وصادق کہ سوا کچھ ہوسکتا ہے۔ خدا نے آپ کو وہ اعزاز بخشا جو آپ کے شایان شان تھا۔ اس کا آخری پیغام تمام انسانیت کے نام!

خدیجہؓ کیسی باکمال خاتون تھیں۔ دنیا کا سب سے انوکھا تجربہ نزول وحی اس کے مقدس شوہر نے بیان کیا اور وہ بول اٹھی ''ہاں! یہ سچ ہے۔ حق اول تا آخر!'' محمد صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ برس سے اس عظیم خاتون کے خوش نصیب شوہر تھے۔ میں سمجھتا ہوں اور دونوں کی زندگی کے یہ دو پل ''ہاں! یہ سچ ہے۔ حق اول تا آخر ان کی پچیس سالہ ازدواجی زندگی کے سب سے زیادہ بیش قیمت دو پل تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا جوہر شناس اور نفیس انسان خدیجہؓ کی محبت اور اس کی نوازش کو کیسے بھول سکتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار عائشہؓ نے پوچھا (وہ ذہین، خوبصورت

اور نوجوان عائشہ جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدیجہؓ کی وفات کے تین برس کے بعد شادی کی تھی) کیا آپ مجھے خدیجہؓ سے زیادہ نہیں چاہتے؟ وہ تو ایک بیوہ تھیں اور عمر رسیدہ ہوچکی تھیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں! خدا کی قسم نہیں اس خاتون نے مجھ پر یقین کیا جب کوئی ایمان نہیں لایا تھا۔ بھری دنیا میں اگر میرا دوست تھا تو وہ خدیجہ تھیں۔

بہرکیف آپ ﷺ نے اپنا پیغام ہر شخص کو سنایا۔ اس فرد کو بتایا۔ ایک سے کہا۔ دوسرے تک پہنچایا لیکن اکثر لوگوں نے اس مبارک پیغام کا مذاق اڑایا۔ کسی نے بے تعلقی برتی تو کسی نے بے پروائی۔ میرا خیال ہے تین لمبے برسوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی کرشماتی ہستی کو صرف تیرہ ساتھی میسر آئے۔ پھر ایک دن آپ نے اپنے خاندان کے چالیس افراد کو اپنے گھر مدعو کیا شک وشبہ کے سناٹے میں ایک سولہ سالہ نوجوان جوش میں کھڑا ہوگیا۔ ''میں آپ کا ساتھ دوں گا'' یہ نوجوان کون تھا؟ علیؓ ابن ابی طالب۔

تاریخ عالم کے عظیم ترن ہیرو، انسانیت کے محسن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاشانہ مبارک میں اپنے گھرانے کے چالیس افراد سے پوچھ رہے ہیں۔ کون ہے جو میرے مقدس مشن میں میرے ساتھ کھڑا ہوگا؟ ایک ۱۶ رسالہ لڑکا نہایت جوش کے ساتھ فوراً کھڑا ہوجاتا ہے وہ کون ہے؟ علیؓ ابن ابی طالب! بذات خود ایک تاریخ ساز ہستی۔ یاد رکھئے کہ اس بچے کے قریب ہی اس کا محترم والد بھی تشریف فرما ہے، ابو طالب۔ وہ ابوطالب جس کے سامنے نگاہیں اٹھاتے ہوئے بڑے بڑے سرداروں کے دل دھڑکنے لگتے ہیں۔ اس محترم بزرگ کی سنجیدہ باوقار خاموشی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور اپنے عزیز بیٹے کے حق میں ایسی خاموشی ہے جو گفتار پر بھاری ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس موقع پر ابوطالب کچھ کہتے، کچھ بھی کہتے تو اتنا بااثر نہیں ہوسکتا تھا جتنی بااثر یہ پروقار خاموشی تھی۔ جو لوگ اس بزم میں حاضر تھے وہ پہلے حیران ہوئے کہ ابوطالب ایک ان پڑھ بوڑھا اور اس کا چھوٹا ۱۶ سالہ بیٹا اس مشن کی تائید کرنے چلے ہیں جو محمد ابن عبداللہ کی دیوانگی کے سوا کچھ نہیں۔ بنی نوع

انسان کی زندگیاں بدلنے کا مشن۔ ان ہی لوگوں میں کچھ ایسے نادان بھی تھے جنہوں نے ساری بات ہنسی میں اڑانا چاہی مگر معزز سامعین! یہ ہنسنے کی بات نہیں تھی۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ محفل نہایت سنجیدہ تھی اور دنیا کا نقشہ بدل دینے والی تھی۔ اس بچے کے بارے میں اور کیا کہوں؟ آپ اس سے صرف محبت کر سکتے ہیں۔ پاک ذہن، محبت کا پیکر اور اس پر آتشیں شجاعت، مجسم سخاوت، شیر سے زیادہ بہادر، سداحق پر قائم اور پروقار! ہمارے کلچرل میں علیؓ جیسی ہستی کو عطا کرنے کے لائق کوئی خطاب تک نہیں۔ نہ سر نہ لارڈ۔ پھر اتنا بڑا انسان کہ جب عراق میں قاتل نے اسے مہلک زخم لگائے تو اس نے کہا 'اگر میں بچ گیا تو حملہ آور کو معاف کر دینا لیکن اگر زخم کاری ثابت ہوا تو قاتل کو فوراً قتل کر دینا۔ اس لئے فوراً قتل کرنا تاکہ میں اور وہ ایک ساتھ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور خدا کا عدل وہ اپنی آنکھوں سے فوراً دیکھ لے۔

پیغمبر ﷺ سے قریش کے لوگ خانہ کعبہ کے متولی اور بتوں کے نگہبان ناراض تھے، انہیں ناراض ہونا ہی چاہئے تھا۔ حق و باطل کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ ان کا مقدس مشن کامیاب ہو کر رہے گا۔ ہر چند کے مخالفت زوردار تھی لیکن حق و باطل کے معرکے میں امپائر انسان نہیں ہوتے قدرت امپائر ہوتی ہے۔ سچائی غالب آ کر رہتی ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ نکتہ خوب جانتے تھے پھر بھی ان کے رب نے اپنے کلام سے اس پر مہر تصدیق ثبت کی۔ قدرت عجیب امپائر ہے۔ اس میں بڑی عظمت ہے، وسعت ہے، گہرائی ہے اور تحمل ہے۔ آپ گندم کا دانہ لیجئے اور اسے زمین کے سینے میں دبا دیجئے۔ یہ بیج بوتے وقت اس بیج پر خاک لگی ہو، بھوسہ لپٹا ہو، سکوکھی گھاس ہو، کچھ بھی ہوا گر آپ نے اسے ایک نرم زرخیز مٹی میں بویا ہے تو قدرت اس میں سے گیہوں اگا کر رہے گی جو گرد، جھاڑ جنکاڑ، گھاس پھوس آپ نے گندم کے اس بیج کے ساتھ زمین کے سپرد کر دیئے ہیں۔ قدرت خاموشی سے انہیں جذب کر لے گی۔ آپ

سے گلہ نہ شکوہ! پھر دیکھئے سنہری سنہری گندم کی بالیاں۔ اتنی وسیع القلب ہے نیچر اور کمال یہ ہے کہ فالتو اجزا جو بیج کے ساتھ زمین میں چلے گئے ہیں انہیں بھی فطرت ضائع نہ ہونے دے گی۔ انہیں بھی کسی کام میں لے آئے گی۔ قدرت سچی ہے اور ماں کی طرح شفیق ہے۔ یہی سلوک وہ ایک پاک دل کے ساتھ کرتی ہے۔ اس پاک دل سے رحمتوں اور برکتوں کے پودے اور شجر جنم لیتے ہیں۔ افسوس مجھے اس بات پر ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عظیم پاک باز دل کو جسم کی ضرورت کیوں پڑتی ہے۔ وہ جسم جو ایک سا نہیں رہتا۔ یہ جسم جس میں سچائی ہے اور حق پنہاں ہے وہ تو فانی ہوتا ہے۔ لیکن میں یقین سے کہتا ہوں کہ جس طرح سچائی کبھی نہیں مرتی اسی طرح پاکیزہ روح کو بھی کبھی موت نہیں آتی۔ یہ ہے قدرت کا قانون۔ سچائی لافانی ہوتی ہے۔ انسان پر قدرت نے یہ مہربانی کی ہے کہ وہ گرد تنکے، بھوسے کو نہیں دیکھتی اسے نظرانداز کر دیتی ہے۔ اسے اس بات سے مطلب ہے کہ تمہارے اندر نشوونما پانے کے قابل بیج ہے یا نہیں۔ میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ تم خود کو خالص انسان سمجھتے ہو۔ کھرا انسان کہتے ہو لیکن تمہارے اندر بیج نہیں ہے۔ سنی سنائی باتوں، اندھی تقلید اور رسم پرستی کی وجہ سے تم نے آمنہ کے فرزند صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھا ہی نہیں۔ میری رائے میں تم کچھ نہیں ہو۔ میری نگاہ میں تمہارا وجود ثابت نہیں ہے۔ قدرت کو تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ہمارے کچھ محققین بڑا ہانکتے ہیں کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مسیحیت سے اخذ کی گئی ہے۔ بحث میں پڑنے کی بجائے میں اتنا پوچھتا ہوں کیا یہ تعلیم مسیحیت سے بہتر نہیں ہے؟ ایک زندہ اور لازوال نظام حیات۔ ایک صحرانشین اپنے حیات بخش مخلص دل اور چمکتی ہوئی دوربین نگاہوں سے ہر معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اظہار کی سادگی ملاحظہ کیجئے۔ وہ اپنی قوم سے کہتا ہے دیکھو تو سہی تمہاری صنم پرستی ہے کیا؟ لکڑی اور پتھر کے چند بت جنہیں تم خود تراش لیتے ہو۔ انہیں زیتون کے تیل سے چمکاتے ہو۔ موم پگھلا پگھلا کر انہیں

خوبصورت بناتے ہو۔ پھر دیکھتے ہو کہ تمہارے ان معبودوں پر مکھیاں آ بیٹھتی ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں کہ تمہارے یہ معبود جو اپنے اوپر بیٹھی مکھیاں نہیں اڑا سکتے تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ یہ تو بے جان بے زور پیکر ہیں جن کی تعظیم میں تمہاری اپنی توہین ہے۔ انسانیت کی توہین ہے۔ معبود حقیقی صرف خدا ہے۔ صرف وہی ہے جو قادر ہے، زبردست ہے۔ اس نے ہمیں بنایا ہے۔ وہی ہمیں مار سکتا ہے۔ وہی ہمیں زندہ رکھتا ہے۔ اللہ اکبر! جان لو کہ خدا کی رضا میں اس کی فرمانبرداری میں تمہاری فوز وفلاح ہے۔ اگرچہ تمہیں اس راہ میں دکھوں کے دریا سے گزرنا پڑے اسی میں دنیا اور آخرت کی کامیابی مضمر ہے۔ کیا تم فوز وفلاح نہیں چاہتے؟ خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہوں نے اس مقدس ہستی کی آواز پر لبیک کہا۔ اس کا پیغام تو اتنا دلکش تھا کہ شخص کو سر تسلیم خم کر دینا چاہئے تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام اتنا سادہ اور برکتوں والا ہے کہ اسے قبول کر کے جو انسان چاہے دنیا کا پیشوا بن سکتا ہے۔ جی ہاں! ہر شخص جو چاہے۔ یہ اس لئے کہ وہ یکا یک زندگی کے مصنف خدائے ذوالجلال کی تحریر کا حرف بن جاتا ہے۔ اس سے بہتر فریضہ کیا ہوگا کہ انسان خالق کائنات کے رجحان سے ہم آہنگ ہو جائے۔ کیونکہ بالآخر یہی ہونے والا ہے کہ خالق نے جو سمت اس جہان کیلئے متعین کر دی ہے یہ جہان اسی سمت میں آگے جا رہا ہے اور جائے گا۔ خوش بخت ہیں وہ لوگ جو اس منزل شناس قافلے کے مسافر بنتے ہیں۔ اے آدم کے بیٹو! اور آدم کی بیٹیو! اس قافلے کی راہ گزر کا نقشہ اپنے دلوں میں ثبت کر لو۔ اسلام نے انسانیت پر بہت بڑا احسان کیا کہ اس نے منزل کے حصوں کا ایک سیدھا راستہ دکھایا اور منزل سے دور لے جانے والی راہوں کو بھی واضح کر دیا۔ یہ بھی وہ عظیم سچائی ہے جو فطرت کے دل سے اٹھی تھی۔ وہ باطل جسے مٹنا تھا مٹ کر رہا۔ حق کی آتش نے باطل کی خس وخاشاک کو جلا کر راکھ کر دیا۔

حق وباطل کی کشمکش کے مد وجزر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم وحی کو لکھواتے رہے یاد کرواتے رہے جسے قرآن کہتے ہیں۔ کتنا پیارا نام ہے۔ ''قرآن'' یعنی وہ صحیفہ جو پڑھنے

کے لائق سمجھنے کے قابل اور عمل کیلئے مہمیز۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے مقدس ساتھی دنیا سے سوال کرتے رہے۔ کہو یہ مقدس کلام معجزہ ہے یا نہیں؟ ۱۲۰۰ برس گزر گئے۔ آج کے دن محمڈن لوگ (مسلمان) آج بھی قرآن سے وہ عقیدت رکھتے ہیں جو بائبل کے ماننے والے مسیحیوں کو بائبل کے ساتھ نصیب نہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک پیغام آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب وہ قانون ہے اور وہ عملی تعلیم ہے جو بنی نوع انسان کے لئے رہتی دنیا تک انسانی تہذیب وتمدن کا اعلیٰ ترین معیار رہے گا۔ نزول وحی کی ابتداء یعنی ۶۱۰ء کے بعد دنیا کا ہر نظام ہر فلسفہ اس مقدس پیغام کے سامنے جانچ پرکھ کے لئے رکھنا ہوگا۔ گوئٹے نے جو کہا ہے کہ انسانی دماغ نظام محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔ کتنی سچی بات کہی ہے اس نے! جتنے نظام ہائے تمدن انسانیت کے ایوانوں میں پیش کئے جائیں گے ان کی کسوٹی ہمیشہ کے لئے اگر کچھ ہوگی تو وہ ہوگی نظام محمد صلی اللہ علیہ وسم اور کچھ نہیں۔ میں گوئٹے سے پوری طرح متفق اس لئے ہوں کہ محسن انسانیت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام براہ راست، بلاواسطہ بہشت کا پیغام ہے۔

سامعین! قرآن کریم نے بہشت کی جو حسین ترین تصویر کشی کی ہے وہ دل بہلانے کا سامان نہیں اٹل حقیقت ہے اور یہ تصویر ہمیں اس لئے دکھائی گئی ہے تاکہ ہم اپنی زمینی زندگی کو اپنے معاشرے کو اسی سانچے میں ڈھالیں جہاں صرف فوز ہے، وہ زندگی جہاں نہ خوف ہے نہ غم۔ یہ وہ مقدس صحیفہ ہے جو پڑھنے کے لائق سمجھنے کے قابل ہماری کامرانیوں کا ضامن۔ مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ قرآن مقدس کو پڑھیں۔ اسے سمجھیں اور اس لافانی نور میں اپنی زندگی کا سفر طے کریں۔

مسجدوں میں ہی نہیں گھروں میں یہ مقدس کتاب روزانہ پڑھی جاتی ہے۔ ۱۲ صدیاں گزر چکی ہیں قرآن کریم کی اہمیت وقت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو ہی نہیں کرہ ارض کے تمام باشندوں کو یہ کتاب عظیم بار بار پڑھنی چاہئے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے

کہ بعض مسلمان محدّث علماء ایسے بھی گزرے ہیں جو کاش قرآن کو اپنی زندگی میں ستر ہزار نہیں.....، ستر سو نہیں، ستر نہیں سات نہیں زندگی میں ایک بار سمجھ کر پڑھ لیتے۔ میں نے بذات خود جارج سیل GEORGE SALE کا ترجمہ قرآن پڑھا ہے۔ میں نے تمام عمر اتنی محنت طلب کتاب نہیں پڑھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے جو ترجمے اور ترجمانیاں ہوئی ہیں وہ کلام خداوندی کا حق ادا نہیں کرتیں۔ اگر کسی یورپین کو انگریزی یا کوئی بھی یورپی ترجمے ملیں تو بغیر ڈیوٹی سمجھے ہوئے یہ کتاب نہیں پڑھ سکے گا۔ میں نے سنا ہے دیگر زبانوں میں بھی اس کلام الٰہی کے ترجموں کا یہی حال ہے۔ خالق کائنات نے اپنا پیغام پہنچا کر اپنا فرض ادا کر دیا۔ یہ ناقص و ناداں انسان ہی ہے جو اسے خدا کے بندوں تک نہ پہنچا سکا۔ جس طرح میرے اور سارے جہاں کے محسن محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا تھا۔ ہوسکتا ہے عرب اسے ہم سے بہتر سمجھتے ہوں لیکن شاید وہ بھی پڑھتے ہیں سمجھتے نہیں۔ صفحات کی گنتی پوری کرتے ہیں۔ ورنہ وہ ہم سے بہتر انسان ہوتے۔ کسی عرب کو قرآن پڑھتے ہوئے سنئے گا تے ہوئے نہیں، پڑھتے ہوئے تو میرے یورپین ساتھی بھی قرآن کی پرشکوہ روانی، غنائیت اور بحر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جیسے صحرا کے سناٹے میں خاموش سنسان تنہائیوں میں دل کو ابھارنے والا کوئی گیت۔ ترجموں میں وہ بات کہاں؟ کوئی تو بات ہے جو اٹھارہ کروڑ انسان اس کتاب پر نثار ہیں۔ (صاحبو ۱۸۴۰ء میں اتنے ہی مسلمان تھے دنیا میں۔ مترجم) قرآن اپنا لا انتہا اثر اس وقت آپ کے دلوں پر شروع کرتا ہے جب آپ اس کی کچھ آیات سمجھ کر اس کتاب کو بند کر چکے ہوتے ہیں اور یہ اثر بڑا ہی دیرپا ہوتا ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ یہ سچا اور کھرا پیغام الٰہی ہے۔ میں تو یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اگر کوئی راہ گم کردہ انسان پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دے تو آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب ایسے راہ گم کردہ شخص کو راہ راست پر لانے کے لئے کافی ہونی چاہئے۔ دنیا کی واحد کتاب اور عجیب منظر! لوگ کہتے ہیں۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کتاب تم نے لکھی ہے اور کہتے ہیں نہیں لوگو!

میں تو محض ایک بشر ہوں تم جیسا اور تم جانتے ہو کہ میں امی ہوں، پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ یہ قرآن جو ہے وحی کے سوا کچھ نہیں، جو میرے قلب پر نازل کی جاتی ہے۔ سامعین کرام! کیا آپ تاریخ عالم سے کوئی ایک مثال ڈھونڈ کر لا سکتے ہیں جہاں کسی پرشوکت کتاب کے بارے میں کہا گیا ہو۔ لوگو! یقین مانو یہ کتاب میں نے نہیں لکھی۔

یاد رکھئے! کہ نزول وحی اس کا املا اور کتابت ان سب حالات میں جاری ہے جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخر الزماں اللہ کے آخری رسول روئے زمین پر مصروف ترین انسان ہیں۔ زندگی اور موت کی کشاکش ہے جنت اور جہنم کی کشمکش جاری ہے۔ قانون سازی ہے، سپہ سالار ہے، گھریلو ذمہ داریاں ہیں۔ میدان کارزار ہے، تبلیغ ہے، لوگوں کی اصلاح ہے، رعایا کی فلاح ہے، محنت ہے، مشقت ہے، عبادت ہے، دعوت ہے، جنگ ہے، امن ہے، رات ہے، دن ہے، سفر ہے، حضر ہے، جلوت ہے، سوال ہیں، جواب ہیں، تعلیم ہے، تربیت ہے، مسجد و منبر، فنا و بقا، تدبیر و تقدیر مسائل کی تشریح ہے، تشریحوں کی تاریخ ہے۔ آپ ہی بتائے کیا نہیں ہے؟ نبوت کے ان ۲۳ سالوں میں، میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ آپ کی حیات پاک میں سکون کے ایک لمحے کا گزر ہوا ہو۔ خیالات کے سمندر میں ایک مقدس ذہن کی شکستی افکار کی لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی۔ اتنے زبردست طوفان میں اس کشتی کو خالق نے اپنے ہاتھوں سے سنبھالا۔ جبرئیل کو بھیج دیا۔ وہ جبرئیل جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اتنی ہی کھلی ہوئی حقیقت تھا جتنا ہمارے لے ایک واہمہ یا تصور ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ فطرت کا یہ عظیم فرزند جبرئیل کے لائے ہوئے پیغام کو جب عرب کے صحرانشینوں کے آگے روز پڑھتا ہے۔ آئے دن انہیں نئی وحی سناتا ہے تو وہ سب اور زیادہ اس کے دیوانے ہو جاتے ہیں۔ قریب تر ہو جاتے ہیں۔ کیا جھوٹ میں ایسی مقناطیسیت ہوسکتی ہے؟ مجھے اپنے ہم وطنوں کی ذہنیت پر افسوس ہے جو ان حالات پر غور کئے بغیر ایسے عظیم الشان انسان کی بارگاہ میں گستاخی کرتے ہیں۔

میں نے اپنی ادبی، فکری اور قلمی زندگی سے یہ نتیجہ حاصل کیا ہے کہ کتاب کوئی ہو، اس کی عظمت کا معیار بالآخر خلوص ہوتا ہے۔ بندے کے حق میں اس سے زیادہ مخلص کون ہوسکتا ہے جس نے اسے بنایا۔ قصہ مختصر جس خالق نے بندے کو بنایا۔ اس نے رہنماؤں کے لئے قرآن بھی نازل کیا۔ میں آپ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ خلوص کی کسوٹی پر یہ کتاب لاثانی ہے۔ کھری ہے، خالص ہے۔ بدقسمتی ہے انسان کی کہ خالص سونے کے گرد کھوٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کتاب الٰہی کے سمجھنے میں نہ جانے کن کن لوگوں نے مختلف طریقوں اور ناموں سے روایتوں کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ جی ہاں! سونے کے ارد گرد کھوٹ۔ میں تو چلا جاؤں گا۔ آپ لوگ جو میری باتیں اتنی محبت سے سن رہے ہیں آپ سب بھی ہمیشہ نہیں رہیں گے لیکن ممکن ہے کہ آج میرے دل سے نکلی ہوئی باتیں وقت کا بے رحم ہاتھ محفوظ کر لے اور نہیں تو آئندہ صدیوں میں آنے والے ایک دو صاحب فکر و نظر دنیا تک پہنچائیں۔

جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے تھے اسی طرح ان کی زندگی بھی سچائی کے سوا کچھ نہیں تھی۔ انہوں نے دنیا کو بتایا کہ یہ کائنات نہ کسی کا خواب ہے اور نہ ہی ایک عکس، شبیہ یا مثال! یہ کائنات ایک ٹھوس اٹل حقیقت ہے۔ فطرت کا یہ فرزند عظیم جانتا تھا کہ زندگی اور موت بھی اٹل حقیقت ہے۔ خواب اور واہمہ نہیں۔ آپ ﷺ کے ارشادات میں آسمانی کروں کی، نباتات و جمادات، ہواؤں، پہاڑوں، بادلوں، سیاروں اور ستاروں کا ایسا دلچسپ اور مستند بیان ملتا ہے جو انسانی ذہن کی پیداوار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ آپ اپنی قوم کو عبرت کے طور پر اور نصیحت و ہدایت کے لئے بار بار انبیائے کرامؑ کی داستانیں سناتے ہیں۔ کبھی ابراہیمؑ، کبھی ہودؑ، کبھی موسیٰؑ، کبھی عیسیٰؑ، کمال یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ میں گم ہو کر نہیں رہ جاتے۔ وہ تاریخ سے سبق سکھاتے ہوئے اس طرح آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں کہ ان کا پچھلا قدم تاریخ میں ہوتا ہے اور اگلا قدم مستقبل میں لیکن دل و دماغ آج کی حقیقتوں پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ جی ہاں! غیر معمولی نظر تھی ان کی، اس دنیا پر اور

دوسری دنیا پر۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی حمد و ثنا کرتے رہتے ہیں جو عام آدمی کی سمجھ سے باہر کی بات ہے لیکن ان کی حمد ثنا رسمی نہیں ہے اوروں سے مختلف ہے کیونکہ ان کی نگاہ فطرت کی گہرائیوں اور پہنائیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ میں اسے نگاہ پاک کہنا چاہتا ہوں اور نگاہ پاک نہ صرف پاک دل کی علامت ہے بلکہ پاک دل کی ثبوت بھی ہے۔ عقیدوں، دلوں، دماغوں، جسموں، جانوں اور زمینوں کا اتنا بڑا فاتح، جب وہ کہتا ہے لوگو! میں تم جیسا ایک بشر ہوں۔ تم مجھ سے معجزوں کی امیدیں نہ رکھو تو اس کی بڑائی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ لوگوں کو سکھاتے ہیں کہ تمہیں میری نہیں ہم سب کے خالق کے عبادت کرنی ہے اور جس کی عبادت کرنی ہے اس کے معجزے تمہارے دائیں بائیں آگے پیچھے، اوپر نیچے ہر سمت بکھرے ہوئے ہیں۔ تمہیں صرف دیکھنے والی آنکھ چاہئے۔ یہ زمین جس میں تمہارے لئے راستے بنائے تم اس پر رہتے ہو۔ چلتے پھرتے ہو۔ یہ بادلوں کے پہاڑ جو آسمان کی پہنائیوں سے اترتے ہوئے لگتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں یہ؟ تم دیکھتے ہو کہ پھر وہ ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بڑی بڑی سیاہ گھٹائیں پانی برسا دیتی ہیں، وہ حات بخش پانی جو مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے، پھر اس زمین سے سبزہ پھوٹ پڑتا ہے اور دیکھو ذرا اونچے کھجور کے درخت اپنی شاخوں پر کھجور کے خوشے اور گچھے تمہارے لئے جھلاتے ہوئے۔ کیا یہ اللہ کی نشانی نہیں؟ پھر تمہارے مویشی ہیں جنہیں اللہ نے ایسا تابع دار بنایا ہے کہ تم ان سے خدمت لیتے ہو۔ غور کرو یہ مویشی تمہارے لئے گھاس کو دودھ بنا دیتے ہیں۔ تم تو ان کی کھالوں سے بھی کپڑے بنا لیتے ہو اور ان کی اون سے بھی۔ شام ڈھلنے لگتی ہے تو وہ خود ہی گھر آجاتے ہیں۔ کیسی نعمت ہے تمہارے لئے؟ جسے دیکھ کر تم خوش ہوتے ہو۔ پہاڑوں جیسے جہاز ہیں جو سمندروں کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ بادبان تم بنا لیتے ہو انہیں چلانے والی ہوائیں کون بھیجتا ہے؟ تم معجزوں کی بات کرتے ہو۔ کیا تم خود خالق کا معجزہ نہیں ہو۔ اس نے تمہیں مٹی سے بنایا۔ یاد ہے تم چھوٹے سے تھے۔ جانتے ہو

کہ اس سے چند برس پہلے تم کچھ نہیں تھے۔ تمہیں متناسب جسم، قوت خیالات عطا ہوئے، ایک دوسرے کے لئے رحم کا جذبہ تمہارے دلوں میں کس نے ڈالا؟ پھر جب عمر بڑھ جاتی ہے تمہارے بال سفید ہونے لگتے ہیں۔ طاقت کمزوری سے بدل جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ پھر تم ڈوب جاتے ہو، مٹ جاتے ہو ایک بار پھر تم کچھ نہیں ہو۔

معزز سامعین! غور فرمایئے کیا کہہ گئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر انسان میں رحم کا جذبہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ یہ خیال بھی انسانی ذہن سے بلند، ماورا خیال ہے۔ براہ راست خالق کائنات کا پیغام۔ جو کچھ بھی خیال انسانوں کو دنیا میں بہترین اور صادق ترین ہوسکتا ہے۔ وہ ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ملتا ہے۔

بلند ترین ذہنی سطح پاکیزہ اعلیٰ ترین سوچ، میرے خیال میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب نے انہیں امی رکھ کر انسانیت پر بڑا احسان کیا۔ خدا نے انہیں خود پڑھایا۔ اپنی بارگاہ سے علم عطا کیا۔ دوربین نگاہ صحرا کی طرح وسیع دل نہایت قوی اور زبردست شخصیت خدا نے انہیں براہ راست عطا کئے۔ وہ چاہتے تو دنیا کے عظیم ترین شاعر اور فلاسفر بن جاتے۔ جس شعبے میں چاہتے بے مثال ہیرو بن جاتے۔

آپ کی نظر ایسی وسیع نظر کہ کائنات کو خالق کی شناخت کا ذریعہ ہی نہیں اس کی لامتناہی قدرت کا نشان سمجھتی ہے۔ پوری کی پوری کائنات اللہ کے وجود ہی کی نہیں اس کی بے حد و بے حساب قوتوں کی گواہی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو بتاتے ہیں کہ یہ بڑے بڑے پہاڑ جو تم دیکھتے ہو خالق کے ایک ''کن'' کے آگے بادلوں کی طرح روئی کے گالوں کی طرح دھنک دیئے جائیں گے اور کچھ نہیں ہوں گے، کچھ نہیں رہیں گے۔ پہاڑوں کی کیا پوچھتے ہو؟ پورے کا پورا کرۂ ارض لٹو کی طرح گھومتا ہوا خاک اور بخارات کی دھند بن کر لاموجود ہو جائے گا۔ جس دن اللہ کائنات سے اپنا ہاتھ اٹھالے گا۔ اسی لمحے جو ہے نہیں ہوگا۔ جو کچھ ہے وہ اس عظیم قدرت کے طفیل ہے جس کی صفات کے بیان سے بھی ہم قاصر ہیں۔

دنیا و مافیہا کی حقیقت اس عظیم ہستی کے سامنے بے حجاب رہتی ہے۔ دور جدید میں آپ لوگ جسے فطرت کے قوانین کہتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسے حکومت خداوندی کہنے سے ذرا نہیں جھجکتے۔ میرے خیال میں شاید ہی کوئی ایسی بات ہو جو اس سے زیادہ یاد رکھنے کے قابل ہو جو اس صحرانشین نے فرمادیا۔ یہ ساری کائنات قوانین فطرت میں جکڑی ہوئی ہے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کو یہ اصول نہ دیا ہوتا اور یہ اصول کہ اللہ کے قوانین کبھی نہیں بدلتے تو آپ کی سائنس آج بھی گھٹنوں کے بل چل رہی ہوتی۔

متعصب مسیحی کہتے آئے ہیں کہ اسلام نے جسمانیت کا بہت ذکر کیا ہے وہ یہ بات جانتے نہیں یا چھپانا چاہتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں دنیا بھر میں جسمانیت، نفسانی خواہشات اور حرص و ہوس کا جو دور دورہ تھا آپ ﷺ کی ذات اقدس نے اسے اتنا گھٹا دیا جو کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ﷺ ایک آسان سا کیف و لطف کا مذہب لے کر آئے تھے۔ آپ غلطی پر ہیں۔ سخت ترین روزے، زبردست اخلاقی پابندیاں، دن میں پانچ دفعہ کی صلوٰۃ، شراب اور جوئے سے مکمل پرہیز، اپنے ہر عمل کو میزان خداوندی میں تولتے رہنا، کیا یہ سب کھیل ہے؟ اور پھر یہ قصہ بھی نہیں کہ اسلام میں جنت مزے سے مل جاتی ہے۔ اس میں تنگ دست فرد کو بھی اور دولت مند شخص کو بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان کارزار میں اترنا پڑتا ہے۔ یہاں تو صورتحال یہ ہے کہ سب سے بڑا اعزاز اپنے پالنے والے کے لئے اپنی پیاری جان نثار کر دینا ہے۔ شہادت حاصل کرنا ہے۔ صحیح معنوں میں خدا کا بندہ اسلام میں وہی ہے جو اپنی عزیز ترین متاع کو اس کی بارگاہ میں قربان کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہے۔ کتنی عالی شان تعلیم ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو چشم زدن میں معمولی کو ہیرو بنا سکتی ہے کہ یہ ہے وہ شخص جس نے اپنی زندگی اپنی دنیا خدا اور رسول ﷺ کی خاطر نثار کر دی۔ ایسے شخص کے آگے دنیا کی ہر کشش ہیچ ہے۔

جب ہی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ خالد بن ولیدؓ نے دشمن کے کمانڈروں

سے ڈنکے کی چوٹ کہہ دیا۔

یاد رکھو! تمہارا مقابلہ اس قوم سے ہے جنہیں موت اتنی ہی پیاری جتنی تمہیں زندگی پیاری ہے۔

غور کیجئے کون ہے جو ایسے جانبازوں کے آگے ٹھہر سکتا ہے۔ یہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم جو بجھے ہوئے دلوں میں ایمان کے شعلے بھڑکا دیتی ہے۔

بدقسمت ہیں وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی پاک ہستی پر خواہشات نفس کے الزام لگاتے ہیں۔ ایسی باتی وہ لوگ لکھ گئے جو آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چند سو برس بعد اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے اسلام کے غیر مسلم متعصب دشمن تھے۔ آج کے مغربی محققین ان ہی دشمنوں کی دوات سے سیاہی چراتے ہیں۔ ذرا سوچو تو سہی جو کی روٹی، کھجور اور پانی پر گزارہ کرنے والا شخص کبھی عیش وعشرت کی طرف مائل ہوسکتا ہے؟ جب یہ عظیم الشان ریاست مدینہ کا حاکم ہے تو کون سی نعمت ہے جو وہ حاصل نہیں کرسکتا لیکن عالم یہ ہے کہ مہینوں اس کے چولہے میں آگ نہیں جلتی ایسی کوئی اور مثال تم لا سکتے ہو؟

جی ہاں! جو کی روٹی، کھجور، ستو اور پانی پر گزبسر کرنے والی یہ عظیم ہستی تاجدار مدینہ تھی۔ ایسی تاجدار ہستی جس کے قدموں پر دنیا کے سب تاج وتخت نثار۔ زمینوں کا نہیں، دلوں کا بادشاہ۔ انسانوں کی محبتوں اور عقیدتوں کے سب جہانوں کا حکمراں۔ لوگ تو اس کے وضو کئے ہوئے پانی میں برکت ڈھونڈتے ہیں۔ دین ودنیا کی فوز وفلاح ان کی ایک نظر کرم۔ اور وہ عظیم انسان اپنے جوتے بھی اپنے ہاتھوں سے سی لیتا ہے۔ اتنا امیر انسان، اتنا غنی، اتنا سخی اور مالا مال کہ اس کی غربت پر ہزار سلطنتیں نچھاور۔ وہ غربت جو اس کی اپنی اختیار کردہ تھی۔ وہ اس سادگی اور درویشی کو اپنا فخر کہتا رہا۔ اس درویشی میں جو نکتہ پنہاں ہے وہ اس پیغمبر اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا بھی آج نہیں سمجھتے۔ آپ چاہتے تو خزانوں کے ڈھیر آپ کے قدموں میں رہتے لیکن آپ اتنے تونگر انسان تھے جو تونگری اور امیری کو

دل کی تونگری اور امیری قرار دیتے تھے۔ شاہ مدینہ کے قدموں میں جو رزق ومال واسباب پیش ہوا تھا۔ اسے وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کئے بغیر سو نہیں سکتے تھے۔ کیا آپ گندم کی روٹی، دودھ، بالائی، مکھن، گوشت اور مرغ مسلم اور پلاؤ تناول نہیں فرما سکتے تھے؟ بات یہ ہے سامعین وہ سب آسائشیں استعمال کر سکتے تھے لیکن استعمال نہیں کرتے تھے۔ اس لئے استعمال نہیں کر سکتے تھے کیونکہ تبوک کے شمال میں اور نجران کے جنوب میں، طائف کے مغرب میں اور ربع الخالی کے مشرق میں ہر ہر بدو کو یہ آسائشیں میسر نہیں تھیں۔ وہ غریب بدو جو کی روٹی، کھجور، ستو اور پانی سے اپنا پیٹ بھرتا تھا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ میرے ہم وطنو! میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ ایسی درویشی اور ایسی تونگری ایسی قلندری اور ایسی سکندری، ایسی غربت اور ایسی امیری کی صرف ایک مثال انسانوں کی تاریخ سے ڈھونڈ لاؤ۔ ہو سکے تو ڈھونڈ لاؤ اور تم ایسا نہیں کرسکو گے۔ اگر ایسی مثال تمہیں کہیں ملے گی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے نام لیواؤں میں ملے گی اور کہیں نہیں۔ یہ کیسا بادشاہ ہے جو محنت کش بھی ہے، محنت کش انسانیت کا محور اور مقناطیس ۲۳ برس کے طویل دور نبوت میں عربوں جیسی سرکش قوم دن رات آپ کے ابرو کے اشاروں کی منتظر رہتی ہے۔ جنگ جو مہم پسند، تنگ مزاج، آتشی فطرت، لوگ جتنا اس ہستی کے قریب ہوتے ہیں اتنا ہی اور زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ اتنا ہی عقیدت منداور پروانوں کی طرح جانثار بن جاتے ہیں۔ کوئی تو بات تھی اس مقدس ہستی میں۔ میں سمجھتا ہوں عرب کے نیم وحشی صحرا نشینوں کو قانون اور احکام کے دائرے میں لانے اور رکھنے والا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور شخص ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان عربوں نے آپ ﷺ کو پیغمبر مان لیا تھا۔ ٹھیک ہے لیکن ذرا شان پیغمبری تو دیکھو کہ نہ اس میں کوئی راز ہے نہ اسرا۔ وہ لوگوں کے سامنے اپنے کپڑوں میں ٹانکے لگا رہا ہے۔ جوتا سی رہا ہے۔ ان کی نفسیاتی تربیت بھی کرتا جاتا ہے۔ انہیں حکم دیتا ہے اور احکام کی تعمیل میں ان کے ساتھ شریک بھی ہے۔

میدان کارزار میں وہ چٹان کی مانند استقامت کا پیکر ہے۔

سامعین! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو بارہ سو برس کے بعد ہم بہتر جانتے ہیں یا ساتویں صدی عیسوی کے وہ سادا لیکن تیز نگاہ عرب جانتے تھے جو دن رات آپ کے گرد اس طرح منڈلاتے تھے جس طرح آپ اس ہال کے دلکش بڑے چراغ کے گرد پروانوں کو منڈلاتا دیکھ رہے ہیں۔ آپ اس مقدس ہستی کو جو چاہیں سمجھیں یہ میرا فرض منصبی ہے کہ آج کی شام اپنے معزز حاضرین کو اور آنے والی نسلوں کو یہ بتا جاؤں کہ دنیا کے کسی بادشاہ، حکمران، فاتح، سلطان، راجہ یا مہاراجہ کو اپنی رعایا کا یہ احترام، محبت اور عقیدت نصیب نہیں ہوئی جو عرب کے اس کملی پوش بادشاہ کو عطا ہوئی۔ لبادہ ایسے اوڑھے ہوئے جس میں اس نے اپنے مقدس ہاتھوں سے جابجا پیوند لگا رکھے تھے۔ محبتوں کی یہ دیوانگی ۲۳ سال لگاتار چلتی ہے بلکہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ انسانوں کا کوئی ایسا ہیرو اتنا محترم انسان آپ کو کہیں اور، کوئی اور دکھائی دیتا ہے؟ آپ کی حیات پاک درخشاں جواہرات سے مزین ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بچہ فوت ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں۔ ''اللہ ہی عطا کرتا ہے اور وہی لے جاتا ہے۔ بلند نام تو اسی کا ہے'' جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ پسندیدہ غلام زید غزوہ موتہ میں شہید ہو جاتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جوان مردی سے فرماتے ہیں۔ ''زید ہمیشہ اپنے مالک کا دم بھرتا رہا اور اب وہ اسی کے پاس چلا گیا ہے'' پھر چند لمحے بعد زید کی بیٹی کیا دیکھتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زید کی میت کے قریب بیٹھے آنسو بہا رہے ہیں۔ وہ لڑکی پوچھتی ہے کہ ''یہ کیا ہے رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب دیتے ہیں ''یہ ہے تقاضائے بشری ایک دوست کی محبت اپنے دوست کے لئے''۔

ایسی عظمت کی مثال لا سکتے ہو تو لاؤ کہ اپنی وفات سے دو دن پہلے وہ مسجد میں چلا جاتا ہے اپنی کمر سے کپڑا اٹھا کر کہتا ہے ''لوگو! اگر میں نے تم میں سے کسی کو دکھ دیا ہو تو آؤ یہ میری کمر حاضر ہے اور یہ زمین پر کوڑا پڑا ہے جو بدلہ لینا چاہے آج کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن

عبداللہ سے بدلہ لے لے''۔

آپ نے دیکھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ کہہ رہے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ نہیں فرماتے۔ اس لئے تا کہ شان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام میں کوئی شخص جھجک میں پیچھے نہ رہ جائے۔ اتنے بڑے ہجوم میں صرف ایک شخص اٹھتا ہے۔ آپ نے ایک بار مجھ سے تین درہم قرض لئے تھے اور پھر اس بے تاج بادشاہ کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی۔ خندہ پیشانی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہوئے قرض لوٹا دیتے ہیں کہ ''آج کے دن کی شرمندگی یوم آخرت کی شرمندگی سے بہت آسان ہے'' یہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم کردار۔ ذرا اپنے دلوں کو ٹٹولیئے۔ کیا وہ ہمارے اپنے نہیں لگتے؟ کیا آپ کو ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ہم سب ایک ہی مادر فطرت کی اولاد ہیں۔ ہم ان صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور وہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہیں۔

میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لئے بھی بے انتہا محبت کرتا ہوں کہ آپ کی زندگی میں دکھاوے کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ عرب کے یہ صحرانشین جو ہیں جیسے ہیں بس وہ ہی ہیں۔ انہیں اپنے اور دوسروں کے کام کرنے میں خدمت بجالانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ اس میں اعزاز پالیتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں کہتے یا ظاہر کرتے جو وہ نہیں ہیں۔ تکبر تو انہیں چھو کر نہیں گزرا۔ ان میں انکساری ہے لیکن ایسی انکساری ہرگز نہیں جو ان کی عزت نفس کو مجروح کر سکے۔ صحرا کا بدو ہو یا سلطنت روما و فارس کے بادشاہ ہوں۔ وہ سب سے ایک ہی انداز میں مخاطب ہوتے ہیں۔ ایسا جب ہی ممکن ہے کہ انسان دوسروں کو بھی سمجھتا ہو۔ انسانیت کے مقام کو پہچانتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ وہ خود بھی ابن آدم ہے اور دیگر لوگ بھی خدا کے بندے ہیں اور خدا کے سب بندے لائق عزت ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم مشن کی ترقی کے دوران آپ کو جنگیں بھی پیش آتی ہیں۔ جنگ جو فطری طور سے ظالمانہ ہوتی ہے لیکن ان حالات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کورحم وکرم، جودوسخا اور عفودرگذر کے عالی شان منبری پر تشریف فرما دیکھتے ہیں۔

اللہ کے آخری نبی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد اپنے مالک پر اتنا محکم ہے کہ وہ حالت جنگ میں موت وحیات کی کشمکش میں بے مثال طریقے سے ثابت قدم رہتے ہیں۔ دشمن کا زور بڑھتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہی الفاظ جاری ہوتے ہیں۔ ''میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں اور میں اللہ کا نبی ہوں جو میں کہہ رہا ہوں اس میں دروغ اور شک کا گزر تک نہیں''۔ میدان کارزار کی حقیقت کو زندگی اور موت کی کشمکش کو وہ حق و باطل کی جنگ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے نہ وہ کسی کی موت پر خوش ہوتے ہیں نہ معذرتانہ انداز اختیار کرتے ہیں اور اپنی فتح پر کسی فخر ومسرت کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ انسانی ذاتیات سے کہیں بلند ہستی ہیں۔ سچائی کا غلبہ چاہتے ہیں۔ کیا سچائی موت وحیات سے بالاتر نہیں ہوتی۔ جس نے حق کی خاطر جان دی اس کا انعام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خالق کے پاس اور جس نے باطل تلوار اٹھائی اس کا معاملہ بھی اسی خالق کے پاس!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول صاف، سیدھا، دوٹوک ہر الجھاؤ سے پاک غزوہ تبوک کا موقع آتا ہے تو کچھ لوگ اس میں شرکت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے گرمی بہت ہے تو کوئی پکی ہوئی کھیتوں کا بہانہ پیش کرتا ہے۔ ذرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استدلال ملاحظہ ہو تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم فصلوں اور کھیتوں کی بات کرتے ہو یہ تو سب دوچار دن کی بات ہے۔ اس کھیتی کے بارے میں سوچو جو لازوال، لافانی اور ابدی ہے۔ سخت گرمی؟ ہاں! سخت گرمی ہے لیکن جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔ کافروں سے خطاب کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نہایت متناسب طنز کا استعمال بھی کر لیتے ہیں۔ اس بڑے دن کو یاد رکھو جب تمہیں اپنے کئے کا پورا پورا پھل مل کر رہے گا۔ دیکھو گے کہ تمہیں بدلہ پورا پورا ملے گا۔ اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی جہاں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ پڑتی ہے حقیقت کے پاتال تک پہنچ جاتی ہے پھر وہ قرآن میں اس طرح بیان ہوتی ہے کہ ایک ایک

لفظ کئی جملوں کو بیان کر دیتا ہے بلکہ ان پر بھاری رہتا ہے۔ آپ کی نصیحت میں کوئی دورخی نہیں۔ وقت سب کچھ ہے اسی وقت سے اے بنی نوع انسان! تم اپنی دنیا سنوارو پھر اسی وقت سے تمہاری آخرت خود بخود سنور جائے گی۔ وقت کا ایسا استعمال جو سب مخلوق کے لئے باعث راحت ہو۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگ خیالات وافکار تھیوری اور اندازے اور اپنے اپنے طرز کی تلاش، جستجو اور تحقیق کے راستوں میں گرتے پڑتے زندگی کا سفر پورا کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بہت ہی دردناک گناہ ہے۔ شاید تمام قابل تصور گناہوں کی جڑ یہی ہے کہ ہم جھوٹ کے ساتھ باطل کے ساتھ تجربے کرنے میں اپنی زندگی صرف کر دیں۔ تجربے کرنے ہیں تو جی بھر کے تجربے کرو۔ دنیا کی ہر تھیوری کو آزماؤ۔ ٹیسٹ کرو۔ اسے پرکھو۔ قرآن کی سچائی کو ٹیسٹ کرنے بیٹھو گے تو چھوٹے ہو جاؤ گے۔ پہاڑوں سے اونچے بادلوں کے پار آسمانوں سے بلند سچائی خالق کائنات کا کلام۔ اسے شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھو گے تو خود کو کیڑے مکوڑے محسوس کرو گے۔ کیا تم اس سے بڑی توہین اپنے لئے گوارا کر سکتے ہو؟ کیا اس سے بڑا گناہ تصور کر سکتے ہو کہ دھرتی کے سینے پر دو پاؤں پر کھڑے ہونے کے بجائے افلاک کے پیغام کو ٹھکرا کر مٹی میں حشرات الارض کی طرح رینگنے لگو۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقد، آپ کے دشمن، آپ کی ذات پاک میں عیب تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ مجھے تو ہنسی آتی ہے کہ ان ناقدین کی بڑی سے بڑی خوبیاں بھی آپ کے نام نہاد عیوب کے سامنے کالی سیاہ نظر آتی ہیں۔ وہ لائق احترام حسن کردار میں تراشا ہوا شخص اپنی ۶۳ سالہ ہجری زندگی میں، جی ہاں! پوری زندگی میں کسی سے سخت بات کہتا ہی نہیں اور کسی پر ہاتھ اٹھاتا تک نہیں۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ زبردست قوتوں کا مالک ہے۔ ہر روز ہر لحظہ آپ کی مقدس شخصیت سے نیکیوں، خوبیوں اور پاکبازیوں کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ شاید اس لئے کہ آپ دل پاک رکھتے ہیں اور عدل وتوازن آپ کا

مزاج مبارک ہے۔

مسیحیت کی مشہور تعلیم کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال پیش کر دو ایک اور طمانچے کے لئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آپ کو ایسی ناممکن تعلیمات نہیں ملیں گی۔ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ تم بدلہ لے سکتے ہو لیکن مساوی اور عدل کے دائرے کے اندر۔ پھر بھی معاف کر دو تو یہ تمہاری عظمت ہے۔ دیکھا آپ نے! قدرت کے باوجود درگزر۔ یہ ہے وہ بلندی جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلام آپ کو لے جانا چاہتا ہے۔

بنی نوع انسان کی مساوات کا اتنا بڑا ایڈوکیٹ نہ دنیا نے دیکھا اور نہ سوچا۔ ایک مومن کی زندگی کے آگے دنیا کی سب بادشاہیں نثار! آپ زکوٰۃ و خیرات کی صرف تلقین ہی نہیں کرتے اس مشکل ترین نظام کو نافذ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ کس کمال کا انقلاب پیدا کیا دلوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے! کہ ہر مسلمان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر اس نے اپنی کمائی سے ضرورت مندوں کو عطا نہ کیا تو ان کا نقصان نہیں اس مسلمان کا اپنا گھاٹا ہے، جو مال وہ دیتا ہے قرآن کے تحت دراصل وہ اس کا ہے ہی نہیں۔ وہ تو غریب اور ضرورت مند کا حق ہے، اس کا مال ہے۔ کیا یہ انسانیت کے دلوں کی آواز نہیں ہے؟

یہ بات جو عیسائی محققین کہتے رہتے ہیں کہ اسلام کی جنت اور جہنم بس جسمانیت ہی جسمانیت ہے سراسر غلط ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے مؤرخین اور محدثین نے جنت و جہنم کے جو جسمانی نقشے کھینچے ہیں اس نقشہ گری کے جرم کے یہ لوگ ذمہ دار ہیں نہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم! قرآن کریم میں بہشت کی آسائشوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ روحانیت پر مبنی ہے نہ کہ لفظی معنوں پر۔ وہاں کی بہشت کی خوشیاں روحانی ہیں، مثلاً وہاں نہ خوف ہوگا نہ غم اور خالق کائنات کی موجودگی دیگر تمام آسائشوں پر چھا جائے گی۔

فرماتے ہیں دیکھو! جنت میں بھی تم ایک دوسرے کو سلام کہو گے۔ امن و سکون راحت و محبت کا تحفہ لو گے۔ مسندیں بچھی ہوں گی جن پر تم آمنے سامنے بیٹھے ہو گے تمہارے دلوں

سے تمام رنجشیں اور کینے مٹا دیئے جائیں گے۔ تمہاری باہم محبت بذات خود ایک بہشت ہوگی۔ کیا خوشگوار چیزوں سے لطف اٹھانا برائی ہے؟ جی نہیں! برائی ہے اپنی اخلاقیات کو آسائشوں کا غلام بنالینا۔ اگر جنت اور جہنم میں آپ کو جسمانی جزا اور سزا کے ارشادات ملتے ہیں تو کیا وہ انسانی فطرت کے عین مطابق نہیں ہیں؟

خالق کائنات کو انسانوں کو سمجھانے کے لئے انسانوں کی زبان میں اور ان کی ذہنی سطح کے مطابق ہی پیغام دینا تھا۔

انصاف کا دن، یوم قیامت ''یوم الدین'' کون سا دل ہے جس میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی آرزو کروٹیں نہ لیتی ہو۔ ۱۹ویں صدی کے وسط میں برطانیہ کا ایک عام آدمی ۶۰ برس کی زندگی پالینے کی امید کر سکتا ہے جب یہ ساٹھ برس گزر جاتے ہیں تو کیا وہ زندگی ایک دو دن کی محسوس نہیں ہوتی۔ مایوسی اور ناامیدی کی اس صورتحال میں محسن انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ہمیں حیات جاوداں کا مژدہ سناتا ہے۔ یہ حسین ترین سچائیوں میں سے ایک سچائی ہے۔ دل سے لگا لینے کے لائق۔ سوال اٹھتا ہے کہ بندے کا انجام کیسا ہے؟ اللہ کا آخری پیغمبر فلسفیوں کی طرح فائدے اور گھاٹے اچھائی اور برائی نیکی اور بدی کے کھاتے کھول کر نہیں بیٹھ جاتا۔ وہ سیدھی سی بات سکھاتا ہے۔ پھر اگر تمہاری بھلائیوں کا وزن میزان خداوندی پر زیادہ نکل آیا تو تم پاس ہو گئے۔ فوز و فلاح پا گئے حیات بعد حیات میں آگے بڑھنے کے لائق ہو گئے۔ اب تمہیں نہ کوئی خوف ہے نہ کوئی ڈر نہ غم۔

اے یورپی دانشورو! اگر تم اپنی ضد پر قائم رہنا چاہتے ہو کہ اسلام مسیحیت سے نکلا ہے تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ اس طرح نکلا ہے جیسے رات کی تاریکیوں سے سورج نکلتا ہے۔

سامعین! فطرت کو ہم اگر مال تصور کر لیں تو مجھے کہنے دیجئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مادر فطرت کے چہیتے اور معزز ترین فرزند ہیں۔ ان کی نگاہوں سے ایک لمحے کے لئے بھی یہ بات اوجھل نہیں ہوتی کہ وہ آمنہ اور عبداللہ کے بیٹے بھی ہیں اور اللہ کے عالی مقام پیغمبر

بھی۔حق بات کہنے میں پاک اور مزاجاً نرم رو اور شرمیلے۔آپ جو دیکھتے ہیں، جو فرماتے ہیں۔اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل و دماغ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔آپ کے بے مثال کلام کی تاثیر کا یہ ایک بڑا سبب ہے۔یقین اور ایقان! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یقین اور ایقان! جس پر انکے خدا نے قرآن کریم میں بار بار مہر تصدیق ثبت کی۔''ایسا ہوگا بالضرور ہوگا۔یہ بات سچ ہے یقیناً اور وہ باطل ہے یقیناً''۔

سامعین! ایک اور بات ہے جو مجھے اس مقدس ہستی کے بارے میں حیرت زدہ کرتی ہے۔دنیا کی تہذیبوں سے کٹے ہوئے ایک صحرائی شہر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے ہیں علم کی کوئی شمع مکہ میں منور نہیں ہے۔یونان، روما، فارس، ہند کے قدیم حکماء کے درس صحرا کے اس فرزند ﷺ کے قریب سے نہیں گزرتے۔نہ معلم ہیں نہ مدرسے نہ کتابیں اور پھر عالم انسانیت کا عظیم ترین رہبر بننے والا شخص پڑھنا بھی نہیں جانتا لیکن آپ ان کی پیغمبرانہ زندگی دیکھئے یا طفلی اور شباب کا مطالعہ کیجئے۔کہیں آپ کو اشارہ تک نہیں ملے گا کہ آپ کچھ سیکھ رہے ہیں۔نبوت کے ۲۳ برس ہی نہیں اس ہستی مکرم کی ۶۳ سالہ ہجری ساری کی ساری آنکھیں کھول کر بلکہ آنکھیں کھول کھول کر دیکھئے۔زندگی مبارک کے کسی مرحلے میں کسی ایک دن یا ایک لمحے میں آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار، حکمت، برتاؤ اور اخلاق میں کجی تلاش نہیں کرسکیں گے۔میں آپ سے پوچھتا ہوں ایسا کوئی اور فرد بھی دنیا میں گزرا ہے؟ ٹھیک ہے اسے کسی نے نہیں سکھایا۔وہ صلی اللہ علیہ وسلم تو عالم انسانیت کو سکھانے والا تھا۔اسے کون سکھاتا۔جب میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اس عظیم ٹیچر کو تمام کی تمام حکمتیں خود بخود کیسے حاصل ہوگئیں تو میرے دل سے صدا اٹھتی ہے، میرے ضمیر کی آواز پکار پکار کر کہتی ہے، نہیں نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا۔خود بخود کوئی یہ سب کچھ نہیں سیکھ سکتا۔عبداللہ کے فرزند کے معاملے میں نہ انسان ٹیچر ہے نہ ماحول نہ کتابیں۔پھر کون ہے آپ کا ٹیچر؟ دل تھام کر سوچئے۔خدا کے سوا کوئی اور ہوسکتا ہے؟۔

جوہن گوئٹے نے اپنی کتاب میسٹرز ٹریولز "Meister's Travels" میں کتنی اعلیٰ تمثیل پیش کی ہے، کہانی کا ہیرو ایک ایسی ہستی میں آرہتا ہے جہاں لوگوں کے عجیب عجیب اور مختلف طریقے ہیں۔افراتفری کے اس ماحول کو سدھارنے کے لئے کتاب کا ہیرو ایک انوکھا تصور پیش کرتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ آج سے ہر شخص اپنی صرف ایک خواہش کو ترک کردے۔فقط ایک خواہش کو ترک کردے۔پھر کیا ہوتا ہے؟ آناً فاناً بستی کا مزاج ہی بدل جاتا ہے۔یکا یک ہزاروں خواہشیں ترک ہوگئیں تو آپ کے جھگڑے مٹ کر رہ گئے۔وہی بستی جاہاں ہنگامہ اور بے سکونی تھی ایک دن میں پرامن ہوگئی۔میں کہتا ہوں کہ دنیا کی عظیم ترین ہستی نے اپنا بھرپور انقلاب بغیر خواہشات کو ترک کئے مکمل کر دکھایا۔جی ہاں! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مادیت سے ہرگز انکار نہیں۔آپ جو تعلیم پیش کرتے ہیں اس میں دنیا اور آخرت کی تمام خوشگواریاں شامل ہیں۔رنگ، خوشبو، خوشحالی، بہتی ہوئی شفاف نہریں، قدرت کی اور انسان کی تمام حسن کاریاں، سہانے موسم لذیذ غذائیں، اچھے اچھے گھر، صفائی، ستھرائی، پاک فطرت، حسین ساتھی، سجتے ہوئے لباس، امن وسکون، سلام ہی سلام، نہ کوئی خوف نہ کوئی غم۔یاد رکھئے! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں نعمتیں اور خوشگواریاں صرف آخرت کا وعدہ فردا نہیں، ان کا تجویز کردہ نظام اپنا لیجئے اور سیارۂ ارضی کو بہشت بریں بنا لیجئے۔غور کرلیجئے کیا بنیادی ضروریات کے بغیر انسان دنیا میں آیا تھا؟ کیا ان ضروریات کے پورا ہوئے بغیر وہ جی سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اسلام مادی چیزوں کا انکار نہیں۔وہ جنت کی تعمیر کیلئے آسائشوں کی بھی ترغیب دیتا ہے۔انجیل کی طرح اسلام یہ نہیں سکھاتا کہ ''مال دار کا جنت میں داخلہ اس سے مشکل ہے کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے''۔تو کیا اسلام مال و دولت، خزانے اور مادی چیزیں سمیٹ لینے کی تلقین کرتا ہے نہیں نہیں! ہرگز نہیں۔وہ تو صرف مادہ پرستانہ ذہنیت "Materialistic Mentality" کو ٹھکراتا ہے۔حرص جس کی ناک میں نکیل ڈال کر یہاں وہاں گھمائے پھرتی ہے۔وہ ذہنیت جس میں صرف میں اور

میرا رہ جاتا ہے تو اور تیرا، وہ اور اس کا کچھ نہیں ہونا۔

جنت اور جہنم کو جس خوبی سے قرآن بیان کرتا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بہشت کے چشمے، نہریں، سبزہ، اچھے ساتھی، عربوں کا خواب تھے اور سخت گرمی میں جھلسنے والے عربوں کے لئے بھڑکتی ہوئی آگ ہی جہنم کا تصور پیش کر سکتی تھی۔ میں برطانیہ میں اپنے ہم وطنوں سے پوچھ رہا ہوں۔ آپ میں کون ہے جسے بہتی ہوئی نہریں، شفاف پانی کے ابلتے ہوئے چشمے، سبزہ زار اور پیارے ساتھی اچھے نہیں لگتے اور وہ کون ہو سکتا ہے جسے بھڑکتی ہوئی آگ میں گرنے کا شوق ہو؟

پھر کمال یہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت و دوزخ کا تصور انسانوں کی ذہنی سطح پر چھوڑ دیا۔ فرمادیا انہوں نے کہ بہشت ایسی جگہ ہے جو در حقیقت نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی، نہ کسی دل میں اس کی حقیقت کا خیال تک گزرا۔ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا صاف کہتا ہے ''جنت جہنم کیا ہے؟ تمہارے اعمال جو میں تمہیں لوٹا کر دے رہا ہوں''۔

بتایئے! آخرت کا اس سے بہتر تصور آپ کو کہیں اور مل سکتا ہے؟ پھر میزان پر بھی توجہ فرمالیجئے۔ عذاب اور ثواب یہاں وہاں بٹ نہیں رہا ہے۔ یہاں تو اعمال کا وزن ہو رہا ہے۔ میزان کے دو پلڑے ہیں۔ استعارہ سمجھ لیجئے۔ تمہاری زندگی میں اگر انسانی فلاح کے کام بھاری رہے تو گویا دایاں پلڑا جھک گیا یہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں خیر ہے اور نتیجہ دیکھئے کتنا قابل رشک ہے! ہمیشہ کی زندگی۔ حیات جاوید! اور وہ بدقسمت جس کا بایاں پلڑا جھک گیا کون ہوگا وہ؟ جس نے اپنے گھرانے اور معاشرے کے حقوق مارے ہوں گے۔ ذہن اچانک اڑ کر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ایسا شخص ہمیشہ کی موت مرجائے گا لیکن قرآن کہتا ہے کہ جس نے انسانوں کا حق ادا نہ کیا، وہ دوسری زندگی میں مریں گے نہیں لیکن جیئیں گے بھی نہیں۔ زندگی اور موت کے بیچ میں کوئی شخص لٹکا ہو وہی اس کیفیت کو سمجھ سکے گا۔ ہم صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کیسی دہشت ناک کیفیت ہو سکتی ہے! پر ہول، رنجور، درد انگیز!۔

سامعین! کمال یہ ہے کہ شاہ مدینہ انسانوں کو اس خوبی سے اپنے اللہ کا پیغام دیتے ہیں کہ انہیں جنت اور جہنم اپنے قریب، بہت قریب محسوس ہونے لگتی ہے۔ آپ فرمادیتے ہیں لوگو؟ جنت اور جہنم تو جوتے کے تسمے سے زیادہ تمہارے نزدیک ہے۔ مجھے تو وجد آجاتا ہے۔ اس طرز تخاطب پر۔ صاحب ایمان شخص صرف آخرت کے خوف و امید میں نہیں جیتا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تربیت یافتہ شخص غلط کام کرتے ہوئے خود کو جہنم کے قریب محسوس کرنے لگتا ہے اور جب وہ نیکی کا ارادہ ہی کر لیتا ہے تو اسے بہشت کی کھڑکیوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبودار ہوائیں چلتی آتی گاتی محسوس ہونے لگتی ہیں۔

سامعین! محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہستی جن کے شایان شان احترام کے لئے دنیا کی کسی زبان میں الفاظ مل ہی نہیں سکتے۔ ان کی خود اعتمادی ملاحظہ فرمایئے۔ وہ پہلے ہیں اور پہلے چلے جارہے ہیں لوگوں پر ہیبت کلام کو سن کر موم کی طرح پگھل جاتے ہو حالانکہ تم پتھر کی طرح سخت بننے کی کوشش کرتے ہو۔ تم اسے چھپ چھپ کر سنتے ہو، ڈرتے بھی ہو کسی کے کانوں میں نہ پڑ جائے۔ تم اس کلام کی شوکت دیکھ کر اتنے حیران ہوتے ہو کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کلام عربی ہے کیا؟ کبھی کہتے ہو یہ شاعری ہے۔ پھر بول اٹھتے ہو نہیں نہیں! شاعری اتنی پر حکمت نہیں ہو سکتی۔ پھر نیا خیال لاتے ہو۔ یہ تو جادو ہے۔ تم میں کا کوئی دانش مند چیخ اٹھتا ہے کہ ہم اس کلام عربی کو آسمانی سمجھ تو لیں لیکن کیا کریں؟

کہاں جائیں! یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تو ہماری طرح کا آدمی ہے۔ کھاتا پیتا بھی ہے۔ بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے۔ میرے متعصب ہم وطنو! میں یقین سے کہتا ہوں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو محض اس نازل ہونے والے کلام کے برتے پر دعویٰ کر بیٹھتا۔ میں تو فرشتہ ہوں، اوتار ہوں، دیوتا ہوں، لیکن آپ جواباً یہ ہی فرماتے ہیں ہاں! میں تم جیسا ہی ایک انسان ہوں۔ بات بس اتنی ہے۔

میں کہتا ہوں بات اتنی ہی نہیں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے اعلیٰ ترین

مقام پر فائز تھے۔ بہترین شہری، بندہ دل نواز، اعلیٰ درجے کا لیڈر، صاحب فکر، اول درجے کا خطیب، صاحب کردار، زبردست کمانڈر، بہترین ساتھی، عظیم فرزند، بے مثال بیٹا اور باپ، صف اول کا قانون ساز، دلوں کا فاتح، دماغوں کا حکمراں، پھر بھی خود کو صرف بشر کہتا ہے اور لوگو! پھر یہاں ٹھہر نہیں جاتا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تم تدبیر کرو سوچو، غور کرو۔ وہ معجزے دکھا کر لوگوں کے ذہنوں کو ماؤف نہیں کر دیتا۔ ان کی عقلوں کو معطل نہیں کر دیتا۔ وہ فرماتا ہے تم اکیلے اکیلے اور کبھی مل جل کر میرے پیغام پر غور کرو چاہو تو میری ذات پر الزامات لے سکتے ہیں۔ ایسی مثال کہیں سے ڈھونڈ کر؟ کتنی دلچسپ بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کو بھی اقرار کرنا پڑتا ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم آپ کو جھوٹا یا برا کہہ ہی نہیں سکتے۔ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو اپنانا نہیں چاہتے۔ انانیت "EGO" خود پرستی کی جو مثال ابوجہل پیش کر گیا وہ بھی اس باب میں حرف آخر ہے۔ اتنا ٹھوس اقرار! اس پر انکار اتنا کمزور! جیسے حجر اسود پر مکڑی نے جالا بن دیا ہو۔ جیسے دوپہر کے سورج کے نیچے سفید بادل کی کوئی ٹکڑی گذر رہی ہو۔ اللہ اکبر!

اب ذرا فکر کا ایک قدم اور آگے بڑھائیے۔ کیا دنیا میں کبھی، کیا تاریخ میں کسی انسان نے اپنے دشمنوں سے یہ کہا ہے تم سب مل جل کر مجھ پر نازل ہونے والے کلام جیسی ایک سورہ بنا لاؤ۔ اپنے حمایتوں کو بھی ساتھ لے آؤ۔

سرداروں، جغادریوں، فرعونوں اور طرم خانوں کے دلوں میں بھونچال پیدا کرنے والا اعلان! میں اپنے اللہ کا ایک بندہ صحیح جیسے تم سب اس کے بندے ہو۔ قرآن میری کتاب نہ سہی کہ اس میں تمہارا ہی تذکرہ اور اس کا مصنف خداوند عالم ہے۔ میں بھی تمہاری طرح ایک جسم رکھتا ہوں، سوتا ہوں، جاگتا ہوں، کھاتا ہوں، پیتا ہوں، بازاروں میں چلتا پھرتا ہوں۔ اگر تم میرے مقدس پیغام سے انکار کرتے ہو، اپنی دشمنیوں میں بڑھتے چلے جاتے ہو تو ایسا کرو کہ سب آپس میں مل کر میرے خلاف کوئی تدبیر کر لو اور ہاں یاد رکھو مجھے

ذرا سی مہلت بھی نہ دینا۔

پھر کون سی تدبیر ہے جو آپ کے دشمن اٹھا رکھتے ہیں اور کون سی شکست اور کون سی ہزیمت ہے جو ان ظالموں کو اٹھانی نہیں پڑتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین عیسائیت سے نکلا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہودیت، مسیحیت اور اسلام سب ایک ہی خدا کے بھیجے ہوئے پیغامات ہیں۔ اسلام البتہ آخری اور کامل دین ہے۔ روحانیت اپنی معراج پر۔ یہاں جنت بخشش کے طور پر عطا نہیں ہوتی۔ ایمان اور بہتر اعمال کے نتیجہ میں ملتی ہے جس سے انسانیت کی بلکہ مخلوق کی بھلائی کا سامان ہوتا ہے۔ اسلام میں جھوٹ تلاش نہ کیجئے لیکن اگر آپ اپنے شوق اور جستجو کے خاطر اسلام میں جھوٹ ڈھونڈنے پر بضد ہیں تو سمجھ لیجئے کہ جو چیزیں آپ کی عقل اور دل میں کھٹک جاتی ہیں وہ رسول عربی کے ڈیڑھ دو سو تین سو برس کے بعد آنے والے مذہبی پیشواؤں کے کارنامے ہیں۔ جھوٹے وہ ہیں، احسان فراموش، خوف خدا سے عاری، اپنی ذات میں بند انسانیت کے دشمن۔ یہ بعد والے لوگ ہیں ان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ عالم کی عظیم ترین ہستی اور اس کے مقدس پیغام کے گرد اپنے چھوٹے چھوٹے دماغوں کی گھٹن پیدا کر دی۔ دیکھنا ہو تو اسلام کی سچائی اور حسن کاریوں کو دیکھئے۔ مسلمان عموماً آپ کو اپنے دین سے اتنی زیادہ محبت کرتے نظر آئیں گے جو مسیحیوں کو نصیب نہیں۔ آج ۱۸۴۰ء میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ۱۲۰۰ برس بعد بھی قاہرہ کی اندھیری رات میں جب چوکیدار پکارتا ہے۔ ''کون ہے'' تو مسافر یہ نہیں کہتا کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں جواباً وہ کہتا ہے'' لا الٰہ الا اللّٰہ ''اور فوراً چوکیدار کی تسلی ہو جاتی ہے۔ اسلام کی ایک خوبصورتی یہ بھی ہے کہ وہ جہاں جہاں جاتا ہے صرف برائی کو مٹاتا ہے۔ خوبی کو تر و تازہ اور شگفتہ رہنے دیتا ہے جیسے آپ گلاب کو سونگھتے ہیں تو آپ کا جی چاہتا ہے کہ اس کی ڈنٹھل اور ٹہنی کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس کی پنکھڑیاں سلامت رہیں۔

عربوں کو اسلام نے اندھیروں سے نکالا اور انہیں روشنی کی طرف لے گیا۔ میں تو یہ

کہوں گا کہ عربوں کو پہلی بار اسلام نے زندگی عطا کی جب سے دنیا بنی تھی یہ غریب عرب چرواہے صحراؤں میں تہذیب کی نگاہوں سے اوجھل بھیڑ بکریاں چراتے پھرتے تھے۔ پھر ان ہی لوگوں میں انسانیت کا عظیم ہیرو پیغمبر نازل ہوتا ہے۔ دنیا کے نظر انداز کئے ہوئے یہ گڈریئے اور چرواہے دنیا پر چھا جاتے ہیں۔ تاج وتخت اور خزانے ان کی ٹھوکر میں ایک صدی نہیں گزرتی کہ اسی عرب کے ایک ہاتھ میں غرناطہ ہے اور دوسرے ہاتھ میں دہلی، ان فتوحات کے ساتھ صرف شجاعت ہی نہیں علم، عدل و کردار کی روشنی بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ عرب نہ صرف خود چمک رہا ہے بلکہ اس نے ایک دنیا کو جگمگا دیا ہے۔ نظام محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ایمان ایسی قوتیں اور برکتیں لے کر آتا ہے کہ دیکھتے دیکھتے ایمان لانے والے افراد، اور قوموں کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عربوں کی مثال ایسی نہیں کہ چمکتی ہوئی ایک چنگاری خشک ریت پر گر کر ٹھنڈی ہوگئی ہو۔ یہ مثال تو ایسی ہے کہ ایک مقدس شرارہ بجلی بن کر بارود کے ڈھیر میں آ گرا ہو اور پھر بارود کے اس ڈھیر سے ایسی آتش فروزاں ہوئی ہو جو دہلی سے غرناطہ تک زمین کو اور زمین سے آسمان تک فضا کو نورانی کر گیا ہمیشہ کے لئے۔ میرا عظیم ہیرو محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ! آسمانی بہشت کی بجلی کا شرارہ دنیا کے لوگ جس کے انتظار میں تھے تاکہ وہ روشنی پائیں اور پھر قیامت تک دیئے سے دیا جلتا چلا جائے۔

- مجمع الامام محمد بن اسماعیل البخاریؒ للدراسات الاسلامیہ
- ایوان امام الہند شاہ ولی اللہ محدث الدہلویؒ
- جامع الامام محمد قاسم النانوتویؒ
- مرکز التوحیدی الاسلامی للدعوہ والارشاد

چھ ہزار طلباء وطالبات کی تعلیم وتربیت اور قیام وطعام کے لئے جامعہ کے تعمیری وترقیاتی منصوبے اور "القاسم اسلامک یونیورسٹی" کا تخمینی بجٹ تقریبا 1,50,20,93,768.00 ڈیڑھ سو کروڑ روپے سے زائد ہے۔ جو بھی خواہان ملت اسلامیہ صاحب جود وسخا اور باتوفیق اہل خیر کے تعاون سے اللہ رب العزت ہی پورا کرانے والا ہے۔ حق جل مجدہ کا پاک ارشاد ہے:

"جس نے اچھے کام کئے ہوں، ہم کبھی اس کا اجر ضائع نہیں کرتے" (الکہف: ۳۰ ترجمہ: امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ "ترجمان القرآن")

اللہ ہی ہمارا اور آپ کا حامی وناصر ہے۔

Published by:

Jamiatul Qasim Darul Uloom-il-Islamia

At & Po. Madhubani, G.P.O. Partap Ganj, Distt: Supaul - 852125 Bihar (India)
Ph: +91-9811125434, 9931906068, 9931515312
www.jamiatulqasim.com / E-mail: jamiatulqasim@yahoo.com
www.facebook.com/muftimahfoozurrahman.usmani
youtube.com/jamiatulqasim

Delhi Office:

K-79, 2nd Floor, Street No.5, Abul Fazal Enclave-I,
Jamia Nagar, New Delhi-110025 (India)
Ph: +91-11- 26981876, 26982907 Mob: +91-9899766786
Printed at : M.R. Printers, 2818, Gali Garaiya, Darya Ganj, New Delhi-110002